

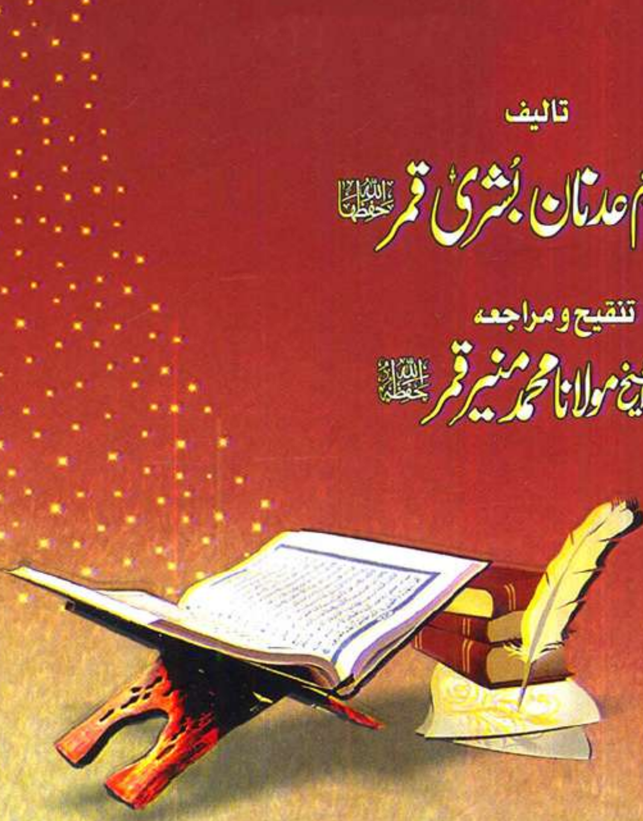
گلدستہ دروسِ خواتین

تالیف

محترمہ ام عدنان بشریٰ قمر حفظہا اللہ

تنقیح و مراجعہ

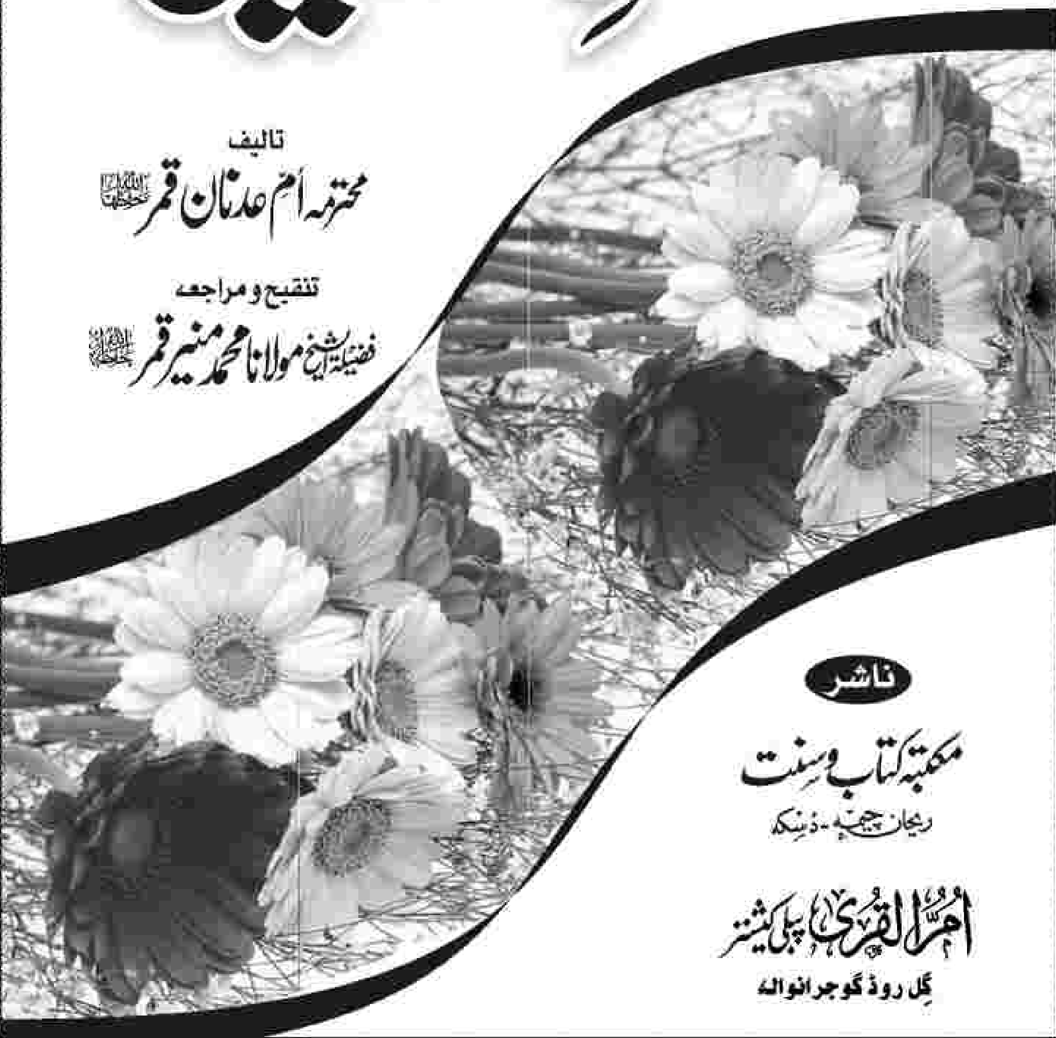
فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ



گلدستہ دروسِ خواتین

تالیف
محترمہ ام عدنان قمر حفظہا اللہ

تنقیح و مراجعہ
فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ



ناشر
مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ - ڈسکہ

ام القریٰ پبلی کیشنز
گل روڈ گوجرانوالہ

نامِ کتاب

گلدستہ دروسِ خواتین

تالیف
محترمہ اُمِ عدنان قمر حفظہا اللہ

تنقیح و مراجعہ
فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

کمپوزنگ: ــــــــ نائلہ قمر، ثنا قمر، نادیہ قمر

سیٹنگ: ــــــــ ابوسفیان عزیزی
0321-6487621

اشاعت: ــــــــ جنوری 2013ء

اُمّ القریٰ پبلی کیشنز

گل روڈ، گوجرانوالہ فون: 0333-8110896. 0321-6466422
Www.umm-ul-qura.org

مکتبہ کتاب و سنت ریحان چیمہ۔ ڈسکہ۔ ضلع سیالکوٹ

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرس

2 فضائلِ قرآن

3 سيرة نبينا محمد ﷺ

4 نماز و روزہ

5 مسنون حج و عمرہ اور زکاۃ

❁❁❁

کلمہ تشکّر

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ، وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَسَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. اَمَّابَعْدُ:

معزز قارئین ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اللہ رب العزت کا مجھ پر بہت بڑا احسان وکرم ہے، اس پاک ذات کا شکر ادا کرنے سے میری زبان قاصر ہے جس نے مجھ نا چیز کو اس چھوٹی سی کوشش کی سعادت بخشی ۔

بے شک اس کی رحمت وکرم اور توفیق کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں ۔ الحمد للہ.... رب رحمٰن کا شکر ادا کرنے کے بعد میں اپنی استاذہ محترمہ (آسودۂ خاک بمبانوالہ ،سیالکوٹ) کی بھی شکر گزار ہوں ، جن سے دیگر ہزاروں طالبات کی طرح میں نے بھی اللہ تعالیٰ کے پاک کلام قرآنِ کریم اور احادیثِ رسول ﷺ کا علم حاصل کیا۔ ان کے لیے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے شمار رحمت اور برکتیں نازل فرمائے اور ان کی قبر کو تا حدِ نگاہ وسیع فرمادے۔آمین

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بعد میں اپنے رفیقِ حیات اور استاذِ محترم ابو عدنان محمد منیر قمر صاحب کے لیے بھی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں، جنھوں نے اس کام کے لیے مجھے تیار کیا اور پھر میری ہمت افزائی کی، چونکہ درس کے متعلق مواد جمع کرنا ،لکھنا اور پھر اس کو حوالوں کے ساتھ تیار کرنا میرے لیے کافی مشکل تھا، اگر چہ ناممکن نہ تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جب رحمت کرتا ہے تو اپنے بندوں پر آسانیاں فرما دیتا ہے۔ الحمد للہ.... اللہ رب العزت ابو عدنان قمر کو جزائے احسن سے نوازے جنھوں نے آج سے تقریباً چار سال پہلے ایک درس کا کچھ حصہ میرے لیے تیار کیا، پھر مجھے خود لکھنے کے لیے کہا اور ساتھ ساتھ اپنے مفید اور ماہرانہ مشوروں سے میری راہنمائی فرمائی، پھر میرے ان درسوں کو کتابی شکل دینے کے بارے میں اپنی قیمتی رائے اور تجویز کا اظہار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو

جزاے خیر عطا فرمائے، انھوں نے اپنے قیمتی وقت اور انتہائی مصروفیات کے باوجود نہ صرف یہ کہ درسوں کو کتابی شکل دینے کے لیے ترتیب دیا، بلکہ کئی بار ان پر نظرِثانی فرمائی اور میری اس کوشش کی احسن طریق سے اصلاح فرمائی اور میرے ان درسوں کی نوک پلک کو سنوارا اور ان کے لیے مقدمہ یا پیش لفظ بھی لکھا ہے۔

یہ میرے لیے ایک عظیم اعزاز ہونے کے علاوہ باعثِ حوصلہ و ہمت افزائی بھی ہے۔ میں اپنے ربِ کریم کا شکر ادا کرنے کے بعد ان کی بھی بے حد شکر گزار ہوں، انھوں نے اس کتاب کے لیے قدم قدم پر میری راہنمائی فرمائی ہے اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے بھی میں نے بہت استفادہ کیا ہے۔

میں ان کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا عطا فرمائے اور ان کی صحت و عمر اور علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دینی خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے اور انہیں ان کے لیے فلاح ونجات کا ذریعہ بنائے۔ اللّٰھُمَّ آمین

علاوہ ازیں میں اپنی لختِ جگر نائلہ قمر اور ثنا قمر کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے ان دروس کو کمپوز کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزاے خیر عطا فرمائے۔ آمین

اسی طرح میں اپنی لختِ جگر نادیہ قمر کی بھی بے حد شکر گزار ہوں جس نے ہمارے درسوں کے مسودے کو نہ صرف مرتب کیا، بلکہ کافی حصہ کمپوز بھی کیا ہے۔ میری ان سب کے لیے دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بیش از پیش توفیقِ خیر سے نوازے اور انھیں دنیا و آخرت میں بہترین بدلے سے نوازے اور ان کے اس عمل کو ذریعہ سعادت ونجات بنائے۔ آمین

آخر میں مَیں اُن تمام کرم فرماؤں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں، جنھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں کسی بھی طرح کا تعاون کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل کو شرفِ قبولیت بخشے اور ان کے لیے ذریعہ فلاح ونجات بنائے۔ اَللّٰھُمَّ آمین

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

دعاؤں کی طلبگار: ام عدنان بشریٰ قمر بنت محمد صادق ڈھلو

الخبر، سعودی عرب

۱۲ ربیع الثانی: ۱۴۳۳ھ = ۵/ مارچ: ۲۰۱۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ، وَ نَسْتَعِينُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا، وَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ. أَمَّا بَعْدُ:

قارئین کرام! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

خلیجی ممالک خصوصاً سعودی عرب میں دعوت و ارشاد کا کام کرنے کے لیے ایک خاص سسٹم ہے، جس کے تحت کسی بھی مسجد یا کھلے مقام پر کچھ کہنے کے لیے با قاعدہ اجازت نامہ چاہیے، جس کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ ہر کس و ناکس اٹھ کر اپنی اپنی راگنی نہیں گا سکتا، بلکہ پہلے اس کا عقیدہ چیک کیا جاتا ہے کہ وہ کون ہے اور کس مسلک و مشرب سے تعلق رکھتا ہے؟ اس طرح اہلِ شرک و بدعت کے لیے تو اپنے غلط افکار و نظریات کی نشر و اشاعت کے دروازے بند ہیں، وہ صرف چوری چھپے گھروں کے اندر ہی اندر کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں اور وہ بھی ڈرے سہمے ہوئے۔ اس کے برعکس اہلِ توحید کے لیے دعوت و ارشاد کے تمام دروازے الحمد للہ کھلے ہیں۔ ریڈیو سعودی عرب کی اردو سروس ہو یا جرائد و مجلّات، اسلامک سنٹرز (مکاتب جالیات) ہوں یا دوسرے دعوتی ادارے؛ ہر جگہ اہلِ توحید کی نمایندگی بھرپور انداز سے ہوتی ہے۔

اسی طرح خواتین کے لیے جالیات سنٹرز کا شعبہ خواتین (قسم النساء) بھی قائم ہے، جس میں اہلِ توحید خواتین کو دعوت و ارشاد کے بھرپور مواقع حاصل ہیں۔

ہمارے شہر الخبر کے اسلامک سنٹرز کے تحت کثرت سے ہفتہ وار دروس اور سالانہ جلسوں کا انتظام کیا جاتا ہے، نیز ہدایہ سنٹر کے زیر انتظام ایک دس روزہ سالانہ پروگرام کورنش الخبر پر منعقد کیا جاتا ہے، جس میں اردو داں طبقے کو بھی با قاعدہ موقع دیا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک عظیم الشان دس روزہ سالانہ پروگرام محمد عاقل صاحب کی کوششوں سے جدہ کورنش پر بھی ہوتا ہے جس میں روزانہ چند علما

کے خطابات ہوتے ہیں، جنھیں سعودی عرب کے دور دراز علاقوں سے مدعو کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جالیات سنٹر الجبیل میں شیخ مختار مدنی اور ان کے رفقا و دعاۃ اور نیو صناعیہ جالیات سنٹر الریاض میں قاری محمد اقبال راشد اور ان کے رفقا کے تعاون سے ہونے والے سالانہ جلسے بھی بڑے عظیم الشان ہوتے ہیں۔

الخبر کے عظیم سالانہ پروگرام میں صرف مرد حضرات ہی نہیں، بلکہ خواتین کا شعبہ بھی حصہ لیتا ہے جس میں پچھلے کئی سالوں سے میری اہلیہ ام عدنان بشریٰ قمر۔و فقھا اللّٰہ تعالیٰ۔ بھی درس دے رہی ہیں۔ اس سالانہ پروگرام کے علاوہ بھی خواتین کے حلقوں میں ہفتہ وار درس و تدریس کا سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے اور ہر ہفتے میں میری اہلیہ کے مسلسل دو اور کبھی کبھی تین درس الخبر کے مختلف علاقوں میں ہوتے ہیں۔ تَقَبَّلَ اللّٰہُ مِنْهَا.

زیرِ نظر کتاب انھی دروس و محاضرات کا مجموعہ ہے جس کی سر دست یہ دو جلدیں پیشِ خدمت ہیں اور اللہ کی توفیق شاملِ حال رہی تو یہ سلسلہ مزید جاری رہے گا۔ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ.

لوگوں کے ہاں خواتین کے دروس پر مشتمل مجموعے اور متعلقہ کتب تو یقیناً موجود ہیں، لیکن اس مجموعے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واہی تباہی قصے کہانیوں، من گھڑت اور ضعیف و منکر روایات سے ممکن حد تک اجتناب کیا گیا ہے، جس کا التزام مولفہ نے دروس کی تیاری ہی میں کیا ہوا ہے، کیوں کہ فضول قصوں کہانیوں سے گریز ہی میں سلامتی اور صحیح و حسن درجے کی احادیث ہی میں خیر و برکت ہے۔

ان دروس و محاضرات کو سات الگ الگ کتب و اجزا کی شکل میں ایک سیٹ کے انداز سے شائع کرنے کا ارادہ تھا، مگر اخراجات کا تخمینہ لگوایا تو وہ سات جلدیں ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ہوگیا۔ صفحات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ایک جلد میں چھاپتے تو بہت ضخیم ہوجاتی، لہٰذا میانہ روی اختیار کرتے ہوئے ان دروس کو دو جلدوں ہی میں شائع کر رہے ہیں، تاہم ساتوں عناوین کو سات ابواب کی شکل دے دی گئی ہے، بلکہ اسلام کے ارکانِ اربعہ کو دو حصوں (۱۔ نماز و روزہ، ۲۔ حج وعمرہ اور زکات) میں الگ الگ کر کے آٹھ ابواب کر دیے گئے ہیں۔

کتاب میں وارد تمام احادیث و مضامین باحوالہ ہیں اور احادیث کی باقاعدہ فنی تخریج کر کے جناب حافظ شاہد محمود صاحب (فاضل مدینہ یونیورسٹی) نے کتاب کے معیار و اعتبار میں مزید اضافہ

کر دیا ہے۔ جَزَاهُ اللّٰهُ خَيْراً.

راقم نے کتاب کے مضامین کی ترتیب و تبویب اور زبان کی قدرے تہذیب و تنقیح کر دی ہے۔ کتاب کی طباعت و اشاعت کے لیے ہم محترمہ ام عبداللہ آمنہ ایوب اور ان کے شوہر، الخبر کے معروف سماجی کارکن اور مخیّر شخصیت محترم جناب محمد ایوب مشتاق صاحب (جنرل منیجر سنسنہ کارنر کنٹریکٹنگ کمپنی الریاض ، الجبیل) کے شکر گزار ہیں، جن کے بھرپور تعاون سے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہنچی ہے۔ فَجَزَاهُمَا اللّٰهُ فِي الدَّارَيْنِ خَيْراً، وَبَارَكَ فِيْ أَهْلِهِمَا وَ مَالِهِمَا وَ عُمُرِهِمَا وَأَعْمَالِهِمَا.

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کتاب کی مولفہ ام عدنان قمر کے اس علمی نقشِ اول کو شرفِ قبول سے نوازے، انھیں مزید توفیق عطا فرمائے اور صحت و عافیت سے رکھے۔ نیز اس کتاب کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور قارئینِ کرام و قارئات محترمات خصوصاً خواتین اور بالأخص دعوت و ارشاد کے شعبے سے منسلک دروس و محاضرات دینے والی واعظات و مدرّسات کے لیے دروس کی تیاری میں معاون بنائے۔ آمین

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ابو عدنان محمد منیر قمر نواب الدین

ترجمان سپریم کورٹ الخبر و داعیہ متعاون

بمراکز الدعوۃ والارشاد

بالدمام والظہران والخبر۔سعودی عرب

بروز جمعۃ المبارک

۱۴۳۴/۲/۲ھ

۲۰۱۲/۱۲/۱۵ء

گلدستہ دروسِ خواتین

1

صحیح اسلامی عقیدہ

تالیف
محترمہ ام عدنان قمر

تنقیح و مراجعہ
فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ۔ ڈسکہ

ام القریٰ پبلی کیشنز
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

فون: 0333-8110896. 0321-6466422

صحیح اسلامی عقیدہ

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

قرآنِ کریم کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ تمام انبیاے کرام علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں کو سب سے پہلے اللہ کی وحدانیت و عبادت کا درس دیا تھا۔ سورۃ الانبیا (آیت: ۲۵) میں امام الانبیا خاتم المرسلین حضرت محمد ﷺ سے مخاطب ہوکر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے:

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾

''اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، تم میری ہی عبادت کرو۔''

لہٰذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اُس امر کا علم و عرفان حاصل کرے، جسے دے کر اس نے رسولوں کو بھیجا، جس کی یاد دہانی کے لیے کتابیں نازل فرمائیں، جس کے سبب دنیا و آخرت، جنت وجہنم اور حشر ونشر کی تخلیق ہوئی، جس کے لیے میزان قائم ہوگا، نامہ اعمال تقسیم کیے جائیں گے اور جس امر کی بنیاد پر شقاوت وبدبختی اور سعادت ونیک بختی حاصل ہوگی، جیسا کہ سورۃ الجاثیہ (آیت: ۲۲) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾

''اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے تا کہ ہر نفس کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے اور ان کے ساتھ نا انصافی نہ ہو۔''

یہ نہیں ہوگا کہ نیک و بد دونوں کے ساتھ وہ یکساں سلوک کرے، جیسا کہ کافروں کا زعمِ باطل ہے، کیونکہ دونوں کو برابری کی سطح پر رکھنا ظلم یعنی عدل کے خلاف اور مسلمات سے انحراف بھی ہے،

اس لیے جس طرح کانٹے بو کر انگور کی فصل حاصل نہیں کی جاسکتی، اُسی طرح بدی کا ارتکاب کر کے وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا جو اللہ نے اہلِ ایمان کے لیے رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ جاننا ہے کہ دینِ اسلام کیا ہے اور عبادت کسے کہتے ہیں؟

اصلاحِ عقیدہ کی اہمیت:

دینی مسائل کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ ''ایمانیات'' کہلاتا ہے، جسے ہم عقائد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسرا حصہ ''عبادات'' کہلاتا ہے، ، جسے ہم ''اعمال'' کے نام سے جانتے ہیں۔ دینِ اسلام میں عقائد کو وہی حیثیت حاصل ہے جو بدن میں ریڑھ کی ہڈی کو اور درخت میں جڑ کو حاصل ہے۔ جس طرح ریڑھ کی ہڈی کے بغیر بدن بدن نہیں رہتا اور جڑ کے بغیر کوئی درخت زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح اگر عقیدہ درست نہ ہو تو سارے اعمالِ خیر اکارت جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین کے صوم و صلات اور اعمالِ خیر کی کوئی قیمت نہیں ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی چیز جس کی اصلاح کی جانی چاہیے، وہ عقائد کا مسئلہ ہے، مگر بدقسمتی سے عقائد پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

صحیح عقیدہ ہی ملتِ اسلامیہ کی بنیاد اور دینِ اسلام کی اساس ہے۔ اسی پر امتوں کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ ہر امت کی بہتری اور سر بلندی اُس کے عقیدے کی سلامتی اور اس کے افکار کی درستی سے وابستہ ہے، اس لیے تمام انبیاء رضی اللہ عنہم نے عقیدے کی اصلاح کی دعوت دی ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا سابقہ آیت سے پتا چل رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی دعوت کی ابتدا اسی طرح کی، چنانچہ سورۃ الاعراف (آیت: ۵۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾

''ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو انھوں نے (ان سے) کہا کہ اے میری برادری کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ مجھے تمھارے بارے میں بڑے دن کے عذاب کا (بہت ہی) ڈر ہے۔''

شرک کی ابتدا:

اس آیت میں اللہ کے نبی حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ان کی قوم نے سب سے پہلے غلو کرنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا لیکن یہ شرک کا مرض تب سے لے کر آج تک مسلمانوں میں بڑھتا ہی چلا آرہا ہے۔

دنیا میں پہلے صرف توحید ہی تھی، شرک بعد میں پیدا ہوا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ (آیت: ۲۱۳) میں فرمایا ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾

''دراصل لوگ ایک ہی گروہ تھے، اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو خوشخبریاں دینے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں تا کہ وہ لوگوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ کریں جن میں انھوں نے اختلاف کیا۔''

ایک اور جگہ سورت یونس (آیت: ۱۹) میں فرمایا:

﴿وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا﴾

''اور تمام لوگ ایک ہی امت تھے، پھر انھوں نے اختلاف پیدا کرلیا۔''

اختلاف ہمیشہ راہِ حق سے انحراف کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس انحراف کا نتیجہ بغض وعناد ہوتا ہے۔ امتِ مسلمہ میں بھی جب تک یہ انحراف نہیں آیا، یہ امت اپنی اصل پر قائم رہی اور اختلافات کی شدت سے محفوظ رہی، لیکن تقلیدِ جامد اور بدعات نے جب حق سے گریز کا راستہ کھولا، تو اس سے اختلافات کا دائرہ پھیلتا اور بڑھتا ہی چلا گیا، تا آں کہ اتحادِ امت ایک ناممکن چیز بن کر رہ گیا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس صدیاں گزری ہیں اور وہ سبھی لوگ اسلام پر تھے۔''[1]

شرک لوگوں کی اپنی ایجاد ہے۔ ورنہ پہلے پہل اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ تمام لوگ ایک ہی

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۵۰)

دین اور ایک ہی طریقے پر تھے اور وہ اسلام ہے جس میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے پہلے تمام لوگ اسی توحید پر قائم رہے۔ قومِ نوح علیہ السلام نے اختلاف کر کے شرک شروع کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں شرک اُس وقت پیدا ہوا جب انھوں نے نیک لوگوں کی تعظیم میں غلو کیا اور اپنے نبی کی دعوت سے تکبر کی بنا پر انکار کیا، جیسا کہ سورت نوح (آیت: ۲۳) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا﴾

''اور انھوں نے کہا: ہرگز نہ چھوڑو، اپنے معبودوں کو اور نہ ہی ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نہ نسر کو چھوڑنا۔''

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے وہ بت تھے جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے، بعد ازاں ان کی اتنی شہرت ہوئی کہ عرب میں بھی ان کی پوجا پاٹ ہوتی رہی، چنانچہ ''وُدّ'' دومۃ الجندل میں قبیلہ بنی کلب کا بت تھا اور ''سواع'' ساحلِ بحر کے قبیلہ بنی ہذیل کا، ''یغوث'' سبا کے قریب جرف جگہ میں بنی مراد اور بنی غطیف کا، ''یعوق'' ہمدان قبیلے کا اور ''نسر'' حمیر قوم کے قبیلہ ذوالکلاع کا معبود رہا۔

شرک کا سبب:

یہ پانچوں قومِ نوح علیہ السلام کے نیک آدمیوں کے نام تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو شیطان نے ان کے عقیدت مندوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ ان مجلسوں میں، جہاں وہ بیٹھا کرتے تھے، ان کی تصویریں بنا کر لگا دو اور اپنے بچوں کے نام ان بزرگوں کے ناموں پر رکھو، تاکہ ان کی یاد تازہ رہے اور ان کے تصور سے تم بھی ان کی طرح نیکیاں کرتے رہو، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جب یہ تصویریں بنا کر رکھنے والے فوت ہو گئے اور لوگ ان کی اصل حقیقت بھول گئے تو شیطان نے ان کی نسلوں کو یہ کہہ کر شرک میں ملوث کر دیا کہ تمھارے آبا و اجداد تو ان کی عبادت کیا کرتے تھے، جن کی یہ تصویریں ہیں، چنانچہ انھوں نے ان کی پوجا شروع کر دی، لیکن شروع میں ان مورتیوں کی پوجا نہ کی، ان کی پوجا اس وقت شروع ہوئی جب مورتیاں رکھنے والے فوت ہو گئے۔ جیسا کہ صحیح البخاری (حدیث: ۴۹۲۰) میں مذکور ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''سلف میں سے کئی ایک نے کہا ہے کہ جب وہ (نیک لوگ) فوت ہو گئے تو انھوں نے ان کی قبروں پر ڈیرا ڈال لیا، پھر انھوں نے ان کے مجسمے بنا ڈالے، پھر کافی مدت گزرنے کے بعد انھوں نے ان کی پرستش شروع کر دی۔''[1]

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے مزید کہا ہے:

''بتوں کی پوجا کے بارے میں شیطان نے ہر قوم کو اس کی سمجھ کے مطابق ہی بے وقوف بنایا ہے۔ ایک گروہ کو مُردوں کی تعظیم کے نام سے بتوں کی عبادت کی طرف بلایا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نیکوکار لوگوں کی تصویریں بنائیں، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے کیا۔ مشرکینِ عوام میں شرک کی ابتدا کا یہی سبب ہے۔ جہاں تک مشرکینِ خواص کا تعلق ہے، انھوں نے ان ستاروں کی شکل کے مجسمے بنائے، جن کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ وہ نظامِ عالم چلانے میں موثر ہیں، پھر ان مجسموں کے لیے انھوں نے گھر بنائے، مجاور اور دربان مقرر کیے اور ان پر چڑھاوے چڑھائے۔ قدیم زمانے سے لے کر اب تک شرک کی یہ صورت دنیا میں موجود ہے، اس کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بے دین قوم سے ہوئی جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شرک کے بطلان کے لیے مناظرہ کیا، اُن کی دلیل کو اپنے علم سے اور اُن کے معبودوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑا، جواب میں انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زندہ جلانے کا مطالبہ کیا۔ ایک گروہ نے چاند کی تصویر بنائی، انھوں نے یہ گمان کیا کہ یہ بندگی کا مستحق ہے اور عالمِ سفلی کا نظم ونسق یہی چلاتا ہے۔ دوسرے گروہ نے آگ کی پرستش کی، یہ لوگ مجوسی ہیں، انھوں نے آگ کے لیے گھر بنائے اور ان کے دربان ومجاور مقرر کیے، وہ ایک لمحے کے لیے آگ کو بجھنے نہیں دیتے۔ کچھ لوگ پانی کی پوجا کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ پانی ہر چیز کی اصل ہے، اسی سے ہر چیز کی پیدایش ہوتی ہے اور اسی سے نشو ونما ہے۔ سب چیزوں کی ستھرائی و پاکیزگی اسی سے ہوتی ہے اور یہی عالم کی آبادکاری کا ذریعہ ہے۔ بعض لوگ

[1] إغاثة اللهفان (٢/ ٢٠٢)

حیوانات کی پرستش کرتے ہیں، ان میں سے کچھ تو گھوڑے کو پوجتے ہیں اور کچھ گائے (ہاتھی، بندر اور ناگ) کو۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زندہ اور مردہ انسانوں کی عبادت کرتے ہیں۔ بعض جنوں کی بندگی کرتے ہیں، بعض درختوں کو پوجتے ہیں اور بعض فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں۔"[1]

مذکورہ سابقہ آیت اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دیواروں پر تصویروں کا لٹکانا اور مجالس اور میدانوں میں مجسمے نصب کرنا بہت خطرناک ہے، اس کی وجہ سے لوگ شرک میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ تصویروں اور مجسموں کی تعظیم لوگوں کو ان کی پرستش تک پہنچا دیتی ہے اور لوگ یہ سمجھنا شروع کردیتے ہیں کہ یہ خیر لانے اور شر دور کرنے کا سبب ہیں، جیسا کہ قومِ نوح علیہ السلام میں ہوا۔ شیطان انسانوں کو گمراہ کرنے اور دھوکا دینے کے لیے بے حد حریص ہے، بسا اوقات وہ ان کے بھلے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، بھلائی کی بات پر ترغیب کے بہانے گمراہ کرتا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ان نیک لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے تو اس نے انھیں ان کی محبت میں غلو کی ترغیب دی، ان سے ان نیک لوگوں کے مجسمے نصب کروائے جس سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ راہِ صواب سے دور ہو جائیں۔

شرک کا انجام:

لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کی منصوبہ بندی صرف موجودہ نسل تک ہی محدود نہیں ہوتی، بلکہ آیندہ نسلوں کے لیے بھی ہوتی ہے۔ جب وہ حضرت نوح علیہ السلام کی نسل میں شرک داخل نہ کر سکا تو اس نے آپ کی قوم کی آنے والی نسلوں کو شرک میں مبتلا کرنے کی غرض سے اپنا جال پھینکا۔ خود اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن اولادِ آدم کو مرے ہوئے لوگوں کو سجدہ کروا رہا ہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کے واقعے میں شرک کے متعلق فرمایا ہے:

﴿ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ١٣]

"شرک مت کرو بے شک شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔"

---

[1] إغاثة اللهفان (٢/ ٢١٨، ٢١٩، ٢٢٩، ٢٣٠، ٢٣١، ٢٣١، ٣٣٣)

جبکہ سورۃ الزمر (آیت: ٦٥) میں اللہ رب العالمین نے نبی کریم ﷺ سے مخاطب ہوکر فرمایا:

﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

''(اے میرے نبی!) اگرتم نے شرک کیا تو تمھارے عمل بھی برباد ہوجائیں گے اورتم خسارہ پانے والوں میں سے ہوجاؤگے۔''

آپ اندازہ کریں کہ جس گناہ سے باز رہنے کے لیے انبیاے کرام اور امام الانبیا۔صلوٰت الله و سلامه عليهم أجمعين۔ کواس قسم کا خطاب کیا گیا ہو، اگر یہی گناہ کوئی امتی کرے گا تو اس کا کیا حشر ہوگا؟

شرک کے نقصان کے بارے میں سورۃ المائدہ (آیت: ٧٢) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰهُ النَّارُ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾

''خود مسیح نے ان سے کہا: اے بنی اسرائیل! اللہ ہی کی عبادت کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی (اور جان رکھو کہ) جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے گا، اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

اور سورت آل عمران (آیت: ١٨، ١٩) میں خود اللہ تعالیٰ نے گواہی دی ہے:

﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾

''اللہ تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ جو انصاف پر قائم ہیں، وہ بھی (گواہی دیتے ہیں کہ) اُس غالب حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ دین تو اللہ کے نزدیک اسلام (ہی) ہے۔''

جن و انس کی تخلیق کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے پروردگار کی حیثیت سے پہچانیں اور صرف اسی کی عبادت کریں، انسان و جنات کی تخلیق کا مقصدِ وحید ہی عبادت بتایا گیا ہے، جیسا کہ سورۃ الذاریات (آیت: ٥٦) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾

’’اور میں نے جنوں اور انسانوں کوصرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔‘‘

عبادت کسے کہتے ہیں؟

ہر انسان جو عاقل و بالغ ہے، اس کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس سے سوال کر کے اپنے ضمیر کو ٹٹولے اور اپنے آپ سے پوچھے کہ میں اس دُنیا میں کیوں پیدا کیا گیا ہوں؟ مجھے ساری کائنات سے ممتاز کیوں بنایا گیا اور اس زمین پر میری ڈیوٹی کیا ہے؟ انسان کی فوقیت و برتری اور ممتاز مقام کا ثبوت تو خود قرآنِ کریم میں مذکور ہے۔ سورت بنی اسرائیل (آیت: ۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ ’’اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔‘‘

تو کیا خیال ہے! ہم اس ذاتِ پاک کا شکر ادا نہ کریں جس نے ہمیں عزت بخشی، خوبصورت شکل اور قد و قامت عطا کی، ایک اور چیز بھی دی جو کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں اور وہ ہے عقل، یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کو عطا کی ہے، اس کے علاوہ دوسری بے شمار نعمتیں بھی ہیں جو اس ذاتِ بابرکات نے اپنے بندے کو عطا فرمائی ہیں، مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

عبادت ایک جامع لفظ ہے جو اُن تمام ظاہری و باطنی اقوال و اعمال کو شامل ہے جنھیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور جن سے خوش ہوتا ہے۔ نیز عبادت ان تمام چیزوں سے براءت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی پسند و رضا کے منافی اور مخالف ہیں۔ لہٰذا عبادت کے معنی ہیں کسی کی رضا کے لیے انتہائی تذلل وعاجزی اور کمالِ خشوع کا اظہار کرنا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ’’شریعت میں کمالِ محبت، خضوع اور خوف کے مجموعے کا نام عبادت ہے۔‘‘ یعنی جس ذات کے ساتھ محبت ہو، اس کی مافوق الاسباب طاقت کے سامنے عاجزی و بےبسی کا اظہار ہو اور اس کی گرفت کا خوف بھی ہو۔ کسی عمل کا عبادت میں اس وقت شمار ہوتا ہے جب اس عمل میں دو چیزیں جمع ہوں:

1 کمالِ محبت۔ 2 کمالِ عجز وانکسار۔

سورۃ البقرۃ (آیت: ۱۶۵) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾

’’جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ سے محبت کی نشانی یہ ہے کہ بندہ صرف وہی چیز پسند کرے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور ہر اس چیز سے نفرت و عداوت رکھے جسے وہ ناپسند کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کی پیروی کرے گا اور نواہی سے اجتناب کرے گا، اس کے اولیا سے دوستی کرے گا اور اس کے دشمنوں سے دشمنی رکھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسند احمد کی ایک حدیث میں اللہ کے لیے دوستی اور اسی کے لیے دشمنی کو ایمان کا مضبوط ترین حصہ کہا گیا ہے۔[1]

سورۃ المائدہ (آیت: ۵۱) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

''اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، یہ ایک دوسرے ہی کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے انھیں دوست بنائے گا، وہ بھی انھیں میں سے ہوجائے گا، بیشک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اللہ تعالیٰ کس چیز کو پسند اور کسے ناپسند کرتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیج کر اور کتابوں کو نازل فرما کر بندوں کو یہ بتا دیا ہے کہ وہ کن کاموں سے خوش ہوتا ہے اور اپنے بندوں کو انھیں کرنے کا حکم دیا ہے اور جس چیز سے ناراض ہوتا ہے، اس سے منع کر دیا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی سورۃ النساء (آیت: ۱۶۵) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾

''(سب) پیغمبروں کو (اللہ نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر) بھیجا تھا، تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع نہ رہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایمان والوں کو جنت اور اس کی نعمتوں کی خوشخبری دینا اور کافروں کو اللہ کے عذاب اور بھڑکتی ہوئی جہنم سے ڈرانا۔ نبوت کا یہ سلسلہ ہم نے اس لیے قائم فرمایا ہے تاکہ

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٨٦)

کسی کے پاس یہ عذر باقی نہ رہے کہ ہمیں تیرا پیغام نہیں پہنچا ہے، جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر سورت طٰہٰ (آیت: ۱۳۴) میں فرمایا:

﴿ وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى ﴾

''اور اگر ہم ان کو پیغمبر (کے بھیجنے) سے پیشتر کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیرے کلام (واحکام) کی پیروی کرتے؟''

نیز سورت آل عمران (آیت: ۳۱) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمھیں دوست رکھے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

یہ بات کتاب و سنت کے دلائل سے واضح ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں انسان کے وہی اعمال مقبول ہوں گے جن کی اساس صحیح عقیدے پر ہوگی۔ اگر عقیدہ صحیح نہیں تو ہر عمل اور ہماری ہر قسم کی عبادت بے کار ہوجائے گی اور اللہ کے ہاں اس کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کی سورۃ الزمر (آیت: ۱۱، ۱۲) میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾

''کہہ دو کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کو خالص کر کے اس کی بندگی کروں اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ میں سب سے اوّل مسلمان بنوں۔''

اس آیت سے واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر قسم کی عبادت میرے لیے خالص ہے،

مثلاً: دعا، خوف، امید، نماز، روزہ، قربانی، نذر وغیرہ کو کمالِ محبت اور خوف کے جذبے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے اس طرح خالص کر دیا جائے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی غیر اللہ کے لیے نہ ہو۔

سورت طلاق (آیت: ۵) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَیْكُمْ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا﴾

''یہ اللہ کے حکم ہیں جو اللہ نے تم پر نازل کیے ہیں اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اُس سے اُس کے گناہ دُور کر دے گا اور اُسے اجرِ عظیم بخشے گا۔''

سورۃ الانبیاء (آیت: ۹) میں اللہ رب العالمین نے فرمایا ہے:

﴿ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَیْنٰهُمْ وَ مَنْ نَّشَآءُ وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِیْنَ﴾

''پھر ہم نے ان کے بارے میں (اپنا) وعدہ سچا کر دیا تو اُن کو اور جس کو چاہا نجات دی اور حد سے نکل جانے والوں کو ہلاک کر دیا۔''

بندوں پر اللہ تعالیٰ کے کیا کیا حقوق ہیں؟

سورۃ الاعراف (آیت: ۵۹) کے مطابق ہر رسول نے اپنی دعوت کی ابتدا اس طرح کی:

﴿ اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ﴾

''اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''

عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق ہے، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم کی ایک معروف حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا تمھیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتے تو وہ اس کو عذاب نہ دے۔[1]

یہ حق تمام حقوق سے پہلے ہے۔ کوئی اور حق اس سے پہلے ہے نہ اس سے بڑھ کر۔ جیسا کہ سورت بنی اسرائیل (آیت: ۲۳) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

[1] صحيح البخاري، كتاب التوحيد (١٣/ ٣٠٠) صحيح مسلم، كتاب الإيمان، رقم الحديث (٣٠)

﴿ وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾
''تمھارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔''

اور سورۃ الانعام (آیت: ۱۵۱) میں یہ بھی فرمایا:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾
''کہہ دیجیے آؤ میں تم کو یہ پڑھ کر سناؤں جو تمھارے پروردگار نے تم پر حرام کیا ہے کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراو۔''

چونکہ یہ حق تمام حقوق پر افضل ہے اور دین کے تمام احکام کی جڑ اور بنیاد ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ مکے کی تیرہ سالہ زندگی میں لوگوں کو اسی حق کے قائم کرنے کی دعوت دیتے رہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کے شریک ہونے کی نفی کرتے رہے۔ قرآنِ کریم کی بیشتر آیات میں اسی حق کو ثابت کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں شبہات کی نفی کی گئی ہے۔ ہر نمازی، خواہ وہ فرض پڑھے یا نفل، اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ کے ساتھ اس حق کو ادا کرنے کا عہد کرتا ہے:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ [الفاتحة: ٥]
''ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔''

اس عظیم حق کو توحیدِ عبادت یا توحید الوہیت کہا جاتا ہے، یہ توحید انسانی فطرت میں موجود ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث شریف میں ہے:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ))[1]
''ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔''

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((حَقُّ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ أَنْ يَّعْبُدُوْهُ، وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا))[2]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٤٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠)

''اللہ تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ صرف اُسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔''

''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' کے اقرار کا تقاضا بھی یہی ہے کہ عبادت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کر دیا جائے اور اُس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔

درجاتِ دین:

دینِ اسلام کے تین درجے ہیں:

① اسلام۔ ② ایمان۔ ③ احسان۔

ان تینوں میں سے جس کا بھی نام لیا جائے، وہی پورے دین کو محیط ہوگا۔

آئیے! سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ اسلام کا کیا معنی ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ اسلام کا معنیٰ ہے توحید کے ساتھ اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا اور شرک سے نکلنا۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر جہنم کو حرام کر دیا ہے جو [صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر] ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' کہتا ہے۔''[1]

اسلام کا سب سے پہلا رکن ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' ہی ہے۔ یعنی اس بات کا قرار کرنا کہ اللہ عزوجل کی عبادت میں کوئی شریک ہے نہ اس کی بادشاہت میں کوئی حصے دار ہے۔ سورت محمد (آیت: ۱۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰكُمْ﴾

''پس جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی اور اللہ تم لوگوں کے چلنے پھرنے اور ٹھہرنے سے واقف ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے سامنے اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ باطل معبودوں کا انکار کیا جائے، جن

[1] صحيح البخاري (١/ ١٠٩)

کی اللہ کے علاوہ پرستش کی جاتی ہے، جیسا کہ سورۃ الحج (آیت: ۶۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾

''یہ اس لیے کہ اللہ ہی برحق ہے اور جس چیز کو (کافر) اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور اس لیے کہ اللہ رفیع الشان اور سب سے بڑا ہے۔''

اسی طرح مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''افضل اسلام اللہ پر ایمان ہے۔''[1]

شہادتین:

اللہ تعالیٰ پر ایمان ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' کا اقرار ہے۔ یعنی اس بات کی گواہی دینا کہ اس کے سوا کوئی خالق و مالک نہیں اور ہر قسم کی عبادت اسی کے لیے خاص ہے جو ہمارا خالق و رازق ہے، جو حی اور قیوم ہے، جو علیم و خبیر ہے، جو سمیع و بصیر ہے اور جس نے حضرت محمد بن عبد اللہ ﷺ کو مطاع بنا کر مبعوث فرمایا، جبکہ ''مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' ''حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' کہہ کر اس بات کی شہادت گواہی دینا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ سورۃ النور (آیت: ۶۲) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾

''مومن تو وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔''

ایسا نہ ہو کہ زبان پہ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' کا ورد ہو اور دل و دماغ میں اس کا کوئی اثر نہ ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو اس کی شہادت غیر مفید ہوگی اور وہ دیگر منافقوں کی طرح کافر ہوگا۔ لہٰذا کلمہ شہادت ایک کلمہ ہی نہیں جسے زبان سے ادا کر لیا جائے تو کافی ہو جائے گا۔ نہیں! بلکہ اس کا ایک عظیم مفہوم ہے جس کی تحقیق بھی ضروری ہے۔ یعنی جب کوئی شخص کلمہ پڑھے تو ساتھ ہی ساتھ اس کے مفہوم کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے ہوئے اس کے تقاضوں کو پورا کرے، نیز اس کے منافی تمام امور سے اجتناب کرے۔ ایسی صورت ہی میں وہ حقیقی مسلمان ہوگا۔

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١١٤) السلسلة الصحيحة (٢/ ٥٥١)

کلمہ شہادت کے متعلق ایک عالم دین کا واقعہ:

ایک عالمِ دین کے پاس کچھ بچے قرآن و حدیث کا سبق پڑھنے آتے تھے، ان میں سے کسی ایک نے مولانا صاحب کو ایک طوطا لا کر دیا جو باتیں کرتا تھا۔ مولانا صاحب نے طوطے کو کلمہ شہادت پڑھانا شروع کر دیا اور طوطے نے کلمہ شہادت یاد کر لیا۔ اب وہ سارا دن ''أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' پڑھتا رہتا تھا، ایک دن شیخ صاحب رو رہے تھے۔ اتنے میں ایک طالب علم باہر سے آیا اور اس نے دیکھا کہ مولانا صاحب بہت رو رہے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ آپ کیوں رور ہے ہیں؟ مولانا صاحب نے کہا کہ طوطا مر گیا ہے، اس کو بلی نے کھا لیا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم اور طوطا لے آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کی موت کی وجہ سے نہیں رو رہا، مجھے اس لیے رونا آرہا ہے کہ سارا دن اس کی زبان پر کلمہ شہادت رہتا تھا لیکن مصیبت کے وقت اس کی زبان پر ''أشهد أن لا إله إلا الله'' کے بجائے چیخ پکار کے سوا کچھ نہ تھا اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہمارا کلمہ شہادت بھی محض زبان کی حد تک نہ رہ جائے۔ کیا ہم اس کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں یا نہیں؟

کلمہ توحید کے تقاضے:

کلمہ شہادت کے تقاضے یہ ہیں:

1. رسول اللہ ﷺ نے جن باتوں کی خبر دی ہے، ان کی اپنے دل کی گہرائیوں سے تصدیق کرنا۔
2. ماضی میں گزرے واقعات کی جو خبر دی ہے اور مستقبل میں آنے والے حالات کے بارے میں جو پیش گوئی کی ہے، سب کی تصدیق کرنا۔
3. جن کاموں کا حکم دیا ہے، ان میں آپ ﷺ کی اطاعت کرنا۔
4. ان چیزوں سے باز رہنا جن سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔
5. اللہ کی عبادت اُسی طریقے سے کرنا، جیسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مشروع فرمایا ہے۔

سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۵، ۴۶) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ وَّ دَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾

''اے پیغمبر! یقیناً ہم ہی نے آپ کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ۔''

اس آیتِ کریمہ سے پتا چلتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی امت کے ان افراد کی گواہی دیں گے، جو آپ پر ایمان لائے اور ان کی بھی جنھوں نے تکذیب کی۔ اس طرح آپ دیگر انبیا علیہم السلام کی بھی گواہی دیں گے کہ انھوں نے اپنی اپنی قوموں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا، یہ گواہی اللہ کے دیے ہوئے یقینی علم کی بنیاد پر ہوگی، اس لیے نہیں کہ آپ ﷺ تمام انبیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ یہ عقیدہ تو نصوصِ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ ''سراجاً منیراً'' کا مطلب ہے روشن چراغ۔ یعنی جس طرح چراغ سے اندھیرے دور ہو جاتے ہیں، اسی طرح آپ ﷺ کے ذریعے سے کفر و شرک کی تاریکیاں دور ہوئیں۔ علاوہ ازیں اس چراغ سے کسبِ ضیا کر کے جو کمال و سعادت حاصل کرنا چاہے، کرسکتا ہے، کیوں کہ یہ چراغ قیامت تک روشن ہے۔

سورۃ المائدہ (آیت: ۴۸) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ مُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّ مِنۡهَاجًا وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنۡ لِّیَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ اِلَی اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِیۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴾

''اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ پر (بھی) سچی کتاب (قرآن شریف) اتاری وہ اگلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی حفاظت کرتی ہے تو جو اللہ نے اتارا اس کے موافق ان لوگوں (اہلِ کتاب) کا فیصلہ کر اور اللہ کے پاس سے جو سچی بات تجھے پہنچی ہے، اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں پر مت چل۔ (لوگو! یہود اور نصاریٰ اور مسلمان) ہم نے تم میں سے ہر ایک کو ایک راہ اور شریعت دی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم (تینوں) کو ایک ہی امت (ایک ہی دین، ایک ہی شریعت والے) کر دیتا مگر (تم کو جو مختلف احکام دیے) اس سے تمھارا آزمانا منظور ہے، بہر حال نیکیوں پر لپکو، تم سب کو اللہ تعالیٰ کے پاس

لوٹ کر جانا ہے۔ جن باتوں میں تم (دنیا میں) اختلاف کرتے تھے، وہ تم کو بتا دے گا۔''

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور ضلالت دونوں کی وضاحت کر کے انسانوں کو ان دونوں میں سے کسی کو بھی اختیار کرنے کی آزادی دی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو ایک ہی راستے یعنی ہدایت کے راستے پر چلا سکتا تھا، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھا۔ اختیار دینے سے مقصود اِن کا امتحان ہے، اس لیے مسلمانو! نیکیوں کی طرف سبقت کریں۔ یعنی نیکی اور بھلائی ہی کے راستے پر گامزن رہیں اور وحیِ الٰہی اور اتباعِ رسول ﷺ ہی بھلائی کا راستہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو اسی اسلامی عقیدے کے ساتھ بھیجا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اسی کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''میری امت میں ایک گروہ حق پر قائم رہے گا، جس کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوگی، لوگ ان کا ساتھ چھوڑ کر ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔''[1]

آپ ﷺ نے مزید فرمایا:

''یہود اکہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور نصاریٰ بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت (ان سے بھی ایک ہاتھ آگے نکل جائے گی، یعنی میری امت) کے لوگ تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائیں گے، لیکن وہ سب کے سب دوزخی ہوں گے سوائے ایک کے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! وہ کون سا فرقہ ہوگا؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو میرے اور میرے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے طریقے پر ہوگا۔''[2]

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں بھی ان لوگوں میں سے بنائے اور ہمارے دلوں کو ہدایت پر قائم و دائم رکھے۔ یہی قرآن و سنت کے مطابق صحیح اسلامی عقیدہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے اور یہی وہ عقیدہ ہے جس پر ہمیشہ مضبوطی سے قائم رہیں اور اس کی خلاف ورزی سے ڈرتے رہنا چاہیے، کیونکہ یہی راہِ نجات ہے اور دنیا و آخرت کی سعادت و کامیابی اسی میں ہے۔ یہی وہ جادۂ مستقیم ہے جس کو اس امت کے سلفِ صالحین اور ائمہ دین نے اختیار کیا۔

---

[1] مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٩٥) مسند أحمد (٥/ ٤٣٦)

[2] السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٠٣ـ ١٤٩٢)

اللہ تعالیٰ سے ہماری دُعا ہے کہ وہ ہمیں اتباعِ حق اور اس پر عمل کرنے، اس کی دعوت دینے اور حق کا جھنڈا بلند کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں صحیح توحید کی سمجھ عطا فرمائے اور باطل عقیدوں سے محفوظ رکھے۔آمین ثم آمین۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا سننے والا نہایت قریب ہے۔

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
3. صحیح اسلامی عقیدہ۔ تالیف: علامہ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ۔ ترجمہ: مشتاق احمد کریمی
4. حراستِ توحید۔ تالیف: الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ
5. حقیقتِ توحید۔ تالیف: ڈاکٹر صالح فوزان الفوزان
اردو ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحمید و ڈاکٹر فضل الٰہی

ارکانِ ایمان

①ایمان باللہ ②ایمان بالملائکہ ③ایمان بالکتب

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

ایمان کی اہمیت:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ﴾ [الرعد: ۲۹]

''جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے خوشحالی بھی ہے اور عمدہ ٹھکانا بھی۔''

نیز سورۃ النحل (آیت: ۹۷) میں ارشاد فرمایا:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

''جو شخص نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ایمان والا ہو، تو اسے ہم یقیناً بہت ہی اچھی زندگی عطا کریں گے اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انھیں ضرور دیں گے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کرنے والے ہر مرد و عورت کو دنیا میں پاکیزہ زندگی عطا کرنے اور آخرت میں ان کے اعمال کا بہتر بدلہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن اس شرط پر کہ عمل کرنے والا، خواہ مرد ہو یا عورت، ایمان والا ہو۔ ان آیات کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت کی کامرانی و کامیابی کے لیے ایمان بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

نئی رات حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روزِ قیامت شفاعت کے ضمن میں ایک لمبی حدیث مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے دن جب میں کہوں گا: اے میرے رب! میری امت کو جہنم سے بچا۔ کہا جائے گا: ''آپ جایئے اور جس کے دل میں ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو، اسے جہنم سے نکال لیجیے! چنانچہ میں جاؤں گا اور اسی طرح کروں گا جیسا مجھے حکم دیا جائے گا۔''[1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ روزِ قیامت ایمان ہی کی بنیاد پر انسان کی نجات ممکن ہو سکے گی اور کسی انسان کی نجات کے لیے ایمان اس قدر اہم ہے کہ اگر یہ رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مسلمانوں میں یہ بات بچپن ہی سے یاد کروا دی جاتی ہے کہ ایمان کے ''چھے ارکان'' کون کون سے ہیں؟ لیکن ان ارکانِ ایمان کی تفصیل نہیں سکھلائی جاتی، جب کہ ایمان دنیا و آخرت میں انسان کی کامیابی اور نجات کے لیے اتنا اہم ہے تو اس کی تعریف کا جاننا اور اس کے ارکان معلوم کرنا ہر مسلمان کے لیے نہایت ضروری ہے۔

ایمان کسے کہتے ہیں؟

ایمان تین چیزوں کا نام ہے: زبان سے اقرار، دل سے تصدیق اور اعضا کا عمل۔ نیز ایمان کی تعریف میں دل کے یہ اعمال بھی شامل ہیں: اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا، اسی سے ڈرنا، اسی کی طرف رجوع کرنا اور اسی پر توکل کرنا وغیرہ۔ چونکہ ایمان کے ضمن میں اعمال بھی آتے ہیں، اس لیے عملِ صالح کرنے سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور نافرمانی کرنے سے ایمان میں کمی واقع ہوتی ہے، جیسا کہ سورۃ الانفال (آیت: ۲،۳،۴) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ﴾

''سچے مومن تو وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب انھیں اللہ کی آیات سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۳)

اپنے رب ہی پر بھروسا کرتے ہیں (اور) وہ نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو مال و دولت انھیں دے رکھا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں، یہی سچے مومن ہیں جن کے لیے ان کے رب کے ہاں درجات بخشش اور عزت کی روزی ہے۔''

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سچے مومنوں کی پانچ صفات ذکر فرمائی ہیں۔ ان میں سے پہلی تین صفات کا تعلق دل سے اور دوسری دو صفات کا تعلق اعضا سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی اور سچے ایمان کے حصول کے لیے اعضا کا عمل ضروری ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ عملِ صالح سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے اہلِ ایمان اطاعت ومعصیت کے حساب سے آپس میں برابر نہیں، ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں، جیسا کہ سورۃ الحجرات (آیت: ۷) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾

''لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمھارے دلوں میں مزین کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ [الأعراف: ۱۵۸] ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔''

یہی شہادتین ہیں جن کے بغیر بندہ دین میں داخل نہیں ہوسکتا، اور یہ معلوم ہے کہ شہادتین اعتقاد کے اعتبار سے قلبی عمل اور اقرار کے اعتبار سے زبانی عمل کا نام ہے۔ جب تک قلب و زبان کا اقرار وعمل ایک دوسرے کے مطابق نہ ہو، ایمان بے فائدہ و بے ثمر ہے، کیونکہ ایمان صرف زبان کے اقرار اور دل کی تصدیق ہی کا نام نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عملِ صالح بھی ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی متعدد آیاتِ کریمہ میں ان لوگوں کو جنت کی خوشخبریاں سنائی ہیں جو ایمان والے اور عملِ صالح کرنے والے ہوں، جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [البقرة: ۲۷۷]

''جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور نماز کو درستی سے ادا کیا اور زکات دی، ان کا ثواب ان کے مالک کے پاس ان کو ملے گا، نہ ان کو ڈر ہوگا نہ غم۔''

بلکہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر تمام انسانوں کو خسارہ پانے والا قرار دیا ہے، سوائے ان لوگوں

کے جو ایمان والے ہوں اور عملِ صالح کرتے ہوں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [سورة العصر]

''زمانے کی قسم! بلاشبہہ انسان خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے ہے۔''

اور سورت تین میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک نہیں، کئی قسمیں کھا کر فرمایا کہ تمام انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود ادنیٰ مخلوق کے درجے میں ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان والے ہوں اور عملِ صالح کرتے ہوں۔ فرمایا:

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ [التين:٦]

''البتہ جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے، ان کو بے انتہا ثواب ملے گا۔''

ان تمام آیاتِ کریمات سے ثابت ہوا کہ زبان کے اقرار اور دل کی تصدیق کے ساتھ ساتھ اعضا کے اعمال بھی ایمان میں شامل ہیں۔

1 اوامر پر عمل:

اعضا کے اعمال میں ایک تو وہ اعمال ہیں جن کا تعلق ان احکامات پر عمل کرنے سے ہے جو اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ نے صادر فرمائے ہیں، مثلاً نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، حج کرنا، زکات دینا، جہاد کرنا، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، صلہ رحمی کرنا، امانتیں ادا کرنا، وعدے پورے کرنا، پڑوسی، یتیم، مسکین، مسافر اور بنی آدم میں سے ہر محتاج کے ساتھ ہر طرح کی اچھائی کرنا، کیوں کہ نہ صرف انسان بلکہ ہر جاندار کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے میں اجر ہے اور زبان کے اعمال یہ ہیں: قرآنِ کریم کی تلاوت کرنا، پڑھنا پڑھانا، ذکر کرنا، حق بات کہنا، اچھی بات کرنا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے منع کرنا، ہر ظاہری اور باطنی فحش گوئی سے اجتناب کرنا، حرام کاموں سے رکنا اور تکبر، ریاکاری، خود پسندی، حسد، منافقت، غیبت، چغلی اور ہر منع کردہ کام سے اپنی زبان کو محفوظ رکھنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جو صفات ذکر فرمائی ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق دل سے اور بعض کا تعلق اعضا سے ہے، جیسا کہ سورۃ الحجرات (آیت: ۱۵) میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجٰهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ﴾

''مومن تو وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر (دل سے) یقین لائے، پھر ان کو (ایمان کی باتوں میں کسی طرح کا) شک نہیں رہا اور انھوں نے اپنی جان اور مال سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوشش کی، ایسے ہی لوگ سچے (ایماندار) ہیں۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ خیر کی بات کرے، ورنہ خاموش رہے، اور اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور اپنے مہمان کا اکرام کرے۔''[1]

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خیر کی بات کرنا، پڑوسی کے حقوق ادا کرنا اور مہمان نوازی کرنا؛ یہ سارے اعمال ایمان میں شامل ہیں۔

2 نواہی سے اجتناب:

اعضا کے اعمال میں اوامر کے ساتھ ساتھ اجتنابِ نواہی بھی شامل ہے۔ یعنی ان اعمال سے بچنا جن سے اللہ تعالیٰ نے یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے، اسی طرح معاصی (اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں) سے اجتناب کرنا بھی ایمان میں شامل ہے۔

① ایمان باللہ:

ارکانِ ایمان میں سے افضل رکن اللہ پر ایمان لانا ہے، جیسا کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا گیا:

«أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟» ''کون سا عمل افضل ہے؟''

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

«إِيمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ»[2] ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔''

اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٧٥، ٦١٣٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧)

[2] صحيح البخاري (١/ ١٢) صحيح مسلم (١/ ٦٢)

''مجھے ایمان کے بارے میں بتائیں!''

تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ اللہ پر، ملائکہ پر، آسمانی کتابوں پر، رسولوں پر، یومِ آخرت پر اور بھلی بُری تقدیر پر ایمان لائیں۔''[1]

ایمانی صفات میں سے سب سے پہلی صفت یہ ہے کہ ہم دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے وجود کی اس طرح تصدیق کریں کہ اس ذات کا مدمقابل پہلے تھا اور نہ بعد میں ہو سکتا ہے، وہی اول ہے، اس سے پہلے کچھ بھی نہیں وہی آخر ہے، اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ وہی ظاہر ہے، اس کے اوپر کچھ بھی نہیں۔ وہی باطن ہے، اس کے ماورا کچھ بھی نہیں۔ وہ حی (زندہ) قیوم (تھامنے والا) اَحد (یکتا) اور صمد (بے نیاز) ہے۔ جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد، اور اس کا مدّ مقابل کوئی نہیں۔ (سورۃ الاخلاص)

توحیدِ الوہیت اور ربوبیت:

نیز یہ تصدیق کرنا کہ وہ اپنی الوہیت، ربوبیت اور اسما و صفات میں یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ تمام ظاہری و باطنی اور قولی و عملی عبادتوں کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کرنا اور اس کے علاوہ ہر چیز سے عبادت کی نفی کرنا خواہ ملائکہ ورسول ہی کیوں نہ ہوں۔ تمام مخلوقات و فرشتے اور جن وانس سب اسی کے غلام اور بندے ہیں۔ یہ سب اس کی بادشاہت، طاقت اور اس کے ارادے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ وہ ایک پاک ذات ہے۔

یہ تمام خصوصیات صرف اسی کا حق ہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ ان چیزوں کا اس کے سوا اور کوئی حق دار نہیں۔ ان چیزوں کی نسبت کسی دوسرے کی طرف کرنا یا ان میں سے کسی چیز کا اثبات اس کے سوا کسی اور کے لیے کرنا قطعاً جائز نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَآَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ﴾ [البقرة: ۲۱، ۲۲]

''اے لوگو! اپنے اُس رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا،

[1] صحيح البخاري (۱/ ۱۸) صحيح مسلم (۱/ ۳۰)

تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ وہ ذات جس نے زمین کو تمھارے لیے بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتار کر اس سے پھل پیدا کیے جو تمھارے لیے روزی ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

[آل عمران: ٢٦]

''آپ کہہ دیجیے: اے اللہ! اے تمام بادشاہت کے مالک! تو جسے چاہتا ہے بادشاہت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہت چھین لیتا ہے، اور تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں سب بھلائیاں ہیں، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الأعراف: ٥٤]

''یاد رکھو! اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، با برکت ہے وہ اللہ جو تمام عالَم کا پروردگار ہے۔''

توحیدِ ربوبیت یہ ہے کہ بندہ اس بات کا پختہ اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا رب، خالق، مالک، مدبر اور متصرف ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی کو اس کائنات کا خالق و مدبر سمجھیں۔ جیسا کہ وہ ہے اور اپنے علم و قدرت کی بنیاد پر جس طرح چاہتا ہے خود سارے معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ دنیا و آخرت اور سارے جہانوں کا مالک ہے، اس کے علاوہ کوئی خالق اور رب نہیں ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو دنیا و آخرت کی اصلاح اور نجات و کامرانی کی راہ دکھانے کے لیے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔

کائنات کا خالق ہونے کے سلسلے میں سورت زمر (آیت: ٦٢) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ﴾

''اللہ ہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز کا نگران ہے۔''

سورۃ البقرہ (آیت: ۱۶۳) میں الوہیت کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾

''اور (لوگو!) تمھارا معبود ایک ہی (اللہ تعالیٰ) ہے، اُس بڑے مہربان (اور) رحم والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل:

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بے شمار دلائل ہیں۔ جو شخص بھی ان پر غور وفکر کرے گا، اس کے علم کو پختگی حاصل ہوگی اور اس کا یقین بڑھ جائے گا کہ باری تعالیٰ اپنی ربوبیت والوہیت میں یکتا ولا ثانی ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ان دلائل میں سے چند ایک کو بطورِ مثال ذکر کیا جاتا ہے:

① کائنات کی تخلیق اور اس کا عجیب وغریب نظم ونسق اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عظیم شاہکار ہے۔ آدمی بھی غور وفکر اور سوچ بچار کرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ یہ زمین وآسمان، سورج اور چاند، حیوانات، نباتات وجمادات اور لیل ونہار کا بڑا ہی دقیق نظام؛ یہ سب چیزیں دلالت کرتی ہیں کہ وہ اکیلا ہی ان کا خالق ومالک اور عبادت کا مستحق ہے۔

سورۃ الانبیاء (آیت: ۳۱، ۳۲، ۳۳) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنا دیے، تاکہ وہ ہچکولے نہ کھائے اور ہم نے اس میں کشادہ راہیں بنادیں تاکہ وہ راستہ معلوم کرلیں اور آسمان کو محفوظ چھت بھی ہم ہی نے بنایا ہے لیکن لوگ اس کی قدرت کی نشانیوں سے منہ پھیرنے والے ہیں۔ وہی اللہ ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے، سب اپنے اپنے مدار میں تیرتے پھرتے ہیں۔''

② اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و وحدانیت کی متعدد نشانیاں ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ۝ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ﴾ [الروم: ۲۰ تا ۲۵]

”اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اب تم انسان بن کر ہر جگہ پھیل رہے ہو۔ اور ایک یہ کہ اس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کر سکو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی، اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں۔ اور ایک یہ کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھاری زبانیں اور تمھارے رنگ مختلف بنا دیے، دانشمندوں کے لیے اس میں بھی یقیناً کئی نشانیاں ہیں۔ نیز تمھارا رات اور دن کو سونا اور اس کا فضل تلاش کرنا بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے، جو لوگ غور سے سنتے ہیں ان کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور ایک یہ کہ وہ تمھیں بجلی دکھاتا ہے جس سے تم ڈرتے بھی ہو اور امید بھی رکھتے ہو اور آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے زمین کو اس کے مرنے (بنجر ہو جانے) کے بعد زندہ (زرخیز) کر دیتا ہے، سمجھنے والوں کے لیے اس میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ زمین و آسمان اسی کے حکم سے (کسی ستون کے بغیر) قائم ہیں، پھر جب وہ

تمھیں ایک ہی دفعہ پکارے گا تو تم زمین میں سے نکل کھڑے ہو گے۔''

③ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی جانوروں کے پیٹ سے نکلنے والا صاف، سفید، خوش رنگ، پاکیزہ، مزے دار اور خالص دودھ بھی ہے، جو محض ایک مشروب ہی نہیں بلکہ انسانی جسم کی نشو ونما کے لیے مکمل غذا کا کام دیتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ﴾ [النحل: ٦٦]

''اور تمھارے لیے چوپایوں میں بھی نشانِ عبرت موجود ہے، ان کے پیٹوں میں غذا کا فضلہ اور خون موجود ہوتا ہے، تو ان دونوں چیزوں کے درمیان سے ہم تمھیں خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہوتا ہے۔''

④ اسی طرح قدرتِ الٰہی کی ایک بڑی نشانی شہد کی مکھی کے پیٹ سے نکلنے والا لذیذ مشروب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ سورۃ النحل (آیت: ۶۸، ۶۹) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾

''اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور (انگور وغیرہ کی) بیلوں میں اپنا گھر (چھتا) بنا، پھر ہر قسم کے پھل سے اس کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کردہ راہوں پر چلتی رہ، ان مکھیوں کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا مشروب (شہد) نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہد کی مکھی اور اس کے پیٹ سے نکلنے والے مشروب میں قدرتِ الٰہی کی کئی نشانیاں موجود ہیں۔ شہد مختلف رنگوں میں ہوتا ہے اور اس کے متعدد خواص ہیں،

سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ بہت سی بیماریوں کے لیے شفا کا حکم رکھتا ہے اور دوسری خاصیت یہ ہے کہ جو اشیا شہد میں رکھی جائیں وہ بڑی مدت تک اس میں محفوظ رہتی ہیں اور اگر ادویہ ڈالی جائیں تو ان کا اثر حتیٰ کہ ان کی خوشبو بھی طویل عرصے تک برقرار رہتی ہے۔

ایمان باللہ کا دوسرا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندہ یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہی معبودِ برحق ہے، وہ اکیلا ہی تمام قسم کی ظاہری و باطنی عبادات کا مستحق ہے اور عبادات میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی پیغام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کو مبعوث فرمایا، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ [النحل: ٣٦]

"اور یقیناً ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔"

اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کی بھی عبادت کی جائے اور وہ اس عبادت سے راضی بھی ہو تو وہ طاغوت ہے۔ ہر رسول نے اپنی قوم سے یہی فرمایا:

﴿ اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ﴾ [الأعراف: ٥٩]

"تم ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ [الأنعام: ١٦٢، ١٦٣]

"آپ ان سے کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہوں۔"

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

"تم جب بھی مانگنا چاہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو اور تمھیں جب بھی مدد کی ضرورت ہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو۔ اس بات پر اچھی طرح سے یقین کر لو کہ اگر

تمام لوگ مل کر تمھیں کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے، سوائے اس نفع کے جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے حق میں لکھ رکھا ہے اور اگر وہ سب کے سب مل کر تمھیں نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ ایسا بھی نہیں کر سکتے، ہاں اللہ تعالیٰ نے تمھارا جو نقصان لکھ رکھا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا۔''[1]

اللہ کون؟

الٰہ اس ہستی کو کہتے ہیں جو تمام قسم کی عبادات: نماز، روزہ، حج، قربانی، دعا اور نذر و نیاز وغیرہ کا مستحق ہو، جس کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھا جائے، جس سے فریاد کی جائے اور مدد طلب کی جائے، جو لاثانی اور لازوال ہو، جو بے نظیر اور بے مثال ہو، کائنات کی کوئی چیز جس سے پوشیدہ نہ ہو، جو ہر وقت ہر جگہ سے ہر شخص کی پکار سنتا ہو، جو دلوں کے حالات جانتا ہو، جو ہر چیز پر قادر ہو، مجبور اور عاجز نہ ہو، غنی ہو، سب اس کے محتاج ہوں۔ وہ کسی کا محتاج نہ ہو، لفظ الٰہ میں توحید کے تمام پہلو اس طرح سمو دیے گئے ہیں کہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کہنے کے بعد مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ توحید کی تمام تفصیلات الٰہ کی تشریحات ہیں۔ یہی وہ توحید ہے جس کو مشرکینِ مکہ سمیت ہر دور کے مشرک ماننے سے انکار کرتے رہے ہیں۔

توحیدِ اسما وصفات:

ایمان باللہ کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسمائے حسنیٰ اور اعلیٰ صفات کا بھی اقرار کیا جائے جن کا قرآنِ پاک میں ذکر آیا ہے اور رسولِ امین ﷺ سے ثابت ہیں، ان کو کسی اور چیز کی مِثل و مشابہ قرار دیے بغیر ان پر ایمان لایا جائے۔ ہم پر واجب ہے کہ ان صفات پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح یہ قرآنِ کریم اور صحیح حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں اور یہ صفات جن عظیم اور اعلیٰ معانی پر دلالت کرتی ہیں، ان پر ایمان لایا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ان صفات سے اللہ تعالیٰ کو متصف سمجھیں اور اس کی مخلوقات کی کسی صفت سے مشابہ نہ ہوں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشوریٰ (آیت: ۱۱) میں ارشاد فرمایا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ ''کائنات کی کوئی چیز اس کی مثل نہیں۔''

---

[1] مسند أحمد، سنن الترمذي، صحيح الجامع للألباني، رقم الحديث (۷۹۵۷)

حقیقت تو یہ ہے کہ ساری کائنات میں ایسا کوئی ہے نہ کبھی ہوسکتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی مانند یا اس کا ہم مرتبہ ہو، جیسا کہ بعض ائمہ اسلام مثلاً امام بخاری کے شیخ نعیم بن حماد الخزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''جس نے اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دی اور جس نے ان صفات کا انکار کیا جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو متصف قرار دیا ہے، وہ کافر ہے۔''

سورۃ الانعام (آیت: ۱۰۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾

''نگاہیں اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرلیتا ہے، وہ لطیف [بڑا بارک بین] اور خبیر [بڑا باخبر] ہے۔''

سنن ترمذی[1] میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مشرکینِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ اپنے رب کا نسب نامہ بیان کیجیے، اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاخلاص کی آیتیں نازل فرمائیں:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴾

''آپ کہہ دیجیے! وہ اللہ ایک ہے، اللہ صمد (بے نیاز) ہے۔''

﴿ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ ''نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔''

کیونکہ جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ مرتی ہے، اور جو چیز مرتی ہے وہ اپنے پیچھے وارث چھوڑتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نہ مرتا ہے نہ کسی کو وارث بناتا ہے۔

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ ''اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم شکل ہے نہ ہم رتبہ اور نہ اس کے مثل ہی کوئی چیز ہے۔''

جن صفات سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو متصف قرار دیا ہے، ان میں تشبیہ نہیں ہے، پس جس نے آیاتِ صریحہ اور احادیثِ صحیحہ میں جو کچھ اللہ تعالیٰ کے متعلق وارد ہوا ہے، اس کو اللہ جل شانہ کے شایانِ شان تسلیم کرلیا، یقیناً اس نے ہدایت پالی۔ اس کی دلیل

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٦٤)

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ [الأنعام: ٨٢]

''جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے آلودہ نہیں کیا، انھی کے لیے امن و سلامتی ہے اور یہی لوگ راہِ راست پر ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے جن اسمائے حسنیٰ اور بلند صفات کا ذکر ہوا ہے، ان کے ساتھ یا دیگر اسمائے حسنیٰ کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس دُعا کو قبول فرماتا ہے اور جو مانگا جائے وہ عطا کرتا ہے۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دُعا کرتے ہوئے سُنا جو کہہ رہا تھا:

''اے اللہ! بے شک میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس بنا پر کہ تو ہی اللہ ہے، تیرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، تو اکیلا ہے، بے نیاز ہے، جس نے نہ کسی کو جنا اور نہ ہی وہ جنا گیا اور کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں۔''

یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تو نے اللہ سے اس کے اُس نام سے سوال کیا ہے کہ اگر اس نام سے مانگا جائے تو عنایت فرماتا ہے اور دُعا کی جائے تو قبول فرماتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ کے ناموں، اس کی صفات اور اس کے افعال میں کوئی اس جیسا نہیں ہے۔ جو شخص کسی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا حامل قرار دیتا ہے، مخلوق کو گنج بخش اور نذر و نیاز کے لائق سمجھتا ہے، وہ مشرک ہے اور مشرک اگر توبہ کے بغیر مرجائے تو ابدی جہنمی ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام عیوب و نقائص مثلاً نیند، عجز، جہالت اور ظلم وغیرہ سے پاک ہے اور مخلوق کی مشابہت سے مبرا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ [الشوریٰ: ١١]

''اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے۔''

---

[1] سنن أبي داود، باب الدعاء، رقم الحديث (٣٤٧٥)

نیز فرمایا:

﴿ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ [حم السجدة: ٤٦]

''اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

غیر اللہ کو اللہ کے ناموں، اس کی صفات اور افعال میں شریک نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں اور اُس کی صفات کے ساتھ ایمان لانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ کے ننانوے [۹۹] نام ہیں جو ان ناموں کو یاد کرے (پڑھے گا) وہ جنت میں داخل ہوگا۔''[1]

② دوسرا رکن: ایمان بالملائکہ:

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات پر ایمان کے بعد فرشتوں پر ایمان رکھنا بھی ارکانِ ایمان میں سے ہے۔ سورۃ الشوریٰ (آیت: ۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾

''فرشتے (اس حال میں ہیں کہ) اپنے مالک کی تعریف کے ساتھ پاکی بیان کررہے ہیں اور زمین والوں کے لیے (جو ایماندار ہیں) بخشش کی دعا کر رہے ہیں، سن لے! بے شک اللہ ہی بخشنے والا مہربان ہے۔''

نیز سورۃ الاعراف (آیت: ۲۰۶) میں فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَ لَهٗ يَسْجُدُوْنَ﴾

''جو لوگ (فرشتے) تیرے مالک کے پاس ہیں، وہ اس کی پوجا (بندگی) سے سر نہیں پھیرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔''

ملائکہ پر ایمان لانے کی اہمیت کا اندازہ قرآنِ کریم کی سورۃ البقرہ (آیت: ۹۸) سے ہو جاتا ہے، جس میں فرمانِ الٰہی ہے:

---

[1] صحيح البخاري (٧/ ١٦٩)

﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾

''جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں، پیغمبروں اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہو (وہ گویا اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے) تو اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے۔''

حدیثِ جبرائیل علیہ السلام میں فرشتوں پر ایمان لانے کا ذکر موجود ہے۔ ملائکہ کی شان میں کثرت سے حدیثیں آئی ہیں، لہٰذا ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو ہے ان پر اجمالی ایمان اور دوسرا تفصیلی ایمان لانا:

1- اجمالی ایمان:

ایک مسلمان اجمالی طور پر اس بات پر ایمان رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ایک غیبی اور نوری مخلوق ہیں، جنھیں اس نے اپنی اطاعت و فرمانبرداری کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ ان کا وجود حقیقی ہے اور ہمارا ان کو نہ دیکھ سکنا ان کے نہ ہونے کی دلیل نہیں، کیونکہ کائنات میں کتنی ہی ایسی عجیب وغریب مخلوقات ہیں جن کا وجود حقیقی ہے، لیکن ہم نے انھیں نہیں دیکھا۔ اسی طرح ملائکہ بھی ایک مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ وصف بتایا ہے کہ وہ برگزیدہ بندے ہیں اور کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے، بلکہ ہمیشہ اللہ کے تابع فرمان رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ نہ اکتاتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں، جیسا کہ سورۃ الانبیاء (آیت: ۲۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾

''رات دن (اُس کی) تسبیح کرتے رہتے ہیں، وہ تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں۔''

2- تفصیلی ایمان:

دوسری صورت ان فرشتوں پر تفصیلی ایمان رکھنا ہے اور تفصیلی ایمان ان چیزوں پر مشتمل ہے:

فرشتوں کی پیدائش:

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نور سے پیدا کیا ہے، جیسا کہ اس نے جنوں کو آگ سے اور بنی آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ ان کی پیدائش آدم علیہ السلام کی پیدائش سے قبل ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان

فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«خُلِقَتِ الْمَلَآئِکَةُ مِنْ نُّوْرٍ، وَخُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ، وَخُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَکُمْ» [1]

''فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا اور جنوں کو بھڑکنے والے شعلے سے اور آدم کو اس چیز سے جس کا وصف تمھارے لیے بیان کیا گیا (یعنی مٹی سے)۔''

فرشتوں کی تعداد:

فرشتے ایک ایسی مخلوق ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ [المدثر: ۳۱]

''اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بے شک میں وہ چیز دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور میں وہ چیز سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے، آسمان چرچرایا اور اسے حق ہے کہ وہ چرچرائے، (کیونکہ) اس میں چار انگلیوں کے برابر بھی کوئی ایسی خالی جگہ نہیں جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز نہ ہو۔'' [2]

واقعہ معراج میں آپ ﷺ نے بیان فرمایا کہ جب مجھے ساتویں آسمان پر لے جایا گیا تو وہاں میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ بیت معمور سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بیت معمور کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، جو پھر کبھی دوبارہ اس کی طرف نہیں پلٹتے۔'' [3]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣١٢۔ وحسنه الألباني)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢)

"قیامت کے روز جہنم کو لایا جائے گا، اس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی اور ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ رہے ہوں گے۔"[1]

فرشتوں کی صفات:

فرشتے ایک حقیقی مخلوق ہیں اور ان کے حقیقی اجسام ہیں جو بعض صفات سے متصف ہیں، جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

ا۔ ان کی پیدایش کی عظمت اور اجسام کی ضخامت: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بڑی طاقتور شکلوں میں پیدا فرمایا ہے، جو ان کے بڑے بڑے اعمال کے شایانِ شان ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کیے ہیں۔

ب۔ ان کے پر ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے دو دو، تین تین اور چار چار پر بنائے ہیں اور بعض کے پر اس سے زیادہ بھی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اصلی شکل میں دیکھا، تو ان کے چھے سو پر تھے اور ہر پر نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ سورت فاطر (آیت: ۱) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

"اصل تعریف اللہ تعالیٰ ہی کو سزا وار ہے جس نے آسمان اور زمین نئے سرے سے بنائے، فرشتوں کو پیغام پہنچانے کے لیے مقرر کیا جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو ہیں، وہ جتنے چاہے (فرشتوں میں) اور (بازو) زیادہ پیدا کرسکتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ کرسکتا ہے۔"

فرشتے کھانے پینے کے محتاج ہیں نہ وہ شادی کرتے ہیں اور نہ آگے ان کی نسل چلتی ہے۔ فرشتے اصحابِ عقل وخرد اور دل والے ہیں، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے گفتگو کی ہے۔ انھوں نے آدم علیہ السلام اور دیگر انبیا سے بھی کلام کی ہے۔ وہ اپنی حقیقی شکل کے بجائے دوسری شکل اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ طاقت وقوت عطا فرمائی ہے کہ وہ انسان کی شکل وصورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٢)

فرشتوں کی موت:

تمام فرشتے ملک الموت سمیت قیامت کے دن فوت ہو جائیں گے۔ پھر انھیں ان اعمال کو ادا کرنے کے لیے دوبارہ اٹھایا جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کر رکھے ہیں۔

فرشتوں کی عبادت:

وہ اللہ تعالیٰ کے لیے مختلف قسم کی عبادات بجالاتے ہیں، مثلاً: دعا، تسبیح، رکوع، سجود، خوف، خشیت، محبت وغیرہ۔

احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے پاس نہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس نے ان کو پیدا کیا اور وہی ان کی صحیح تعداد کو جانتا ہے۔

فرشتوں کے نام:

جن فرشتوں کا اللہ تعالیٰ نے یا اس کے رسول ﷺ نے نام کے ساتھ ذکر کیا ہے، جیسے: جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل [جو نفخِ صور کے لیے مامور ہے] اور ملک الموت اور اسی طرح مالک [داروغہ جہنم] رضوان (داروغہ جنت) یہ وہ نام ہیں جن کا احادیثِ صحیحہ میں ذکر آیا ہے۔

فرشتوں کے فرائض:

فرائض کے اعتبار سے ملائکہ کی بہت ساری قسمیں ہیں۔ بعض کے پاس رسولوں کے پاس وحی پہنچانے کی ذمے داری تھی، یہ روحِ امین حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ بعض کو صور پھونکنے کا کام سونپا گیا ہے، یہ حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ بعض کے ذمے بارش برسانا ہے، یہ حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں۔ بعض کے ذمے روح قبض کرنے کا کام ہے، یہ ملک الموت اور اس کے ساتھی ہیں۔ بعض کی ذمے داری بندے کی حفاظت اور نگرانی کا کام ہے اور کچھ تو وہ ہیں جو عرشِ الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں، جیسا کہ سورۃ المومن (آیت: ۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾

''جو (فرشتے) عرش کو اٹھا رہے ہیں اور جو (فرشتے) عرش کے گرد ہیں وہ (سب) اپنے مالک کی پاکی تعریف کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں (کہتے ہیں:) مالک ہمارے! تیری رحمت اور تیرے علم نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے، تو جو لوگ توبہ کرتے ہیں اور تیری (بتائی ہوئی) راہ پر چلتے ہیں، ان کو بخشش دے اور انھیں دوزخ کے عذاب سے بچا دے۔''

کچھ فرشتے جنت کی نگرانی کرتے ہیں اور وہ رضوان اور ان کے ساتھی ہیں اور کچھ جہنم کی نگرانی پر مامور ہیں اور ان کا نام مالک ہے اور کچھ بندوں کے اعمال کا ریکارڈ تیار کرنے میں مصروف ہیں، جو کراماً کاتبین کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الانفطار (آیت: ۱۰ تا ۱۲) میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾

''اور تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں، جو معزز ہیں اعمال لکھنے والے، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔''

اعمال لکھنے والے دن اور رات کے فرشتے الگ الگ ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''تم میں دن اور رات کے فرشتے باری باری آتے ہیں۔ وہ نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے وقت جمع ہوتے ہیں، پھر وہ فرشتے اوپر چلے جاتے ہیں جنھوں نے تمھارے پاس رات گزاری ہوتی ہے، چنانچہ ان کا رب ان سے سوال کرتا ہے، حالانکہ وہ ان کے بارے میں زیادہ جانتا ہے: تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ تو وہ کہتے ہیں: ہم نے جب انھیں چھوڑا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ان کے پاس آئے تو بھی وہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔''[1]

کچھ وہ فرشتے ہیں جن کے ذمے بادل لانا، بارش برسانا اور پودوں کو اُگانا ہے۔ کچھ وہ فرشتے ہیں جن کے ذمے پہاڑوں کے امور ہیں۔ جن کی دلیل نبی اکرم ﷺ کے سفرِ طائف سے ملتی ہے، جب نبی اقدس ﷺ کو طائف والوں نے پتھروں سے لہولہان کر دیا اور خون نکل کر آپ ﷺ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٥، ٣٢٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٣٢)

کے دونوں جوتے پاؤں کے ساتھ چپک گئے۔ اسی حالت میں آپ ﷺ ایک باغ کی ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے اور پھر اسی حالت میں اللہ تعالیٰ سے عرض کی:

''الٰہی! میں تجھ سے اپنی کمزوری اور بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ یا ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تو ہی میرا بھی رب ہے۔ تو نے مجھے کس کے حوالے کر دیا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے جو میرے ساتھ ناروا سلوک کرے؟ یا کسی دشمن کے جس کو تو نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کوئی پروانہیں، میرے لیے تیری عافیت زیادہ بہتر ہے، میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں دور ہو گئیں، مجھے تو تیری رضا مطلوب ہے، یہاں تک کہ تو خوش ہو جائے اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔''

اس دعا کے بعد آپ ﷺ قرن المنازل کے قریب پہنچے تو آسمان پر ایک بادل سا چھا گیا، آپ ﷺ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو جبرائیل علیہ السلام نظر آئے۔ انھوں نے پکار کر کہا: ''آپ کی قوم نے جو جواب آپ کو دیا ہے، اللہ نے اسے سن لیا ہے۔ اب یہ پہاڑوں کا منتظم فرشتہ اللہ نے بھیجا ہے، آپ جو حکم دینا چاہیں، اسے دے سکتے ہیں۔'' پھر پہاڑوں کے فرشتے نے آپ کو سلام کر کے عرض کی: ''آپ حکم دیں تو دونوں طرف کے پہاڑ ان لوگوں پر الٹ دوں؟'' جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''نہیں! میں ایسا کلمہ نہیں کہوں گا، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا فرمائے گا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گی۔''[1]

اسی طرح جنت اور جہنم کے خازن فرشتے بھی ہیں اور کچھ وہ فرشتے ہیں جو بنی آدم کی حفاظت پر مامور ہیں، جیسا کہ سورۃ الرعد (آیت: ۱۱) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾

''ہر شخص کے آگے اور پیچھے اللہ کے مقرر نگران (فرشتے) ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٩٥)

کچھ وہ فرشتے ہیں جن کے ذمے انسان کے ساتھ رہنا اور اس کے لیے بھلائی کی دعا کرنا ہے۔ بعض فرشتوں کو قبر میں سوال جواب کرنے کا ذمے دار مقرر کیا گیا ہے، ان کو [منکر ونکیر] کہتے ہیں اور بعض کے ذمے یہ ہے کہ رحمِ مادر میں باپ کا نطفہ پہنچائے اور اس کے متعلق تمام باتیں لکھنے کا کام بھی انہی کے ذمے ہے۔

بعض ملائکہ کائنات میں یہ پتا کرنے کے لیے پھرتے رہتے ہیں کہ مجالسِ ذکر یعنی اللہ کے دین کی خاطر مجالس کہاں کہاں منعقد ہوتی ہیں؟ بعض صف باندھے کھڑے ہیں، تھکتے نہیں، بعض رکوع میں اور بعض سجدے میں پڑے ہیں، سجدے سے سر نہیں اٹھاتے اور بعض وہ ہیں جن کی ذمے داری امت کے سلام نبی اکرم ﷺ تک پہنچانا ہے، جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''بے شک اللہ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو زمین میں سیاحت کرتے رہتے ہیں اور وہ مجھ تک میری امت کا سلام پہنچاتے ہیں۔''[1]

مذکورہ ملائکہ کے علاوہ بھی دوسرے بہت سارے فرشتے ہیں، جیسا کہ سورۃ المدثر (آیت: ۳۱) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ﴾

''اور تمھارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ تو انسان کی یاد دہانی کے لیے ہے۔''

③ ایمان بالکتب:

اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام پر جو کتابیں نازل کیں، ان پر ایمان لانا، ارکانِ ایمان میں سے تیسرا رکن ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت: ۱۳۶) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾

''(مسلمانو!) تم کہو، ہم تو اللہ تعالیٰ پر اور جو ہم پر اترا (قرآن شریف) اور جو ابراہیم

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٨٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٩١٤)

اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اترا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو اپنے پروردگار سے ملا سب پر ایمان لائے، ہم ان پیغمبروں میں سے کسی ایک کو بھی الگ نہیں کرتے (جیسے یہود کرتے ہیں کہ ایک کو مانتے ہیں اور دوسرے کو نہیں مانتے) اور ہم اس (اللہ) کے تابع فرمان ہیں۔‘‘

ایمان بالکتب کے بارے میں بھی اجمالی طور پر یہ ایمان رکھنا ضروری ہے کہ وہ حق ہیں۔حق کی تعلیم دینے اور اس کی دعوت وتبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا ورسل علیہم السلام پر جو کتابیں نازل کی ہیں، ان کو تسلیم کیا جائے اور ان میں سے صرف آخری کتاب قرآن مجید کی تعلیمات و احکام کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا جائے۔سورۃ الحدید (آیت: ۲۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ ﴾

’’ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتاب نازل کردی۔‘‘

اس کے علاوہ بہت ساری آیات ہیں۔عمل کے لیے سورۃ الشوریٰ (آیت: ۱۵) ہی کافی ہے:

﴿ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ﴾

’’(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے۔‘‘

ہم ان کتابوں پر مفصل ایمان رکھتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے نام کے ساتھ اپنی کتاب قرآنِ کریم میں ذکر کیا ہے اور وہ ہیں: قرآن مجید، تورات، انجیل، زبور اور اس کے علاوہ اور بھی اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں جن کو اس نے اپنے نبیوں پر نازل فرمایا جن کے ناموں اور تعداد کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ان میں سب سے افضل اور آخری کتاب قرآنِ مجید ہے، جو تمام سابق کتابوں پر نگران اور ان کی تصدیق کرنے والا ہے۔اس کا اتباع کرنا تمام امت پر فرض ہے۔

قرآنِ پاک اور اس کے ساتھ ساتھ رسول ﷺ سے ثابت شدہ احادیثِ صحیحہ کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو تمام جنوں اور انسانوں کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپ ﷺ پر یہ قرآنِ کریم نازل کیا ہے، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان فیصل اور حکمران بنے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کو دلوں کے لیے باعثِ شفا، ہر معاملے کا عُقدہ کشا، یعنی ہر قسم

کی پیچیدگی کا حل اور اہلِ ایمان کے لیے سرتاپا ہدایت و رحمت بنا کر نازل کیا ہے۔ سورۃ الاعراف، (آیت: ۵۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾

''اور ہم نے ان کے پاس کتاب پہنچا دی ہے جس کو علم و دانش کے ساتھ کھول کھول کر بیان کر دیا ہے (اور) وہ مومن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔''

سورۃ النحل (آیت: ۸۹) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾

''اور ہم نے تم پر (ایسی) کتاب نازل کی ہے کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔''

آسمانی کتابیں بندوں کے لیے دنیا وآخرت کی سعادت کی ضامن اور ان کے لیے دنیا میں گزر بسر کرنے کے لیے ایک نظامِ زندگی اور دستورِ حیات ہیں، اور لوگوں کے درمیان اختلاف کی صورت میں ان کے درمیان فیصلہ کرنے والی ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ [الحدید: ۲۵]

''یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو واضح دلائل دے کر مبعوث فرمایا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو کو نازل کیا، تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔''

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت ذکر فرمائی ہے، جو یہ ہے کہ لوگ عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے۔

کتابوں پر ایمان لانے کی حقیقت:

کتابوں پر ایمان لانے کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ دل سے اس بات کی تصدیق کرے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ کتابیں اپنے رسولوں علیہم السلام پر نازل فرمائی ہیں وہ اس کا حقیقی کلام ہے اور غیر مخلوق ہے، ان کتب میں نور ہے اور وہ باعثِ ہدایت ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں کا یا ان میں سے بعض کا انکار کرے، وہ کافر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا﴾ [النساء: ١٣٦]

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اسی طرح ان کتابوں پر بھی جو اس نے اس سے پہلے نازل کی ہیں، اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور قیامت کے دن سے کفر کیا، وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا۔'' (حوالہ کتب)

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف۔
3. صحیح اسلامی عقیدہ۔ تالیف: علامہ عبد العزیز بن باز رحمہ اللہ۔ ترجمہ: مشتاق احمد کریمی
4. حراست توحید۔ تالیف: الشیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز رحمہ اللہ
5. حقیقتِ توحید۔ تالیف: ڈاکٹر صالح فوزان الفوزان
اردو ترجمہ: ڈاکٹر سمیر عبدالحمید و ڈاکٹر فضل الٰہی
6. ارکانِ ایمان، ایک تعارف۔ تالیف: ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد۔
مراجعہ وتقدیم: ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

ارکان ایمان

④ایمان بالرسل ⑤ایمان بالیوم الآخر ⑥ایمان بالقدر

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

④ ایمان بالرسل:

سورۃ النساء (آیت: ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

’’جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کو نہیں مانتے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں میں جدائی ڈالنا چاہتے ہیں (مثلاً اللہ کو مانتے ہیں اور پیغمبروں کو نہیں مانتے) اور کہتے ہیں ہم بعضے پیغمبروں کو مانیں گے، بعضوں کو نہیں مانیں گے اور (کفر و ایمان کے) درمیان میں ایک راستہ بنانا چاہتے ہیں۔یہی لوگ حقیقی (پکے) کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔اور جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کو جدا نہیں سمجھا (سب کو سچا پیغمبر مانا) ایسے ہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان کے اجر (آخرت میں) دے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

﴿ آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ﴾[1] ''میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا۔''

لہٰذا ایمان والوں کو بھی اسی طرح انبیا پر مجمل اور مفصل؛ ہر دو طریقے سے ایمان لانا ضروری ہے۔ اجمالی ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ڈرانے اور خوشخبری دینے اور ان کو حق کی طرف بلانے کے لیے اپنے انبیا و رسول بھیجے۔ اول سے آخر تک سارے رسولوں کی دعوت و عبادت کی اصل بنیاد ایک ہی تھی، اور وہ بنیاد توحید ہے۔ تمام انبیا و رسل علیہم السلام کا دین اسلام ہی ہے، جیسا کہ سورت آل عمران (آیت: ۱۹) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین، اسلام ہی ہے۔''

تمام انبیا علیہم السلام ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے اور غیر اللہ کی عبادت چھوڑنے کی تلقین کرتے رہے، اگرچہ ان کی شریعتیں اور احکام مختلف تھے، لیکن وہ سب کے سب ایک اساس و بنیاد پر متفق تھے جو توحید ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تمام انبیا آپس میں علاتی بھائی ہیں (جن کا باپ (دین) ایک ہے اور) مائیں (شریعتیں) الگ الگ ہیں اور ان سب کا دین ایک ہے۔''[2]

جس شخص نے ان کی فرمانبرداری کی وہ ہدایت یافتہ ہوا اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جو کچھ نازل فرمایا ہے، انھوں نے اسے مخلوق تک مکمل اور واضح طور پر پہنچا دیا ہے، اس میں انھوں نے کچھ تبدیلی کی ہے نہ کچھ چھپایا ہے۔ انھوں نے امانت کو ادا کر دیا۔ انھوں نے امت کی خیر خواہی کی۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے کا حق ادا کر دیا اور لوگوں پر حجت قائم کر دی۔

اللہ تعالیٰ نے انبیا و رسل علیہم السلام میں سے جن کے نام ہمارے لیے ذکر کیے ہیں، ان پر اور جن کے نام ذکر نہیں کیے، ان پر بھی ایمان لانا ہم پر لازم ہے۔

حقیقتِ نبوت:

مخلوق تک خالق کی شریعت کو پہنچانے کا جو واسطہ ہے اسے نبوت کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ

---

[1] صحيح البخاري (٧/ ١١٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٦٥)

اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ یہ احسان فرماتا ہے اور اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے، اس منصب کے لیے منتخب فرمالیتا ہے۔ انتخاب کرنے کا یہ اختیار اللہ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾

[الحج: ٧٥]

''فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے پیغام پہنچانے والوں کو اللہ چن لیتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے۔''

البتہ جہاں تک احکام وفرائض کی بات ہے تو بعض امتوں پر جو صوم و صلات فرض کی گئی تھی، وہ دوسری امتوں پر فرض نہیں کی گئی اور بعض امتوں پر جو چیزیں حرام تھیں دوسری امتوں پر حرام نہیں تھیں، یہ فرق امتحان وآزمایش تھا جیسا کہ سورت ملک (آیت: ٢) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَّهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ﴾

''جس نے موت اور زندگی (دونوں) کو اس لیے پیدا کیا تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ کون تم میں اچھے کام کرتا ہے (اور کون برے) اور وہ زبردست ہے بخشنے والا۔''

پس جس نے ان کی دعوت پر لبیک کہا، وہ سعادت مند اور فائز المرام ہوا اور جس نے ان کی مخالفت کی، ناکامی اور حسرت اس کا مقدر بنی۔

انبیا و رسل علیہم السلام کی تعداد اور سب سے افضل رسول:

جن رسولوں کے اسمائے گرامی اور ان کے واقعات قرآنِ کریم میں بیان کیے گئے ہیں، ان کی تعداد پچیس ہے: ① آدم۔ ② ادریس۔ ③ نوح۔ ④ ہود۔ ⑤ صالح۔ ⑥ ابراہیم۔ ⑦ لوط۔ ⑧ اسماعیل۔ ⑨ اسحاق۔ ⑩ یعقوب۔ ⑪ یوسف۔ ⑫ ایوب۔ ⑬ شعیب۔ ⑭ موسیٰ۔ ⑮ ہارون۔ ⑯ یونس۔ ⑰ داود۔ ⑱ سلیمان۔ ⑲ الیاس۔ ⑳ یسع۔ ㉑ زکریا۔ ㉒ یحییٰ۔ ㉓ عیسیٰ۔ ㉔ ذوالکفل۔ ㉕ محمد۔ صلوات اللہ وسلامه عليه وعليهم أجمعين.

جن انبیا ورسل کے نام اور واقعات قرآنِ کریم میں بیان نہیں کیے گئے، ان کی تعداد کتنی ہے؟

اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک حدیث میں جو بہت مشہور ہے، حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! انبیا کی تعداد کتنی ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مِائَةُ أَلْفٍ وَّأَرْبَعَةٌ وَّعِشْرُوْنَ أَلْفًا، اَلرُّسُلُ مِنْ ذٰلِكَ ثَلَاثُمِائَةٍ وَّخَمْسَةَ عَشَرَ﴾[1]

''انبیا کی تعداد ایک لاکھ اور چوبیس ہزار ہے، ان میں سے تین سو پندرہ رسول تھے۔''

ان میں سے بعض کے واقعات اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہمارے لیے بیان فرمائے ہیں اور بعض کے واقعات بیان نہیں کیے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾

[النساء: ١٦٤]

''اور آپ سے پہلے کے بہت سے رسولوں کے واقعات ہم نے آپ سے بیان کیے ہیں اور بہت سے رسولوں کے بیان نہیں کیے۔''

ان انبیا علیہم السلام میں سے افضل اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جیسا کہ سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾

''محمد تمھارے مَردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اس کو ختم کر دینے والے) ہیں اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔''

قرآن و حدیث سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار و حالات میں مبشرین و منذرین (انبیا) آتے رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبوت کا سلسلہ اس لیے قائم فرمایا تاکہ کسی کے پاس یہ عذر باقی نہ رہے کہ اے اللہ! ہمیں تو تیرا پیغام نہیں پہنچا، لہٰذا یہ سلسلۂ نبوت چلتا چلتا بالآخر ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم فرما دیا گیا۔ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کتنے نبی آئے؟ ان کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، تاہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جتنے بھی دعوے دارانِ نبوت ہو گزرے یا ہوں گے، سب دجال اور کذاب ہیں اور ان کی جھوٹی نبوت پر ایمان لانے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

---

[1] رواه أحمد وصححه الألباني في تخريج المشكوٰة (٥٧٣٧)

لہٰذا ان انبیا اور رسولوں میں سے اللہ تعالیٰ نے جن کا ذکر کیا ہے، یا نبی اکرم ﷺ نے جن کا نام بتایا ہے، ان پر تفصیل و تعیین کے ساتھ ایمان لانا فرض ہے۔ اے اللہ! ہم ان پر اور ان کے علاوہ: دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام پر بھی ایمان لائے ہیں اور اپنے نبی -علیه أفضل الصلوٰة و التسليم- پر بھی ایمان لائے۔

اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت و برتری عطا کی ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاسراء (آیت: ۵۵) میں یوں بیان فرمایا ہے:

﴿ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾

''ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر برتری دی ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ (آیت: ۲۵۳) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾

''یہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔''

ان میں سے افضل وہ پانچ رسول ہیں جو اولو العزم (عالی ہمت) کہلاتے ہیں، وہ یہ ہیں: حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ۔

سورۃ الاحقاف (آیت: ۳۵) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾

''پس (اے پیغمبر!) آپ ایسا صبر کریں جیسا صبر عالی ہمت رسولوں نے کیا۔''

یہ کفارِ مکہ کے رویے کے مقابلے میں نبی مکرم ﷺ کو تسلی دی جاری ہے اور صبر کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ حضرت محمد ﷺ سب رسولوں میں سے افضل رسول ہیں اور آپ ﷺ خاتم النبیین، امام المتقین اور بنی آدم کے سردار ہیں۔ یہ عظیم منصب نبی اکرم ﷺ کو خود اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، چنانچہ سورۃ النساء (آیت: ۴۱) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾

''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت پر (گواہی دینے کے لیے اس کے پیغمبر کو) گواہ (بنا

کر) لائیں گے اور تجھ کو ان لوگوں پر گواہ (بنا کر) لائیں گے۔''

سورۃ النحل (آیت: ۸۹) میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَ یَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا عَلَیْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِیْدًا عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ﴾

''اور (وہ دن یاد کر) جس دن ہم ہر امت میں انہی میں سے ایک گواہ اٹھالیں گے اور (اے پیغمبر!) تجھ کو ان لوگوں (آخری زمانے کی امت) پر گواہ بنا کر لائیں گے۔''

سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۵) میں فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا﴾

''اے پیغمبر! ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

اسی طرح سورۃ الفتح (آیت: ۸) میں بھی آپ ﷺ کے اس منصب عالی کا پتا دیا گیا ہے، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا﴾

''اور ہم نے (اے نبی!) آپ کو حق ظاہر کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا اور خوف دلانے والا (بنا کر) بھیجا ہے۔''

اسی پر بس نہیں بلکہ نبی اکرم ﷺ سے خود اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور اس نے اپنی اور اپنے فرشتوں کی محبت کا پتا دیتے ہوئے تمام اہلِ ایمان کو آپ ﷺ سے محبت کرنے اور آپ پر درود و سلام پڑھنے کا حکم دیتے ہوئے سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۶) میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾

''اللہ اور اُس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں، تم بھی آپ پر درود اور سلام بھیجا کرو۔''

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کے اس مرتبے و منزلت کا بیان ہے جو (آسمان) میں آپ ﷺ کو حاصل ہے اور وہ یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ عالمِ علوی (فرشتوں) میں آپ کی ثنا و تعریف

کرتا اور آپ ﷺ پر رحمتیں بھیجتا ہے اور فرشتے بھی آپ ﷺ کی بلندیِ درجات کی دعا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے عالمِ سفلی (اہلِ زمین) کو حکم دیا کہ وہ بھی آپ ﷺ پر صلات و سلام بھیجیں، تاکہ آپ کی تعریف میں علوی اور سفلی دونوں عالم متحد ہو جائیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! سلام کا طریقہ تو ہم جانتے ہیں، التحیات میں ((السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ)) پڑھتے ہیں'' ہم درود کس طرح پڑھیں؟ اس پر آپ ﷺ نے درودِ ابراہیمی بیان فرمایا جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔''[1]

لہٰذا ہر اہلِ ایمان کے لیے حکم ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر کثرت کے ساتھ درود ابراہیمی پڑھا کریں کیوں کہ نبی مکرم ﷺ نے اسی کے پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔

☆ بلکہ ایک دوسرے مقام پر تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم فرمایا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تم سے محبت کرے اور تمھیں بخش دے تو تم میرے نبی کا اتباع اور پیروی کرو، چنانچہ سورت آل عمران (آیت: ۳۱) میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دیں کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمھیں دوست رکھے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

عزیز و اقارب اور متاعِ دنیا تو درکنار مسلمانوں کو تو یہ حکم ہے کہ اپنے دلوں میں اپنی جانوں سے بھی زیادہ نبی اکرم ﷺ کی محبت پیدا کریں۔ اہلِ ایمان کو اپنے تمام ارادوں، تمناؤں اور فیصلوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے تابع کر دینے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٩٧)

لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾

''اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی اَمر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے، وہ صریح گمراہ ہوگیا۔''

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنے دین کی افضل شریعت دے کر مبعوث فرمایا اور آپ ﷺ کی امت کو جو لوگوں کے لیے بپا کی گئی، بہترین امت بنایا، آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی اُمت کو متعدد فضائل اور بہترین خوبیوں سے مزین فرمایا جو آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو سابقہ امتوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ ﷺ کی امت دنیا میں آنے کے اعتبار سے سب سے آخری امت ہے، لیکن قیامت کے دن سب سے پہلے اٹھائی جانے والی ہے۔

محبتِ مصطفیٰ ﷺ:

لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم آپ ﷺ پر ایمان لائیں، آپ ﷺ کی اطاعت اور پیروی کریں، آپ ﷺ سے محبت کریں اور آپ ﷺ پر درود پڑھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

''جو مجھ پر درود پڑ نا بھول گیا، وہ جنت کا راستہ گم کر بیٹھا۔''[1]

ہمارے نبی پر بے حد و حساب صلات و سلام ہو۔ ہمارے نبی رحمۃ للعالمین حضرت محمد ﷺ ہیں، جنھوں نے کفار و مشرکین کی گالیاں سنیں، طعنے سہے، پتھر کھائے لیکن حقِ رسالت ادا کیا۔ وہ نبی ﷺ جنھیں عمر بھر اپنی امت کی مغفرت اور بخشش کی فکر لاحق رہی۔ جو رات کی تنہائیوں میں آنسوں بہا بہا کر اپنی امت کے لیے اللہ سے جنت کی بھیک مانگتے رہے، جو روزِ قیامت بار بار اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوکر اپنی امت کی شفاعت کے لیے دُعا فرمائیں گے، ہمیں چاہیے کہ ہم آپ ﷺ کا ادب کریں اور آپ ﷺ کی عزت و ناموس کا دفاع کریں۔ سید المرسلین، شفیع المذنبین حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ایسی محبت کرنا اہلِ ایمان پر فرض ہے جو اللہ کے علاوہ باقی تمام محبتوں پر غالب ہو۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[1] صحيح سنن ابن ماجه للألباني (ص: ٧٤٠)

''کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے سارے لوگوں سے بڑھ کر میرے ساتھ محبت نہ کرے۔''[1]

اہل و مال اور دل و جان سے زیادہ محبت کا معیار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پورا کر کے دکھلا دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سمیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حبِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی مثالیں قائم کیں، جنھیں پڑھ کر آدمی حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ اہلِ ایمان کے لیے ان کی اپنی جانوں سے بھی بڑھ کر عزیز اور محترم ہے۔ امام ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام و اکرام وفات کے بعد بھی اتنا ہی ہے جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلامِ ماثور (احادیث) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اسی طرح رفیع الشان ہے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلتے وقت تھا، لہٰذا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام و احادیث پڑھی جائیں تو وہاں موجود ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنی آواز بلند نہ کرے اور نہ اس سے روگردانی کرے، جس طرح یہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے والے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سننے والے کے لیے لازم تھا۔''[2]

غرض سلف صالحینِ امت نے اس سلسلے میں بہترین مثالیں قائم فرمائی ہیں۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ خیر یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و ارشادات میں سے کسی حدیث کے تذکرے کے وقت ایسے ہوجاتے کہ ان پر ہیبت و جلال طاری ہوجاتا اور وہ ادب کی تصویر بن جایا کرتے تھے۔

❁ حضرت عَمر و بن میمون رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے صرف ایک ہی مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ انھوں نے کہا:

﴿ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ﴾ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔'' تب میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا کہ یہ کلمات کہنے سے پہلے انھوں نے اپنی ازار ڈھیلی کرلی، ان کی رگیں پھول گئیں اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔

❁ ابوسلمہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤)

[2] تفسير القرطبي (٦/ ١٦/ ٣٠٧)

''امام مالک بن انس رحمہ اللہ جب حدیث بیان کرنے کے لیے گھر سے نکلنے لگتے تو نماز کے وضو کی طرح مکمل وضو کرتے، سب سے اچھا لباس زیبِ تن کرتے، ٹوپی پہنتے اور ڈاڑھی کو کنگھا کرتے۔ ان سے اس سلسلے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:

((أُوَقِّرُ بِهٖ حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم))[1]

''ایسا کرکے میں حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر بجا لاتا ہوں۔''

❀ ابن ابی الزناد بیان کرتے ہیں کہ تابعی کبیر حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ بیمار لیٹے ہوئے تھے اور جب ان سے حدیث بیان کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے پکڑ کر بٹھا دو۔ مجھے یہ بات گوارا نہیں کہ میں لیٹے لیٹے حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان کروں۔[2]

❀ امام محمد بن سیرین [صاحب تعبیر الرؤیا] دورانِ گفتگو ہنس لیا کرتے تھے، لیکن جب حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم آجاتی تو مکمل ادب و احترام کی تصویر بن جایا کرتے تھے۔[3]

❀ اسی طرح ایک ثقہ راوی امام مصعب بن عبداللہ رحمہ اللہ امام مالک کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جب ان کے سامنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ جمیل کیا جاتا تو ان کا رنگ بدل جاتا اور وہ فرطِ محبت و احترام سے رونے لگتے۔ ایک دن ان سے اس سلسلے میں استفسار کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: جو کچھ میں نے دیکھا ہوا ہے اگر وہ تم نے بھی دیکھا ہوتا تو تم مجھ پر نکیر نہ کرتے۔ میں [ایک ثقہ و فاضل شخص] امام القراء محمد بن منکدر رحمہ اللہ کو دیکھا کرتا تھا کہ ہم جب بھی ان سے کسی حدیث کے بارے میں پوچھتے تو احترامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات سے مغلوب ہوکر وہ رونے لگتے تھے۔[4]

نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت محض زبانی جمع خرچ تک ہی نہیں رہنی چاہیے اور نہ اس کا کوئی سالانہ یا ماہانہ اظہار کافی ہے، بلکہ حبِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا یہ ہے کہ محبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو اپنے سامنے رکھے اور ہر اس سنت کے احیا میں کوشاں رہے جو گردشِ

---

[1] الجامع للخطیب (۲/ ۳٤) و شرح الشفاء (۲/ ۷۷)

[2] الجامع للخطیب (۲/ ٤٥) و جامع بیان العلم (۲/ ۱۲۲۰)

[3] الجامع للخطیب (۲/ ۵۷)

[4] حوالہ سابقہ.

زمانہ کی دھول تلے دب گئی ہو یا ہوسِ دنیا اور خواہشاتِ نفس کی وجہ سے طاقِ نسیان پر رکھی جاچکی ہو، ایسی تمام متروک سنتوں کا احیا ایک اچھے مسلمان کی ذمے داری ہے۔

نبی اکرم ﷺ سے محبت کے تقاضوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے صادر ہونے والے تمام اوامر و احکام پر عمل پیرا ہوں اور جن امور سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے، ان تمام کاموں سے مکمل اجتناب و گریز کیا جائے، یہ محض تقاضا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی یہی ہے۔

محبانِ رسول ﷺ کے لیے حبِ رسول ﷺ کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو اپنے سامنے رکھیں، آپ ﷺ نے جو کام خود کیا یا کرنے کا حکم فرمایا اسے اپنالیں، جس کام سے منع فرمایا اس سے باز آجائیں، کسی بھی کام کے فعل و ترک میں من مانی نہ کریں اور نبی مکرم ﷺ کی مرضی سے تجاوز کرکے آپ ﷺ سے پیش قدمی کا ارتکاب ہرگز نہ کریں، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، چنانچہ سورۃ الحجرات کی پہلی ہی آیت میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

''مومنو! اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سنتا اور جانتا ہے۔''

اسی طرح نبی اکرم ﷺ سے محبت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر وہ کام اور چیز جس سے نبی مکرم ﷺ نے براءت و بیزاری کا اظہار فرمایا ہے، ہر محبِّ رسول ﷺ بھی اس سے قولی و عملی بیزاری کا اظہار کرے بعض امور ایسے ہیں کہ نہ صرف نبی اقدس ﷺ نے ان سے براءت و بیزاری کا اظہار فرمایا ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دے رکھا ہے مثلاً:

- اسلام دشمن کفار سے براءت و بیزاری اور نفرت و دلی دشمنی رکھنے اور ان سے موالات و دلی محبت نہ کرنے کا قرآنِ کریم میں باقاعدہ حکم دیا گیا ہے، چنانچہ سورت آل عمران (آیت: ۲۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ مَنْ يَّفْعَلْ

ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ﴾

''مومنوں کو چاہیے کہ مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اُس سے اللہ کا کچھ (عہد) نہیں، ہاں اگر اس طریق سے تم اُن (کے شر) سے بچاؤ کی صورت پیدا کرو (تو مضائقہ نہیں) اور اللہ تم کو اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

سورۃ التوبہ (آیت: ۲۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

''اے اہلِ ایمان! اگر تمھارے (ماں) باپ اور (بہن) بھائی ایمان کے مقابل کفر کو پسند کریں تو ان سے دوستی نہ رکھو اور جو ان سے دوستی رکھیں گے وہ ظالم ہیں۔''

لہٰذا ہمیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، خلوت و جلوت میں بھی اس کا شکر یہ ادا کریں، اس نے ہمیں دینِ اسلامی کی راہ دکھا کر ہم پر احسان کیا اور ہمیں سب سے بہتر نبی کا امتی بنایا، جس کو اس نے ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تا کہ وہ اسے تمام ادیان پر غلبہ عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو روشن آیات اور واضح معجزات دے کر بھیجا اور ان پر قرآن کریم نازل فرمایا، جو سراسر ہدایت اور تمام امراض کے لیے کامل شفا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ کی اقتدا کرنے، آپ ﷺ کی سیرت اپنانے اور آپ ﷺ کی سنت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا ہمیں نبی مکرم ﷺ کے ساتھ اور آپ ﷺ کی سنتوں کے ساتھ پیار کرنا چاہیے، زیارتِ مصطفیٰ کی تمنا کرنی چاہیے، یہ نبی کریم ﷺ سے شدید محبت کی علامت بھی ہے اور اس محبت کا تقاضا بھی، چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''میری امت کے مجھ سے شدید محبت رکھنے والے لوگوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو اس بات کی خواہش رکھتے اور تمنا کرتے ہیں کہ انھیں چاہے اپنے سارے اہل و عیال اور

دولت و مال کے عوض ہی میری زیارت نصیب ہو جائے، تب بھی سودا مہنگا نہیں۔''[1]

لٰہذا ہمیں چاہیے کے ہم آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کریں اور اپنی مجلسوں میں آپ ﷺ کا ذکرِ خیر کثرت کے ساتھ کریں، کیونکہ آپ ﷺ سے محبت کا اظہار کرنا ہر اہلِ ایمان پر واجب ہے۔

⑤ ایمان بالیوم الآخر:

یومِ آخرت پر ایمان لانا دنیوی زندگی کی انتہا اور اس کے بعد دوسرے جہان میں داخل ہونے پر پختہ اعتقاد رکھنے کا نام ہے۔ آخرت پر ایمان لانا ان ارکان میں سے ہے جن کے بغیر انسان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا اور جو شخص ان میں سے کسی ایک کا انکار کرے، وہ کافر ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے دلائل بھی کثرت سے موجود ہیں، جیسا کہ سورۃ البقرۃ (آیت: ۱۷۷) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق و مغرب کی طرف کرلیا جائے، بلکہ حقیقتاً نیک وہ شخص ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور پچھلے دن (قیامت) پر اور سب فرشتوں پر اور کتاب اللہ (قرآنِ کریم) اور (تمام آسمانی کتابوں پر) اور تمام پیغمبروں پر ایمان رکھنے والا ہو۔''

سورۃ الذاریات (آیت: ۵) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ﴾ ''جس (قیامت) کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچ ہے۔''

نیز ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيْهَا ﴾ [المؤمن: ٥٩]

''قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔''

قرآنِ کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کے ایک ایک لفظ کے سچ ہونے پر مومنوں کا ایمان

[1] صحيح مسلم (٤/ ٢١٧٨) رقم الحديث (١٨٣٢) مسند أحمد (٥/ ١٥٦) السلسلة الصحيحة (١٤١٨)

ہے۔ ویسے بھی ہر مسلمان روزانہ پانچ نمازوں میں کئی بار اس بات کا اقرار کرتا اور کہتا ہے:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ''وہ مالک ہے یومِ آخرت (قیامت) کا۔''

یومِ آخرت پر ایمان کا مطلب:

یومِ آخرت پر ایمان کا کیا مطلب ہے اور اس پر ایمان لانے میں کیا کیا امور داخل ہیں؟
یومِ آخرت پر ایمان کا مطلب ہے:

① اس کے لامحالہ واقع ہونے پر پختہ یقین رکھنا، اس کی تصدیق کرنا اور اس کے مقتضا پر عمل کرنا۔

② اس پر ایمان لانے میں قیامت کی علامتوں اور نشانیوں پر ایمان بھی داخل ہے جو ہر حال میں قیامت سے پہلے وقوع پذیر ہوں گی۔

③ نیز موت اور مرنے کے بعد پیش آنے والے تمام امورِ غیبیہ جن کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے خبر دی ہے، ان سب پر ایمان لانا، ایمان بالآخرت میں شامل ہے۔

④ قبر کی آزمایش، اس کا عذاب اور اس کی نعمت بھی اسی میں شامل ہے اور یہ کہ قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا، تمام مخلوق قبروں سے اٹھے گی، قیامت کا موقف بھیانک وخوفناک ہوگا اور اس روز پیش آنے والی شدید ہولناکیاں، پل صراط پر سے گزرنا، یہ سب امور بھی اس میں داخل ہے۔

پل صراط کے اوپر سے گزرنا:

اس سلسلے میں بہت سی احادیث آئی ہیں، چنانچہ شفاعت والی حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب مجھے (شفاعت کی) اجازت دی جائے گی، پھر امانت اور رحم کو بھیجا جائے گا جو پل صراط کے دائیں بائیں کھڑے ہو جائیں گے، پھر (لوگ پل صراط پر سے گزرنا شروع کریں گے چنانچہ) سب سے پہلا شخص بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گزر جائے گا۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، کوئی چیز بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بھی گزر سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''کیا تم نے (آسمان پر) بجلی کو نہیں دیکھا؟ کیسے وہ تیزی کے ساتھ جاتی ہے اور پلک جھپکتے ہی واپس آجاتی ہے؟ پھر دوسرا آدمی ہوا کی طرح تیزی کے ساتھ گزر جائے گا۔

پھر تیسرا آدمی پرندے کی اڑان اور مردوں کے دوڑنے کی طرح گزر جائے گا۔ یہ سب اپنے اپنے اعمال کے مطابق وہاں سے گزریں گے اور تمھارا نبی پل صراط پر کھڑے ہو کر کہہ رہا ہوگا:

﴿ یَا رَبِّ! سَلِّمْ سَلِّمْ ﴾ ''اے میرے رب! تو ہی سلامتی دے اور تو ہی محفوظ فرما۔''

''یہاں تک کہ بندوں کے اعمال عاجز آ جائیں گے اور ایک آدمی ایسا آئے گا جو گھسٹ گھسٹ کر چلنے کے قابل ہوگا۔ پل صراط کے کناروں پر مڑے ہوئے سرے والی لوہے کی سلاخیں لٹکی ہوئی ہوں گی، جنھیں بعض لوگوں کو پکڑنے اور اچک لینے کا حکم دیا گیا ہوگا، لہٰذا وہاں سے گزرنے والوں میں سے کچھ تو خراشیں وغیرہ لگنے کے بعد نجات پا کر اسے عبور کر جائیں گے اور کئی لوگوں کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور وہ جہنم میں گر جائیں گے۔''

پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ابو ہریرہ کی جان ہے! جہنم کی گہرائی ستر سال کی مسافت کے برابر ہے۔''[1]

میزان برحق ہے:

قیامت والے دن میزانِ عدل قائم کیا جائے گا، جس کی دلیل سورت انبیا (آیت: ۴۷) میں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے:

﴿ وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾

''اور قیامت کے دن ہم ٹھیک ترازوئیں رکھیں گے پھر کسی شخص پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا اور جو رائی کے دانے برابر (کسی کا عمل) ہوگا تو ہم اس کو بھی (تولنے کے لیے) حاضر کریں گے اور ہم حساب کرنے کے لیے کافی ہیں۔''

حساب و کتاب، جزا و سزا اور لوگوں کے درمیان نامہ اعمال کی تقسیم، کچھ لوگ انھیں دائیں

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۵)

ہاتھ میں لیں گے اور کچھ بائیں ہاتھ میں یا پھر کچھ لوگ پیٹھ کے پیچھے سے لیں گے۔ نیز حوضِ کوثر جو رسول اللہ ﷺ کو قیامت کے روز عطا ہونا ہے، اس پر ایمان لانا اور جنت وجہنم پر ایمان لانا بھی ایمان بالآخرت میں شامل ہے۔ ایمان والوں کا جنت کی نعمتوں سے نوازے جانا اور اس میں سب سے بڑی نعمت اہلِ ایمان کے لیے اپنے رب جل شانہ کا دیدار ہونا اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ بات کرنا کافروں کو جہنم میں سزا دی جائے گی اور سب سے بڑھ کر ان کے لیے سزا اللہ تعالیٰ کے دیدار سے ان کی محرومی ہوگی۔ قیامت یا یومِ آخرت اُن غیبی امور میں سے ایک ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص کرلیا ہے اور اس کی خبر کسی کو بھی نہیں دی، جیسا کہ سورت لقمان (آیت: ۳۴) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾

''بے شک اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے وہی بارش نازل فرماتا ہے اور ماں کے پیٹ میں جو ہے وہی اسے جانتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؟ نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ یاد رکھو اللہ ہی پورے علم والا اور صحیح خبروں والا ہے۔''

ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ پانچ چیزیں ''مفاتیح الغیب'' ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔[1]

① قربِ قیامت کی علامات تو نبی اکرم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں، لیکن قیامت کے وقوع کا یقینی علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی نبی مرسل کو۔

② بارش کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ آثار و علامات سے اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے لیکن یہ اندازے کبھی صحیح اور کبھی غلط بھی ثابت ہوتے ہیں، جس سے صاف واضح ہے کہ بارش کا بھی یقینی علم اللہ کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔

③ رحمِ مادر میں مشینی ذرائع سے جنسیت کا ناقص اندازہ (جو یقینی قطعی نہیں ہوتا اور اسی بنا پر اسے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٧)

علم نہیں کہہ سکتے، کیونکہ علم کسی شے کو یقینی طور پر جاننے کا نام ہے، یہ تو شاید ممکن ہے کہ بچہ ہے یا بچی) لیکن ماں کے پیٹ میں نشو و نما پانے والا یہ بچہ نیک بخت ہے یا بد بخت، ناقص ہوگا یا کامل، خوب صورت ہوگا یا بدشکل، کالا ہوگا یا گورا، ان سب باتوں کا علم اللہ کے سوا کسی کے پاس نہیں۔

④ انسان کل کیا کرے گا؟ وہ معاملہ دین کا ہو یا دنیا کا، کسی کو آنے والے کل کے بارے میں علم نہیں ہے کہ وہ اس کی زندگی میں آئے گا بھی یا نہیں۔

⑤ اسی طرح موت کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ موت کہاں آئے گی؟ گھر میں یا گھر سے باہر، اپنے وطن میں یا دیارِ غیر میں جوانی میں آئے گی یا بڑھاپے میں؟ اپنی آرزوؤں اور خواہشات کی تکمیل کے بعد آئے گی یا اس سے پہلے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ حدیثِ جبرائیل علیہ السلام میں بھی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے سوال کیا کہ آپ مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''مسئول (جس سے دریافت کیا گیا ہے) سائل (دریافت کرنے والے) سے زیادہ نہیں جانتا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی احادیثِ صحیحہ کے ذریعے احوالِ قیامت کے متعلق جو کچھ ثابت ہے، ان پر ایمان لانا ضروری ہے، جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کے بارے میں بتایا ہے۔ اگر کوئی اہلِ ایمان ٹھیک اسی طرح ایمان لانے کے بعد تقویٰ و عمل اور عقیدۂ صحیحہ کا اہتمام کرتے ہیں محض زبان سے اظہارِ ایمان کو کافی نہیں سمجھتے تو ان کے لیے ان کے پروردگار کی طرف سے کامیابی کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿ أُولَئِكَ عَلَى هُدًى مِّن رَّبِّ وَ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [البقرة: ٥]

''یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔''

یہ اہلِ ایمان کا انجام بیان فرمایا گیا ہے۔ یعنی ان کی کامیابی سے مراد آخرت میں رضائے الٰہی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩)

اور اس کی رحمت و مغفرت کا حصول ہے۔ اس کے ساتھ دنیا میں بھی خوش حال اور سعادت وکامرانی مل جائے تو سبحان اللہ، ورنہ اصل کامیابی آخرت ہی کی کامیابی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اے اللہ! ہمیں بھی اُن اہلِ ایمان میں شامل فرمالے کیونکہ ہم بھی تیری کتاب قرآن کریم اور تیرے نبی محمد ﷺ کے فرمان پر ایمان لائے ہیں۔

٦ ایمان بالقدر:

ایمان بالقدر کے چار درجے ہیں:

پہلا درجہ:

اللہ تعالیٰ کے علم پر ایمان جو ہر چیز کو محیط ہے، اس سے آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی چیز پوشیدہ ہے نہ زمین میں، جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے اور یہ بھی کہ ان مخلوقات کے رزق، ان کی عمر، ان کے سارے اعمال اور دوسرے تمام امور کا اس کو مکمل علم ہے اور اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ تقدیر کے پہلے درجے ''ایمان بالعلم'' کی دلیل سورۃ الحشر (آیت: ٢٢) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾

''وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ غیب وحاضر کا علم رکھتا ہے۔''

نیز سورۃ الطلاق (آیت: ١٢) میں فرمایا ہے:

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴾

''اللہ کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔''

سورت سبا (آیت: ٣) میں مزید فرمایا:

﴿ عٰلِمِ الْغَیْبِ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ وَ لَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ﴾

''وہ عالم الغیب ہے، اس سے ذرہ برابر کوئی شے پوشیدہ نہیں، نہ آسمانوں میں، نہ زمین میں، نہ اس سے چھوٹی، نہ بڑی۔''

سورت انعام (آیت: ۵۹) میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَ عِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ﴾

''اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، غیب اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

سورت انعام (آیت: ۱۲۴) میں مزید ارشاد فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنی رسالت کہاں بھیجنا ہے۔''

سورت قلم (آیت: ۷) میں فرمایا:

﴿ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ﴾

''اللہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے گمراہ ہو گیا ہے اور وہی ہدایت یاب لوگوں کو بھی جانتا ہے۔''

سورت انعام (آیت: ۵۳) میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰكِرِيۡنَ﴾ ''کیا اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نہیں جانتا؟''

سورت عنکبوت (آیت: ۱۰) میں اللہ رب العالمین کا فرمان ہے:

﴿ اَوَ لَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِىۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾

''کیا اللہ تعالیٰ دنیا والوں کے سینوں کی باتوں کو نہیں جانتا؟''

سورت بقرہ (آیت: ۳۰) میں فرمایا:

﴿ قَالَ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾

''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا میں (اس میں جو مصلحت ہے) جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔''

نیز سورۃ البقرہ (آیت: ۲۱۶) میں فرمایا:

﴿ وَ عَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّ هُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ وَ عَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ وَ اللّٰهُ يَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾

''اور ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو بری لگے لیکن وہ تمھارے حق میں بہتر ہو اور ایک

چیز تم کو بھلی لگے لیکن وہ تمھارے حق میں بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘

صحیح بخاری و مسلم میں روایت ہے:

’’ایک آدمی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا جنتی اور جہنمیوں کی الگ الگ پہچان ہو چکی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اس نے دریافت کیا: پھر لوگ عمل کس بات کے لیے کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’ہر شخص وہ عمل کرتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، یا آپ ﷺ نے فرمایا: وہی عمل کرتا ہے جو اس کے لیے آسان بنایا گیا ہے۔‘‘[1]

اسی روایت میں یہ بات بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے مشرکوں کی اولاد کے سلسلہ میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ))[2]

’’اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرنے والے ہوتے۔‘‘

صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

’’اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے کچھ لوگوں کو پیدا کیا اور اس وقت پیدا کیا جب وہ اپنے باپ کی پشتوں میں تھے، کچھ لوگوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا اور ان کو بھی اس وقت پیدا کیا جب وہ اپنے آبا کی پشتوں میں تھے۔‘‘[3]

صحیح مسلم میں یہ روایت بھی آئی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

’’آدمی بہ ظاہر لوگوں کی نظر میں جنت والا عمل کرتا ہے، حالانکہ وہ جہنمی ہے اور ایسا بھی ہے کہ بہ ظاہر آدمی جہنم والا عمل کرتا ہے اور وہ جنتی ہے۔‘‘[4]

ایک روایت میں نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

’’تم میں کوئی بھی بندہ نہیں مگر اللہ تعالیٰ اس کی جنت و جہنم کا ٹھکانا جانتا ہے۔‘‘

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا:

---

[1] صحيح البخاري، كتاب القدر (٧/ ٢١٠) صحيح مسلم، كتاب القدر (٨/ ٤٨)

[2] صحيح مسلم (٧/ ٢١٠)

[3] صحيح مسلم، كتاب القدر (٨/ ٥٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧١٣) مسند أحمد (٦/ ٢٠٨)

[4] صحيح البخاري (٧/ ٢١٣) صحيح مسلم، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه (٨/ ٤٩)

اے اللہ کے رسول ﷺ! پھر ہم کوئی عمل کریں؟ کیا ہم اسی پر بھروسا نہ کر لیں؟
آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! عمل کرتے جاؤ، ہر آدمی کے لیے وہی آسان کر دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔''
پھر آپ ﷺ نے سورۃ اللیل (آیت: ۴ تا ۱۰) کی تلاوت فرمائی:

﴿اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾

''جس نے اللہ کے راستے میں مال دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات (ملتِ اسلام) کو سچا سمجھا تو ہم اس کو راحت کی چیز کے لیے سامان دیں گے، اور جس نے بخل کیا اور اللہ سے بے نیازی برتی اور اچھی بات (اسلام) کو جھٹلایا، تو ہم اس کو تکلیف کی چیز کے لیے سامان دیں گے۔''[1]

تقدیر پر ایمان لانے کا دوسرا درجہ:

اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ نے قضا و قدر کے ہر فیصلے کو ایک کتاب میں قلم بند کر رکھا ہے، جیسا کہ سورت یٰس (آیت: ۱۲) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾

''اور ہر چیز کو ہم نے کتابِ روشن (لوحِ محفوظ) میں لکھ رکھا ہے۔''
سورۃ الحج (آیت: ۷۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ﴾ ''یہ (سب کچھ) کتاب میں (لکھا ہوا) ہے۔''
فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا:

﴿فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى﴾ [طٰہٰ: ۵۱، ۵۲]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧)

''پہلی امتوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس (موسیٰ) نے جواب دیا: اس کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں ہے، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

''کوئی نفس نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا جنت وجہنم کا ٹھکانا لکھ رکھا ہے اور یہ بھی لکھ رکھا ہے کہ وہ بدبخت ہے یا سعادت مند؟''[1]

اسی روایت میں ہے کہ حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ہمیں دین سکھایئے! گویا ہم ابھی پیدا ہوئے ہیں، عمل کس چیز پر ہے؟ آیا اس بات پر جسے قلم لکھ کر خشک ہو چکا ہے، اور تقدیریں نافذ ہوچکی ہیں، یا اس امر میں کہ آگے ہم اس کا سامنا کریں گے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

''نہیں! بلکہ اس امر میں جسے لکھ کر قلم خشک ہو چکا ہے اور جس پر تقدیریں نافذ ہو چکی ہیں۔'' حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: پھر عمل کس بات پر؟ آپ نے فرمایا: ''عمل کرتے جاؤ، کیونکہ ہر عمل کرنے والے کے لیے اس کا عمل آسان کر دیا جاتا ہے۔''[2]

تقدیر لکھے جانے میں پانچ تقدیریں داخل ہیں اور سب کی سب علم کی طرف لوٹتی ہیں:

① پہلی تقدیر، آسمان وزمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے اس کا لکھا جانا، جب اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا۔ اس کو ''تقدیرِ ازلی'' کہتے ہیں۔

1 ''تقدیر ازلی'' کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ﴾ [الحديد: ٢٢]

''کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمھاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم

---

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب تفسير سورة ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى﴾ (٦/ ٨٤) صحيح مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي الخ (٨/ ٤٧، ٤٨)

[2] صحيح البخاري، تفسير سورة ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى﴾ (٦/ ٨٤)

اس کو پیدا کریں، وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔''

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے ساری مخلوق کی تقدیریں لکھ دی تھیں، اس وقت اللہ کا عرش پانی پر تھا۔''[1]

نیز نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے کہا لکھ! قلم نے کہا: اے میرے رب! میں کیا لکھوں؟ اللہ نے کہا: ''قیامت تک آنے والی ہر چیز کی تقدیر لکھ۔''[2]

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اے ابو ہریرہ! قلم آنے والی ہر شے کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔''[3]

2 ''تقدیرِ عمری''؟

دوسری تقدیر ''تقدیرِ عمری'' کہلاتی ہے، جب اللہ تعالیٰ نے سب سے ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟'' کا عہد و میثاق لیا تھا۔ سورۃ الاعراف (آیت: ۱۷۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾

''اور (اے پیغمبر! وہ وقت یاد کر) جب تیرے مالک نے آدم کی اولاد سے (اور اسی طرح خود آدم سے) ان کی پشت سے ان کی اولاد نکالی اور خود کو ان پر گواہ کیا (ان سے فرمایا:) کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا: بے شک (تو ہی ہمارا رب ہے) ہم اس بات کے گواہ ہیں۔ تم قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس بات سے (کہ تو ہمارا مالک ہے) بے خبر تھے۔''

---

[1] صحيح مسلم، كتاب القدر (٨/ ٥١)

[2] مسند أحمد (٥/ ٣١٧) سنن أبي داود (٤٧٠٠) صحيح جامع الترمذي (٤/ ٤٥٨) رقم الحديث (٢١٥٥)

[3] صحيح البخاري، كتاب القدر (٧/ ٢١٠) مسند أحمد، رقم الحديث (٦٨٥٤)

امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا نئے سرے سے عمل کی ابتدا ہوتی ہے یا قضا و قدر پہلے مقرر کی جا چکی ہے؟ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو ان کی پشت سے نکالا، تو انھیں ان کے نفس پر گواہ بنایا، پھر انھیں اپنی ہتھیلی پر لے کر فرمایا: ''یہ لوگ جنتی ہیں اور یہ لوگ جہنمی ہیں، جنتیوں کے لیے جنت والا عمل آسان کیا جاتا ہے اور جہنمیوں کے لیے جہنم والا عمل۔''[1]

سنن ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم لوگ جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ہمیں بتا یئے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ والی کتاب کے بارے میں فرمایا:

''یہ رب العالمین کی طرف سے نوشتہ ہے، اس میں جنتیوں کے نام، ان کے باپوں کے نام اور قبیلوں کے نام لکھ کر سب کو جمع کر دیا گیا ہے، اس میں کبھی اضافہ ہوسکتا ہے نہ کمی۔''

پھر آپ نے بائیں ہاتھ والی کتاب کے بارے میں فرمایا:

''یہ رب العالمین کی طرف سے نوشتہ ہے، اس میں جہنمیوں کے نام، ان کے باپوں کے نام اور ان کے قبیلوں کے نام لکھ کر سب کو جمع کر دیا گیا ہے، اب اس میں نہ کبھی اضافہ ہوسکتا ہے نہ کمی۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے دریافت کیا: ''اے اللہ کے رسول! جب معاملہ پہلے ہی فارغ کر دیا گیا ہے تو پھر عمل کس بات پر؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''درست راہ پر قائم رہو، قربت حاصل کرتے جاؤ اور جنتی کا خاتمہ جنت والے عمل پر ہوتا ہے، خواہ اس کا جو بھی عمل رہا ہو۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں کو جھاڑ کر فرمایا: تمھارا رب بندوں سے فارغ ہو چکا ہے، اب ایک فریق جنتی ہے اور دوسرا فریق جہنمی۔''[2]

---

[1] دیکھیں: الدر المنثور (٣/ ٧٤٣) ابن کثیر (٢/ ٢٢٩) علامہ البانی رحمہ اللہ نے امام ابن ابی عاصم کی کتاب ''السنة'' کی تحقیق (١/ ٧٣) میں کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔

[2] یہ حدیث صحیح ہے۔ مسند أحمد (٢/ ١٦٧) سنن الترمذي (٤/ ٤٤٩) رقم الحديث (١٢١٤١)

③ تیسری تقدیر:

تیسری تقدیر، اسے بھی ''تقدیرِ عمری'' کہہ سکتے ہیں، جب کہ رحمِ مادر میں نطفے کی تخلیق ہوتی ہے، تخلیقِ نطفہ کے وقت جو ''تقدیرِ عمری'' لکھی جاتی ہے، اس کی دلیل سورۃ النجم (آیت: ۳۲) میں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے:

﴿ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ [النجم: ۳۲]

''اللہ تمھیں بہتر جانتا ہے جب تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماں کے پیٹ میں ''جنین'' تھے، اس لیے خود کو پاکیزہ نہ سمجھو، وہ جانتا ہے کون متقی ہے؟''

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

''تم اپنی ماں کے رحم میں چالیس دن نطفے کی شکل میں رہتے ہو، پھر وہ نطفہ دوسرے چالیس دن میں جما ہوا خون بن جاتا ہے، پھر چالیس دن میں گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجتا ہے، وہ آ کر اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے حکم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق یہ چار امور لکھ دے:

① رزق۔ ② موت وحیات۔ ③ عمل۔ ④ بد بخت یا سعادت مند۔

پھر فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں! ایک شخص جنتیوں جیسا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے مابین صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، اس پر نوشتہ (تقدیر) سبقت کر جاتا ہے اور وہ جہنم والا عمل کر بیٹھتا ہے اور جہنمی بن جاتا ہے۔ ایک شخص جہنمیوں والا عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے مابین صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر نوشتہ (تقدیر) سبقت کر جاتا ہے اور وہ جنت والا عمل کر گزرتا ہے اور جنت میں چلا جاتا ہے۔''[1]

اس سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مختلف الفاظ کے ساتھ روایات آئی ہیں اور سب کا معنی ایک ہی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب القدر (٧/ ٢١٠) صحيح مسلم، كتاب القدر (٨/ ٤٤)

4 ''تقدیرِ حولی'':

چوتھی تقدیر ''تقدیرِ حولی'' کہلاتی ہے، یہ لیلۃ القدر میں ہوتی ہے۔ ''تقدیرِ حولی'' جس کی دلیل سورۃ الدخان (آیت: ۴، ۵) میں یہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا ۚ إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ﴾

''لیلۃ القدر میں ہر حکمت والے معاملہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے، یہ ہمارا فیصلہ ہے بے شک ہم ہی بھیجنے والے ہیں۔''

5 ''تقدیرِ یومی'':

پانچویں تقدیر ''تقدیرِ یومی'' کہلاتی ہے، اس کا مطلب ہے ہر تقدیر کو اس کے وقت پر جاری و نافذ کرنا۔ ''تقدیرِ یومی'' کی دلیل سورۃ الرحمٰن (آیت: ۲۹) میں وارد یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴾ ''ہر دن اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے۔''

مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں ایک لوحِ محفوظ بھی ہے جو سفید موتی سے بنا ہوا ہے، اس کی جلدیں لال یاقوت کی ہیں، اس کا قلم و کتاب دونوں نور کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر دن اسے تین سو ساٹھ مرتبہ دیکھتا ہے اور ہر نظر میں پیدا کرتا ہے، رزق عطا کرتا ہے، اسی چیز کو قرآن میں ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴾ کہا گیا ہے۔''[1]

لہٰذا یہی وہ تمام تقدیریں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں لکھنے کا حکم دیا تھا اور یہ سب کے سب کام اللہ تعالیٰ کے علم سے صادر ہوتے ہیں جو اس کی صفت ہے۔

سعادت و شقاوت پہلے ہی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے:

تمام آسمانی کتابیں اور احادیثِ نبویہ اس امر پر متفق ہیں کہ پہلے ہی تقدیر کا لکھا جانا عمل کو مانع ہے نہ اس پر ہاتھ دھرے بیٹھ جانے کا موجب ہے، بلکہ عمل و محنت، جدوجہد اور عملِ صالح کی رغبت و حرص کا موجب ہے، یہی وجہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقدیر لکھے جانے، اس کے نافذ

[1] مستدرك الحاكم (۲/ ۹۹) امام حاکم نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور حافظ ذہبی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔

ہونے اور قلم خشک ہو جانے کی بات بتائی تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ﴿أَفَلَا نَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ؟﴾ ''کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسا نہ کر لیں اور عمل ترک نہ کر دیں؟'' تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ﴿لَا، اِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ﴾ ''نہیں! عمل کرتے جاؤ، کیونکہ ہر آدمی کے لیے اس کا عمل آسان کر دیا جاتا ہے۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴾ [الليل: ٥]

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تقدیریں بنائی ہیں اور اس کے لیے اسباب مہیا کیے ہیں، اس کا معاش و معاد کے لیے اسباب بنانا حکمت پر مبنی ہے، اس نے سب کے لیے وہ راستہ آسان کر دیا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جب بندے کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے آخرت کے مصالح اسباب کے تحت مربوط ہیں، تو اسے کرنے اور بجا لانے میں سخت جدوجہد کرے گا، بلکہ اس سے بڑھ کر کرے گا جو وہ اسبابِ معاش اور مصالحِ دنیا کے لیے اختیار کرتا ہے، اس نکتے کو اس صحابی نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا جب انھوں نے تقدیر والی حدیث سنی تو یہ کہا:

﴿مَا كُنْتُ أَشَدَّ اِجْتِهَادًا مِّنِّيْ الْآنَ﴾

''اب تو میں پہلے سے بھی زیادہ عمل میں محنت کروں گا۔''

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اِحْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجَزْ﴾ [1]

''تم اس امر کے حریص بنو جو تمھیں نفع دے، اللہ سے مدد مانگو اور تھک ہار کر بیٹھ نہ جاؤ۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا کہ ''ہم جو علاج اور جھاڑ پھونک کراتے ہیں، کیا اس سے تقدیر پلٹ جاتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ﴾ [2] ''یہ بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے تقدیرِ خیر و شر بنائی ہے اور ان میں سے ہر ایک کے لیے اسباب مہیا کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بہرحال نافذ ہو کر رہتی ہے۔ بس وہی کچھ ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے چاہا

---

[1] صحيح مسلم، كتاب القدر (٨/ ٥٦) مسند أحمد (٢/ ٣٧٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٦٥، ٢٤١٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٣٧) مسند أحمد (٣/ ٤٢١)

ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا وہ نہیں ہوا، جیسا کہ سورت تکویر (آیت: ۲۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

''اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو اللہ رب العالمین چاہے۔''

سورۃ الانعام (آیت: ۳۹) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

''اللہ جسے چاہے گمراہ کردے اور جسے چاہے صراط مستقیم پر لگا دے۔''

اللہ کے لیے کوئی کام مشکل نہیں، جیسا کہ سورت یٰس (آیت: ۸۲) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾

''اللہ کا معاملہ تو ایسا کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ ''کُنْ'' (ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے۔''

سورۃ الانعام (آیت: ۱۲۵) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا ﴾

''اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تمام بندوں کے دل ایک دل کی مانند رحمٰن کی دو انگلیوں کے مابین ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے انھیں پھیرتا رہتا ہے۔''[1]

نیز نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم یہ نہ کہو کہ جو اللہ اور فلاں شخص چاہے، بلکہ یوں کہو: جو صرف اللہ چاہے۔''[2]

نیز نبی ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم، كتاب القدر (٨/ ٥٠) صحيح سنن الترمذي (٤/ ٤٤٨)

[2] حديث صحيح. سنن الترمذي، باب العلم، رقم الحديث (٢٦٧٢)

''جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔''[1]

اور ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے، تنگی نہیں چاہتا۔''

بندے پر تقدیر کے متعلق واجبات:

بندے پر تقدیر کے بارے میں دو واجب ہیں:

① حسبِ مقدور واجبات وفرائض پر عمل کرے۔

② محرمات سے اجتناب کرے۔

یعنی جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، ان سے بچنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتا رہے اور اس سے دعا کرے کہ وہ اس کے لیے خیر وبھلائی کے اعمال میسر فرمادے، صرف اور صرف اسی پر توکل کرے، اسی کی پناہ طلب کرے اور بھلائی کے حصول اور برائی کے ترک کرنے پر اسی کا محتاج رہے، کیونکہ اس کے بغیر انسان نیکی کر سکتا ہے نہ برائی سے بچ سکتا ہے، جیسا کہ «لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ» کا معنی بھی یہی ہے۔ لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ وہ تقدیر میں لکھی ہوئی چیز پر جزع وفزع نہ کرے، بلکہ صبر کا مظاہرہ کرے اور وہ اس بات پر یقین کر لے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، جس پر اسے راضی ہی رہنا چاہیے اور اسے تسلیم کرنا چاہیے۔ نیز اسے اس بات پر بھی یقین ہونا چاہیے کہ جو چیز اس کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے وہ اس سے چوکنے والی نہیں، بلکہ اسے مل کر رہے گی اور جو چیز اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں نہیں لکھی، وہ اسے ملنے والی نہیں، چاہے وہ جتنی مرضی محنت کر لے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''اس بات کا اچھی طرح سے یقین کر لو کہ جو چیز اللہ تعالیٰ تجھ سے روک لے وہ تجھے ہرگز نہیں مل سکتی اور جو چیز اللہ تعالیٰ تجھے عطا کرنا چاہے، اسے کوئی بھی تجھ سے روک نہیں سکتا۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٧)

[2] مسند أحمد، سنن الترمذي، صحيح الجامع للألباني، رقم الحديث (٧٩٥٧)

مسئلہ تقدیر اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق میں ایک راز ہے:

تقدیر اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق میں ایک راز ہے، جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا، جیسے اللہ تعالیٰ کا کسی کو گمراہ کرنا، کسی کو ہدایت دینا، کسی کو مارنا، کسی کو زندہ کرنا، کسی کو محروم کرنا اور کسی کو نوازنا وغیرہ ہے۔ ان تمام امور اور ان کی حکمتوں سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

《إِذَا ذُكِرَ الْقَدَرُ فَأَمْسِكُوا》[1]

''جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو (بحث کرنے سے) رُک جا۔''

دنیوی اسباب کا استعمال:

دنیوی اسباب کو اختیار کرنا تقدیر اور توکّل کے منافی نہیں، بلکہ یہ اسی کا ایک جزو ہے۔اگر کسی انسان پر کوئی مصیبت یا آزمایش آجائے تو اسے کہنا چاہیے:

《قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَآءَ فَعَلَ》

''اللہ تعالیٰ ہی نے تقدیر بنائی ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرگزرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ، فرشتوں، رسولوں، آسمانی کتابوں، یومِ آخرت اور تقدیر پر ایمان لانے سے انسان حقیقی اور کامل مومن بنتا ہے اور ان میں سے کسی بھی ایک چیز کو تسلیم نہ کرنے سے انسان دائرہ ایمان واسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ نیک اعمال اور ایمان آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ دونوں میں سے ایک نہ ہو تو دوسرے کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''ایمان کے ستّر سے زائد درجے ہیں اور سب سے اعلیٰ **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** ہے اور سب سے ادنا، راستے سے تکلیف دہ چیزوں کا ہٹانا اور شرم وحیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔''[2]

ایمان باللہ کے سلسلے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ایمان قول اور عمل کے مجموعے کا نام ہے جو اطاعت وفرمانبرداری سے بڑھتا اور گناہ ومعصیت سے گھٹتا ہے۔ کفر وشرک کے علاوہ کسی

---

[1] المعجم الكبير وحسنه العراقي في تخريج الإحياء (١/ ٥٠) والحافظ ابن حجر في الفتح (١١/ ٤٧٦) والألباني في الصحيحة، رقم الحديث (٣٤)

[2] مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٠٠)

گناہ کی وجہ سے کسی مسلمان کی تکفیر جائز نہیں ہے، مثلاً: زنا، چوری، سود خوری، شراب نوشی، نشہ بازی، والدین کی نافرمانی اور ان کے علاوہ دوسرے کبیرہ گناہ جب تک کہ وہ اس کو حلال نہ سمجھ لے۔

ایمان باللہ میں یہ بات بھی داخل ہے کہ محض اللہ کے لیے محبت کی جائے اور اسی کے لیے کسی سے بغض رکھا جائے اور دوستی و دشمنی صرف اسی کے لیے ہو، کیونکہ ایک سچا مومن اہلِ ایمان کو ہی دوست رکھتا ہے اور ان ہی سے محبت بھی کرتا ہے۔ اس امت کے تمام مومنوں کی صفِ اول میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ اہلِ ایمان ان سے محبت رکھتے ہیں، ان کو دل سے چاہتے ہیں اور ان پر اعتماد رکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد وہ بہترین انسان ہیں، اس لیے کہ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''تمام زمانوں میں سب سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ پھر اس کے بعد جو لوگ ہوں گے، پھر اس کے بعد جو لوگ ہوں گے۔''[1]

اسی طرح مومن اہلِ بیت سے بھی محبت رکھتے ہیں اور ان سے انتہائی اپنائیت محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں تمام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی بھی تعظیم و احترام کا جذبہ ہے، وہ ان کو تمام اہلِ ایمان کی مائیں سمجھتے ہیں اور ان سب کے لیے اللہ سے رضا طلبی کی دعائیں طلب کرتے ہیں۔ اس امت کے آخر میں آنے والوں کی اصلاح اسی چیز سے ممکن ہے جس سے اس امت کے پہلے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی اور وہ ہے کتاب اللہ و سنتِ رسول ﷺ کا اتباع اور جو کچھ اس کے خلاف ہو اس کا ترک کرنا۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی منکر ہے تو وہ دائرہ ایمان سے خارج ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جہاں ایمان کا ذکر کیا ہے، ساتھ ہی نیک اعمال کا بھی ذکر کیا ہے، جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نیک اعمال، ایمان کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ نیک عمل کے بغیر ایمان ایک ایسی چابی ہے جس کے دندانے نہ ہوں، جس طرح دندانے والی چابی کے بغیر تالا نہیں کھلتا، اسی طرح ایسا ایمان جو نیک عمل سے خالی ہو، اس کے لیے جنت کا دروازہ نہیں کھلے گا۔

لہٰذا اگر ہم دنیا و آخرت میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ایمان کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ کا ذخیرہ جمع کرنا ضروری ہے۔ وہ ایمان جو صرف زبان تک محدود رہتا ہے اور اس کا اثر

[1] صحيح الجامع الصغير، رقم الحديث (٣٣١٧)

انسانی زندگی پر کچھ نہیں ہوتا، یعنی اعضاے انسانی: آنکھ، کان، ناک اور دل و دماغ سے اگر اس کا اظہار نہ ہوتو وہ ایک بے معنی سا لفظ بن کر رہ جاتا ہے جس کی اللہ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں ہے۔ یعنی نیک اعمال کے بغیر ایمان کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ یہاں علامہ اقبال کا شعر موقع ومحل کے عین مطابق ہے:

زبان سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

لہٰذا زبان کے اقرار کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔

دو نقصان دہ چیزیں:

دو چیزیں عام طور پر انسان کو ایمان اور عملِ صالح سے روکتی ہیں:

1. شبہات: یعنی اس کو ایمان اور نیک عمل میں کچھ نظری اور فکری شبہات پیدا ہوجائیں جن کی وجہ سے عقائد خراب ہوجائیں اور عقائد کی خرابی سے نیک اعمال کا برباد ہونا واضح ہے۔
2. شہوات: یعنی نفسانی خواہشات جو انسان کو بعض اوقات نیک عمل سے روک دیتی ہیں اور بعض اوقات بُرے اعمال میں مبتلا کردیتی ہیں، اگرچہ وہ نظری اور اعتقادی طور پر نیکی پر عمل اور بُرائی سے بچنے کو ضروری سمجھتا ہو، مگر نفسانی خواہشات اس کے خلاف ہوں اور وہ ان خواہشات سے مغلوب ہوکر سیدھا راستہ چھوڑ بیٹھے۔

دو مفید چیزیں:

دو چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے انسان خسارے سے محفوظ رہے گا:

1. حق کی تلقین کرنا: یعنی ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرنا۔ کسی شخص کو تاکید کے ساتھ موثر انداز میں نصیحت کرنے اور نیک کام کی ہدایت کرنے کا نام وصیت ہے۔ مطلب یہ کہ انسان خود ہی راست بازی اور حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ دوسرے کو حق اختیار کرنے، حق پر قائم رہنے اور حقوق ادا کرنے کی تاکید بھی کرتا رہے، ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لیے کافی نہ ہوگا۔ خصوصاً اپنے اہل وعیال، احباب واقارب اور متعلقین کے بُرے اعمال سے غفلت برتنا، نجات کا راستہ بند کرنا ہے، اگرچہ وہ خود کیسے ہی نیک اعمال کا پابند کیوں نہ ہو۔ اسی لیے

قرآنِ کریم اور احادیثِ شریفہ میں ہر مسلمان پر اپنی اپنی قدرت و طاقت کے مطابق نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے کا فریضہ عائد کیا گیا ہے، مگر اس معاملے میں مسلمان غفلت میں مبتلا ہیں۔خود عمل کرنے کو کافی سمجھے بیٹھے ہیں، اولاد اور گھر والے کچھ بھی کرتے رہیں، اُس کی کوئی فکر نہیں کرتے۔

2. صبر کرنا: دوسری چیز جو انسان کو خسارے سے بچاتی ہے وہ ہے: ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔ مطلب یہ کہ اسلام یا حق کو غالب کرنے کے راستے میں جتنی بھی مشکلات حائل ہوں یا مصائب سے دوچار ہونا پڑے تو وہ صرف خود ہی صبر اور برداشت سے کام نہ لے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ صبر کی تلقین بھی اگرچہ حق کی تلقین میں شامل ہے، لیکن اس کی اہمیت اور شرف وفضل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے الگ بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ جن لوگوں میں یہ چار چیزیں (ایمان وعمل اور حق وصبر کی وصیت) پائی جائیں، ان کے متعلق یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے لمحات کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور وہ آخرت میں خسارے سے محفوظ رہیں گے، لہٰذا زمانے کے اوقات سال، مہینے، دن، رات گھنٹے اور منٹ انسانی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ ان کا صحیح استعمال کر کے انسان دنیاوی و اخروی منافع حاصل کرسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اپنے آپ کو آخرت کے خسارے سے بچاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی رضا اور سنت نبویہ کے مطابق نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، کیونکہ رضائے الٰہی اور سنتِ نبویہ کے اتباع کے بغیر کوئی عمل صالح وقبول نہیں ہوسکتا، چاہے اس میں جتنا بھی عجز وانکساری ہو اور کتنا ہی وقت اور سرمایہ اس کے لیے خرچ کیوں نہ کیا گیا ہو، وہ سب بے معنی ہو جائے گا، یعنی آخرت میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح طریقے سے ارکانِ ایمان واسلام کی سمجھ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف۔

3 صحیح اسلامی عقیدہ۔ تالیف: علامہ عبد العزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ۔
ترجمہ: مشتاق احمد کریمی

4 حراستِ توحید۔ تالیف: الشیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز رحمہ اللہ

5 حقیقتِ توحید۔ تالیف: ڈاکٹر صالح فوزان الفوزان۔
اردو ترجمہ: ڈاکٹر سمیر عبدالحمید و ڈاکٹر فضل الٰہی

6 ارکانِ ایمان، ایک تعارف۔ تالیف: ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد۔
مراجعہ و تقدیم: ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

اقسامِ توحید اور ازالہ شبہات ①

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ البقرہ (آیت: ۲۱) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

''اے لوگو! اپنے مالک کی بندگی کرو، جس نے بنایا تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو، تم پرہیزگار ہو جاؤ گے۔''

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کی دعوت تمام انسانوں کو دی جا رہی ہے۔ فرمایا: اگر تم عذابِ الٰہی سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ کو ایک مانو اور صرف اس کی عبادت کرو، جانتے بوجھتے شرک کا ارتکاب مت کرو۔ عبادت کرنے اور عذابِ الٰہی و شرک سے بچنے کے لیے توحید کا جاننا ضروری ہے کہ توحید کیا ہے اور اس کی کتنی اقسام ہیں؟

توحید کی قسمیں:

توحید کی تین اقسام ہیں:

① توحیدِ ربوبیت۔ ② توحیدِ الوہیت۔ ③ توحیدِ اسما و صفات

① توحیدِ ربوبیت:

توحیدِ ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا اقرار کریں کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی ساری مخلوق کا بنانے والا، اس کا نظم و نسق چلانے والا، زندگی اور موت دینے والا، خیر لانے والا اور شر روکنے والا ایک ہی الٰہ ہے جو ساری کائنات کا خالق و مالک و رازق ہے۔ توحید کی اس قسم میں کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا، حتیٰ کہ مشرکین نے بھی اپنے شرک کے باوجود اس کا اقرار کیا ہے اور انکار کی

جرأت نہیں کی، جیسا کہ سورت یونس (آیت: ۳۱) میں اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ مکہ کے اعتراف کے متعلق فرمایا ہے:

﴿ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾

''کہہ دیجیے: کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ وہ کون ہے جو (تمھارے) کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو بے جان سے جاندار اور جاندار سے بے جان کو پیدا کرتا ہے؟ اور کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ ضرور وہ یہی کہیں گے: ''اللہ'' (یعنی یہ سب کام کرنے والا اللہ ہے) تو ان سے کہہ دیجیے کہ پھر تم کیوں نہیں ڈرتے؟''

اسی طرح کا سوال سورۃ الزمر (آیت: ۳۸) میں ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾

''اور (اے پیغمبر!) اگر تو ان کافروں سے پوچھے: آسمان اور زمین کو کس نے بنایا؟ تو بے شک وہ یہی کہیں گے: اللہ نے بنایا۔ اب ان سے کہہ: بھلا بتلاؤ تو سہی، اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ اس کی بھیجی ہوئی تکلیف دور کرسکتے ہیں؟ یا اللہ اگر مجھ پر فضل کرنا چاہے تو یہ (جھوٹے دیوتا) اس کے فضل کو روک سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، اے پیغمبر! کہہ دے کہ اللہ مجھ کو کافی ہے، اسی پر بھروسا کرنے والے بھروسا کرتے ہیں۔''

توحیدِ ربوبیت کا اقرار انسانی فطرت میں داخل ہے، کوئی مشرک بھی اس میں اختلاف نہیں کرتا۔ دنیا کے سارے گروہوں میں سے دہریوں کے سوا کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ دہریے خالق کائنات کا انکار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ نظامِ کائنات کسی مدبر و منتظم کے بغیر خود بخود چل رہا

ہے، جیسا کہ سورۃ الجاثیہ (آیت: ۲۴) میں اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق بیان کیا ہے:

﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ﴾

''اور انھوں نے کہا: ہماری تو یہی دنیا کی زندگی ہے، (اسی دنیا میں) ہم مرتے ہیں اور (یہیں) جیتے رہتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کرتا ہے۔''

پھر ان کی تردید ان الفاظ میں فرمائی:

﴿ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴾ [الجاثية: ٢٤]

''(دراصل) انھیں اس بارے میں کچھ علم نہیں، وہ تو صرف قیاس اور اندازوں ہی سے کام لے رہے ہیں۔''

جبکہ ان کے سامنے اللہ کی طرف سے واضح اور روشن دلیل پہنچ گئی تھی۔ دہریوں کا انکار کسی دلیل پر مبنی نہیں تھا، ان کے پاس صرف ظن تھا اور ظن تو حق سے بے نیاز نہیں کرسکتا، کیونکہ خیال اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اُس بات کا بھی کوئی جواب نہ دے سکے جو سورۃ الطّور (آیت: ۳۵، ۳۶) میں ہے:

﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَل لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴾

''کیا وہ آپ ہی (کسی بنانے والے کے بغیر) بن گئے ہیں یا انھوں نے خود (اپنے آپ کو) بنایا ہے؟ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے؟ بلکہ وہ یقین نہیں لاتے۔''

نہ وہ اللہ تعالیٰ کے اُس فرمان کا جواب دے سکے جو سورت لقمان (آیت: ۱۱) میں ہے:

﴿ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ﴾

''اللہ کی بنائی ہوئی تو یہ چیزیں ہیں، تم مجھے دکھلاؤ کہ اللہ کے سوا دوسرے لوگوں نے کیا بنایا ہے؟''

اسی طرح سورۃ الاحقاف (آیت: ۴) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ﴾

''کہہ دیجیے: بھلا دیکھو تو سہی جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ تو سہی انھوں نے زمین میں کیا بنایا ہے اور آسمانوں میں ان کی شراکت کیا ہے؟''

بہ ظاہر جو کوئی توحید کی اس قسم کا انکار کرتا ہے جیسا کہ فرعون، وہ بھی دل سے اسے درست سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی فرعون کے متعلق سورت بنی اسرائیل (آیت: ۱۰۲) میں فرمایا ہے:

﴿ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ ﴾

''تو خوب جان چکا ہے کہ ان نشانیوں کو آسمانوں اور زمین کے پروردگار ہی نے اتارا ہے۔''

پھر سورۃ النمل (آیت: ۱۴) میں اس کے اور اس کی قوم کے متعلق فرمایا:

﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ﴾

''ان کے دلوں میں ان نشانیوں کا یقین آ گیا تھا، لیکن انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کیا۔''

سورۃ العنکبوت (آیت: ۳۸) میں پہلی امتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴾

''اور عاد اور ثمود کو بھی (ہلاک کیا) اور ان کے گھر تمھارے لیے ظاہر ہیں، شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے زینت دی اور ان کو (سچی) راہ سے دور کر دیا اور وہ سب کچھ دیکھنے والے اور ہوشیار تھے۔''

یعنی وہ عقل مند اور ہوشیار تھے، لیکن دین کے معاملے میں انھوں نے اپنی عقل و بصیرت سے کچھ کام نہیں لیا، اس لیے یہ عقل اور سمجھ ان کے کام نہ آئی۔ یعنی دلائل و معجزات کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بدستور منکر بنے رہے۔ یعنی انھوں نے ایمان و تقوی اختیار کرنے سے گریز کیا۔

جس طرح انسانوں کے کسی معروف گروہ نے توحید کی اس قسم کا انکار نہیں کیا، اسی طرح ان امور میں شرک کا ارتکاب بھی نہیں کیا، سب ہی اس بات کا اقرار کرتے رہے ہیں کہ اللہ ہی تنہا تخلیق کرنے والے اور کائنات کا نظم و نسق چلانے والے ہیں۔ دنیا کے گروہوں میں سے کسی سے بھی یہ کہنا ثابت نہیں کہ تخلیق کرنے والے دو ہیں، جو صفات اور افعال میں برابر ہیں۔ مجوسیوں میں سے

ثانویہ جو کائنات کے دو خالقوں کا عقیدہ رکھتے ہیں، ان کے نزدیک ایک خالقِ خیر ہے جو خیر و نور کا خالق ہے اور دوسرا خالقِ شر ہے جو شر و تاریکی کا خالق ہے، مگر وہ بھی نور و ظلمت کو برابر نہیں سمجھتے، نور ان کے نزدیک اصل ہے اور ظلمت ایک وقتی شے ہے، ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ روشنی تاریکی سے بہتر ہے۔

اسی طرح نصاریٰ جو تثلیث کے قائل ہیں، انھوں نے بھی جہان کے تین الگ الگ خدا نہیں بنائے، بلکہ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ جہان کا تخلیق کرنے والا ایک ہی ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ باپ سب سے بڑا الٰہ (معبود) ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ توحیدِ ربوبیت کا اثبات ایک ایسی بات ہے جس پر سب کا اتفاق ہے اور اس میں شرک کم ہی ہوا ہے، لیکن مسلمان بننے کے لیے یہ کافی نہیں، کیوں کہ اس کے لیے توحیدِ الوہیت کا اقرار بھی ضروری ہے۔ کافر قومیں اور خصوصاً عرب کے مشرک جن میں خاتم المرسلین ﷺ معبوث کیے گئے تھے، توحیدِ ربوبیت کا اقرار کرتے تھے لیکن توحیدِ الوہیت کا اقرار نہ کرنے کی وجہ سے وہ مسلمان نہ بن سکے۔

قرآنِ کریم کی آیات پر غور وفکر کرنے والے کے لیے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وہ توحیدِ ربوبیت سے استدلال کرتے ہوئے توحیدِ الوہیت کا مطالبہ کرتی ہیں، جس بات کا مشرکوں نے انکار کیا، ان آیات میں اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور جس بات کو وہ مانتے ہیں، اس سے استدلال کیا جاتا ہے۔ ان آیات میں توحیدِ عبادت کا حکم ہے اور اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ وہ توحیدِ ربوبیت کا اقرار کرتے ہیں۔

اس بارے میں قرآنِ کریم میں جو پہلا حکم ہے، وہ سورۃ البقرہ (آیت: ۲۱، ۲۲) میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ يَآيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

”اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تمھیں اور تم سے پہلے لوگوں کو تخلیق

کیا، تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ، جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسا کر تمھارے کھانے کے لیے پھلوں کو نکالا، پس تم اللہ کے لیے شریک نہ بناؤ اور تم جانتے ہو۔''

اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں واضح طور پر اس بات کا بیان ہے کہ مشرک لوگ توحید کی اس قسم کے قائل تھے۔

② توحیدِ الوہیت:

توحید کی جس دوسری قسم کا وہ انکار کرتے ہیں، وہ توحیدِ عبادت ہے۔ توحیدِ الوہیت کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کی تمام اقسام کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ عبادت ہر وہ کام ہے جو کسی مخصوص ہستی کی رضا یا اس کی ناراضی کے خوف سے ادا کیا جائے، اس لیے نماز، روزہ، حج اور زکات وغیرہ صرف یہی عبادات نہیں، بلکہ کسی مخصوص ہستی سے دعا و التجا کرنا، اس کے نام کی نذر و نیاز دینا، اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہونا، اس سے طمع اور خوف رکھنا وغیرہ بھی عبادات ہیں۔ توحیدِ الوہیت سے مراد ہے بندے کی تمام ظاہری و باطنی اور قولی و عملی عبادتوں کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کرنا اور اس کے علاوہ ہر چیز کی عبادت کی نفی کرنا، خواہ وہ ملائکہ و رسول ہی کیوں نہ ہوں، جیسا کہ سورت بنی اسرائیل (آیت: ۲۳) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾

''آپ کے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔''

نیز سورۃ النساء (آیت: ۳۶) میں فرمایا:

﴿ وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا ﴾

''اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔''

''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ''، وہ کلمہ ہے جو ہر قسم کی عبادت کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ثابت کرتا ہے اور غیر اللہ سے اس کی نفی کرتا ہے۔ جو بھی قرآنِ کریم، حدیث یا سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ کرنے والا ہے، وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اُس وقت عرب کے اندر مختلف مذاہب کے لوگ تھے، ان میں یہودی، عیسائی، مجوسی، صابی اور مکہ والے مشرکین بھی تھے اور ان کی عبادت کا

طریقہ بھی الگ الگ تھا، لہٰذا کوئی درخت کی اور کوئی آگ کی اور کوئی چاند سورج کی پوجا کرتا تھا اور کسی نے خود اپنے ہاتھوں سے تراشی ہوئی پتھر یا لکڑی کی مورتیاں بنائی ہوئی تھیں، یعنی ہر کسی نے اپنی اپنی عبادت کے لیے اپنا اپنا معبود بنایا ہوا تھا۔ نبیِ رحمت ﷺ نے ان سب کو ایک اللہ کی عبادت کرنے کے لیے کہا اور لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کا مطلب بتایا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکوں کو یہ کلمہ پڑھنے کے لیے کہا تو انھوں نے انکار کیا اور کہنے لگے:

﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴾ [صٓ: ۵]

''کیا اس (نبی) نے سب معبودوں کو ایک معبود کر دیا ہے یہ تو بڑی انوکھی بات ہے۔''

کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ جس نے یہ کلمہ پڑھ لیا، اس نے غیر اللہ کے لیے ہر قسم کی عبادت کے باطل ہونے کا اعتراف کیا اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہر قسم کی عبادت کا اثبات کیا، اور عبادت نام ہے ان ظاہری اور باطنی اقوال واعمال کا جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں، لہٰذا جس کسی نے کلمہ پڑھنے کے بعد غیر اللہ کو پکارا، اس نے اپنے ہی قول کی خلاف ورزی کی۔

توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت لازم وملزوم ہیں۔ توحیدِ ربوبیت کا اقرار اس بات کو واجب ٹھہراتا ہے کہ توحیدِ الوہیت کا اقرار کیا جائے اور اس کے تقاضوں کو ظاہری وباطنی طور پر ادا کیا جائے، اسی لیے سارے رسول اپنی امتوں سے اس بات کا مطالبہ کرتے رہے ہیں اور ان کے توحیدِ ربوبیت کے اعتراف سے توحیدِ الوہیت کی دلیل پکڑتے رہے ہیں، جیسا کہ سورۃ الانعام (آیت: ۱۰۲) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ﴾

''وہی اللہ تعالیٰ تمھارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں، وہ ہر چیز کا بنانے والا ہے، اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے۔''

قرآنِ کریم میں کتنی ہی دفعہ توحیدِ عبادت کی طرف دعوت، اس کے بارے میں حکم اور اس کے متعلق اٹھائے گئے شبہات کا رد کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی ہر سورت بلکہ ہر آیت اسی توحید کی طرف دعوت دیتی ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ اور اس کے اسما وصفات وافعال کے متعلق خبر

ہے اور یہی توحیدِ ربوبیت ہے، اس میں ایک اللہ کی عبادت کی دعوت اور غیر اللہ کی عبادت سے روکا گیا ہے اور یہی توحیدِ الوہیت ہے، اس میں اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ توحید اور اپنے اطاعت گزاروں کو کس طرح دنیا وآخرت میں نوازا ہے اور یہی نوازنا توحید کا بدلہ ہے۔

قرآنِ کریم میں مشرکوں اور دنیا و آخرت میں ان کی سزا کے متعلق بتلایا گیا ہے اور یہی اصل میں توحید سے بغاوت کرنے والوں کے سزا ہے، اور یہ توحید کے حقوق میں سے ہے کیونکہ شریعت سازی کا حق صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ایک کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' توحید کو اپنی تمام قسموں کے ساتھ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، کیونکہ اس میں نفی بھی ہے اور اثبات بھی (غیر اللہ سے الوہیت حقہ کی نفی ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا اثبات ہے) اسی کلمہ میں ''ولاء'' اور ''براء'' بھی ہے (ولاء دوستی اللہ تعالیٰ کے لیے اور براء ت اللہ تعالیٰ کے سواسب سے) اور دینِ توحید کی بنیاد ان ہی دو باتوں پر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بتایا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا:

﴿ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ﴾

[الزخرف: ٢٦، ٢٧]

''جس چیز کی تم عبادت کرتے ہو میں اس سے بے زار ہوں، مگر اس سے جس نے مجھے پیدا کیا، وہ عنقریب میری راہ نمائی کرے گا۔''

یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کردہ ہر رسول کا دستور ہے۔ سورۃ النحل (آیت: ٣٦) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾

''ہم تو ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیج چکے ہیں (یہ حکم دے کر) کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

سورۃ البقرۃ (آیت: ٢٥٦) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾

''دین میں زبردستی نہیں ہے، نیک راہی اور گمراہی کھل گئی ہے، پھر جو کوئی طاغوت (جھوٹے خدا) کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط کنڈا تھام لیا، جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ خوب سنتا خوب جانتا ہے۔''

جس کسی نے لا الٰہ الا اللہ کہا، اس نے غیر اللہ کی عبادت سے اظہارِ براءت کیا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اپنے کو پابند کیا، یہ وہ عہد ہے جس کی پابندی کی ذمے داری انسان خود قبول کرتا ہے، جیسا کہ سورۃ الفتح (آیت: ۱۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

''پس جو کوئی عہد توڑے، اس کے عہد توڑنے کا نقصان اسی کی جان کو ہے اور جو کوئی اس عہد کو پورا کرے جو اس نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑا ثواب دیں گے۔''

''لا الٰہ الا اللہ'' توحیدِ عبادت کا اعلان ہے، کیونکہ ''الٰہ'' کے معنی معبود کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ اس کلمے کے معنی کو جانتے ہوئے اسے پڑھنے والا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے شرک کی نفی اور توحید کا اقرار کرنے والا اور اس پر اعتقاد رکھنے والا صحیح معنوں میں مسلمان ہے، جس نے یہ کلمہ پڑھا اور دل کے اعتقاد کے بغیر ظاہری طور پر اس کے تقاضوں کو پورا کیا، وہ منافق ہے اور جو کوئی زبان سے تو اس کلمے کو پڑھے، لیکن اس کے منافی مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کرے وہ کافر ہے، اگرچہ وہ اس کلمے کو بار بار دہرائے، جیسا کہ آج کل کے قبر پرست ہیں، جو یہ کلمہ اپنی زبانوں سے پڑھتے ہیں لیکن اس کے معنی کو بالکل نہیں سمجھتے، ان کی عادات و اطوار اور اعمال کے بدلنے میں بھی اس کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، وہ لا الٰہ الا اللہ بھی کہتے ہیں اور مدد یا عبدالقادر، یا علی، یا فلاں بھی پکارتے ہیں۔ وہ مُردوں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں اور مصائب میں ان سے فریاد کرتے ہیں، پہلے مشرکوں نے کلمے کے معنی کو ان سے بہتر سمجھا تھا، جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے لا الٰہ الا اللہ کہنے کا مطالبہ کیا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ ان سے بتوں کی عبادت چھوڑنے اور ایک اللہ کی عبادت کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، اسی لیے انھوں نے کہا:

﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ [صٓ: ۵]

''کیا اس نے کئی معبودوں کو ایک معبود کر دیا ہے؟''

سورۃ الاعراف (آیت: ۷۰) میں ہے کہ قومِ ہود علیہ السلام نے کہا:

﴿ اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ﴾

''کیا تو اس لیے ہمارے پاس آیا ہے کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے، ان کو چھوڑ دیں؟''

قومِ صالح علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿ اَتَنْهٰنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ﴾ [هود: ٦٢]

''کیا تو ہمیں ان چیزوں کی عبادت سے روکتا ہے جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے ہیں؟''

کافروں نے لا الٰہ الا اللہ کے معنی یہ سمجھے کہ بتوں کی عبادت کو چھوڑا جائے اور صرف ایک اللہ کی عبادت کی جائے، اسی لیے انھوں نے یہ کلمہ پڑھنے سے انکار کیا تھا، کیونکہ اس کے پڑھنے کے بعد لات و منات اور عزیٰ کی عبادت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ لات و منات اور عزیٰ وہ بت تھے جنھیں مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے اسما دے ڈالے تھے، اس طرح کہ انھوں نے ''الٰہ'' سے ''لات'' بنایا، ''عزیز'' سے ''عُزّیٰ'' اور ''منّان'' سے منات'' بنا دیا اور اپنے بتوں کے نام رکھ دیے۔ اُنھوں نے تو مخلوق کو رب العالمین کے برابر بنایا اور اِنھوں نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے اجسام کے درجے میں اتار دیا اور اللہ جو ہر قسم کی تشبیہ سے پاک ہے، اس کو مخلوق کے مشابہ قرار دے دیا۔

۳۔ توحیدِ اسما و صفات:

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کسی مثیل و شریک سے بہت بلند اور پاک ہے، جیسا کہ سورۃ الشوری (آیت: ۱۱) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [الشوریٰ: ١١]

''اس کے مثل کوئی چیز نہیں، وہ سمیع و بصیر ہے۔''

سورت طٰہٰ (آیت: ۱۱۰) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴾

''وہ ان کی اگلی اور پچھلی باتوں کو جانتا ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔''

آج کے قبر پرست اس تناقض کو نہیں سمجھ پائے، وہ اس کلمے کو بھی پڑھتے ہیں اور مُردوں کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ الٰہ سے مراد اختراع وتخلیق اور ایجاد پر قدرت رکھنے والا بیان کرتے ہیں، اس طرح اس کلمے کے معنی ہوں گے: نئے سرے سے تخلیق پر اللہ تعالیٰ کے ماسوا کوئی قدرت نہیں رکھتا، لیکن یہ انتہائی فاش غلطی ہے، اتنی بات کا اقرار تو مشرکین بھی کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق بیان کیا ہے کہ اختراع وتخلیق اور زندگی وموت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، لیکن اس اقرار کے باوجود وہ مسلمان نہ بن پائے، اگرچہ یہ باتیں لا الٰہ الا اللہ کے معنی میں شامل ہیں، لیکن وہ اس کلمے کا اصل مقصود نہیں۔

توحیدِ عبادت میں شرک:

توحید کی تمام قسمیں آپس میں لازم وملزوم ہیں، اس لیے جو کسی ایک قسم میں شرک کرے گا وہ باقی قسموں میں بھی مشرک ٹھہرے گا، مثلاً: غیر اللہ کو پکارنا اور اس سے ایسی چیز کا سوال کرنا جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ یاد رکھیے کہ اللہ سے دعا مانگنا عین عبادت ہے، اس لیے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے سے دعا مانگنا ''عبادت والوہیت'' میں شرک ہے۔ غیر اللہ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ بھلائی پہنچاتا ہے، ہر طرح کی برائی دور کرتا ہے اور وہ سب باتوں پر قادر ہے، یہ ''ربوبیت میں شرک'' ہے، کیونکہ اس عقیدے کے مطابق اس نے اللہ کے ساتھ اس کی بادشاہت میں غیر اللہ کو تصرف کا حق دے دیا، پھر اس نے غیر اللہ سے اس اعتقاد کے ساتھ دعا مانگی کہ وہ دور ونزدیک، ہر وقت اور ہر جگہ اس کی دعا سن رہا ہے، اس لیے اس کا غیر اللہ سے دعا مانگنا، اللہ کے اسما وصفات میں شرک ہے، کیونکہ اس نے غیر اللہ کے لیے ایسے ''سمع'' کا اثبات کیا جو تمام چیزوں کو محیط ہے اور قرب ونزدیک اس کے سننے سے مانع نہیں ہے، اس طرح غیر اللہ کو پکارنے میں شرک فی الالوہیت، شرک فی الربوبیت اور شرک فی الاسماء والصفات سب شامل ہوگئے اور تینوں قسموں کے اعتبار سے وہ مشرک ٹھہرا۔

روے زمین پر قومِ نوح علیہ السلام میں شرک کی ابتدا ہوئی اور یہ آج تک مخلوق میں جاری ہے سوائے ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا ہے۔

عبادت میں شرک کی دو قسمیں:

① ایک شرکِ اکبر جو انسان کو ملت سے خارج کر دیتا ہے، جیسے غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا، غیر اللہ سے دعا کرنا یا اسی طرح کی کوئی اور عبادت غیر اللہ کے لیے ادا کرنا۔

② دوسری قسم شرکِ اصغر ہے جو ملت سے خارج تو نہیں کرتا، البتہ اس سے توحید میں نقص واقع ہوتا ہے اور بسا اوقات انسان شرکِ اکبر تک پہنچ جاتا ہے، جیسے غیر اللہ کی قسم کھانا، یا ریا کاری کرنا، یا یہ کہنا کہ جیسے اللہ چاہیں اور آپ چاہیں، یا یہ کہنا کہ اگر اللہ اور آپ نہ ہوتے اور اسی طرح کے دوسرے جملے، جو زبان سے ادا تو کیے جاتے ہیں، لیکن ان کے معانی مقصود نہیں ہوتے۔

اس امت میں شرک بڑا رواج پا چکا ہے، جس کے پھیلنے کے اسباب بہت سے ہیں، مثلاً بہت سے لوگوں کی کتاب وسنت سے دوری، آبا و اجداد کی اندھی تقلید، مُردوں کی تعظیم میں مبالغہ، ان کی قبروں پر عمارتوں کا بنانا اور اس دین کی حقیقت سے بے خبری جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا۔

امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”جب اسلام میں وہ لوگ پروان چڑھیں گے جنھوں نے جاہلیت کو نہیں پہچانا تو اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ جائیں گی۔“

بعض شبہات و اعتراضات اور ان کا ازالہ:

شرک کے عام ہونے کے اسباب میں سے ان شبہات اور حکایات کی شہرت بھی ہے جن کی وجہ سے بہت سے لوگ بھٹک گئے ہیں اور جن کو وہ اپنے مشرکانہ اعمال کی درستی کے لیے سند قرار دیتے ہیں، ان میں سے کچھ شبہات ایسے ہیں جو گذشتہ امتوں کے مشرکین نے پیش کیے اور کچھ ایسے ہیں جو اِس امت کے مشرکین نے پیش کیے ہیں، ان شبہات میں سے چند ایک یہ ہیں:

پہلا شبہہ:

یہ شبہہ مشرکوں کے نئے اور پرانے تقریباً تمام گروہوں میں موجود ہے، اس کی اساس آبا و اجداد کے طرزِ عمل کو حجت ٹھہرانا ہے اور یہ کہ انھیں یہ عقیدہ اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملا ہے، جیسا

کہ سورۃ الزخرف (آیت: ۲۳) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴾

''اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے جب کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا تو وہاں کے مالدار لوگ یہی کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم تو انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔''

اس دلیل کا سہارا وہ لوگ لیتے ہیں جو اپنے دعوے کے اثبات کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے، لیکن میدانِ مناظرہ میں اس بودی دلیل کی کوئی وقعت و قیمت نہیں ہے، کیونکہ ان کے آبا و اجداد ہدایت پر نہیں تھے اور جو ہدایت پر نہ ہو، اس کی پیروی اور اتباع کرنا ناجائز ہے۔ سورۃ المائدہ (آیت: ۱۰۴) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾

''کیا اگر ان کے آبا و اجداد نہ کچھ جانتے ہوں اور نہ ہی ہدایت پانے والے ہوں (تب بھی یہ ان کی پیروی کریں گے)۔''

سورۃ البقرہ (آیت: ۱۷۰) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾

'' اور جب ان (مشرکوں یا یہود) سے کہو: اللہ نے جو (حکم) اتارا ہے اس پر چلو تو کہتے ہیں: نہیں ہم تو اس طریق پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو چلتے ہوئے پایا، بھلا اگرچہ ان کے بزرگ (باپ دادے) بے عقل اور گمراہ ہوں۔''

آبا و اجداد کی پیروی قابلِ تعریف اُس وقت ہے جب وہ حق پر ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ

بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾ [یوسف: ۳۸]

''میں نے اپنے آبا و اجداد ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی، ہمارے لیے یہ روا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کریں، یہ ہم اور تمام لوگوں پر اللہ کا فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

دوسری جگہ سورۃ الطّور (آیت: ۲۱) میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان کے ساتھ ان کی راہ پر چلی، تو ہم ان کی اولاد کو بھی (جنت میں) ان کے ساتھ کر دیں گے۔''

یہ شبہہ مشرکین کے دلوں میں ایسا بیٹھ چکا ہے کہ وہ اس کو انبیا علیہم السلام کی دعوت کے مقابلے میں ہمیشہ پیش کرتے رہے ہیں، جیسا کہ سورت ہود (آیت: ۶۲) میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا:

﴿قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ﴾

''کہنے لگے: صالح! تُو تو اس (پیغمبری کے دعوے) سے پہلے ہونہار سمجھا جاتا تھا، بھلا (یہ کیا بات ہے) تو ہمیں ان چیزوں کو پوجنے سے منع کرتا ہے جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے اور ہمیں تو اس راستے (توحید) میں شک ہے، جدھر تو بلاتا ہے، اس پر دل نہیں جمتا۔''

اسی سورت (آیت: ۸۷) میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا:

﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ﴾

''وہ کہنے لگے: اے شعیب! کیا تیری نماز نے تجھے یہ سکھلایا ہے کہ ہم ان (بتوں) کو چھوڑ بیٹھیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے یا اپنے مال میں جو ہم چاہیں (جس طرح تصرف ہم کو منظور ہو) وہ نہ کریں؟ تُو تو بڑا بردبار اور نیک چلن تھا۔''

سورۃ الشعراء (آیت: ۷۰ تا ۷۴) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دلیل سے اپنی قوم کو خاموش کر دیا تو انھوں نے یہی بات کہی:

﴿ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ۞ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ۞ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۞ أَوْ يَنفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ۞ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ﴾

''ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: تم کس کو پوجتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم بت پوجتے ہیں اور انھیں کے سامنے پڑے رہتے ہیں۔ (ابراہیم نے کہا:) جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا یہ سنتے ہیں؟ یا تمھیں نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا: ہم نے اپنے آبا و اجداد کو اسی طرح کرتے ہوئے پایا ہے۔''

دوسرا شبہہ:

یہ شبہہ مشرکینِ قریش او دیگر لوگوں نے پیش کیا، ان کا کہنا تھا کہ جس شرک کا وہ ارتکاب کرر ہے ہیں وہ درست ہے، کیونکہ وہ تقدیرِ الٰہی سے ہے۔ سورۃ الانعام (آیت: ۱۴۸) میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

﴿ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ﴾

''عنقریب مشرکین کہیں گے: ہمارا کیا قصور ہے، اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔''

سورۃ الزخرف (آیت: ۲۰) میں ہے:

﴿ وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَٰنُ مَا عَبَدْنَاهُم ﴾

''اور انھوں نے کہا: اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کو نہ پوجتے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۃ الانعام کی مذکورہ بالا آیت (۱۴۸) کی تفسیر میں لکھا ہے:

''مشرک اپنے شرک اور اپنی طرف سے حرام کردہ چیزوں کی حرمت ثابت کرنے کے

لیے جو شبہہ پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسے بیان کیا ہے کہ ان کے شرک اور ان کے چیزوں کو حرام کرنے کی اللہ تعالیٰ کو خبر ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ ہمارے دلوں میں ایمان ڈال دے، ہمیں کفر سے روک دے لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے اعمال و تصرفات اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے سے ہیں اور وہ ہمارے ان اعمال کی وجہ سے ہم سے راضی ہے۔‘‘

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس پر لکھا ہے کہ یہ کچی اور باطل دلیل ہے، اگر ان کی یہ بات درست ہوتی تو انھیں اللہ تعالیٰ کیوں عذاب چکھاتے اور کیوں انھیں تباہ و برباد کرتے اور ان سے شدید انتقام لیتے؟

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

’’(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے کیا تمھارے پاس اس بارے میں کوئی علم ہے (کہ اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہیں)؟‘‘

﴿فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا﴾ ’’پس تم اس کو ہمارے سامنے پیش کرو۔‘‘

﴿اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ﴾ ’’تم تو صرف گمان کی پیروی کرتے ہو۔‘‘

یعنی یہ تو محض ان کا وہم اور خیال ہے جس کی بنا پر وہ یہ بات کہہ رہے ہیں۔

﴿وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ﴾

’’تم اپنے دعوے میں اللہ پر جھوٹ و افترا باندھ رہے ہو۔‘‘[1]

ان کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کو ناپسند کرتے ہوتے تو ہمیں ان کی سزا دیتے اور ہمیں ان اعمال کی طاقت و قدرت ہی نہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہے کے تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ [النحل: ٣٥]

’’رسولوں کی ذمے داری تو صرف واضح طور پر (پیغام) پہنچانا ہے۔‘‘

جیسا کہ سورۃ النحل (آیت: ۳۵) میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ١٨٦)

﴿ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾

''اور مشرک کہتے ہیں (ہمارا کیا قصور ہے؟) اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے سوا اور کسی چیز کو نہ پوجتے اور نہ ہم اللہ کے حرام کیے بغیر (اپنی طرف سے) کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، ان سے پہلے جو (کافر) گزرے ہیں، انھوں نے بھی ایسا ہی (حیلہ اور حوالہ) کیا (پیغمبروں سے کج بحثی کی) تو پیغمبروں کے ذمے اس کے سوا کچھ کام نہیں کہ صرف کھول کر (اللہ کا حکم) پہنچا دیں۔''

یعنی صورتِ حال اس طرح نہیں جس طرح تم نے گمان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری مذمت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے تو انتہائی شدید انداز میں تمھاری مذمت کی ہے اور انتہائی سخت انداز میں شرک سے منع کیا ہے، ہر زمانے اور لوگوں کے ہر گروہ میں رسول مبعوث کیا اور سب رسول ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے اور غیر اللہ کی بندگی سے منع کرتے رہے۔ اس کے بعد کسی مشرک کا یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے؟

اللہ تعالیٰ کی مشیتِ شرعیہ ان کے شامل حال نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے رسولوں کے ذریعے روکا ہے۔ لہٰذا ان کے اس شبہے کو پیش کرنے سے مشرکوں کا مقصد اپنے برے اعمال کی معذرت کرنا نہیں، کیونکہ وہ اپنے اعمال کو برا سمجھتے ہی نہیں، وہ تو سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں، جیسا کہ سورۃ الکہف (آیت: ۱۰۴) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴾

''اور وہ اسی گمان میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔''

سورۃ الزمر (آیت: ۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾

یعنی وہ بتوں کی اس لیے پوجا کر رہے ہیں کہ وہ انھیں مقام و مرتبے میں اللہ سے اچھی طرح قریب کر دیں۔

ان کے اس شبہے کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے اعمال جائز ودرست اور اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر حقیقت وہی ہوتی جو یہ پیش کرر ہے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مذمت کے لیے رسولوں کو معبوث کرتے نہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو سزا دیتے۔

تیسرا شبہہ:

ان کے شبہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کا صرف زبان سے کہہ لینا جنت میں داخلے کے لیے کافی ہے، خواہ اس کے بعد انسان کیسے ہی شرکیہ یا کفریہ اعمال کرے۔ اس سلسلے میں وہ ان احادیث کے ظاہری الفاظ سے دلیل لیتے ہیں جن میں آیا ہے کہ جس نے اپنی زبان سے شہادتین (اللہ تعالیٰ کی توحید کی شہادت اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی) کا اقرار کیا، اس پر جہنم کی آگ حرام ہوگئی۔ جبکہ ان احادیث سے مراد تو وہ شخص ہے جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اسی پر اس کو موت آئی، شرک کر کے اس نے اس کلمے کی نفی نہیں کی، بلکہ خلوصِ دل سے اس کلمے کا اقرار کیا اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا جن کی عبادت کی جاتی ہے، ان کا انکار کیا اور اسی پر اس کی موت آئی، جیسا کہ حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ پر اس شخص کو حرام کر دیا ہے جس نے لا الٰہ الا اللہ، اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے حصول کے لیے کہا۔"[1]

نیز صحیح مسلم ہی میں مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ کے سوا جس کسی کی بھی عبادت کی جاتی ہو، اس سے کفر کیا تو اس کا مال اور خون محفوظ ہوگیا (کسی کو اس کے مال پر ہاتھ ڈالنے اور اس کا خون بہانے کی اجازت نہیں) اور اس کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔"[2]

اس حدیثِ شریف میں نبی کریم ﷺ نے مال وخون کی حفاظت وحرمت کو دو باتوں سے مشروط کیا ہے، پہلی بات: لا الٰہ الا اللہ اور دوسری بات: اللہ تعالیٰ کے سوا جن (طاغوتوں) کی عبادت

---

[1] صحيح مسلم (١/ ٤٥٦)

[2] صحيح مسلم (١/ ٥٣)

کی جاتی ہے، ان سے کفر کرنا۔ اس طرح معنی کے بغیر لا الٰہ الا اللہ کے الفاظ کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کا کہنا بھی ضروری ہے اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

لا الٰہ الا اللہ کہنا جنت میں داخل ہونے اور جہنم کی آگ سے نجات پانے کا سبب ہے، لیکن کوئی سبب اُسی وقت کارآمد و مفید ہوتا ہے جب اس کی شرائط بھی پائی جائیں اور اس کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹیں موجود نہ ہوں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ سے کہا گیا: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ''جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا جنت میں داخل ہوگیا؟'' فرمانے لگے: ''جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے حقوق وفرائض کو ادا کیا جنت میں داخل ہوگیا۔'' حضرت وہب بن منبہ نے اس شخص کو جس نے آپ سے سوال کیا کہ کیا لا الٰہ الا اللہ جنت کی کنجی نہیں؟ جواب دیتے ہوئے کہا: کیوں نہیں، لیکن ہر کنجی کے دندانے ہوتے ہیں، اگر تو ایسی کنجی لائے گا جس کے دندانے ہوں تو وہ تیرے لیے تالا کھول دے گی ورنہ نہ کھول سکے گی، لہٰذا کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ صرف لا الٰہ الا اللہ کہنا جنت میں جانے کے لیے کافی ہے، خواہ اس کا کہنے والا مُردوں سے دعائیں کرتا ہو، مشکلات میں ان سے فریاد کرنے والا ہو اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا جن کی پوجا کی جاتی ہے، ان سے کفر بھی کرنے والا نہ ہو! یہ تو کھلا ہوا مغالطہ ہے۔

چوتھا شبہہ:

ایک غلط خیال یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ جب تک لوگ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے رہیں گے، تب تک امتِ محمدیہ میں شرک داخل نہیں ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولیا و صالحین کی قبروں کے پاس جو کچھ کیا جاتا ہے، کیا وہ شرک نہیں ہے؟ جبکہ نبی کریم ﷺ نے بتایا ہے کہ اس امت میں یہود و نصاریٰ کے مشابہ اعمال پائے جائیں گے۔ ان کے اعمال میں سے ایک عمل یہ تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے علما اور راہبوں کو رب بنایا تھا۔ رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

''تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں کی ہر ہر بات میں پیروی کروگے، اگر وہ لوگ کسی سوراخ میں داخل ہوئے تو تم بھی اس میں داخل ہوگے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا یہود و نصاریٰ (مراد ہیں)؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ مراد نہیں تو اور کون مراد ہے؟''[1]

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١٣/ ٣٠٠)

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بتایا ہے کہ یہ امت وہ سب کچھ کرے گی جو پہلی امتوں نے کیا، خواہ اس کا تعلق دینی امور سے ہو یا عادات اور سیاست سے، اور جس طرح سے پہلی امتوں میں شرک تھا اسی طرح اس امت میں بھی شرک پایا جائے گا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اس بات کی خبر بھی دے دی کہ اس وقت تک قیامت نہ آئے گی جب تک ان کی امت میں ایک قبیلہ مشرکوں کے ساتھ نہ مل جائے گا اور جب تک ان کی امت میں سے کچھ گروہ بتوں کو نہ پوجیں گے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے جس بات کی خبر دی ہے وہ بات واقع ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ کے بجائے ان قبروں کی کتنی ہی صورتوں میں پرستش کی جاتی ہے اور ان پر نذریں پیش کی جاتی ہیں؟ اس امت میں شرک، تباہ کن باتیں اور گمراہ فرقے ظاہر ہو چکے ہیں، جن کی وجہ سے بہت سے لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہو چکے اور ہو رہے ہیں۔

پانچواں شبہہ:

مشرکین کے شبہات میں سے ایک یہ ہے کہ ہم اولیا و صالحین سے یہ نہیں چاہتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بجائے ہماری ضروریات کو پورا کریں، بلکہ ہم ان سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری شفاعت و سفارش کریں، کیونکہ وہ صالحین اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہیں اور شفاعت کا ثبوت تو کتاب وسنت میں موجود ہے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ بالکل یہی بات عرب کے مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے بجائے مخلوق سے اپنے تعلق کی درستی کو ثابت کرنے کے لیے کہی تھی، جیسا کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ﴾ [الزمر: ٣]

”سن لے، خالص اللہ ہی کی بندگی کرنا چاہیے اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو (اپنا) حمایتی بنایا ہے (وہ کہتے ہیں: ہم ان کو اللہ سمجھ کر نہیں پوجتے) ہم تو ان کو بس اس لیے پوجتے ہیں تاکہ وہ ہم کو اللہ کے نزدیک کر دیں، بے شک یہ لوگ جن باتوں میں

[1] سنن أبي داود، باب الفتن، رقم الحديث (٤٢٥٢)

اختلاف کر رہے ہیں اللہ (قیامت کے دن) ان کا فیصلہ کر دے گا، بے شک جو شخص جھوٹا ناشکرا ہے اللہ اس کو راہِ ہدایت پر نہیں لگاتا۔''

ایک دوسرے مقام پر سورت یونس (آیت: ۱۸) میں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾

''وہ اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہیں کہ نہ وہ ان کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ ان کو نفع دے سکتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ ہمارے اللہ کے ہاں سفارشی ہوں گے۔''

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى﴾ [النجم: ٢٦]

''آسمان کے فرشتے تو کتنے ایسے ہیں کہ ان کی سفارش کچھ کام نہیں آ سکتی مگر ہاں اللہ جس کے لیے چاہے حکم دے اور اس کی مرضی ہو (تو یہ اور بات ہیں)۔''

دوسری بات یہ ہے کہ شفاعت برحق ہے لیکن وہ صرف اللہ ہی کی ملکیت ہے، جیسا کہ سورۃ الزمر (آیت: ۴۴) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

''کہہ دیجیے سفارش تو ساری اللہ کے اختیار میں ہے، آسمانوں اور زمین میں اسی کی بادشاہی ہے۔''

حصولِ شفاعت کی شرائط:

شفاعت اللہ تعالیٰ سے طلب کی جاتی ہے نہ کہ مُردوں سے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ اس کے حصول کے لیے دو شرطیں ہیں:

① پہلی شرط یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفاعت کی اجازت میسر ہو، جیسا کہ سورۃ البقرہ (آیت: ۲۵۵) میں فرمایا گیا ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾

''کون ہے جو اس کے ہاں اس (اللہ) کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے؟''

② دوسری شرط یہ ہے کہ جس کی شفاعت کی جائے اللہ اس کے قول اور عمل سے راضی ہو اور وہ مومن موحد ہی ہوسکتا ہے، جیسا کہ سورۃ الانبیاء (آیت: ۲۸) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾

''اور وہ (فرشتے) سفارش نہیں کرتے مگر اس شخص کے لیے جس کو وہ (اللہ تعالیٰ) پسند کرے۔''

اسی طرح سورت طٰہٰ (آیت: ۱۰۹) میں فرمایا:

﴿ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴾

''اس دن کسی کی شفاعت کام نہ آئے گی مگر جس کو رحمٰن (سفارش کرنے کی) اجازت دے اور اس کی بات پسند کرے۔''

قرآنِ کریم کی ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ اللہ شفاعت کرنے والے کو شفاعت کی اجازت بخشتا ہے، اگر وہ اجازت نہ دے تو کوئی اس کے دربار میں شفاعت کی جرأت نہیں کرسکتا۔ شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلص لوگوں پر عنایت فرماتے ہوئے انھیں ان لوگوں کی دعا کی وجہ سے معاف فرما دیتے ہیں جن کو انھوں نے از راہِ تکریم شفاعت کی اجازت عطا فرمائی ہوتی ہے۔

چھٹا شبہہ:

ایک شبہہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اولیا و صالحین کا اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص مقام ہے، ان کی محبت و تعظیم میں یہ بات شامل ہے کہ ان کے ساتھ رابطہ رکھا جائے، ان کے آثار سے تبرک حاصل کیا جائے اور ان کے طفیل اور ان کے حق کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سب مومن لوگ اولیاء اللہ ہیں، البتہ اپنے ایمان اور اعمال کے مطابق ان کی ولایت کے درجات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن کسی ایک کے بارے میں قطعی طور یہ کہنا کہ وہ اللہ کا ولی ہے، اس کے لیے کتاب وسنت سے دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ جس کی ولایت کی شہادت کتاب و سنت دیں، ہم بھی اس کی ولایت کی شہادت دیتے ہیں اور جس کی شہادت کتاب وسنت نہ دیں تو ہم حتمی طور پر اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، البتہ مومن کے لیے خیر کی امید رکھتے ہیں۔

جن لوگوں کے بارے میں کتاب وسنت سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ وہ اولیاء اللہ میں سے ہیں، ان کے بارے میں بھی غلو کرنا، ان سے تبرک حاصل کرنا، ان کے طفیل اور حق کے ساتھ اللہ سے سوال کرنا جائز نہیں۔ یہ سب باتیں شرک اور بدعاتِ محرمہ کے وسائل میں سے ہیں۔ ہم بھی نیک لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور اچھے اعمال اور بھلی عادات میں ان کی پیروی کرتے ہیں لیکن ان کے بارے میں غلو کرتے ہیں نہ ان کو ان کے مقام و مرتبے سے اونچا کرتے ہیں۔ شرک کی ابتدا نیک لوگوں کے بارے میں غلو ہی سے ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں ہوا۔ انھوں نے نیک لوگوں کے بارے میں غلو کیا اور پھر یہ غلو یہاں تک پہنچا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی پوجا کی۔ اسی طرح اس امت میں نیک لوگوں کے بارے میں غلو کی وجہ سے ''شرک فی العبادہ'' (عبادت میں شرک) شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلو سے باز رہنے کی بارہا تلقین کی ہے۔ سورۃ المائدہ (آیت: ۷۷) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ ﴾

''کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں حد سے مت بڑھو۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری تعریف میں اس طرح حد سے تجاوز نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے مریم کے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی تعریف کرتے ہوئے حد سے تجاوز کیا۔ درحقیقت میں تو بندہ ہوں، تم (میرے بارے میں) صرف یہ کہو: ''اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم کسی ولی وغیرہ کے واسطے کے بغیر صرف اسی سے دعا کریں اور اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ہماری فریاد کو سنے گا، یقیناً وہ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، جیسا کہ سورت غافر (آیت: ٦٠) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِىٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾

''اور تمھارے رب نے کہا ہے: مجھ سے دعا کرو میں تمھاری فریاد سنوں گا۔''

سورۃ البقرۃ (آیت: ۱۸۶) میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِى عَنِّى فَإِنِّى قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (٦/ ٤٧٨)

”اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو (کہہ دیجیے:) بے شک میں قریب ہوں، جب مجھ سے دعا کرنے والا دعا کرتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں۔“

اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں مفسرینِ کرام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”جب کوئی شخص مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار یا دعا کو صرف سنتا ہی نہیں بلکہ شرفِ قبولیت بھی بخشتا ہوں۔“

لہٰذا لوگوں کا یہ کہنا اور سمجھ لینا ٹھیک نہیں کہ اللہ ہم گنہگاروں کی دعا کب سنتا اور قبول کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآنِ کریم کی اُس آیت پر غور کرنا چاہیے جس میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کی سنتا ہے، ویسے ہی وہ گنہگاروں کی بھی سنتا اور اسے شرفِ قبولیت بخشتا ہے، لہٰذا دعا صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی چاہیے، وہی ہماری التجائیں سنتا ہے اور ہماری مصیبتوں کو ٹالتا بھی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم کسی وسیلے کے بغیر براہِ راست اپنے رب سے مانگیں، جو ہمارا خالق و مالک ہے اور وہی ہماری امیدوں کا مرکز ہے، جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کا فرمان ہے:

”جس چیز کو اللہ تعالیٰ عطا کرے، اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جس چیز کو وہ روک لے، اس کو کوئی دینے والا نہیں۔“[1]

سورۃ الاعراف (آیت: ۵۵) میں بھی ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً﴾ ”اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔“

اللہ تعالیٰ سے آہ وزاری اور خفیہ طریقے سے دعا کی جائے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

”لوگو! اپنے نفس کے ساتھ نرمی کرو (اور اپنی آوازوں کو پست رکھو) تم جس کو پکار رہے ہو، وہ بہرا ہے نہ غائب، وہ اچھی طرح تمھاری دعائیں سننے والا اور بڑا قریب ہے۔“[2]

ایک اور مقام پر سورت غافر (آیت: ۶۵) میں فرمایا:

﴿فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ ”اسی کو پکارو خالص اس کی بندگی کر کے۔“

اسی طرح جن آیات میں دعا کرنے کا حکم دیا ہے، ان میں یہی کہا گیا ہے کہ براہِ راست

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٤٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٨٤)

کسی کے واسطے کے بغیر دعا کرو۔ اولیا و صالحین تو خود اللہ تعالیٰ کے محتاج اور دست نگر بندے ہیں، جیسا کہ سورت بنی اسرائیل (آیت: ۵۷) میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا﴾

''یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں، وہ خود اپنے رب کے تقرب کی جستجو میں رہتے ہیں کہ ان میں سے کون اللہ کے زیادہ قریب ہے اور وہ خود اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ بات بھی یہی سچ ہے کہ تیرے رب کا عذاب ڈرانے کی چیز ہے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ مشرک لوگ کہا کرتے تھے:

''ہم فرشتوں اور مسیح و عزیر کی عبادت کرتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ ...﴾ یعنی یہ فرشتے جن کو تم پوجتے ہو، وہ تو خود اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لیے کوشاں ہیں، وہ اللہ کی رحمت پانے کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف زدہ ہیں اور جس کی خود یہ کیفیت ہو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے فریاد نہیں کی جاسکتی۔''[1]

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اعمالِ صالحہ ہیں اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ بھی یہی ہے، لہٰذا اصل چیز ایمان اور عملِ صالح ہی ہے، جو پہلے صالحین کا بھی سرمایہ تھا اور قیامت تک آنے والے انسانوں کی نجات کا بھی واحد ذریعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں مسئلہ توحید، احکامِ شریعت اور اصولِ دین سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اے اللہ! قرآنِ کریم اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی عطا فرمائیے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٦)

اے ہمارے رب! ہم آپ سے شک، شرک، کفر، نفاق اور برے اخلاق سے پناہ طلب کرتے ہیں۔

اے اللہ! ہمیں حق کو حق سمجھنے اور اس کی پیروی کی توفیق عطا فرما دے اور ہمیں باطل کو باطل سمجھنے اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمایئے۔

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف۔
3. حقیقتِ توحید۔ تالیف: شیخ صالح الفوزان، ترجمہ: ڈاکٹر فضل الٰہی، ڈاکٹر سمیر عبدالحمید
4. صحیح اسلامی عقیدہ۔ تالیف: علامہ حافظ بن احمد الحکمی۔ ترجمہ: مشتاق احمد کریمی
5. مزاروں اور درباروں کی شرعی حیثیت۔ تالیف: حافظ مقصود احمد

توحید سے متعلق شبہات کا ازالہ ②

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [المائدة: ٣٥]

''مسلمانو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو (اور اس تک (پہنچنے کا) وسیلہ ڈھونڈو اور (دین کے دشمنوں سے) اس کی راہ میں (اس کی رضا مندی کے لیے) لڑو تاکہ تم مراد کو پہنچو۔''

سابقہ درس میں اقسامِ توحید کے تذکرے کے بعد بعض لوگوں کے چند شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے۔ ذیل میں اسی سلسلے میں بعض دیگر شبہات کا زالہ پیش خدمت ہے۔

ساتواں شبہہ:

ایک شبہے کی بنیاد مندرجہ ذیل دو آیات سے استدلال پر ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ (آیت: ٣٥) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

دوسری آیت سورت بنی اسرائیل (آیت: ٥٧) میں ہے، جس میں فرمایا ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ﴾

''یہ لوگ جنھیں پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کی طرف ذریعہ تلاش کرتے ہیں کہ کون اللہ کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔''

انھوں نے ان دو آیات سے یہ سمجھا کہ ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان انبیا و صالحین کی شخصیتوں، ان کے حقوق اور مقام و مرتبے کا وسیلہ پکڑنا جائز و درست ہے۔ ان دونوں آیتوں میں وسیلے سے مراد وہ کچھ نہیں جو یہ سمجھتے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ نیک اعمال سے قربِ الٰہی کا حصول کیا جائے۔

وسیلہ کی اقسام:

وسیلے کی دو قسمیں ہیں: ایک جائز وسیلہ ہے اور دوسرا نا جائز۔ جائز وسیلے کی کئی اقسام ہیں:

① اللہ تعالیٰ کے اسما و صفات کا وسیلہ:

سورۃ الاعراف (آیت: ۱۸۰) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ﴾

''اور اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں ان ہی کے ساتھ اللہ سے دعا کرو۔''

جیسا کہ مسلمان یہ کہے: ''یَا اللّٰهُ'' اے اللہ! ''یَا حَيُّ یَا قَیُّوْمُ'' اے زندۂ جاوید!
اسی طرح ''یَا رَزَّاقُ'' اے رزق دینے والے! ''یَا حَنَّانُ'' اے شفقت فرمانے والے!
''یَا مَنَّانُ'' اے احسان فرمانے والے! ''یَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ'' اے جلالت واکرام والے!
''یَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ'' اے رحم کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ رحم کرنے والے! میں آپ سے اس بات کا سوال کرتا ہوں۔ غرض اللہ کے اسما و صفات کے ساتھ دعا کرنا جائز ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے اللہ سے ہر قسم کی مدد طلب کرے، مثلاً:

«یَا حَيُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِیْثُ أَصْلِحْ لِيْ شَأْنِي كُلَّهٗ»

''اے زندہ جاوید! اے قائم و دائم! میں تیری رحمت کے ذریعے سے مدد طلب کرتا ہوں، تو میرا ہر کام سنوار دے۔''

حدیثِ رسول ﷺ میں ہے:

''یہ دعا مشکلات اور مصیبتوں میں کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے آسانی کے راستے کھول دیتا ہے۔''[1]

[1] المستدرك للحاكم، رقم الحديث (۲۰۰۰)

② فقر وحاجت کے اظہار کا وسیلہ:

جیسا کہ سورۃ الانبیاء (آیت: ۸۳) میں حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا:

﴿ وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾

''ایوب کی اس حالت کو یاد کرو جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھے بیماری پہنچی ہے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ مہربان ہیں۔''

③ نیک اعمال کا وسیلہ:

اس ''وسیلے'' سے مراد وہ اعمالِ صالحہ ہیں جن کے ذریعے اللہ کی رضامندی اور اس کا قرب حاصل ہوتا ہے، اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، ابو وائل، حسن، عبد اللہ بن کثیر، امام سعدی، ابن زید اور دیگر ائمہ تفسیر رحمہم اللہ نے وسیلے کے معنیٰ ہی قربت کے کیے ہیں، یعنی اللہ کی اطاعت اور اس کے پسندیدہ عملوں کے ذریعے سے اس کا قرب حاصل کرنا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان ائمہ نے جو کچھ کہا ہے، اس کی بابت مفسرین کے مابین کوئی اختلاف نہیں، وسیلہ ایسی ہی چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے مقصود تک پہنچا جا سکے۔''[1]

ظاہر بات ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اعمالِ صالحہ ہیں، اس لیے اعمالِ صالحہ ہی اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں، جیسا کہ بنی اسرائیل کے اُن تین اشخاص کے قصے میں آیا ہے کہ غار کے منہ پر پتھر آ پڑا اور انھوں نے اپنے اپنے نیک اعمال کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مصیبت دور کر دی۔[2]

یہی وسیلہ ہے جس کا ذکر ان دونوں آیات میں ہے، جن سے شبہہ پیش کرنے والوں نے دلیل لی ہے، حالانکہ یہ وسیلہ نیک اعمال کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے۔

④ زندہ نیک لوگوں کی دعا کا وسیلہ:

اسی طرح ایک جائز وسیلہ یہ بھی ہے کہ کسی زندہ نیک شخص جو صحیح عقیدے والا ہو، اس سے دعا کروائی جائے، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں قحط سالی دور کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٤٣)

کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی دعا کو وسیلہ بنایا، یعنی ان سے بارش کی دعا کروائی اور یہ فرمایا:

''اے اللہ! پہلے ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کرواتے تھے (جبکہ وہ زندہ تھے) تو تُو ہم پر اپنی رحمت کی بارش نازل فرمادیتا تھا۔ اب ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کو تیری بارگاہ میں بطورِ وسیلہ (دعا کے لیے) پیش کر رہے ہیں، پس اے اللہ! (ان کی دعا قبول فرما کر) ہم پر بارش نازل فرما۔ (راوی کہتا ہے) کہ اس پر بارش ہو جاتی۔''[1]

اگر فوت شدہ بزرگوں سے وسیلے کے طور پر دعا کروانی جائز ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قحط سالی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک پر جاکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست ضرور کرتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تعلیم نہیں ہے کہ کسی کی وفات کے بعد اس کی قبر پر جاکر اس کی ذات کے وسیلے سے اللہ کو پکارا جائے، بلکہ ان لوگوں نے زندہ بزرگ شخصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم کو وسیلہ بنایا، یعنی ان سے دعا کروائی اور یہ وسیلہ جائز ہے۔

میری مسلمان بہنو اور بھائیو! وسیلے کی جائز اور درست اقسام میں نے آپ کے سامنے بیان کردی ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آٹھواں شبہہ:

ان لوگوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ بعض قبروں کے پاس ان کی بعض حاجتیں پوری ہوگئیں، جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں قبر پر حاضر ہوکر دعا کی، یا فلاں شخص یا ولی کا نام پکارا تو اس کی مراد پوری ہوگئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مشرک کی کسی حاجت کا پورا ہونا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ جس شرک کا ارتکاب کر رہا ہے وہ جائز اور درست ہے، بلکہ اس مقام پر اس کی حاجت کا پورا ہونا تقدیرِ الٰہی سے تھا اور مشرک یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہ کسی شیخ یا ولی سے اس کے فریاد کرنے کی وجہ سے ہوا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی کسی مراد کے یوں پورا ہونے میں اس کے لیے آزمایش ہو۔ خلاصہ یہ کہ کسی وقت کسی مشرک کی حاجت پورا ہونے سے اس بات کی دلیل نہیں لی جاسکتی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے دعا کرنا درست ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠١٠)

﴿ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [النحل: ۲۱]

''وہ مردے ہیں زندہ نہیں وہ خود نہیں جانتے کہ انھیں کب ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا۔''

صالحین کو پکارنے اور ان کی قبروں کو عبادت گاہ بنانے والوں کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جس مرض میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، اس وقت اپنے چہرے پر کبھی کپڑا ڈالتے، کبھی ہٹا لیتے اور فرماتے:

''اللہ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر جنھوں نے انبیا اور نیک لوگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا دیا۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: دراصل اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو بیان کر کے ان کے اس گندے فعل سے اپنی امت کو خبردار کرنا چاہتے تھے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لوگوں کو کہا: خبردار ہو جاؤ! تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں وہ اپنے انبیا اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو عبادت گاہ نہ بنانا، میں تمھیں ایسا کرنے سے منع کرتا ہوں۔ اسی طرح صحیح بخاری کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ام سلیم اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہما جب ہجرت کر کے حبشہ کی طرف گئیں تو وہاں انھوں نے عیسائیوں کا ایک گرجا گھر دیکھا، اس میں کچھ تصویریں لٹک رہی تھیں، اس بات کا ذکر انھوں نے واپسی پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہی وہ لوگ ہیں کہ جب ان میں سے کوئی نیک آدمی مرجاتا تو یہ ان کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے اور اس کی تصویر لٹکا لیتے۔'' پھر فرمایا: ''اس قسم کے لوگ اللہ رب العزت کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔''[2]

میری مسلمان بہنو (اور بھائیو!) اس بات پر غور کریں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں اور ان کی تصویریں یا مجسمے بنا لیتے ہیں، یہ لوگ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔

اس حدیث میں تصویر کا ذکر آ ہی گیا ہے تو کیوں نہ اس کے متعلق بھی کچھ باتیں ہو جائیں،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

کیونکہ بہت سے مذہب کے لوگوں نے اپنے گھروں میں تصویریں سجائی ہوئی ہیں، جن کی وہ صبح اٹھ کر عبادت کرتے ہیں جیسا کہ سکھوں نے اپنے گھروں میں گورونانک کی تصویر رکھی ہے، صبح اٹھ کر وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس کی عبادت کرتے اور اس پر پھولوں کا ہار ڈالتے اور اگر بتی جلاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں نے بھی اپنے گھروں میں مورتیاں بنائی ہوئی ہیں جن کی وہ صبح اٹھ کر عبادت کرتے ہیں، اب آپ ایک کلمہ گو کو دیکھیں جو لا الہ الا اللہ کا اقرار کرنے اور اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے والا ہے، اس کی عبادت کا طریقہ بھی آپ دیکھ لیں، اس مسلمان نے بھی اپنے پیر کی تصویر کو اپنے گھر میں سجایا ہوا ہے اور یہ مسلمان روزانہ اٹھ کر اپنے پیر کی تصویر کے سامنے اگر بتیاں جلاتا ہے، اس پر پھولوں کا ہار ڈالتا ہے، اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کیجیے اور بتایئے کہ کیا فرق ہے سکھوں کے کفر اور شرک میں اور اس مسلمان کی بدعقیدگی میں؟!

صحیح بخاری کی حدیث میں نبی اقدس ﷺ کا فرمان ہے کہ ''رحمت کے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس گھر میں تصویر یا کتا ہو۔''[1] اب آپ غور کریں کہ ہم نے کن کن لوگوں کی تصویریں تبرک کے طور پر اپنے گھروں میں سجائی ہوئی ہیں؟ کیا یہ نبی اکرم ﷺ کی کھلے عام نافرمانی نہیں ہے؟ یہ وہ کفر اور شرک تھا جو مکے کے مشرکین کے حوالے سے اور کچھ اقوامِ سابقہ، یہودیوں اور عیسائیوں کے تعلق سے میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے۔

کیا مسلمان بھی شرک کرتے ہیں؟

اب آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ کیا مسلمان بھی شرک کرتے ہیں؟ کیونکہ بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان شرک نہیں کرتے تو دیکھتے ہیں کہ ان کے متعلق اللہ کا قرآن کیا کہتا ہے؟

سورت یوسف (آیت: ۱۰۶) میں اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ مَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾

''ان میں سے اکثر لوگ باوجود اللہ پر ایمان رکھنے کے بھی مشرک ہی ہیں۔''

یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ متعدد جگہ بیان فرمایا ہے کہ مشرکین یہ تو مانتے ہیں کہ آسمان و زمین کا خالق، مالک، رازق اور مدبر صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٠٦)

اس کے باوجود عبادت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک ٹھہرا لیتے ہیں اور یوں اکثر لوگ مشرک ہیں، یعنی ہر دور میں لوگ توحیدِ ربوبیت کے تو قائل رہے ہیں لیکن توحیدِ الوہیت ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

آج کے قبر پرستوں کا شرک بھی یہی ہے کہ وہ قبروں میں مدفون بزرگوں کو صفاتِ الوہیت کا حامل سمجھ کر انھیں مدد کے لیے پکارتے ہیں اور عبادت کے کئی مراسم بھی ان کے لیے بجا لاتے ہیں۔ یوں بہت سارے لوگ اللہ پر ایمان رکھنے کے بعد بھی شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور وہ مشرک ہیں۔ صحیح بخاری کی حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم اپنے سے پہلوں کے نقشِ قدم پر چلو گے جس طرح اقوامِ سابقہ قبر پرستی کے شرک میں مبتلا تھیں۔ یعنی ان کے ہر ہر طریقے کی پیروی کرو گے، خواہ اس کا تعلق عبادت سے ہو یا عادت سے، جس طرح سے پہلی امتوں میں شرک تھا، اسی طرح اس امت میں بھی شرک پایا جائے گا، لہٰذا مشرکینِ مکہ اور سابقہ قوموں کی طرح ہی آج مسلمانوں میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو صالحین کی قبروں پر عبادت کر رہے ہیں، فرق صرف ناموں کا ہے، اُنہوں نے کچھ اور نام رکھے تھے اور اِنہوں نے کچھ اور رکھ لیے ہیں، لیکن مسلمان ان کاموں کو شرک نہیں سمجھتے، جبکہ اللہ کے رسول ﷺ نے اقوام سابقہ کے شرک اور ان کی ہلاکت کو مدنظر رکھ کر بار بار ان حرکتوں سے خبردار کیا کہ تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، میں تم کو ایسا کرنے سے منع کر رہا ہوں۔

قبروں کی زیارت کا مقصد:

ابتداے اسلام میں نبی کریم ﷺ نے قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، کیونکہ دورِ جاہلیت میں لوگوں کے عقائد غلط تھے اور قبروں پر خرافات کا ارتکاب کیا جاتا تھا، کیونکہ جو چیز پہلے شرک کا سبب بنی وہ قبریں ہی تھیں، اس بنا پر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسلامی تربیت فرمائی اور کچھ عرصہ بعد جب لوگوں کے ایمان مضبوط ہو گئے اور عقائد میں توحید کی خوشبو رچ بس گئی، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، لیکن اب تم جا سکتے ہو، کیونکہ یہ تمھیں آخرت کی یاد دلائے گی۔''[1]

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٤٥)

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے قبروں کی زیارت کا مقصد بیان فرمایا ہے۔عوام الناس جو مقصد لے کر قبروں اور مزاروں پر جاتے ہیں اور جن خرافات کا وہاں ارتکاب کرتے ہیں، اسے بھی سامنے رکھیں اور پیارے پیغمبر امامِ کائنات ﷺ نے قبرستان جانے کا جو مقصد بیان فرمایا ہے، اسے بھی مدِنظر رکھیں، تو ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔قبرستان جانا تو باعثِ عبرت ہے، جہاں پہنچ کر انسان کو یہ تصور کرنا چاہیے کہ اس شہرِ خموشاں کے مکین بھی کسی وقت ہماری طرح زمین پر چلتے پھرتے، نرم و نازک بستروں پر آرام کرتے، اپنے بیوی بچوں اور اعزا و اقارب میں خوشیوں اور مسرتوں کی زندگی بسر کیا کرتے تھے، مگر موت نے آج انھیں دنیا وما فیہا سے کاٹ کر رکھ دیا ہے اور ایسی بستی میں انھوں نے ڈیرے ڈال لیے ہیں جہاں چاروں طرف مٹی ہے، اندھیرا ہی اندھیرا ہے، نہ کچھ سنتے ہیں، نہ سنا سکتے ہیں، نہ اپنے عزیزوں کی غمی و خوشی میں شریک ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے گھروں کی طرف کبھی واپس لوٹ کر آ سکتے ہیں۔ جب آدمی قبرستان میں کھڑے ہو کر ان حقائق پر نظر ڈالے گا تو دنیا کی حقیقت اس پر عیاں ہو جائے گی اور وہ آخرت کی تیاری میں ضرور مصروف ہو جائے گا۔ حدیث میں جس قبرستان کی زیارت کی اجازت دی گئی ہے وہ اپنے ہی شہر یا گاؤں کا مقامی قبرستان ہے جس میں آپ کے شہر کے لوگ، آپ کے دوست، آپ کے اپنے دفن کیے گئے ہیں، جن کی قبروں کو دیکھ کر آپ کو اپنی آخرت یاد آئے گی اور قبرستان کی زیارت کا یہ مقصد اسی وقت پورا ہو گا جب قبریں کچی اور سادہ ہوں گی، اگر انھیں سنگِ مرمر سے پختہ بنا دیا گیا ہو، مختلف رنگوں کے پھولوں سے انھیں سجا دیا گیا ہو، ان پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کر دی گئی ہوں، عرقِ گلاب سے انھیں دھویا جا رہا ہو اور پھر انھیں مشکل کشا و حاجت روا سمجھ کر ربِ کائنات کے اختیارات میں حصہ دار بنا دیا گیا ہو، تو پھر قبروں کی زیارت سے وہ مقصد جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا ہے، کیسے حاصل ہو گا؟

کتاب و سنت کی رو سے قبروں کو پختہ کرنے اور ان پر عمارت کھڑی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ امامِ کائنات ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبریں کچی مٹی سے بنائی تھیں۔ جنگِ احد میں تقریباً ستر (۷۰) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے، جن میں سید الشہدا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، امام کائنات ﷺ نے ان کی تدفین اپنے سامنے کروائی، مگر کسی قبر پر پکی اینٹوں کو استعمال کیا نہ کسی قبر پر قبہ تعمیر کیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر سادہ ہو اور پاکستان، ہندستان، بنگلہ دیش، افغانستان، ایران اور دیگر کئی ایک ممالک کے چھوٹے بزرگوں کی قبریں بڑی اونچی اونچی اور قبہ نما ہوں، کیا یہ بے انصافی نہیں؟ کیا ان بزرگوں کا مقام حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مقام سے اونچا ہے؟ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (نعوذ باللہ) بھول گئے کہ انھوں نے شہدائے اُحد (جن کی فضیلت قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے) کی قبروں پر قبے تعمیر نہیں کیے؟

اگر خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی کی قبر پر قبہ اور مزار تعمیر نہیں کیا، تو ان بزرگوں کی قبروں پر تعمیر کیے گئے قبوں اور مزاروں کی کیا حیثیت ہے؟ کیا یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑے ہیں؟ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے شریعت اور تھی اور ان بزرگوں کے لیے اور شریعت ہے؟ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قبے بنانے کا طریقہ نہ آتا تھا جو ہم نے سیکھ لیا؟ ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

لہٰذا جو لوگ بڑے بڑے آستانوں، مزاروں اور درگاہوں کی طرف ثواب کی نیت سے جاتے ہیں، ایسے لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں، انھیں اللہ سے ڈرنا چاہیے، کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قبرستان کی زیارت کی اجازت دی ہے وہ آپ کے اپنے علاقہ کا ہونا چاہیے جہاں جانے سے آپ کو دنیا کی بے ثباتی پر غور وفکر کا موقع ملتا ہے، دوسروں کی قبریں دیکھ کر اپنی قبر کا خیال آتا ہے۔ عارضی دنیا کی خاطر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر پشیمانی اور ندامت کا احساس پیدا ہوتا ہے، اپنے گناہوں پر توبہ و استغفار کی رغبت پیدا ہوتی ہے اور انسان دنیا کو بھول کر آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی ایسی قبر پر جا رہے ہیں جس پر مزار بنا ہوا ہے اور وہاں قوالی ہو رہی ہو اور ساتھ ہی بے پردہ عورتیں گھوم رہی ہیں تو آپ ایمان کے ساتھ بتائیں! کیا وہاں آپ کو آخرت کی یاد آئے گی؟ ہرگز نہیں۔ اس بات کو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج دینِ اسلام کی جتنی رسوائی، جتنی توہین ان آستانوں، درگاہوں اور مزاروں پر ہو رہی ہے، شاید غیر مسلم مندروں، گرجوں اور گُردواروں پر بھی اسلام کی ایسی توہین نہ ہوتی ہوگی۔

اسی طرح صالحین کی قبروں پر قُبے تعمیر کرنا، انھیں خوبصورت بنانا، ان پر چراغ جلانا، ان پر پھول چڑھانا، انھیں غسل دینا، ان پر مجاوری کرنا، نذر و نیاز چڑھانا، وہاں کھانا اور شرینیاں تقسیم کرنا،

جانور ذبح کرنا، رکوع و سجود کرنا، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، ان سے مرادیں مانگنا، ان کے نام کی چوٹی رکھنا اور ان کے نام کے کنگن اور چھلے پہننا، دکھ یا مصیبت میں انھیں پکارنا، مزاروں کی دیواروں کو بوسہ دینا، وہاں سے خاک لا کر کھانا ننگے گے پاؤں مزاروں پر چل کر پیدل جانا اور وہاں سے اُلٹے پاؤں واپس پلٹنا، یہ شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ سارے کام تو وہ ہیں جو ہر چھوٹے بڑے مزار پر روزمرہ کا معمول ہیں۔

لیکن جو مشہور اولیاے کرام کے مزار ہیں، ان میں سے ہر مزار کا کوئی نہ کوئی الگ امتیازی وصف ہے، مثلاً: بعض خانقاہیں ایسی ہیں جہاں پر اللہ تعالیٰ کی جنت کے مقابلے میں ایک دروازے کا نام ''بہشتی درازہ'' رکھا ہوا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو یہاں سے گزر جائے گا وہ بہشتی ہوگا۔ اس دروازے کے سامنے سارا سال قوالی اور موسیقی کا دور چلتا ہے۔ یقیناً یہ ان لوگوں کی بہشت ہے، جنھیں شیطان نے گمراہ کر کے شرک میں مبتلا کر دیا ہے، ہم تو اللہ تعالیٰ سے اس جنت کا سوال کرتے ہیں، جس کے دروازے پر سب سے پہلے امامِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ دستک دیں گے، جیسا حدیثِ پاک میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''میں جنت کے دروازے پر آؤں گا اور دستک دوں گا تو فرشتہ پوچھے گا: آپ کون ہیں؟ فرمائیں گے: میں محمد (ﷺ) ہوں۔ فرشتہ کہے گا: جب سے اللہ تعالیٰ نے جنت بنائی ہے اور مجھے اس کے دروازے پر کھڑا کیا ہے، یہ حکم دے کر کھڑا کیا ہے کہ اگر محمد (ﷺ) دستک دیں تو دروازہ کھولا جائے، کسی دوسرے کی دستک پر دروازہ نہ کھولا جائے۔''[1]

جبکہ پاکپتن کا بہشتی دروازہ تو کسی ڈپٹی کمشنر یا وزیر اعلیٰ کے آنے پر کھولا جاتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر اور وزیر اعلیٰ کوئی شرابی، زانی، کرپٹ اور غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے، ایسے دروازے کو بہشتی دروازہ کہنا جنت کی توہین، نبی اکرم ﷺ کی توہین، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی توہین اور اللہ تعالیٰ کا براہِ راست مقابلہ کرنا ہے۔

یاد رہے اس بہشتی دروازے کے دیر سے کھلنے پر ۲۰۰۱ء میں رش کی وجہ سے کم از کم ۶۰/ افراد ہلاک اور سیکڑوں زخمی ہوئے۔ دنیا بھر کے ذرائعِ ابلاغ سے اس سانحے کی خبر نشر ہوئی اور اندرون و

---

[1] مسند أحمد (٣/ ١٤٤)

بیرون ملک پاکستان کی بڑی بدنامی ہوئی۔ مرکز دعوۃ التوحید اسلام آباد نے اس حادثے کے بعد جامعہ سلفیہ اسلام آباد، جامعہ فریدیہ، جامعہ فرقانیہ، جامعہ رحمانیہ لاہور اور مفتی اعظم سعودی عرب سے اس جعلی بہشتی دروازے کے متعلق فتویٰ حاصل کیا، تو تمام مفتیانِ کرام نے بالاتفاق اس کا نام ''بہشتی دروازہ'' رکھنے کو ناجائز اور اس سے گزرنے کو شرک قرار دیا اور لکھا کہ ایسا دروازہ گرادینا چاہیے، کیونکہ یہ شرک کا سبب ہے۔[1]

لیکن پھر بھی وہاں پر گدی نشین لوگوں سے نذرانے وصول کرتے اور جنت کی ٹکٹیں تقسیم کرتے ہیں، ہمارے حکمران اور بڑے بڑے عہدے دار وہاں دنیا کے مال و دولت کے بل بوتے پر جنت کو خریدنے جاتے ہیں۔ عقل کے اندھے یہ نہیں جانتے کہ جنت دنیا کے مال سے نہیں ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔

قبر پرستی کا شرک آخرت میں انسانوں کی ہلاکت اور بربادی کا باعث تو ہے ہی، دنیا میں اس کے معاشرتی مفاسد، اخلاقی بگاڑ اور دیگر زہریلے ثمرات کا اندازہ بھی درجِ ذیل اخباری خبروں سے لگایا جاسکتا ہے:

① ضلع بہاولپور میں خواجہ محکم الدین میرائی کے سالانہ عرس پر آنے والی بہاولپور یونیورسٹی کی دو طالبات کو سجادہ نشین کے بیٹے نے اغوا کر لیا، جبکہ ملزم کا باپ سجادہ نشین منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا گیا۔[2]

② رائے ونڈ میں بابا رحمت شاہ کے مزار پر عرس میں ورائٹی پروگرام کے نام پر لگائے گئے سات کیمپوں میں محافل مجرا جاری ہیں۔ درجنوں نوعمر لڑکیاں فحش ڈانس کر کے تماش بینوں سے داد عیش حاصل کر رہی ہیں۔ تماش بین نئے نوٹوں کی گٹھیاں لے کر یہاں پہنچ جاتے ہیں اور رات دو بجے تک گھنگروؤں کی جھنکار پر شرابیوں کا شور سنائی دیتا رہتا ہے۔ سائیکل شوز پروگرام میں نوعمر لڑکے لڑکیوں کے روپ میں ڈانس کر کے ہم جنس پرستی کی دعوت دے رہے ہیں۔ عرس میں جوا، شراب نوشی اور اسلحے کی نمائش سر عام ہے۔ شہریوں کے احتجاج کے باوجود کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔[3]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مجلّہ الدعوۃ (صفر ۱۴۲۲ھ، مئی ۲۰۰۱ء لاہور، پاکستان)

[2] روزنامہ ''خبریں'' لاہور (۱۵ اکتوبر ۱۹۹۲ء)

[3] روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور (۶ اگست ۲۰۰۱ء)

③ داتا دربار میلے کی آڑ میں مجرے، فحش گانوں پر گرما گرم ڈانس، پولیس اور انتظامیہ کے تعاون سے درجنوں طوائفوں کا مجرا زور وشور سے جاری ہے۔ فحش گانوں پر ہیجان انگیز رقص دیکھنے کے لیے ۱۰ سالہ بچے سے لے کر ۷۰ سالہ بابے تک سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ رقص کرتے کرتے ایک موقع پر طوائفیں کمر کے بل زمین پر لیٹ گئیں تو تماشائی اٹھ کھڑے ہوئے اور اس ہنگامے میں سیکڑوں کرسیاں ٹوٹ گئیں۔[1]

④ ڈبا پیروں نے غیر ملکی ایجنٹوں کا کاروبار بھی سنبھال لیا ہے۔ سرکاری حلقوں سے گہرے تعلقات، پولیس بیشتر جرائم پیشہ افراد کو پیروں کے سیاسی اور سرکاری اثر و رسوخ کی بنا پر پکڑنے سے خائف رہتی ہے جو پیری مریدی کی آڑ میں منشیات فروشی اور بدکاری کے اڈوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ داتا دربار میں پھرنے والے درویش سیاسی جلسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔[2]

⑤ عورتوں کے برہنہ جسموں پر تعویذ لکھنے والا راسپوٹین پکڑا گیا۔ ملزم زنا، قتل، ڈکیتی اور ہیرا پھیری کی وارداتوں میں کئی اضلاع کی پولیس کو مطلوب تھا۔ ملتان کے بعد شیخو پورہ کے نواح میں ''پیر خانہ'' کھول کر دھندا کرتا رہا۔[3]

اسی طرح کچھ درگاہیں ایسی بھی ہیں جہاں پر معصوم بچوں کا چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے۔ گجرات شہر میں ایک خانقاہ شاہ دولا ولی کے نام کی ہے، جہاں پر مسلمان معصوم بچوں کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ بدعقیدگی ہے کہ جو بچہ شاہ دولا ولی کی قبر پر چڑھاوا مانا جائے وہ چوہے کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ رب العزت نے قرآنِ کریم کی سورت آل عمران (آیت: ٦) میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴾

''وہ ماں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں جس طرح کی چاہتا ہے بناتا ہے، اس کے سوا

---

[1] خبریں رپورٹ، بحوالہ شاہراہِ بہشت پر، از مولانا امیر حمزہ (ص: ۷۹)

[2] حوالہ سابقہ۔

[3] حوالہ سابقہ (ص: ٦۷)

کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔‘‘

یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے یا بدصورت، مذکر ہے یا مؤنث، نیک بخت ہے یا بدبخت، ناقص الخلق ہے یا تام الخلق ہوگا، جب رحمِ مادر میں یہ سارے تصرفات صرف اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے تو پھر بابا جی کی تخلیق کس طرح ہوسکتی ہے، جو خود بھی اسی مرحلہ تخلیق سے گزر کر اس دنیا میں آئے ہیں، جس کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے رحمِ مادر میں قائم فرمایا ہے، لیکن مسلمان یہ غلط عقیدہ رکھتے ہیں کہ باباجی کی مرضی سے تخلیق ہوئی ہے۔ پھر یہ بات تو مشہور ہی ہے کہ جب سات بار اجمیر چلا جائے اس کا ایک حج ہوجائے گا۔ (والعیاذ باللہ) بلکہ ایک دیوانے نے یہاں تک کفر بک ڈالا ہے ؎

خواجہ کی گلی کا ایک چکر سو حج کے برابر ہوتا ہے

میری مسلمان بہنو (اور بھائیو!) اسی طرح بعض درگاہیں ایسی ہیں جہاں پر نوجوان لڑکیاں خدمت کے لیے وقف کردی جاتی ہیں اور بعض درگاہیں ایسی بھی ہیں جہاں پر اولاد سے محروم عورتیں نو راتیں بسر کرنے کے لیے جاتی ہیں، وہاں جا کر مجاوروں اور گدی نشینوں کی خدمت کرتی ہیں اور کثرت سے خانقاہیں منشیات، ہیروئن، چرس، فحاشی، بدکاری اور جوے کے اڈے بنی ہوئی ہیں۔ انھیں خانقاہوں کے گدی نشینوں اور مجاوروں کے حجروں میں جنم لینے والی بے حیائی پر مبنی داستانیں سنیں تو واللہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

انھیں خانقاہوں پر منعقد ہونے والے سالانہ عرسوں میں مردوں عورتوں کا کھلے عام اختلاط، عاشقی معشوقی اور شرکیہ مضامین پر مشتمل قوالیوں کی مجلس لگی ہو تو وہاں آخرت کی یاد کیسے آئے گی؟ جہاں ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ نوجوان ملنگوں اور ملنگنیوں کی دھمالیں ہو رہی ہوں، وہاں منکر ونکیر کا خیال کیسے آئے گا؟ جہاں پر کھلے بالوں کے ساتھ رقص عام نظر آتے ہیں، وہاں قبر کا ذکر کہاں؟

انہی رنگ رلیوں اور عیاشیوں کی باعث گلی گلی، محلے محلے، گاؤں گاؤں، شہر شہر مزار تعمیر ہورہے ہیں اور لوگ جوق در جوق آستانوں اور درگاہوں مزاروں پر جا رہے ہیں۔ یہ لوگ کھلے عام اللہ عزوجل کے ساتھ شرک کر رہے ہیں، لیکن مسلمان پھر بھی ان باتوں کو شرک نہیں سمجھتے۔

اسی کا نام شرک ہے جو بدقسمتی سے محبتِ اولیا کے نام پر مسلمانوں میں عام ہے۔ میلوں اور

عرسوں کے موقع پر بے پردہ عورتوں کا کثرت سے آنا جانا شرم و حیا کی چادر کو تار تار کر دیتا ہے۔ پردے کے وہ احکام جو اللہ رب العزت نے سورۃ الاحزاب اور سورت نور میں نازل فرمائے ہیں، کیا مزاروں پر ان کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کی جاتی؟ امامِ کائنات ﷺ معصوم بھی ہیں، امت کے باپ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں، اس کے باوجود آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عورتوں سے بیعت لیتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''اللہ کی قسم! نبی کریم ﷺ کا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا، البتہ آپ ﷺ نے کلام کے ساتھ عورتوں سے بیعت لی۔''[1]

لیکن ان گدی نشینوں کے سامنے کوئی عورت پردہ کر کے نہیں آ سکتی کیونکہ یہ اسے ان کی گستاخی پر محمول کرتے ہیں۔ یہ ایک مختصر سا تعارف ہے مزاروں، خانقاہوں اور آستانوں کی دنیا کا جو ہماری دنیا سے کہیں زیادہ رنگین، کہیں زیادہ دلفریب اور کہیں زیادہ پرکشش ہے، ایسی قبروں اور مزاروں پر جا کر موت کسے یاد آئے گی؟ آخرت کا خیال کسے آئے گا؟ عذاب یا ثواب کی فکر کسے ہوگی؟ اللہ کا خوف کس کے دل میں پیدا ہوگا؟ دنیا سے بے رغبتی کیوں کر پیدا ہوگی؟ جن علمائے کرام کے مسلک میں یہ تمام امور جائز ہیں، ان کی خدمت میں خلوصِ دل سے درخواست ہے:

① براہ کرم! غور فرمائیں کہ چڑھاوے چڑھانے، عرس منانے، نذر و نیاز دینے، منتیں ماننے، صدقہ خیرات کرنے اور مراد مانگنے کے بہانے مزاروں، خانقاہوں اور آستانوں پر تشریف لانے والے مرد اور عورتیں معاشرے میں جس بے حیائی، فحاشی، بدکاری اور دیگر جرائم کے حیا سوز کلچر کو جنم دے رہے ہیں، اس کا ذمے دار کون ہے؟ قیامت کے روز اس کی جواب دہی اور مسئولیت کس کے ذمے ہوگی؟

② اگر مزاروں اور خانقاہوں پر نیازیں دینا، چڑھاوے چڑھانا، مرادیں مانگنا، عرس اور میلے لگانا: واقعی شریعتِ اسلامیہ میں جائز اور نیکی کا کام ہے تو پھر اس خیر اور نیکی کے کام سے فحاشی، بے حیائی، بدکاری اور جرائم کا کلچر کیوں جنم لے رہا ہے؟

میری بہنو (اور بھائیو!) ایسا کرنے کے لیے اللہ رب العزت نے کوئی سند نازل کی ہے نہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٦٦)

نبی مکرم ﷺ نے کوئی تعلیم اپنی امت کو دی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو جب کوئی قرآن و حدیث کو ماننے والا سمجھاتا ہے کہ یہ حرام ہے، شرک ہے تو بگڑ جاتے ہیں۔ جب وہ کہتا ہے کہ اس سے باز رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قرآن اعلان فرما رہا ہے:

﴿ وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [یونس: ۱۸]

''اور یہ (مشرک) اللہ تعالیٰ کے سوا ان کو (بتوں) پوجتے ہیں جو نہ ان کا نقصان کر سکتے ہیں نہ فائدہ اور کہتے ہیں: اللہ کے پاس یہ ہمارے سفارشی ہوں گے (اے پیغمبر!) کہہ دے: کیا تم اللہ کو وہ بات بتلاتے ہو جس کو نہ وہ آسمانوں میں پہچانتا ہے نہ زمین میں، وہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔''

جب وہ انھیں کہتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ شرک کرنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے، تو یہ مسلمان اللہ کا کلام اور نبی اکرم ﷺ کا فرمان سننے کے بعد بھی احسان ماننے کے بجائے اُس کے دشمن بن جاتے ہیں اور کہتے کیا ہیں کہ تم تو ہو ہی وہابی۔ تمھیں کیا پتا، تم بے دین ہو بلکہ مرتد ہو، تمھیں انبیا و صالحین سے محبت ہی نہیں، ہم ان سے محبت کرتے ہیں، یہ اللہ کے بڑے پیارے ہیں، انھوں نے بڑی محنتیں کی ہیں، یہ بہت ہی اللہ کے قریب پہنچے ہوئے ہیں، ہماری ان کی آگے، ان کی اللہ کے آگے، لہٰذا ہم ان کی عبادت نہیں کرتے یہ تو اولیاء اللہ کی محبت اور ان کی تعظیم ہے، یہ صالحین ہمارے اور اللہ کے درمیان وسیلہ ہیں۔ نہیں، ہرگز یہ ان کا وسیلہ نہیں بنیں گے، یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں، جن کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ان لوگوں کے متعلق اللہ کا قرآن اعلان فرما رہا ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَ لَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ﴾ [الأعراف: ۱۹۷]

''اور جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ تمھاری کچھ مدد نہیں کر سکتے، وہ تو اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے۔''

جو اپنی مدد آپ کرنے پر قادر نہ ہو، وہ بھلا دوسروں کی مدد کیا کریں گے؟ جو خود محتاج ہو

دوسرے کا بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا؟ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے بہت محنتیں کی ہیں، ایسے لوگوں سے میرا سوال ہے کہ کیا یہ محنتیں انھوں نے آپ کے لیے کی ہیں؟ کیا قیامت کے دن صالحین آپ کو اپنی عبادت سے کچھ حصہ دیں گے؟ کیا اللہ کے سامنے حساب و کتاب کے وقت آپ کی مدد کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآنِ کریم نے اس بات کو واضح کردیا ہے۔

سورۃ البقرۃ (آیت: ۱۳۴) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ﴾

''جو انھوں نے کیا وہ ان کے لیے ہے اور جو تم نے کیا وہ تمھارے لیے۔''

اس آیتِ کریمہ میں کسب و عمل کی اہمیت بیان فرما کر بزرگوں کی طرف انتساب یا ان پر اعتماد کو بے فائدہ قرار دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے، اس کا صلہ انھیں ہی ملے گا، تمھیں تو وہی ملے گا جو تم کماؤ گے، اس سے معلوم ہوا کہ صالحین جو اس دنیا سے گزر گئے ہیں، ان کی نیکیوں یا ان کی محنتوں کا آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ ان کے عملوں کے متعلق تم سے یا تمھارے عملوں کی بابت ان سے نہیں پوچھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [الفاطر: ۱۸] ''کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

سورۃ النجم (آیت: ۳۹) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾

''انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔''

یعنی بات واضح ہوگئی کہ نیک صالحین جو گزر گئے ہیں، ان کی نیکیوں کا سہارا ہمیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا، بلکہ وہ قیامت کے دن ان لوگوں کے خلاف گواہی دیں گے۔ قبر کے ان پجاریوں کو صالحین کہیں گے: اے اللہ! ہم ان کو جانتے ہیں نہ ہم نے ان کو کہا تھا کہ ہماری قبروں کو عبادت گاہ بنانا، کیونکہ یہ ہماری شایانِ شان نہیں۔ پھر وہاں یہ لوگ کیا کہیں گے؟ سنیے!

﴿ لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ﴾ [البقرۃ: ۱٦۷]

''کاش! ہم دنیا کی طرف دوبارہ جائیں تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بے زار ہوجائیں جیسے یہ ہم سے ہیں۔''

آخرت میں پیروں اور گدی نشینوں کی بے بسی اور بے وفائی پر مشرکین حسرت کریں گے لیکن وہاں اس حسرت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کاش! یہ لوگ دنیا ہی میں شرک سے توبہ کرلیں۔

آج اگر کسی بھی اہلِ بدعت کو سمجھایا جائے کہ ان بدعات کی دین میں کوئی اصل نہیں تو وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ یہ رسمیں تو ہمارے آبا واجداد سے چلی آرہی ہے، لیکن شریعت کے مقابلے میں آبا پرستی یا اپنے ائمہ وعلما کی پیروی غلط ہے۔

جن لوگوں نے تقلیدِ آبا و اجداد میں اپنی عقل وفہم کو معطل کر رکھا ہے، ان کی مثال اُن جانوروں کی طرح ہے جن کا ذکر اسی سورت (آیت: ۱۷۱) میں آیا ہے جو اپنے چرواہے کی صرف پکار اور آواز ہی کو سنتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ انھیں کیوں بلایا اور پکارا جا رہا ہے؟ اسی طرح یہ اندھے مقلدین بھی بے عقل ہیں کہ دعوتِ حق اور دعوتِ توحید وسنت کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو شرک اور بدعات کی دلدل سے نکالے، آمین۔ لیکن جن کے دلوں میں شرک کا روگ راہ پا گیا ہو، ان کے کان حق بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے ہیں، کیونکہ پیٹ کے کچھ پجاریوں نے انھیں مغالطے میں ڈال دیا ہے اور کہتے ہیں کہ دیکھو! جب ہم بیمار ہوجاتے ہیں تو ڈاکٹر سے مدد حاصل کرتے ہیں، بیوی سے مدد چاہتے ہیں، دوست، رشتے داروں سے روپے سے مدد حاصل کرتے ہیں، ڈرائیوروں اور دیگر انسانوں سے مدد کے طالب ہوتے ہیں، اس طرح یہ باور کرواتے ہیں کہ اللہ کے سوا دوسروں سے مدد مانگنا بھی جائز ہے۔ حالانکہ اسباب کے ماتحت ایک دوسرے سے مدد چاہنا اور مدد کرنا یہ شرک نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے، جس میں سارے کام ظاہری اسباب کے مطابق ہی ہوتے ہیں اور یہ کام کرنے والا ان پر قادر ہے، حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام بھی اپنی امت کے لوگوں سے مدد حاصل کرتے تھے، جیسا کہ سورۃ الصّف (آیت: ۱۴) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ ''اللہ (کے دین) کے لیے کون میرا مددگار ہے؟''

اسی طرح سورۃ المائدہ (آیت: ۲) میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو فرمایا ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی﴾

''نیکی اور تقوے کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔''

ظاہر بات ہے یہ تعاون ممنوع ہے نہ شرک کا اس کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ شرک تو یہ ہے کہ کسی ایسے شخص سے مدد طلب کی جائے جو ظاہری اسباب کی لحاظ سے مدد نہ کرسکتا ہو، جیسا کہ کسی فوت شدہ شخص کو مدد کے لیے پکارنا، اس کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا اور اسی کو نافع اور نقصان دہ باور کرنا، اسی طرح اسے دور اور نزدیک سے ہر کسی کی فریاد سننے کی صلاحیت سے بہرہ ور تسلیم کرنا، ایسے ہی مافوق الاسباب طریقے سے مدد طلب کرنا اور اسے خدائی صفات سے متصف ماننا شرک ہے، جو توحیدِ الوہیت میں بدقسمتی سے محبتِ اولیا کے نام پر مسلمان ملکوں میں عام ہے۔

بد اعتقادی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب بعض ماہرین ولیوں اور مزاروں کے اختیارات اور امتیازات بانٹ دیتے ہیں، مثلاً شادی سے مایوس عورتوں کی شادی کرانے کی خاطر فلاں خاتون کے آستانے کا رخ کیا جائے، اگر بے روزگاری ختم کرنا ہو تو فلاں ولی کے مزار کا قصد کیا جائے۔

پوری پلاننگ اور محکم سازش جس کے جال میں صرف عوام اور جاہل طبقہ ہی نہیں پھنسا، بلکہ تکلیف کی بات تو یہ ہے کہ شہرت یافتہ اور بلند پایہ یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم طلبا اور طالبات پر بھی اس کا گہرا اثر ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ خرافات ایسے لوگوں کے دلوں میں سرایت کر جاتی ہیں جن کو ان بدترین اور خطرناک مشرکانہ افعال سے دور رکھنے والے صحیح عقیدے کی حمایت حاصل نہیں ہوتی اور یہ وہی لوگ ہیں جو قرآنِ کریم کی تعلیم سے دور ہیں۔ ان لوگوں نے قرآنِ کریم کی اس آیت کو پڑھا ہی نہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شیطان نے کہا:

﴿ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾ [الأنعام: ١٧]

''پھر اُن کے پاس ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے آؤں گا اور ان کی دائیں طرف سے اور ان کی بائیں طرف سے اور تو اکثر آدمیوں کو شکر گزار (موحد) نہ پائے گا۔''

خلاصہ کلام یہ کہ جو شخص اللہ پر پورے اعتماد و یقین سے ایمان رکھتا ہے، اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اللہ ہی ہر چیز کا مالک اور پالنہار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ کسی وسیلے کا محتاج نہیں، یقیناً ایسا شخص اپنی ایمانی قوت اور ٹھوس عقیدے کے سائے میں زندگی بسر کرے گا، خرابیاں

اس تک ہرگز نہیں پہنچ سکتیں، بلکہ ساری کی ساری برائیاں اس کی ایمانی چٹانوں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گی، کیونکہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کے حوالے کر چکا ہے، اس کے نزدیک اب اس معاملے میں تبادلہ خیال کی بھی گنجایش باقی نہیں۔ اس طرح ایمان وعقیدہ ایسی چیزیں ہیں جن کی دست یابی یونیورسٹیوں کی چار دیواری اور کتابوں کی سیاہ سطروں میں ضروری نہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر کس و ناکس کے لائق بنایا، تاکہ نادار اپنی محتاجی کے باعث محروم نہ رہ سکے اور صاحبِ ثروت اپنی دولت سے اسے خرید نہ سکے۔

بزرگوں کا احترام:

میری مسلمان بہنو (اور بھائیو!) بزرگوں کے احترام کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں ان صالحین کے ساتھ بہت پیار ہے، کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں، ان کا احترام ہم سب مسلمانوں پر واجب ہے، چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے:

''جس نے میرے کسی دوست سے دشمنی رکھی، میرا اس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔''[1]

اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ اولیاء اللہ کی محبت اور ان کی تعظیم نہایت ضروری ہے اور ان سے بغض وعناد اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کے خلاف اعلانِ جنگ فرماتا ہے۔ لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگتے ہیں اور اللہ کے ولیوں کے ساتھ بہت پیار اور محبت کرتے ہیں، وہ بزرگانِ دین جو علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں ہم سے بہت آگے ہیں، ان کا احترام واجب ہے، اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کرتے ہوئے ''رضي اللّٰه عنهم'' اور ان کے بعد والے بزرگوں کا نام لیتے ہوئے ''رحمة اللّٰه عليهم'' کہنا ان کے ادب واحترام کا تقاضا ہے، لیکن اولیا و صالحین کی محبت، احترام یا تعظیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے نام پر بدعات وخرافات کرنا شروع کردیں، ان کی قبروں پر گنبد اور قُبے بنائے جائیں، ان کی قبروں پر سالانہ عرسوں کے نام پر میلوں کا اہتمام کیا جائے، ان کی قبروں کو غسل دیا جائے، ان پر چادریں چڑھائی جائیں اور ان کی چوکھٹوں پر سجدہ کیا جائے، جیسا کہ بدقسمتی سے اولیاء اللہ کی محبت کے نام پر ہمارے ہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، حالانکہ یہ محبت نہیں بلکہ یہ ان کی عبادت ہے، جو شرک اور ظلمِ عظیم ہے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٠٢)

جیسا کہ سورۃ المائدہ (آیت: ۷۲) میں اللہ رب العزت نے بڑے شدید لہجے میں مشرک کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰهُ النَّارُ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾

''جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے تو اللہ تعالیٰ جنت کو اس پر حرام کر چکا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں (مشرکوں) کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔''

موطا امام مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا کی:

''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا دینا کہ اس کی پوجا ہونے لگے۔ ان لوگوں پر اللہ کا بڑا شدید غیظ وغضب نازل ہو جنھوں نے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا دیا۔''[1]

ایسے لوگوں کے متعلق قرآنِ کریم کی سورۃ الشوریٰ (آیت: ۲۱) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

''کیا ان لوگوں نے (اللہ کے) شریک بنا رکھے ہیں جو ان کو دین کا وہ راستہ بتلاتے ہیں جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا اور اگر ہو چکی ہوئی بات نہ ہوتی تو (اب تک کب کا) ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور گناہگاروں (نافرمانوں) کو بے شک تکلیف کا عذاب (ایک دن ضرور) ہونا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے تو کسی کو حکم نہیں دیا کہ تم قبر والوں کے وسیلے سے مجھے پکارو اور نہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسا کوئی راستہ اپنی امت کو بتایا ہے، بلکہ اللہ رب العزت نے تو اپنے بندوں کو اس بات کی تعلیم دی ہے، جیسا کہ مسلمان نماز کی حالت میں براہِ راست اپنے رب کو پکارتے ہیں:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ [الفاتحه: ٤]

''ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔''

یعنی کسی قبر والے کے وسیلے کے بغیر سے اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عبادتِ قبور

[1] الموطأ (۱/ ۱۷۲)

کے اس فتنے سے محفوظ رکھے۔ آمین

اسی طرح ایک اور خاص بات وسیلے کے حوالے سے میں اپنی بہنوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ بعض لوگ نبی کریم ﷺ کے وسیلے سے دعا مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکال دیا تھا تو اُس وقت حضرت آدم علیہ السلام نے عرشِ الٰہی پر ''لا الہ الا اللہ'' محمد رسول اللہ لکھا ہوا دیکھا، تو انھوں نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے دعا مانگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف فرما دیا۔ جبکہ یہ روایات موضوع و من گھڑت ہیں۔[1]

یہ قرآنِ کریم کے بھی معارض ہیں، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے بھی خلاف ہیں، تمام انبیا علیہم السلام نے ہمیشہ براہِ راست اللہ سے دعائیں کیں، کسی نبی، ولی اور بزرگ کا واسطہ اور وسیلہ نہیں پکڑا، اس لیے نبی کریم ﷺ سمیت تمام انبیا علیہم السلام کا طریقۂ دعا یہی رہا ہے کہ کسی واسطے اور وسیلے کے بغیر اللہ کی بارگاہ میں دعا کی جائے، لہٰذا عمل کے بغیر کوئی وسیلہ یا سفارش قبول نہیں ہوگی اور نہ کوئی مددگار آگے آئے گا، جیسا کہ قرآنِ کریم کی سورۃ البقرۃ (آیت: ۴۸) میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾

''اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کچھ کام آئے گا، نہ اس کی سفارش سنی جائے گی، نہ بدلہ (روپیہ وغیرہ بطورِ فدیے کے) منظور ہوگا اور نہ مدد ملے گی۔''

اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ وہاں اللہ کے نافرمانوں کو کوئی سہارا نہیں دے سکے گا، لیکن امتِ محمدیہ کے کچھ لوگ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ ہماری شفاعت ہوگی۔ نبی مکرم ﷺ اللہ کی اجازت سے یقیناً شفاعت فرمائیں گے اور اللہ ان کی شفاعت قبول فرمائے گا، لیکن یہ بھی احادیث میں آتا ہے کہ اِحْدَاث فِي الدِّين کے مرتکب اس سے محروم ہی رہیں گے، نیز بہت سے گناہ گاروں کو جہنم میں سزا دینے کے بعد آپ ﷺ کی شفاعت پر جہنم سے نکالا جائے گا، کیا جہنم کی یہ چند روزہ سزا قابلِ برداشت ہے کہ ہم شفاعت پر تکیہ کرکے معصیت کا ارتکاب کرتے رہیں؟ نہیں، ہرگز

[1] السلسلة الضعيفة للألباني، رقم الحديث (٢٥)

نہیں، کیونکہ ہمیں تو خیر الامت کے لقب سے نوازا گیا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس انعامِ الٰہی کو یہودیوں کی طرح اپنی بدعملیوں اور شرک و بدعات کا ارتکاب کرکے کھو دیں اور خیر الامت کے بجائے شر الامت بن جائیں۔ ھَدَانَا اللّٰہُ تَعَالٰی

حقیقت تو یہ ہے کہ مشرکوں کے پاس اپنے مشرکانہ اعمال کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک بھی ٹھوس اور پختہ دلیل نہیں، ان کی کیفیت تو وہی ہے جو سورۃ المومنون (آیت: ۱۱۷) میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے:

﴿ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ﴾

''اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو پکارے جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں۔''

شرک کی اساس کسی برہان ودلیل پر نہیں، جبکہ توحید کی بنیاد قطعی براہین اور واضح دلائل پر ہے، جیسا کہ سورت ابراہیم (آیت: ۱۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾

''کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔''

سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲) میں بھی فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

''خبردار! باوجود جاننے کے اللہ کے شریک مت مقرر کرو۔''

ظلم کی تمام اقسام میں سب سے سنگین قسم شرک ہے، چنانچہ سورت لقمان (آیت: ۱۳) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ ''بے شک شرک ظلمِ عظیم ہے۔''

جس کی موت شرک پر ہوئی اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی نہیں، جیسا کہ سورۃ النساء (آیت: ۴۸) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ وہ جس کو چاہتے ہیں معاف فرما دیتے ہیں۔''

مشرک پر جنت ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ مشرک پلید ہے اس کا مسجدِ حرام میں داخلہ جائز نہیں، جیسا کہ سورۃ التوبہ (آیت: ۲۸) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾

''اے ایمان والو! بے شک مشرک پلید ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجدِ حرام کے قریب نہ آئیں۔''

مشرک واضح طور پر سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور اس نے شرک کر کے بہت بڑا بہتان باندھا ہے، اور وہ توحید کی بلندی سے دور جا گرا، جیسا کہ سورۃ الحج (آیت: ۳۱) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾

''اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے (تو اس کی مثال ایسی ہے) جیسے وہ آسمان سے گر پڑا، پھر پرندے اس کو اچک لیں یا آندھی اس کو کہیں دور پھینک دے۔''

مشرک کا کوئی عمل قبول کیا جاتا ہے نہ اس کی عبادت ہی، جیسا کہ سورۃ الانعام میں اٹھارہ انبیا کے اسمائے گرامی ذکر کر کے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اگر یہ حضرات بھی شرک کا ارتکاب کر لیتے تو ان کے سارے اعمال برباد ہو جاتے:

﴿ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [الأنعام: ٨٨]

''اور اگر (فرضاً) یہ حضرات بھی شرک کرتے تو ان کے اعمال جو وہ کرتے تھے، یقیناً برباد ہو جاتے۔''

اسی طرح سورۃ الزمر (آیت: ۶۵) میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الزمر: ٦٥]

''اے میرے نبی! اگر تو نے بھی شرک کیا تو تیرے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور تو خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔''

تاہم پیغمبر شرک سے محفوظ ہوتے ہیں، اس کا مقصد صرف امتوں کو شرک کی خطرناکی اور ہلاکت خیزی سے آگاہ کرنا ہے۔

ریا کاری اور دکھلاوے:

اسی طرح میری پیاری بہنو (اور بھائیو!) آپ کے سامنے ایک چیز اور بھی ذکر کرنا ضروری ہے جو شرکیہ امور میں سے ہے۔ وہ ہے عبادت میں ریا کاری، جبکہ مسلمان کی ہر قسم کی عبادت خالص اللہ کی رضا کے لیے ہونی چاہیے، کیونکہ اخلاص کا یہ آئینہ تو اتنا زیادہ نازک ہے کہ غیر کا سایہ پڑتے ہی چور چور ہو جاتا ہے، چنانچہ ریا کاری اور دکھلاوے تک کو برداشت نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ اس عمل کو رسول اللہ ﷺ نے شرکِ اصغر سے تعبیر فرمایا ہے:

«اِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! وَمَا الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ؟ قَالَ: الرِّيَاءُ»[1]

”بلاشبہہ میں تمھارے سلسلے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف محسوس کرتا ہوں، وہ شرکِ اصغر ہے، لوگوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! شرکِ اصغر کیا ہے؟ فرمایا: وہ ریا ہے۔“

ایک حدیث قدسی میں ہے:

«أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَ شِرْكَهُ»[2]

”میں سب سے زیادہ شرک سے بے نیاز ہوں، لہٰذا جس نے بھی کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ غیر کو شریک کیا تو میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔“

یہاں تک کہ ریا کاری کا بڑا بھیانک انجام بتایا گیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”روزِ قیامت سب سے پہلے جن کا فیصلہ کیا جائے گا، ان میں سے ایک شہید ہوگا۔

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٤٢٩) علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث (٩٥١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٥)

اسے لایا جائے گا، اللہ اسے اپنی نعمت کی معرفت کرائے گا، چنانچہ وہ اسے پہچان لے گا، اللہ کہے گا کہ تونے اس نعمت کا کیا کیا؟ وہ کہے گا: (اللہ!) میں نے تیرے لیے قتال (جہاد) کیا، یہاں تک کہ میں شہید کردیا گیا۔ اللہ کہے گا: تونے جھوٹ کہا، بلکہ تونے قتال تو اس لیے کیا تاکہ تجھے بہادر (غازی) کہا جائے، چنانچہ تجھے بہادر کہا جاچکا، پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور ایک ایسا آدمی بھی پیش کیا جائے گا جس نے علمِ دین سیکھا ہوگا، اس کی تعلیم دی ہوگی اور قرآن پڑھا ہوگا، اسے لایا جائے گا، اللہ اسے اپنی نعمت کی معرفت کرائے گا، چنانچہ وہ اسے پہچان لے گا، اللہ کہے گا کہ تونے اس علم پر کتنا عمل کیا؟ وہ کہے گا: (اللہ!) میں نے علم حاصل کیا اور اس کی تعلیم دی اور تیری رضا کے لیے قرآن پڑھا، اللہ کہے گا: تونے جھوٹ کہا، بلکہ تونے تو اس لیے علم حاصل کیا تاکہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لیے پڑھا تاکہ کہا جائے: فلاں قاری ہے، چنانچہ کہا جاچکا، پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور ایسا شخص بھی پیش کیا جائے گا، جسے اللہ نے (ہر چیز میں) کشادگی دی ہوگی اور اسے ہر طرح کے مال سے نوازا ہوگا، اسے لایا جائے گا، اللہ اسے اپنی نعمت کی معرفت کرائے گا، چنانچہ وہ اسے پہچان لے گا، اللہ کہے گا کہ تونے اس مال کا کیا کیا؟ وہ کہے گا: (اللہ!) میں نے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جس میں خرچ کرنا تجھے پسند تھا، مگر میں نے اس راستے میں تیرے لیے ضرور خرچ کیا۔ اللہ کہے گا: تونے جھوٹ کہا، بلکہ تونے تو اس لیے ایسا کیا تاکہ کہا جائے فلاں سخی ہے، چنانچہ (تجھے سخی) کہا جاچکا، پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔"[1]

معلوم ہوا کہ اخلاص ہر عمل کے لیے نہایت ضروری ہے، چنانچہ جو عبادت بھی اخلاص سے خالی ہوگی وہ صحیح نہ ہوگی، ایسے ہی اعمال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٣]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٠٥)

''اور ہم نے بڑھ کر ان کے تمام اعمال کو برباد کر دیا، (کیونکہ ان کے اعمال اخلاص اور متابعت سے خالی ہوں گے)۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''یہ معاملہ روزِ قیامت پیش آئے گا، جبکہ اللہ رب العزت بندوں کے خیر و شر کا امتحان لے گا، چنانچہ اللہ مشرکوں کو باخبر کر رہا ہے کہ وہ جن اعمال کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھ رہے ہیں آخرت میں انھیں حاصل نہ کر سکیں گے، کیونکہ ان میں اعمال کی قبولیت و صحت کے شرائط، اخلاص یا شریعتِ الٰہیہ کی متابعت مفقود ہوں گے، چنانچہ ہر وہ عمل جو اخلاص اور شرعی موافقت سے خالی ہوگا، باطل ہوگا۔''[1]

اللہ رب العزت ہم سب کو اس سے محفوظ فرمائے، کیونکہ آج یہ فتنہ مسلمانوں کے اندر عام ہو چکا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس ریا کاری کے فتنے کو فتنۂ دجال سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیا ہے۔ لیکن بڑے ہی افسوس کی بات ہے کہ بڑے بڑے دین دار لوگ اس ریا کاری کے فتنے میں مبتلا ہیں، بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو اس فتنے سے محفوظ ہیں۔ اب ریا کاری کی کچھ نشان دہی بھی آپ کے سامنے کر دیں تاکہ اس فتنے سے آپ محفوظ رہیں۔

مثلاً کچھ لوگ ایسے ہیں جب وہ کوئی نیک عمل کر لیں تو ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے اس عمل کی خبر لوگوں کو ہو جائے، ہمیں شہرت حاصل ہو اور لوگ ہماری تعریف کریں کہ یہ کتنا عبادت گزار ہے، اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جب لوگوں کی موجودگی میں قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو اپنی آواز کو بڑا خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگ کہیں کہ کیا خوب آواز ہے!

اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب وہ قرآن و حدیث کا درس دیتے ہیں تو اپنے الفاظ کو بڑا بنا کر سنوار ادا کرتے ہیں تاکہ سننے والے یہ کہیں کہ واہ! کیا خوب اندازِ بیاں ہے!

اسی طرح کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو بازاروں، مجلسوں اور پارٹیوں میں اپنے ہاتھوں میں تسبیحاں لیے ہوتے ہیں، یہ بھی ریا کاری کے نمونوں میں سے ہے، اس لیے ان کاموں سے اجتناب کریں۔

مختصر بات یہ ہے کہ ریاکاری کے لیے کیا ہوا کوئی بھی عمل جب اس سے اللہ تعالیٰ کی

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٦/ ١١١)

خوشنودی مقصود نہ ہو بلکہ لوگوں میں شہرت مقصود ہو تو وہ عمل اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ریا کاری کے فتنہ کو شرکِ خفی قرار دیا ہے، اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کرے اور اللہ رب العزت سے دعا کیا کریں کہ وہ ہمیں ریاکاری کے عمل بلکہ ہر قسم کے شرک سے محفوظ فرمائیں اور ہمیں حق بات کہنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جو اللہ کی ملاقات کا منتظر ہو اسے چاہیے کہ اللہ کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرے کیونکہ وہ مالک و معبود خالص عبادت ہی قبول کرتا ہے، ملاوٹ والی عبادت اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں۔ ساری نعمتیں اسی کی طرف سے آتی ہیں حتی کہ توفیق کی نعمت بھی وہی عطا کرتا ہے اور پھر فضل واحسان کے ساتھ نیک عمل کو قبول بھی وہی فرماتا ہے۔

اے ہمارے رب! ہمیں ہر قسم کے شرک و بدعات سے محفوظ فرما اور ہمارے ملک کو شرک کا سبب بننے والے مزارات سے پاک صاف کر کے اپنی توحید اور کتاب وسنت کی نشر و اشاعت کا گہوارا بنا دے۔

اے میرے خالق و مالک! ہمیں ایمان کی راہ، صراطِ مستقیم پر گامزن رکھیے۔ آمین

﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الصافات: ۱۸۰ تا ۱۸۲]

”(اے پیغمبر!) تیرا مالک جو عزت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بناتے ہیں اور سلام ہے پیغمبروں پر، اور ساری تعریف اسی اللہ کی ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔“

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ

مراجعِ درس

① تفسیر ابن کثیر
② تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف۔
③ حقیقتِ توحید۔ تالیف: شیخ صالح الفوزان۔ ترجمہ: ڈاکٹر فضل الٰہی و ڈاکٹر سمیر عبدالحمید۔

4 صحیح اسلامی عقیدہ۔ تالیف: علامہ حافظ بن احمد الحکمی ۔ترجمہ: مشتاق احمد کریمی

5 مزاروں اور درباروں کی شرعی حیثیت۔ تالیف: حافظ مقصود احمد

6 میں قبر پرست تھا۔ تالیف: عبد المنعم الجداوی۔ترجمہ: کفایت اللہ سلفی

7 عبادت۔ تالیف: مولانا تمیم مدنی

8 شاہراہِ بہشت پر۔ تالیف: مولانا امیر حمزہ

عبادت کی قسمیں

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿ يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾

''مسلمانو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور ہر شخص کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا (سامان) آگے بھیجا ہے اور خدا کا خوف رکھو، بے شک اللہ تعالیٰ کو تمھارے (سب) کاموں کی خبر ہے۔''

عبادت کی اقسام:

صرف نماز، روزہ اور حج و زکات پر ہی بس نہیں اور نہ بات فقرا و مساکین کی اشک شوئی اور بیمار کی مزاج پرسی پر آ کر ختم ہو جاتی ہے، بلکہ عبادت کے آفاق اتنے وسیع اور اس کا دائرہ اتنا کھلا ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص نیک نیتی اور رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر راستے میں پڑی کسی تکلیف دہ چیز یا رکاوٹ کو ہٹا دے تو یہ بھی باعثِ اجر وثواب ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''ایک آدمی کا گزر راستے میں پڑی [کانٹے دار] شاخ کے پاس سے ہوا تو اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس ٹہنی کو ضرور مسلمانوں کے راستے سے ہٹاؤں گا تاکہ انہیں اس سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس بنا پر وہ شخص جنت میں داخل کر دیا گیا۔''[1]

اسی طرح صحیح مسلم میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''میرے سامنے میری امت اور اس کے اچھے برے تمام اعمال پیش کیے گئے تو میں نے ان کے اعمالِ حسنہ میں راستے میں پڑی تکلیف دہ چیز کو ہٹانا بھی دیکھا اور ان کے

[1] مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۹۵)

برے اعمال میں یہ بھی دیکھا کہ کوئی شخص مسجد میں [بلغمی] تھوک پھینک دے اور اسے دفن [یا صاف] نہ کرے۔''[1]

آپ اندازہ کریں کہ اتنے چھوٹے کام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو دکھا دیا۔ جس کی ہم پروا ہی نہیں کرتے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ہر وہ کام کریں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو۔

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد کی ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''انسان کے جسم کے ہر جوڑ کے بدلے اس پر روزانہ صدقہ لازم ہے، جبکہ دو آدمیوں کے مابین عدل و انصاف کرے تو یہ بھی صدقہ ہے۔ کسی کو اس کی سواری پر بٹھانے میں یا اس کا سامان اس پر رکھوانے میں مدد دینا بھی صدقہ ہے۔ اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے۔ نماز ادا کرنے کے لیے جاتے وقت جتنے قدم اٹھائے گا، یہ ہر قدم صدقہ ہے، کسی کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔''

پھر آخر میں فرمایا:

''تمھارا راستے میں پڑی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔''[2]

اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث الادب المفرد امام بخاری، سنن ابی داود اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں نبی کریم ﷺ بیان فرماتے ہیں:

''انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر جوڑ کے عوض روزانہ صدقہ کرے۔''

مسند احمد میں ہے:

''صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اتنی طاقت کس میں ہے؟'' گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھا کہ شاید مالی صدقہ مراد ہے، جس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اگر مسجد میں کسی نے تھوک دیا تو اسے دفن [یا صاف] کرنا بھی صدقہ ہے، راستے میں پڑی چیز کو ہٹا دو [تو یہ بھی] صدقہ ہے۔ اگر یہ سب کرنے کی طاقت نہ ہو تو نمازِ چاشت

---

[1] صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٠٠٣)

[2] صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٢٨)

کی دو رکعتیں بھی تمھارے لیے کفایت کر جائیں گی۔‘‘[1]

صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد کی ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے کسی حاجت مند کی ضرورت کو پورا کرنے، خیر و بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے خود اپنے آپ کو روک کر رکھنے کو بھی صدقہ قرار دیا ہے۔[2]

جبکہ سنن نسائی، صحیح ابن حبان اور مسند احمد کی ایک قدرے طویل حدیث میں کثرت سے کئی افعال کو نبی مکرم ﷺ نے صدقہ قرار دیا ہے، جن میں سے ’’اللّٰہ أکبر، سبحان اللّٰہ، الحمد للّٰہ، لا إلٰہ إلّا اللّٰہ اور أستغفر اللّٰہ‘‘ کہنا، نیکی کا حکم کرنا، برائی سے روکنا اور ’’لوگوں کے راستے سے کانٹے، ہڈی اور پتھر ہٹانا۔‘‘ بھی شامل ہے۔ نیز اندھے کو سیدھا راستہ دکھانا، گونگے بہرے کو توجہ سے آواز بلند بتانا، یہاں تک کہ وہ بات کو سمجھ جائے، کسی کو اس کی مطلوبہ جگہ کا پتا بتانا یہاں تک کہ وہ اپنی مطلوبہ جگہ کو سمجھ جائے، کسی فریاد کرنے والے کے ساتھ تعاون کرنا اور ضعیف و کمزور کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ اسی حدیث میں ہے:

’’تمھارا اپنی بیوی سے جماع [ہمبستری] کرنا بھی تمھارے لیے اجر و ثواب کا ذریعہ ہے۔‘‘[3]

صحیح بخاری، سنن ترمذی اور صحیح ابن حبان کی ایک حدیث کے آخر میں: ’’اپنے ڈول سے پانی نکال کر اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینے‘‘ کو بھی نبی اکرم ﷺ نے صدقہ قرار دیا ہے۔ نیز فرمایا کہ ’’تمھارا اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی صدقہ ہے۔‘‘[4]

غرض اسلام ان اعمالِ حسنہ کی صرف تعریف ہی نہیں کرتا بلکہ وہ ان کی طرف دعوت دیتا ہے، ان پر آمادہ کرتا ہے، ان کا حکم دیتا ہے اور انھیں مسلمان کے شب و روز کے اُن واجبات میں سے قرار دیتا ہے جو اسے جنت کے قریب اور جہنم سے دور کردیں، تاہم وہ کبھی تو انھیں صدقے کا نام دیتا ہے، کبھی درود و نماز سے تعبیر کرتا ہے جو بہر حال عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہی یہ سماجی و معاشرتی خدمات بھی ہیں۔

---

[1] صحيح الترغيب، رقم الحديث (٦٦٤) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (١٣١٥)

[2] صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٠٣٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٧٣)

[3] صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٠٣٨) الصحيحة، رقم الحديث (٥٧٥)

[4] صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٩٠٨)

اسلام نے ان عبادات و خدمات کو کسی زمان و مکان یا وقت و جگہ کے ساتھ پابند نہیں کیا، نہ یہ اعمال صرف مالی ہیں کہ صرف مالدار لوگ ہی سرانجام دے سکیں اور غریب محروم ہو جائیں اور نہ یہ اعمال ایسے قوت طلب ہیں کہ صرف قوی و طاقتور ہی ثواب کمائیں اور کمزور دیکھتے رہ جائیں اور نہ کوئی ایسے کام ہیں جنھیں صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ (Well Cultured) لوگ ہی کر پائیں اور کم پڑھے لکھے اور ان پڑھ حرماں نصیب رہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ وہ اعمالِ صالحہ اور وہ کارہائے خیر ہیں جنھیں ہر امیر و فقیر، ہر طاقتور و کمزور اور ہر عالم و عامی ہر جگہ اور ہر وقت سرانجام دے کر اجر و ثواب کما سکتا ہے۔

اس طرح مسلمان اپنے معاشرے میں خیر و بھلائی اور شفقت و رحمت کا سرچشمہ بنا رہتا ہے، اس سے دوسروں کو نفع پہنچانے کا فیضان جاری رہتا ہے، وہ نیک کام کرتا ہے اور دوسروں کو بھی نیک کام کرنے کی دعوت دیتا اور ترغیب دلاتا ہے۔ وہ خود معروف کو سرانجام دیتا ہے اور دوسروں کی اس طرف راہنمائی کرتا ہے، وہ ہر خیر کا دروازہ کھولنے والی چابی بنتا ہے اور شر کے دروازے بند کرتا ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

”لوگوں میں سے بعض خیر و بھلائی کی چابیاں ہوتے ہیں اور شر و برائی کے دروازے بند کرنے والے ہوتے ہیں، جبکہ اس کے برعکس لوگوں میں سے بعض شر و برائی کی چابیاں ہوتے ہیں اور خیر و بھلائی کے راستے بند کرنے والے ہوتے ہیں۔ خوشخبری ہے ان لوگوں کے لیے جن کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ خیر و بھلائی کی چابیاں رکھ دے اور ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جن کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ شر و برائی کی چابیاں تھما دے۔“[1]

مسلمان خیر و بھلائی اور نیکی و احسان کے جن آفاق میں زندگی بسر کرتا ہے، ان کا دائرہ صرف انسان کی ذات تک ہی محدود نہیں، بلکہ اُس میں اس کائنات کی ہر چیز: کیڑے مکوڑے، پرندے اور حیوانات سبھی شامل ہیں۔ آپ کسی بھی چیز کے ساتھ نیکی و احسان اور شفقت کا سلوک کریں، نبی اکرم ﷺ کے ارشادات کی رو سے اس پر اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں مروی ہے کہ ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٧) شعب الإيمان (١/ ٣٧٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢٢٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٣٢)

کہنے لگا کہ میں کنویں سے پانی نکال کر حوض میں ڈالتا ہوں، تاکہ اپنے اونٹوں کو پلاؤں، اتنے میں کسی کا اونٹ ادھر آجاتا ہے اور میں اسے بھی پانی پلا دیتا ہوں: ((فَهَلْ فِيْ ذٰلِكَ مِنْ أَجْرٍ؟)) ''کیا اس میں بھی اجر وثواب ہے؟''

اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''ہر جاندار [کی خدمت وشفقت] میں اجر وثواب ہے۔''[1]

اسی طرح صحیح بخاری ومسلم میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''ایک آدمی سفر کر رہا تھا کہ اسے سخت پیاس لگی تو وہ ایک کنویں پر پہنچا، پھر اس میں اترا اور پانی پیا۔ جب پانی پی کر کنویں سے باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور پیاس کی شدّت کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔اس آدمی نے سوچا کہ اس کتے کو بھی اسی طرح شدید پیاس لگی ہوئی ہے جیسا کہ مجھے پیاس کی شدت نے ستا رکھا تھا۔ وہ کنویں میں اترا، اپنے موزے میں پانی بھرا اور باہر آ کر کتے کو پلایا۔''

یہ ایک رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں میں رکھی ہوئی ہے جسے ہم رحم وشفقت اور پیار کے نام سے پکارتے ہیں۔ بس یہی رحم اس کے دل میں آ گیا تو اس نے یہ نہیں سوچا کہ یہ جانور تو حلال نہیں، میں اس کو پانی کیوں پلاؤں؟ نہیں، اس کے دل میں پیار اور رحم آ گیا اور اس کو پانی پلا دیا اور اس کی پیاس کی شدّت کو کم کیا جس کی وجہ سے وہ پریشان تھا، تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهٗ، فَغَفَرَ لَهٗ))

''اللہ نے اس کے اس عمل کو اتنا پسند فرمایا کہ اسے بخش دیا۔''

جبکہ صحیح بخاری وابن حبان میں ہے:

((فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهٗ، فَاَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ))

''اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کے بدلے اسے جنت میں داخل کر دیا۔''

اس آدمی نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم کیا، عرش والے کو اس پر رحم آ گیا اور بدلے میں کیا ملا؟ جنت کا داخلہ۔ اللہ اکبر!

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٣، ٢٣٦٣)

یہ واقعہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے از راہِ تعجب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسا کیا کہ ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا جانور کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں بھی ہمیں اجر ملتا ہے؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((فِيْ كُلِّ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ))

''ہر جاندار [کی خدمت و شفقت] میں اجر و ثواب ہے۔''

صرف اسی پر بس نہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے اندازہ ہوتا ہے کہ چیونٹی، پرندہ، بھیڑ بکری، گائے، اونٹ؛ ہر جانور کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا ضروری ہے اور مسلمان تو مسلمان کافر بھی اگر متحارب نہ ہو بلکہ ذمی ہو تو اس کے بھی حقوق ہیں اور دورانِ جنگ بھی کافروں کے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، ان میں سے ہر ہر بات کا ثبوت کتبِ حدیث میں موجود ہے جن کی تفصیل ذکر کرنے سے بات طویل ہو جائے گی۔[1]

آپ صرف اسی بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حلال جانور تو حلال ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہر جانور بلکہ ہر جاندار کے ساتھ حسنِ سلوک کو اجر و ثواب کا باعث قرار دیا ہے حتیٰ کہ کتے کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا اور جنت میں داخل فرما دیا۔ اس کے برعکس دوسرا پہلو بھی بیان فرما دیا کہ بلاوجہ کسی جاندار کو مارنے، پیٹنے، ستانے اور بھوکا پیاسا مار دینے پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے، حتیٰ کہ ایک عورت کو صرف بلی کو بھوکا پیاسا مار دینے پر اللہ تعالیٰ نے جہنم میں جھونک دیا۔ صحیح بخاری میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''ایک عورت کو بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا جس نے اسے بھوکا پیاسا باندھے رکھا، یہاں تک کہ وہ مر گئی، اسی کے نتیجے میں وہ عورت جہنم میں چلی گئی، نہ اس نے اسے کچھ کھلایا نہ پلایا بلکہ باندھے رکھا اور نہ اسے کھولا کہ وہ اللہ کی زمین ہی سے کچھ کھا پی سکے۔''[2]

جبکہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بلی کو دیکھا کہ جہنم میں اُس عورت کو اپنے ناخنوں سے نوچ رہی ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو یہ بات بتائی گئی۔ کہ یہ وہ عورت ہے جو اس کو باندھے رکھتی تھی۔[3]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: سوئے حرم (ص: ٦١٦ تا ٦٢١ طبع دوم) حقوقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (ص: ٣٤ تا ٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٦٥، ٣٤٨٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٦٤)

اللہ اکبر! جانوروں کی وجہ سے ایک کو جنت میں داخل کر دیا گیا اور دوسری طرف ایک کو جہنم میں جھونک دیا گیا۔ آپ اندازہ کریں کہ جاندار حقداروں کے کتنے حقوق ہیں جس کا ہم خیال ہی نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. اسکرپٹ ریڈیو پروگرام۔ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
2. سوئے حرم۔ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
3. حقوق مصطفیٰ ﷺ۔ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

عبادت میں شرک

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل (آیت: ۳۶) میں فرمایا ہے:

﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾

''اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں (کی پرستش) سے اجتناب کرو اور اُن میں بعض ایسے ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی اور بعض ایسے ہیں جن پر گمراہی ثابت ہوئی، سو زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں (جس نے بھی انکار کیا) کا انجام کیسا ہوا؟''

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو ایک مقصد کے تحت پیدا فرمایا ہے۔ اگر آپ نظامِ کائنات میں غور و تدبر سے کام لیں تو آپ کو ہر چیز کے وجود میں ایک خاص مقصد پوشیدہ نظر آئے گا، ان میں سے چند ایک کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کئی دفعہ ان باتوں کا ذکر کیا ہے کہ اے لوگو! ہم نے سورج اور چاند کو پیدا کیا، اس لیے کہ انسان ان سے دنوں اور مہینوں کا اندازہ لگا سکیں اور پھر آسمان سے بارش نازل کی، اس مردہ زمین کو زندہ کیا، تاکہ زمین سے اناج اور سبزی اُگائے۔ اس لیے کہ انسان اور جانور اپنی بھوک مٹا سکیں، پانی کو پیاس بجھانے کے لیے اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں سے کچھ ہمارے کھانے کے کام آتے ہیں اور کچھ سواری کے اور بار برداری کے لیے، یہ ساری چیزیں کھیل تماشہ نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتابِ حکیم میں سورۃ الدخان (آیت: ۳۸) میں فرمایا ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ﴾

''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے ان کو کھیلتے ہوئے نہیں بنایا۔''

بلکہ ایک خاص مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق فرمائی اور پھر ایک خاص مقصد کے لیے اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اکثر مخلوقات پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو فضیلت بھی عطا فرمائی ہے۔ اس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں سورۃ الاسراء (آیت: ۷۰) میں ذکر فرمایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾

''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔''

اتنے سارے انعامات اور اعزازات اولادِ آدم کو دیے گئے۔ ان بلندیوں کا آپ خود مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ آج انسان نے اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے علم سے کتنی چیزیں ایجاد کیں اور کرتا ہی چلا آ رہا ہے۔

اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انھیں استعمال کرتا ہے۔ ان تمام احسانات میں سے سب سے بڑا احسان اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ زمین و آسمان اور ساری مخلوقات کی پیدایش تو اس کے ''كُنْ فَيَكُوْنُ'' سے ہوئی، لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا اور پھر اعزاز و تکریم کی بلندیوں کی انتہا فرما دی کہ ملائکہ جو اللہ تعالیٰ کی مقرب اور فرمانبردار مخلوق ہے اور ابلیس جو اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوتے ہوئے بھی نافرمان ہو گیا، ان تمام کو حضرت آدم علیہ السلام کے لیے سجدے کا حکم دیا۔ اللہ اکبر! اللہ نے اتنا مقام عطا فرمایا حضرت آدم علیہ السلام کو، مگر ابلیس نے انکار کر دیا اور وہ نافرمانوں میں سے ہوگیا۔ سورت ص (آیت: ۷۵) میں اللہ تعالیٰ نے اس کا یوں ذکر کیا ہے:

﴿ قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ﴾

''(اللہ نے) فرمایا کہ اے ابلیس! جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا ہے؟ کیا تم غرور میں آگئے یا تم اونچے

درجے والوں میں سے تھا؟''

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے کتنا بلند مقام عطا کیا، یہ مقام ومرتبہ کسی اور مخلوق کو حاصل نہ ہوسکا۔

اب سوال یہ ہے کہ اتنے انعامات عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے اس کے عوض میں کیا طلب کیا؟ غور کرنے کی بات ہے کہ ضرور کوئی مقصد پوشیدہ ہے، کوئی خاص بات ہوگی یا کوئی بہت بڑا مطالبہ ہوگا، لیکن ایسا کچھ نہیں، اللہ نے ہمیں اتنا کچھ عطا کیا اور اس کے بدلے صرف ایک ہی بات کہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الذاریات (آیت: ٦٥) میں یوں بیان کیا ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔''

جب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ انسانوں اور جنات کو پیدا کرنے کا مقصد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبادت کیسے کی جائے؟ نیز کون کون سے کام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عبادت قرار دے کر خاص اپنی ذات کے لیے کرنے کا حکم دیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے کسی بات کو تشنہ نہیں چھوڑا، ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے انبیا اور رسول بھیجے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بجا آوری کے لیے بنی نوعِ انسان کی راہنمائی کریں۔

اللہ تعالیٰ نے تو اپنے عرش پر مستوی ہوتے ہوئے اپنے بندوں کی راہنمائی کے لیے وحی کے ذریعے احکامات نازل فرما دیے، تاکہ اس کے بندے اس کی مرضی کے مطابق اس کی عبادت و بندگی کریں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں ایک خوشخبری دینے اور ڈرانے والا بھیجا، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کے آداب سکھائیں اور اس کی فرمانبرداری کرنے کے سبب سے جو انعامات (جنت) دیے جائیں گے ان کی خوشخبری دیں اور اس کی نافرمانی کرنے کے جرم میں جو سزائیں دی جائیں گی، ان سے ڈرائیں۔

انھیں رسولوں میں سے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے باعثِ ہدایت بنا دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے واقعات قرآن میں موجود ہیں، جبکہ ہمارے نبی سارے انبیا اور رسولوں کے امام ہیں،

اولادِ آدم میں سب سے افضل ہیں، ان کو آخری امت کے لیے راہنما اور ہادی بنا کر مبعوث کیا اور تمام آسمانی کتابوں میں سے قیامت تک باقی رہنے والی کتاب قرآنِ کریم کو نازل فرمایا جو ساری انسانیت اور بالخصوص پرہیز گاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفصل اور اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے ٹھیک طور پر راہنمائی کرنے والی کتابِ کریم ہے۔ آگے سورۃ النحل (آیت: ۸۹) میں فرمایا:

﴿ وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴾

''اور (اس دن کو یاد کرو) جس دن ہم ہر اُمت میں سے خود اُن پر گواہ کھڑے کریں گے اور (اے پیغمبر!) تمھیں ان لوگوں پر گواہ لائیں گے اور ہم نے تم پر (ایسی) کتاب نازل کی ہے کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔''

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ مجید مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔ یہی نہیں کہ قرآن ہدایت اور رحمت اور شفا ہے، بلکہ فرمایا: یہ حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب ہے۔ یہ ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ یہ کلامِ الٰہی ہے۔ اگر یہ کسی اور کا کلام ہوتا تو ضرور اس میں خامیاں اور غلطیاں پائی جاتیں، لیکن قرآنِ کریم ان تمام عیوب سے پاک اور صاف ہے اور یہ قیامت تک ہر قسم کے عیب سے پاک ہی رہے گا۔

اس نے اپنی کتابِ مبین میں حق اور باطل کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اللہ کے معبودِ بر حق ہونے کی نشانیاں بھی واضح ہیں اور اسلام کے پانچ رکن نبی کریم ﷺ نے ہمیں ارشاد فرمائے ہیں۔ جن میں سب سے پہلا رکن اسلام قبول کرنا، یعنی کلمہ طیبہ پڑھنا ہے اور اس کلمہ کا پہلا حصہ ہے: ''لا إلٰه إلا اللّٰه''، یعنی ''اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں'' اور ہر قسم کی عبادت اس کی ذات کے لیے ہے، دوسرا حصہ ہے: ''محمد رسول اللّٰه''، ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

دوسرا رکن نماز پڑھنا اور پھر تیسرا رکن رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور چوتھا رکن زکات جبکہ پانچواں اور آخری رکن بیت اللہ کا حج کرنا ہے۔ ان پانچوں کو پورا کرنے کے لیے عقیدے کا

ٹھیک ہونا ضروری ہے۔ ان میں پہلا رکن ''لا إلٰه إلا الله'' کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر سچے اور صدقِ دل سے ایمان لائیں کہ وہ ہی ہر چیز کا خالق و مالک ہے، یہی نہیں بلکہ غالب اور علیم ہونے کا بھی اقرار کرنا ہے اور ہماری ہر قسم کی عبادت نماز، روزہ، حج، عمرہ اور زکات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہو۔ اس میں قربانی اور ہر قسم کا صدقہ اور خیرات بھی شامل ہے، جن میں سے کچھ فرض ہیں اور کچھ نوافل اور ان کے لیے رزق کا حلال ہونا ضروری ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ان تمام پاکیزہ چیزوں کے کھانے کا حکم دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی تاکید ہے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی حلال کردہ چیزیں ہی پاک اور طاہر ہیں، حرام کردہ اشیا پاک نہیں ہوسکتیں۔ چاہے وہ نفس کو کتنی ہی مرغوب ہوں، جیسے اہلِ یورپ کو سور کا گوشت بہت مرغوب ہے۔ یعنی کوئی چیز اچھی لگنے سے حلال نہیں ہوجاتی۔

جیسا کہ سورۃ النحل (آیت: ۱۱۴) میں فرمایا ہے:

﴿ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾

''پس اللہ نے جو تم کو حلال وطیب رزق دیا ہے اُسے کھاؤ اور اللہ کی نعمتوں کا شکر کرو اگر اُسی کی عبادت کرتے ہو۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ حلال وطیب چیزوں سے تجاوز کر کے حرام وخبیث چیزوں کا استعمال کرنا اور اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرنا، یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ہے۔

سورۃ المائدہ (آیت: ۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾

''حرام ہے تم پر مردار (جو اپنی موت سے مر جائے) اور بہتا ہوا خون اور سور کا گوشت اور جس جانور پر اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کا نام پکارا جائے۔''

قرآن کریم کی اس آیت سے یہ واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ چار محرمات سے مسلمانوں کو

نہایت تاکید کے ساتھ بچانا چاہتا ہے اور وہ چار چیزیں یہ ہیں:

① مردار۔ ② بہتا ہوا خون۔ ③ سور کا گوشت۔ ④ اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا جائے۔ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر حرام کردی ہیں۔

اس کی مختلف صورتیں ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ غیر اللہ کے تقرّب اور اس کی خوشنودی کے لیے جانور ذبح کیا گیا اور ذبح کرتے وقت نام بھی اسی بزرگ کا لیا جائے جس کو راضی کرنا مقصود ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نیت وہ ہی ہے لیکن ذبح کرتے وقت اللہ کے نام پر ہی ذبح کیا جاتا ہے جس طرح قبر پرستوں میں یہ سلسلہ عام ہے۔ وہ جانوروں کو بزرگوں کے لیے نامزد کردیتے ہیں اور اس کو وہ بسم اللہ پڑھ کر ہی ذبح کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو حرام نہیں بلکہ جائز ہے کیونکہ یہ غیر اللہ کے نام نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس پر تو اللہ کا نام پڑھا گیا ہے، یوں شرک کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ اللہ کے کلام قرآن کریم میں کئی مقامات پر آیا ہے:

﴿وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ یعنی ''وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔'' وہ حرام ہے، اگرچہ ذبح کے وقت اس پر اللہ ہی کا نام لیا جائے، کیونکہ اس کی نیت کچھ اور ہے۔ اس طرح نیکی کا کوئی بھی کام کیا جائے جس میں صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا مقصود ہو تو وہ صدقہ ہو یا نذر و نیاز ہر قسم کا عمل صرف اور صرف رضائے الٰہی کے لیے ہی ہو، کسی اور کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو، تو ان شاء اللہ اس کا اجر و ثواب ہوگا ورنہ نہیں، کیونکہ یہ سارے کام تو مکے کے مشرکین بھی کیا کرتے تھے، لیکن ان کے عمل قبول نہ ہوئے، کیوں؟

وہ لوگ نماز بھی پڑھتے تھے اور روزہ بھی رکھا کرتے تھے، حج بھی کرتے اور بیت اللہ کا طواف بھی کرتے تھے، لیکن وہ پھر بھی کافر اور مشرکین کیوں ہیں؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کام تو وہ سب مسلمانوں والے کرتے تھے، پھر اُن کی نماز، روزہ، حج، طواف کیوں قبول نہیں ہوئے؟ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو بھی حصہ دار بناتے تھے، جس کو وہ دین کا کام سمجھ کر اپنی مرضی سے کرتے تھے، مگر دین کے کام اپنی مرضی سے نہیں ہوتے، عمل وہ ہی قبول ہوگا جو نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو اور جس پر نبی اکرم ﷺ کی مہر ہو، یعنی جس کے کرنے کا حکم نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا ہے، ورنہ کوئی عبادت قابلِ قبول نہیں ہوگی۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

''جو شخص ایسا عمل کرے جس کے بارے میں ہمارا حکم نہ ہو تو وہ مردود ہے۔''[1]

مشرکینِ مکہ نماز بھی پڑھا کرتے تھے اور روزہ بھی رکھتے تھے، بلکہ دس محرم یا عاشورا کا روزہ بھی رکھتے تھے۔ کئی قومیں اور بھی ایسی ہیں جو آج بھی روزہ رکھتی ہیں اور اپنے اپنے طریقے سے عبادت بھی کرتی ہیں تو کیا یہ روزے اور ان کی عبادات اور ان کی نمازیں ان کو کوئی نفع دے سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں، کیونکہ جب تک یہ دینِ اسلام قبول نہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا نہ چھوڑ دیں گے اور نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل نہ کریں گے، تب تک کوئی عمل قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ کیونکہ عقیدہ سب سے اہم ہے، اسی لیے اسلام کے پانچ ارکان میں اہم رکن عقیدہ ہے۔ اگر عقیدہ صحیح ہے، اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہے اور نیت بھی نیک ہے، یعنی اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے ہو، تو پھر آپ کا کیا ہوا ہر عمل ان شاء اللہ قابلِ قبول ہوگا، ورنہ نہیں۔

سب سے پہلے ہم اپنے عقیدے کی اصلاح کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ مشرکینِ مکہ کی طرح آپ کی بھی عبادت قبول نہ ہو، یعنی عمرہ، حج، صدقہ وغیرہ، کیونکہ بنیاد صحیح ہے تو دیواریں کھڑی ہونگی ورنہ عمارت گر جائے گی۔ صدقہ وخیرات مشرکینِ مکہ بھی اللہ کے نام پر دیتے تھے، لیکن اپنے معبودانِ باطلہ کے نام پر بھی کچھ حصہ مقرر کرتے تھے اور آج کا مسلمان کیا کرتا ہے: یہ بکرا قربانی کے نام ہے اور یہ گیارہویں کا، یہ بکرہ عقیقے کا اور یہ پیروں کی نیاز کا۔ تو پھر ان میں اور آج کے مسلمانوں میں کیا فرق رہ گیا ہے؟ کیونکہ وہ بھی جب تقسیم کرتے تھے تو ایک حصہ اللہ کا اور ایک حصہ اپنے باطل معبودوں کے نام کرتے تھے، اگر اللہ کے حصے میں چیز زیادہ آجاتی تو اس سے نکال لیتے، اگر دوسری طرف چلی جاتی تو اسے رہنے دیتے۔ انہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٣٦] ''کتنا بُرا ہے ان کا یہ فیصلہ جو یہ کرتے ہیں۔''

آج کا مسلمان بھی نیاز، گیارھویں، فاتحہ ضرور کرے گا، چاہے اس کے لیے اُسے سود پر قرض ہی کیوں نے لینا پڑے۔ اگر انھیں کہیں کہ یہ غلط ہے۔ میرے بھائی اگر دینا ہے تو اللہ کے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧١٨)

نام پر دیں، تو کہتے ہیں کہ اگر پیر کے نام کی نیاز بر وقت پر نہ دی تو پیر کی مار پڑتی ہے اور کاروبار میں سے خیر و برکت ختم ہوجاتی ہے اور کہتے ہیں کہ پیر کو پیٹھ بھی نہیں کرنا چاہیے، یوں انھوں نے دینِ اسلام کا مذاق بنا دیا ہے، کیونکہ یہ سب کام وہ دین ہی کے نام پر تو کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ایسے پیر کے پاس کیوں جانا جو رشوت کے بغیر کسی کے کام نہیں آتے؟ دوسری بات یہ ہے کہ ان سے کوئی برکت نہیں ملتی، بلکہ پہلی بھی ختم ہوجاتی ہے، اس قسم کے پیروں کی وجہ سے گھروں میں برکتیں ختم ہوجاتی ہیں، ان کو چھوڑ دیں، ایک ہی پیر کی اتباع کریں جو پیروں کے پیر حضرت محمد ﷺ ہیں۔ ان کی اتباع میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہیں، لہٰذا وہ جو بات کہتے ہیں اس پر عمل کریں، ان شاء اللہ تعالیٰ کسی پیر کی مار نہیں پڑے گی، بلکہ ہر طرف ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی، برکت ختم ہی نہ ہوگی۔

ماں باپ کا بہت بڑا مقام ہے، کیونکہ جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ذکر آیا ہے وہاں ہی ماں باپ کی فرمانبرداری کا حکم آیا ہے۔ مگر کچھ لوگ زندگی میں کبھی ایک دن بھی مکمل والدین کی فرمانبرداری نہیں کرتے لیکن ان کے مرنے کے بعد ان کی قبروں کو پختہ ہی نہیں بلکہ سنگِ مرمر کی بناتے اور اس پر لوہے کی جالی لگاتے ہیں۔ پھر لاکھوں روپیہ لگا کر فاتحہ کرتے اور اس بات کا جھوٹا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے ماں باپ سے بہت پیار تھا اور دیکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ دیکھو اس نے اپنے ماں باپ کی برسی کتنی دھوم دھام سے کی ہے۔ نہیں میری بہنو اور بھائیو! بلکہ ان سے یہ پوچھیے کہ اس کا اُن کو کوئی فائدہ ہوا ہے، یعنی کوئی ثواب پہنچا ہے مرنے والے کو جس کے لیے اس نے اتنا خرچہ کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ نہ اس کو نہ اس کے والدین کو کوئی ثواب ملا ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

”انسان جب مرجاتا ہے تو اس کے سارے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں سوائے تین چیزوں کے، ان میں سے: ① نیک اولاد ہے جو اپنے ماں باپ کے لیے دعا مغفرت کرے (جو بہت کم لوگوں کے نصیب میں ہوتی ہے) ② صدقہ جاریہ۔ ③ کوئی علمی کام جس سے لوگوں کو (اس کے مرنے کے بعد بھی) فائدہ پہنچتا رہے۔“[1]

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۷۶)

مگر آج لوگ اس کے بدلے میں قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا دیتے ہیں جبکہ اس کا کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، نہ قبر کے اندر والے کو اور نہ چادر چڑہانے والے کو، بلکہ چادر کی ضرورت اس کے گھر والوں کو ہے۔

اب پانچواں اور اسلام کا آخری رکن جو بیت اللہ کا حج وعمرہ کرنا ہے، یہ مشرکینِ مکہ بھی کیا کرتے تھے، جب وہ لوگ خانہ کعبہ کا طواف کرتے تو وہ تلبیہ بھی پڑھا کرتے تھے،لیکن ان کا تلبیہ کچھ اس طرح ہے:

﴿لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ إِلَّا شَرِيْكاً هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ﴾

''اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے کہ اس کا اور اس کی ہر ملکیت کا بھی تو ہی مالک ہے۔''

یعنی جن کو ہم وسیلہ بناتے ہیں اپنے اور تیرے درمیان ان کا بھی تو ہی مالک ہے۔

کیا خیال ہے! اگر ہم ان کے اس تلبیے کی روشنی میں اپنے اعتقاد کا جائزہ لیں تو فرق کیا ہے؟ آج کا مسلمان بھی تو یہی کہتا ہے کہ یہ اولیاء اللہ دراصل اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں، یعنی اللہ کے قریب ہیں، اس نے ان اولیا کو فطرت سے بالاتر قوت عطا کی ہے۔ اسی لیے تو ہم کسی کو گنج بخش (خزانوں کا مالک) کسی کو داتا (دینے والا) اور کسی کو غوثِ اعظم کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان اولیاء اللہ سے مانگنا دراصل اللہ ہی سے مانگنا ہے تو پھر ہمارے اور مشرکین کے اعتقادات میں کیا فرق ہے؟ ہم کریں تو ہم مسلمان ہیں، وہ کرتے تھے تو وہ مشرک ... کیوں؟ یہاں انصاف کرنے کے لیے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

مشرکین اور مسلمانوں میں فرق کیا ہونا چاہیے؟ فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لیے ہو اور اس کا طریقہ بھی وہی ہو جو نبی اکرم ﷺ نے ہمیں بتایا ہے اور جس کام کو نبی کریم ﷺ نے کیا ہو، اگر وہ ہی طریقہ ہم نے اپنالیا تو ہم مسلمان ہیں اور ان شاء اللہ ہمارا ہر عمل قبول ہوگا اور اس میں ہمارے لیے خیر وبرکت ہے۔لیکن اگر ہم نے بھی وہ طریقہ اپنایا جس سے نبی اکرم ﷺ نے منع کیا ہے تو وہ کام کبھی ہمارے لیے خیر اور بھلائی کا نہیں ہوسکتا اور جس کام میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی ہو ہم اس کو دین سمجھ کر کریں گے تو ایسا کوئی

کام قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اگر قبول نہیں تو اجر وثواب کی امید بھی نہ رکھیں۔ بلکہ آپ کا شمار اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نافرمانوں میں سے ہوگا۔ سورۃ الکوثر (آیت:۲) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ ''تم اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو۔''

مشرکین بتوں کی عبادت کرتے اور انہی کے لیے جانور ذبح کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اے میرے نبی ﷺ! آپ ان کی مخالفت کرتے ہوئے ان کے طریقے سے انحراف کریں اور اللہ ہی کے لیے اخلاصِ نیت اپنا کرلیں۔

امام ابن ابی حاتم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عیدِ قربان کے دن دو مینڈھوں کی قربانی دی اور انھیں ذبح کرتے ہوئے یہ پڑھا:

﴿ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [الأنعام: ٧٩]

''میں نے سب سے یکسو ہوکر اپنے آپ کو اُسی ذات کی طرف متوجہ کیا (یعنی اپنا رُخ اس کی طرف کیا) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''[1]

اس میں ہر قسم کی عبادت آجاتی ہے۔ صدقہ وخیرات بھی، یعنی ہمارا ہر کام اللہ کے لیے ہو۔ یہی فرق ہونا چاہیے مشرکین اور مسلمانوں میں، کیونکہ صدقہ وخیرات مشرکینِ مکہ بھی بہت کیا کرتے تھے، ان میں سے ایک شخص جس کا نام عبداللہ بن جدعان تھا، حج کے مہینے میں وہ سینکڑوں اُونٹ ذبح کرکے حجاج کی ضیافت کیا کرتا تھا۔ اس کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسولِ اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اس کے اس عمل کا اس کو کیا صلہ ملے گا؟ تو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا: وہ جہنم ہی میں ہوگا اس لیے کہ وہ مشرک تھا۔

مشرکینِ مکہ اجتماعی طور پر حجاج کو کھلاتے پلاتے، منٰی اور مزدلفہ بھیجتے، مسجدِ حرام کی تعمیر بھی کرتے اور وہاں کی صفائی بھی کیا کرتے تھے، لیکن ان کے اس کام کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں یوں ذکر کیا ہے:

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٣٦) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٣٤)

﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [التوبة: ١٩]

"کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) کو آباد کرنا اس شخص کے اعمال جیسا خیال کیا ہے (یعنی اپنے آپ کو ان کے برابر سمجھتے ہو) جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے؟ یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو قبول نہیں کیا، کیوں؟ یہ لوگ اللہ کے گھر کے خادم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ظالم کہا ہے۔ کیوں؟

جو کسی چیز کو اصلی جگہ سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دے، اس کو ظالم کہا جاتا ہے۔ مشرکین کیا کرتے تھے؟ یہی نہ کہ جو عبادت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے، وہ اپنے بنائے ہوئے معبودانِ باطلہ کے لیے بھی کیا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کو ظالم کہا ہے اور شرک کو ظلمِ عظیم "سب سے بڑا گناہ" قرار دیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے خاندان والے بنو ہاشم یا ہاشمی کہلاتے ہیں تو کیا وہ سب کے سب جنت میں جائیں گے؟ ہرگز نہیں، کیونکہ وہاں بھی عمل کے حساب سے جنت ملے گی۔ اگر کام نیک کیے ہیں، اپنی زندگی کو نبی اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزار رہے ہیں اور آپ کے ہر کام میں رضائے الٰہی شامل ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ جس جنت کا اللہ نے مومنوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے، آپ اس کے وارث ہیں۔ اگر عمل میں مشرکوں کی مخالفت نہ کی، نیت میں اخلاص للہ نہیں ہے تو پھر کوئی عبادت قبول نہیں ہے، کیونکہ جو بھی شرک و کفر کی حالت میں مرا، وہ دائمی جہنمی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی سورۃ المائدہ (آیت: ۲۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾

’’(اے نبی!) ان کو آدم کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کے حالات جو (بالکل) سچے ہیں پڑھ کر سنا دو کہ جب ان دونوں نے (اللہ کی راہ میں) قربانی دی تو ایک کی قربانی تو قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی (تب قابیل نے ہابیل سے) کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اُس وقت اس (ہابیل) نے کہا کہ اللہ صرف پرہیز گاروں ہی کی (نیاز) قبول فرماتا ہے۔‘‘

ہابیل بہت پرہیز گار اور صبر والا تھا۔ اس کا اللہ پر ایمان اور توکل تھا، اسی تقوے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی قربانی کو قبول فرمالیا تھا۔

مشرکینِ مکہ مسجدِ حرام [خانہ کعبہ] کی تعمیر بھی کرتے تھے اور ہر قسم کی نیکی کا کام بھی کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی قوم کو جو دعوت دی، وہ کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ نے کس کام کا حکم دیا تھا آپ ﷺ کو؟ یہی نہ کہ اے میرے نبی ﷺ! ان کو کہہ دیں کہ ایک اللہ کو اپنا خالق و مالک مانو، اس کے سوا کوئی مدد کرنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کیا سچ کہا ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی پیروی کرو، کیونکہ وہ مشرکین میں سے نہیں تھے، بلکہ خالص ایک اللہ کی عبادت کرنے والے تھے۔ دراصل نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث ہی اس لیے کیا تھا کہ آپ ﷺ ملتِ ابراہیمی کی تجدید کریں اور جو گندگی [شرک و بدعات اور خرافات] کا انبار ان مشرکینِ مکہ نے دینِ ابراہیمی کے نام پر لگایا ہے، اس کو نکال پھینکیں اور جو اللہ کا گھر [کعبۃ اللہ] دونوں باپ اور بیٹے خلیل و ذبیح علیہما السلام نے مل کر بنایا ہے، اس کو آباد کریں اور اپنا دعوتِ دین کا کام یہیں سے شروع کریں۔ وہ دعوتِ حق کیا تھی؟ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، صرف ایک اللہ کو مانو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کرو، بتوں کی پوجا چھوڑ دو، خالص اللہ کو پکارو، اس کے سوا کوئی مدد کرنے والا نہیں۔

جب نبی کریم ﷺ نے اس بات کی دعوت دی تو ان لوگوں نے کہا کہ اے محمد ﷺ! یہ تو کون سا دین لے کر آیا ہے؟ تیرے باپ اور دادا نے تو ایسا دین نہیں مانا تھا اور جس دینِ ابراہیمی کی تم بات کر رہے ہو، اس پر تو ہم ہیں، ہم لوگ خانہ کعبہ کی تعمیر کرنے اور اس کی صفائی کرنے والے، حاجیوں کو کھانا کھلانے اور زم زم پلانے والے اور ان کی ضیافت کرنے والے ہیں، لہٰذا دینِ ابراہیمی پر تو ہم ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے کہا: یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام تمھاری طرح مشرک نہیں تھے، بلکہ وہ تو یک سو ہو کر اپنے اللہ کی عبادت کرنے والے تھے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی سورت آل عمران (آیت: ۹۵) میں فرمایا ہے:

﴿ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾

''کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرما دیا پس دینِ ابراہیم کی پیروی کرو جو سب سے بے تعلق ہو کر ایک (اللہ ہی) کے ہو گئے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔''

مشرکینِ مکہ کو آج کے ان کلمہ پڑھنے والوں سے بہتر ہی کہنا چاہیے، کیونکہ جب وہ کشتیوں میں سوار ہوتے تو خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے۔ اس لفظ پر آپ غور کریں کہ خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن آج اگر آپ جائزہ لے کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج کے مسلمان کی زبان پر الفاظ کیا ہیں، جب یہ سواری پر چڑھ رہا ہو تو کہے گا: یا علی مدد۔ کوئی کہتا ہے: یا رسول اللہ مدد۔ کوئی یا غوث المدد کہتا ہے۔ جب بھی کہیں گے شرکیہ کلمات ہی کہیں گے۔ ہم جو بات آپ کو بتانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ کبھی کبھی خالص اللہ کی بھی عبادت کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ان کا ذکر سورۃ العنکبوت (آیت: ٦۵) میں یوں فرمایا ہے:

﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ﴾

''پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے (اور) خالص اُسی کی عبادت کرتے ہیں لیکن جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔''

سورت لقمان (آیت: ۳۲) میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

﴿ وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ﴾

''اور جب ان پر (دریا کی) لہریں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو اللہ کو پکارنے (اور) خالص اُس کی عبادت کرنے لگتے ہیں پھر جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی پر

پہنچا دیتا ہے تو بعض انصاف پر قائم رہتے ہیں اور ہماری نشانیوں سے وہی انکار کرتے ہیں جو عہد شکن اور ناشکرے ہیں۔‘‘

اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ سمندروں میں کشتیوں کا سفر کرتے اور موجیں اُن پر چھا جاتی اور وہ اپنی جانوں پر خطرہ محسوس کرتے تو مدد کے لیے خالص اللہ ہی کو آواز دیتے اور جب اللہ تعالیٰ انھیں نجات دے دیتا تو پھر سے شرک کرنے لگتے، یعنی خطرہ محسوس کرتے تو کس کو پکارتے؟ خالص اللہ ہی کو پکارتے...!

یہ پکارنا کیا ہے؟ یہ عبادت ہی تو ہے۔ اسی ضمن میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی آتا ہے، جو ابوجہل کے بیٹے تھے۔ ان کا اسلام قبول کرنے کا سبب بھی سمندر کی موجوں میں صرف اللہ کو پکارنا ہی بنا تھا۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے جس کی وجہ سے انھیں قبولِ اسلام کی توفیق حاصل ہوئی۔

ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد یہ مکہ سے فرار ہوگئے، تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفت سے بچ جائیں۔ یہ حبشہ جانے کے لیے ایک کشتی میں بیٹھے، کشتی گرداب میں پھنس گئی تو کشتی میں سوار لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ پورے خلوص کے ساتھ اپنے رب سے دعائیں کرو، اس لیے کے یہاں اس کے علاوہ کوئی نجات دینے والا نہیں ہے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا کہ اگر یہاں سمندر میں اس کے سوا کوئی نجات نہیں دے سکتا تو اس کے باہر بھی صرف وہی نجات دے سکتا ہے۔ اسی وقت انھوں نے اللہ سے عہد کر لیا کہ اگر میں یہاں سے بخیریت ساحل پر پہنچ گیا تو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا، یعنی مسلمان ہوجاؤں گا، چنانچہ وہاں سے نجات پا کر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

آج کے مسلمانوں سے وہ مشرکین پھر بھی بہتر تھے کیونکہ آج ہم خوشی و مسرّت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا تو دور مشکلوں اور پریشانیوں میں بھی اللہ کے علاوہ غیروں کو پکارتے ہیں۔ اگر ہمارا بچہ بیمار ہوجائے، چاہیے تو یہ تھا کہ دوا کے ساتھ ساتھ اپنے اللہ تعالیٰ سے گڑ گڑا کر دعائیں کرتے، توبہ واستغفار کرتے، اپنے اعمال کا جائزہ لیتے، کہیں ہمارے اعمال میں تو کمی نہیں، مگر نہیں، ایسا کرنے کے بجائے سیدھے کسی مرشد مُلّا یا پھر کسی ڈھونگی پاکھنڈی کے جال میں پھنس کر اپنا عقیدہ برباد کرلیتے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۷۱)

جب انھیں پوچھا جائے کہ بہن اب بچہ کیسا ہے؟ تو یہ لوگ اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے فوراً کہیں گے کہ بابا جی کے دربار میں گئے تھے، بابا کا کرم ہوگیا ہے۔ اگر بچے کی وفات ہوگئی تو کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی! اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کرم نہیں کرتا۔ نعوذ باللہ! صرف بزرگ کرم کرتے ہیں۔ نہیں میری مسلمان بہنوں اللہ تعالیٰ تو بہت کریم و رحیم ہے، اللہ اپنے بندوں کو دکھ نہیں دیتا، بلکہ ہمارے اپنے ہی ہاتھوں کا کیا ہوا عمل ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہمیں اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے۔

مسلمانوں نے اپنے بچوں کے نام بھی ان بزرگوں کے ناموں پر رکھے ہیں۔ کسی کا نام نبی بخش، ولی بخش، پیر بخش، خواجہ بخش، غلام رسول، غلام حسین، عبد النبی، غلام غوث ہے یا پھر غلام محی الدین۔ غلام کیا ہے (غلام کا معنی ہوتا ہے بندہ) جب کہ ہم سارے کے سارے تو اللہ کے بندے ہیں لیکن ان لوگوں کے عقائد ملعون شیطان بگاڑ چکا ہوتا ہے اس لیے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو پیروں، بزرگوں اور ولیوں کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ راضی ہوگا؟

پھر کیوں نہ ہم کہیں کہ آج کے کلمہ پڑھنے والوں سے تو وہ بہتر تھے اور یہی نہیں کہ وہ صرف اللہ کو مانتے تھے بلکہ وہ اپنے بچوں کے نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن بھی رکھتے تھے، چنانچہ تاریخ گواہ ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کا نام عبد اللہ تھا۔ جو حُجاج کی ضیافت کیا کرتا تھا، اس کا نام عبد اللہ بن جدعان تھا اور جب کبھی ضرورت پڑتی تو وہ اللہ کی قسم بھی کھاتے تھے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے سورت فاطر (آیت: ۴۲) میں فرمایا ہے:

﴿ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ﴾

’’اور یہ اللہ کی سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ہدایت کرنے والا آئے تو یہ ہر ایک امت سے بڑھ کر ہدایت پر ہوں گے، مگر جب ان کے پاس ہدایت کرنے والا آیا تو اس سے ان کو نفرت ہی بڑھی۔‘‘

وہ لوگ جب بھی قسم کھاتے تو عموماً اللہ کے سوا کسی کی قسم نہیں کھاتے تھے، بلکہ اللہ ہی کی

قسمیں کھاتے تھے، مگر پھر بھی وہ مشرک اور آج کے مسلمان ایسی قسمیں کھاتے ہیں جس سے صاف طور پر شرک ظاہر ہوتا ہے، مگر کہنے کو ہم مسلمان ہیں...؟

اگر آدمی کسی معاملے میں قسم کھا رہا ہے یا تو وہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے یا پھر کسی معاملے میں اس کو گواہ بنانے کے لیے قسم کھائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جب کبھی گواہی کی ضرورت ہو تو جس کی قسم کھائی گئی ہے، ضروری ہے کہ وہ حاضر رہے، یعنی ہمیشہ رہنے والا ہو۔

آج کا مسلمان کہتا ہے: ہرے جھاڑ کے نیچے ہوں جھوٹ نہیں بول رہا اور کوئی کہتا ہے: انگار ہاتھ میں ہے جھوٹ نہیں بول رہا اور کوئی کہتا ہے: رزق یا کھانا ہاتھ میں ہے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، مجھے میری ماں کی قسم، میرے بیٹے کی قسم، تیری قسم، تیرے سر کی قسم۔ کیا یہ قسم کھانا نہیں تو اور کیا ہے؟

آج کے مسلمان ایسی چیزوں کو گواہ بنا رہے ہیں جو سب فنا ہونے والی ہیں، اگر قسم کھانے کی ضرورت پڑے تو اس ذات کی قسم کھائیں جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور وہ گواہی کے لیے کافی ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ ''اور حق ظاہر کرنے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔''

کیونکہ ظاہر اور باطن کے حال وہی جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کو مخلوقات کی قسم کھانے سے منع کیا ہے، کیونکہ غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے، مگر کافر و مشرک اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا اقرار کرتے تھے، وہ سب چیزوں کا مالک اللہ ہی کو مانتے تھے، اس کے لیے نمازیں بھی پڑھتے، روزے بھی رکھتے اور حج و عمرہ بھی کرتے بلکہ حُجاج کی ضیافت اور خدمت بھی کرتے تھے، مشکلات میں خالص اللہ ہی کو پکارتے اور قسمیں بھی اللہ ہی کی کھاتے تھے۔

اور تو اور کوئی تحریر بھی لکھتے تو شروع میں اللہ ہی کا نام لکھتے، اتنے سب کچھ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو کافر و مشرک قرار دیا، اُن سے جنگیں لڑی گئیں، ان کے مال کو مالِ غنیمت قرار دیا گیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو باندی اور غلام بنایا گیا، آخر کیوں؟ وہ کون سا ایسا گناہ کر رہے تھے؟ ان کا جُرم کیا تھا؟ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو کافر و مشرک قرار دیا؟ آیئے! دیکھیں کہ ان کے بارے میں اللہ کا قرآن کیا کہتا ہے؟ سورۃ الزمر (آیت: ۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ

اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ﴾

''دیکھو خالص عبادت اللہ ہی کے لیے (زیبا) ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے ہیں (وہ کہتے ہیں:) ہم ان کو اس لیے پوجتے ہیں کہ ہم کو اللہ کا مقرب بنا دیں تو جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں، اللہ ان میں ان کا فیصلہ کر دے گا بے شک اللہ اس شخص کو جو جھوٹا وناشکرا ہے ہدایت نہیں دیتا۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [یونس: ۱۸]

''اور یہ (لوگ) اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ اُن کا کچھ بگاڑ ہی سکتی ہیں اور نہ کچھ بھلا ہی کر سکتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں کہہ دو کہ کیا تم اللہ کو ایسی چیز بتاتے ہو جس کا وجود اُسے نہ آسمانوں میں معلوم ہوتا ہے اور نہ زمین میں۔ وہ پاک ہے اور (اُس کی شان) ان کے شرک کرنے سے بہت بلند ہے۔''

مشرکینِ مکہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب اُن سے کہا جاتا کہ تم ان (بتوں) کو اللہ کے علاوہ دوست کیوں بناتے ہو؟ تو یہ کہتے کہ یہ اللہ کے نزدیک ہمارے سفارشی ہیں اور یہ ہمیں اللہ کے قریب کرنے والے ہیں۔ اگر سفارشی بنانا شرک نہ ہوتا تو آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کے شرک سے پاک ہونے کا اعلان کیوں کیا ہے؟

آج جو لوگ اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کو اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ اور اپنے درمیان وسیلہ بناتے ہیں، وہ ان اولیا اور بزرگوں کو اللہ تعالیٰ کے یہاں سفارشی ہی نہیں بذاتِ خود دینے والے اور مرادیں پوری کرنے والے مانتے ہیں۔ کیا ہم شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ اور خواجہ صاحب وغیرہ کے بارے میں ایسا اعتقاد نہیں رکھتے؟ جب کہ یہ کھلّم کھلا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

کیا کہا ہے کہ اے میرے بندو! ''تم مجھے پکارو میں تمھاری پکار کا جواب بھی دیتا ہوں۔''

کیونکہ میں تمھارے اتنا قریب ہوں کہ اگر تم مجھے دل میں بھی پکارو تو وہ پکار تمھاری صرف میں ہی سنتا ہوں کیونکہ میں تمھاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں اور میں ہی تمھاری مرادیں بھی پوری کرتا ہوں۔ اس بات کا ذکر قرآنِ کریم کے بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے کہ جب بھی اللہ کے نیک بندوں نے اپنے رب کو پکارا، اللہ نے اُن کی پکار کو سُنا اور اُن کی مرادیں بھی پوری کیں، جس کی ایک دو دلیل ہم آپ کو بتاتے ہیں:

① حضرت آدم اور اماں حوا علیہما السلام نے اپنے رب کو کیسے پُکارا اور کیا کہا؟ سورۃ الاعراف (آیت: ۲۳) میں ہے:

﴿ قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

''دونوں عرض کرنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی غلطی پر ندامت و پشیمانی کا اظہار اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ و استغفار کا اہتمام کیا تو اللہ کی رحمت و مغفرت کے مستحق ہو گئے۔

② حضرت یونس علیہ السلام نے کا واقعہ آپ نے قرآن میں پڑھا ہوگا۔ انھوں نے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح پیغام آنے سے قبل ہی یہ امید قائم کرلی کہ ان کی دُعا کے نتیجے میں قوم پر عذاب آ کر رہے گا، تو حضرت یونس علیہ السلام نے نینوا والوں سے کہا: آنے والی صبح ہمارے لیے عذاب لے کر آئے گی۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم آنے سے پہلے ہی انھوں نے نینوا کو چھوڑ دیا۔ ان کے وہاں سے نکلنے کے بعد بستی کے لوگوں نے سوچا کہ ہم نے اُن کی بات نہ مان کر غلطی کی ہے۔ اب جلد ہی ہم پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ جب انھیں عذاب کے آثار نظر آئے تو وہ سخت نادم ہوئے، اللہ سے ڈر گئے اور اسلام لے آئے، اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنے لگے۔ جب انھوں نے سچے دل سے توبہ کی تو اللہ

نے اُن کو معاف کر دیا۔ اس طرح اُن سے عذاب ٹال دیا۔

اب آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تقدیر کا لکھا ہوا نہیں ٹل سکتا، یہ بات بھی ٹھیک ہے لیکن جب بندے اپنے رب سے سچے دل سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ اُس کے نتیجے میں آیا ہوا عذاب بھی ٹال دیتا ہے۔

جب حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہوکر نینویٰ کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر جانے کے لیے کشتی میں بیٹھ گئے۔ کشتی اپنے سفر پر روانہ ہوئی۔ جب خاصی دور چلی گئی تو اچانک زور کی آندھی چلنا شروع ہوگئی اور کشتی ہچکو لے کھانے لگی اور پانی کی لہریں بلند ہوکر کشتی میں گرنے لگیں۔ اس طرح کشتی میں پانی داخل ہونے لگا۔ جب پانی کی مقدار کافی ہوگئی تو اس بات کا خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں کشتی ہی نہ غرق ہوجائے۔ مسافروں کو ملاح نے مشورہ دیا: اگر جانوں کو بچانا ہے تو پھر تمام اشیا کو سمندر میں پھینک دیں، لہٰذا ہر چیز کو پھینک دیا گیا۔ اس کے باوجود اسے لگتا تھا کہ کشتی کسی وقت بھی الٹ سکتی ہے۔ انھوں نے سوچا اب تو باقی انسان ہی رہ گئے ہیں۔ اگر ان میں سے کچھ لوگوں کو سمندر میں پھینک دیا جائے تو باقی لوگوں کی زندگی بچ سکتی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے کس کو پھینکا جائے؟ کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ قرعہ اندازی کی جائے، جب قرعہ اندازی ہوئی تو قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا۔ حضرت یونس علیہ السلام بڑے نیک سیرت تھے اور کشتی والے انھیں بڑا پسند کرتے تھے۔ لہذا انھوں نے قرعہ دوسری بار نکالا۔ پھر بھی آپ کے نام نکلا۔ مگر مسافروں نے آپ کو منع کر دیا۔ انھوں نے کہا: ایک بار پھر نکالتے ہیں۔ اللہ کی قدرت تیسری مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی تب بھی قرعہ آپ کے نام نکلا۔ اب حضرت یونس علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے۔ چنانچہ انھوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

ادھر اللہ تعالیٰ نے بحیرہ روم کی ایک بڑی مچھلی بھیج دی اور وہ آپ کو نگل گئی۔ مچھلی کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ یونس (علیہ السلام) کی حفاظت کرے۔ ان کا گوشت نہیں کھانا، کیونکہ یونس علیہ السلام اس مچھلی کا رزق نہ تھے۔ پھر اللہ کے حکم سے مچھلی آپ کو لے کر تمام سمندروں کا چکر لگانے اور گہرے پانیوں میں گھومنے لگی۔ جب آپ مچھلی کے پیٹ میں پہنچ گئے تو آپ نے سوچا کہ آپ فوت ہو چکے ہیں، لیکن جب اپنے اعضا کو حرکت دی تو جان گئے کہ آپ ابھی زندہ تھے۔ چنانچہ آپ اللہ کے لیے

سجدے میں گر گئے اور عرض کی:

اے اللہ! میں نے ایک ایسی جگہ کو تیرے لیے سجدہ گاہ بنایا ہے کہ اس طرح کے مقام پر کسی نے تیری عبادت نہیں کی۔ آپ نے مچھلیوں کو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے سُنا اور کنکریوں سے اللہ کی تسبیح سُنی۔ اب یہاں کئی اندھیرے تھے۔مچھلی کے پیٹ کا، سمندر کا اور رات کا، ان اندھیروں میں مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ کی عبادت شروع کردی۔ استغفار کرنے لگے اور اپنے اللہ کو پکارنا شروع کر دیا۔ ان کی پکار کیا تھی؟ سورۃ الانبیاء (آیت: ۸۷) میں ہے:

﴿ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

''اور ذوالنون (مچھلی والے کو یاد کرو) جب وہ (اپنی قوم سے ناراض ہوکر) غصے کی حالت میں چل دیے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہیں پا سکیں گے، آخر اندھیرے میں (اللہ کو) پکارنے لگے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے (اور) بے شک میں قصور وار ہوں۔''

اپنے رب سے کہنے لگے کہ اس مچھلی کے پیٹ سے مجھے نکال دیں۔ قرآنِ پاک میں ان کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر وہ اللہ کی پاکیزگی بیان نہ کرتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔ [الصّٰفّٰت: ۱۴۴] مگر یونس علیہ السلام کی دُعا عرش تک جا پہنچی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قدر اندھیروں اور رکاوٹوں میں سے اپنے بندے حضرت یونس علیہ السلام کی پکار کو صرف سُنا ہی نہیں بلکہ ان کی دُعا کو شرفِ قبولیت بھی بخشا۔

تین دن مچھلی کے پیٹ میں گزرے تھے، اللہ نے اُن پر رحم کرکے مصیبت سے نجات دے دی اور کہا کہ اپنی بستی کی طرف لوٹ جائیں۔ جب وہ واپس پہنچے تو قوم اُن کی منتظر تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو بھی مومن ہمیں اس طرح مصیبتوں میں پکارے گا، ہم اُسے نجات دیں گے۔

③ حضرت ایوب علیہ السلام نے (۱۸) سال کی آزمائشوں کے بعد بارگاہِ الٰہی میں دُعا کی۔ سورۃ الانبیاء (آیت: ۸۳) میں ہے:

﴿ وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾

''اور ایوب (کو یاد کرو) جب انھوں نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھے یہ بیماری لگ گئی

ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی دُعا کو قبول فرمایا اور صحت کے ساتھ مال و اولاد پہلے سے دوگنا عطا فرمائے۔ سورۃ المومنون (آیت: ۱۱۸) میں دعاے رسول یوں مذکور ہے:

﴿رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴾

''اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے اور (مجھ پر) رحم کر اور تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اُن کی پکار کو کیسے سنا؟ جب انھوں نے اپنے رب کو آواز دی، اپنے اللہ کو پکارا کہ یااللہ تیرے سوا کوئی بھی مجھے مشکل سے نکال نہیں سکتا تو اللہ نے اُن کی پکار کو سُن لیا۔ یہ تو اللہ کے نبی تھے، دوسری طرف اللہ کا دشمن ہے جس کی بیوی اپنے اللہ کو پکار رہی ہے، اس کا ذکر قرآنِ کریم کی سورۃ التحریم (آیت: ۱۱) میں ہے:

﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾

''اور مومنوں کے لیے (ایک) مثال (تو) فرعون کی بیوی کی بیان فرمائی کہ اس نے اللہ سے التجا کی کہ اے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے نجات بخش اور ظالم لوگوں کے ہاتھ سے مجھ کو مخلصی عطا فرما۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کی پکار بھی سُنی اور مُراد بھی پوری کی۔ اب آپ یہ بتائیں کہ انھوں نے اپنے اور اپنے رب کے درمیان کس کو وسیلہ یا سفارشی بنایا ہے؟ کسی کو بھی نہیں، سیدھا اپنے اللہ سے مانگا ہے جو سب کی حاجت پوری کرنے والا ہے۔

مشرکینِ مکہ اللہ کو ماننے کے باوجود کسی اور کو اللہ کے یہاں سفارشی ہی بناتے تھے۔ اب وہ کس کو سفارشی بناتے تھے؟ یہ جاننا بے حد ضروری ہے، کیونکہ وہ لوگ اللہ کے علاوہ جنھیں سفارشی مانتے تھے وہ عام لوگ نہ تھے وہ تو انبیاء، ملائکہ، صالحین اور ایسی شخصیتوں کو سفارشی بناتے تھے جن کے بارے میں ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ نیکوکار، پرہیزگار اور متقی ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا تو خانہ کعبہ کے اندر

آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تصویریں یا بت بنے ہوئے دیکھے اور ان کے ہاتھوں میں فال گیری کے تیر تھے [یہ تیر مشرکینِ مکہ فال نکالنے کے لیے استعمال کرتے تھے]

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تیر دیکھے تو فرمایا: اللہ تعالیٰ مشرکینِ مکہ کو ہلاک کرے، کیونکہ ان لوگوں نے میرے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اتنی بڑی تہمت لگائی ہے کہ وہ فال گیری کرتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص جس کا نام عَمرو بن لحیّ تھا،جس نے سب سے پہلے اہلِ مکہ کو شرک و بُت پرستی کی دعوت دی تھی۔ اس نے قومِ نوح علیہ السلام کے زمانے میں جو نیک اور باوقار لوگ تھے، جن کا ذکر سورت نوح میں ہے اور ان کے نام کچھ اس طرح تھے: ”وَد، سُواع، یَعُوق، یَغوُث، نَسُر“ ان صالحین کے بت بنا کر ان کو اللہ کا سفارشی اور اپنا دوست بنا لیا تھا۔

مشرکینِ مکہ تو شرک کرتے ہوئے بھی آج کے کلمہ گو مشرکوں سے اچھے تھے، کیونکہ ان لوگوں نے جن کو سفارشی بنایا تھا، وہ انبیا یا فرشتے تھے یا پھر وہ نیک و باوقار لوگ تھے جن کے تقوے اور طہارت کے بارے میں انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ حقیقت میں نیک اور متقی و پرہیزگار تھے، وہ تو ان ہستیوں کو اولیا مانتے تھے،جنھیں اللہ تعالیٰ نے حقیقتاً اپنا مقرّب بنایا ہے۔ اس کے باوجود وہ لوگ مشرک تھے، کیونکہ انھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، جب کہ اللہ زمینوں اور آسمانوں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ پاک ہے اور آج کے مسلمان جن لوگ کو اللہ تعالیٰ کا سفارشی اور اپنا دوست بنائے ہوئے ہیں، ان کا نام سنو تو ہنسی آتی ہے، لیجیے سنیے! کسی کا نام ”گھوڑے شاہ [اجمیر شریف]، طوطے شاہ [، گمنام شاہ [آصف نگر]، پتنگ شاہ، [تالاب کٹا] ۔چینی شاہ۔ ایسے ناموں پر ہنسی نہیں آتی بلکہ شرم آتی ہے کہ آج ہم نے ایسے لوگوں کو اللہ کا دوست، مشکل کشا اور حاجت روا سمجھا ہوا ہے۔ جو اپنی مدد آپ کرنے پر قادر نہ ہوں وہ بھلا دوسروں کی مدد کیا کریں گے؟ ؎

جو خود محتاج ہو دوسرے کا
بھلا اُس سے مدد کا مانگنا کیا

اگر کسی نے وسیلہ بنانا ہے تو خلوصِ نیت کے ساتھ کیے گئے اعمالِ صالحہ کے وسیلے کے ساتھ دُعا و التجا کرے تو یہ جائز ہے،لیکن اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ذرا بھی خلاف جانے کو کفر سمجھتے تھے جس کے واقعات معروف ہیں۔ آج ہم سب اپنے آپ کو بہت

بڑے مسلمان کہلواتے ہیں، لیکن عمل سے کوسوں دور ہیں۔

آج جسے ہم اسلام سمجھ کر اس عمل کر رہے ہیں، یہ وہ اسلام نہیں جو شہرِ مدینہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم لے کر نکلے تھے۔ اسلام ہم تک پہنچا تو ضرور ہے لیکن عرب سے لے کر جو بھی راستے میں ملتا گیا اسے بھی ہم نے اسلام میں شامل کرلیا، اس طرح دینِ اسلام کی بنیاد ہی ختم ہوگئی اور ہم اس خوش فہمی میں ہیں کہ یہی اسلام ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے سچ ہی کہا تھا: ؎

رہا شرک نہ باقی وہم و گماں میں | یہ بدلا گیا آ کر ہندوستان میں
کرے غیر اگر بت کی پوجا تو کافر | کواکب میں مانیں کرشمہ تو کافر
جھکے آگ پر بہرِ سجدہ تو کافر | جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں | پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھا دیں | نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
یہ دن رات مزاروں پہ نذریں چڑھائیں | شہیدوں سے جا جا کے مانگے دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے | اسلام بگڑے نہ ایمان جائے
ہمیشہ سے تھا جس یہ اسلام نازاں | وہ دولت بھی آج کھو بیٹھے مسلماں
رہا شرک نہ باقی وہم و گماں میں | یہ بدلا گیا آ کے ہندوستان میں

اسلام آیا لیکن اپنی اصلی حالت سے بدل جانے کے بعد۔ تاریخی اعتبار سے یہ بھی ایک غلط فہمی ہے کہ پاک و ہند میں دعوتِ اسلامی کا آغاز خواجہ معین الدین چشتی نے کیا، تاریخی اعتبار سے یہ بات بالکل غلط ہے۔ اسلام تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں تقریباً ۲۲ ہجری میں جہاں آج کل ہندوستان کا شہر ممبی ہے، اس کے ساحلی علاقہ تھانا میں داخل ہو چکا تھا، آپ ایک نظر اس کی تاریخ پڑھ کر دیکھ لیں اور سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کریں۔

یہ تھے مشرکینِ مکہ کے عقائد اور اعمال کی نسبت سے کچھ حقائق جو میں نے آپ سب کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اس لیے کہ کسی چیز کا علم رکھتے ہوئے اسے چھپانا یا پھر کسی کو آگاہ نہ کرنا یہ دین میں خیانت ہے، اب آپ ان حقائق کو سامنے رکھیں اور اپنے اعتقادات اور اعمال کا جائزہ لیں کہ کیا ہم راہِ حق پر ہیں یا نہیں؟

یہ دنیا چار روز کی ہے، کسی کو نہیں معلوم کب اور کہاں کس کا وقت آ جائے؟ اس لیے اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں، کیونکہ حق آ جانے کے بعد پھر یہی ضد نہ پکڑے رہنا چاہیے کہ ہم تو اپنے بڑوں [باپ اور دادا] جیسا کرتے تھے ویسا ہی کریں گے کیونکہ کچھ لوگ اپنے ماحول اور ابتدائی تربیت کے زیرِ اثر ایسے نظریات قائم کر لیتے ہیں کہ پوری عمر اُن کے چنگل سے باہر نہیں نکل پاتے۔ اگر ہم قرآن اور صحیح حدیث کی رو سے حقیقت کو اُن کے سامنے بھی رکھیں گے تو بھی بات کو نظر انداز کرتے جائیں گے۔

یاد رکھیں! اگر آپ کا طریقہ عمل نبی اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہ ہوا تو آپ کا کوئی عمل قبول نہیں ہوگا کیونکہ حق آ جانے کے بعد اگر ہم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کریں گے تو پھر گذشتہ قوموں کا انجام آپ جانتے ہیں۔

اُن کے پاس بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول اور نبی آئے لیکن انھوں نے حق کو ٹھکرا دیا اور باطل کو گلے لگا لیا، پھر ان کی آخرت کیا تھی؟ وہ آپ جانتے ہیں۔ آج اللہ کریم نے ہمیں موقع دیا ہے کہ ہم دینِ حق کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن ہمارے ساتھ بھی وہی سلوک ہو جو ان لوگوں کے ساتھ ہوا، جو یہ کہیں گے کہ کاش! ہم رسول کی پیروی کرتے، کاش ہم فلاں کو اپنا دوست نہ بناتے۔ اگر آپ نے ایمان لانا ہے تو اس طرح ایمان لائیں جس کی مثال اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں دی ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت: ۱۳۷) میں ہے:

﴿ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾

”اگر وہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم (صحابہ کرام) ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر منہ پھیر لیں (اور نہ مانیں) اور وہ (تمھارے) مخالف بھی ہو جائیں تو بھی وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے کیونکہ اُن کے مقابلے میں تمھیں اللہ ہی کافی ہے اور وہ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔“

یہ بات اللہ تعالیٰ نے کن کے بارے میں فرمائی تھی؟ مکے کے مشرکین کے متعلق! کیونکہ

دعوتِ حق قبول کرنے سے انھوں نے منہ پھیر لیا تھا اور پھر ان کا انجام کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے۔ آمین

اگر آج بھی کوئی صدقِ دل سے اپنے اللہ پر کامل ایمان لے آئے تو دنیا کی کوئی چیز اس کو نقصان نہیں دے سکتی، کیونکہ جس نے اللہ کے ساتھ دوستی کر لی اس کے لیے وہ کافی ہوگیا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ جہاں کہیں ہمیں اپنے عقائد میں کوئی غلطی نظر آئے تو فوراً اس کی اصلاح کرلیں اور توبہ واستغفار کر کے اپنے رب کو راضی کر لیں، کیونکہ وہ بہت زیادہ مہربان، رحم کرنے والا، توبہ قبول کرنے والا اور گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

''سارے کے سارے مسلمان خطا کار ہیں اور بہتریں خطا کار وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرتے رہتے ہیں۔''[1]

یاد رکھیے! جب گناہ کا احساس پیدا ہوجائے اور آپ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہم سے غلطی سرزد ہوگئی ہے تو سمجھ لیں کہ اب آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا دورازہ کھول دیا ہے۔ پھر عجز و انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جایئے، کیونکہ وہ ہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور خطاؤں کو معاف کرتا ہے۔ گناہ کے بعد احساسِ ندامت سے مغلوب ہوکر بارگاہِ الٰہی میں جھک جانا اور توبہ و استغفار کا اہتمام کرنا، بندگانِ الٰہی کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی خاص نسل سے محبت یا نفرت نہیں ہے۔ محبت یا نفرت صرف بندے کے اعمال و اخلاق کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم یا فرد اچھے عمل کرتا ہے، ایمان اور اس کے تقاضوں کو صحیح طریقے سے ادا کرتا ہے تو وہ اس کا محبوب ہے اور رب تعالیٰ اس کا معاون و مددگار ہے۔ اگر اس کے برعکس ایمان وعمل کے تقاضوں سے بے خبر کوئی قوم یا فرد ہے تو وہ اللہ کو ناپسندیدہ ہے اور دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی اس کا مقدّر ہے، یعنی وہ ہر قسم کی ہلاکت سے دوچار ہوگا۔

اسی لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جب بھی ہم قرآنِ کریم کی تلاوت یا مطالعہ کریں تو اس وقت ہم اپنے اخلاق و کردار کا جائزہ لیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہیں جو گذشتہ قوموں کی تباہی کا باعث تھیں!!

---

[1] سنن الترمذي، ابن ماجه، مسند أحمد، صحيح الجامع الصغير، رقم الحديث (٤٥١٥)

اسی طرح شرک اور بدعت کی دلدل سے بھی نکلنے کی کوشش کریں، جس میں ہماری اکثریت پھنسی ہوئی ہے، جو غضبِ الٰہی کا موجب ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اخلاق و کردار کی اصلاح کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ یااللہ! ہمارے اعمال وعقائد کی، ظاہر اور باطن کی اور ہمارے دین اور دنیا کی اصلاح فرما۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم قرآنِ کریم کی ابدی حقیقتوں پر سچے دل سے ایمان نہیں لائیں گے اور اس کی روشنی میں اپنے عقیدے وعمل کی بنیادوں کو صحیح نہیں رکھیں گے۔ عمل کے لیے نیت اور اخلاص کی ضرورت ہے اور عقیدہ ہی عمل کی بنیاد ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سے لوگوں کو بلندیاں عطا فرماتا ہے اور اسی کی وجہ سے کچھ دوسروں کو پستی میں دھکیل دیتا ہے۔''[1]

قرآن پر عمل کا صلہ بلندی اور اس سے اعراض وغفلت کا نتیجہ ذلت و بربادی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم قرآنِ کریم کو پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. سوئے حرم۔ تالیف: مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
3. عبادت میں شرک۔ تالیف: مولانا عبدالمتین
4. قصص الانبیاء۔ امام ابن کثیر۔ دار السلام۔ لاہور
5. میں قبر پرست تھا۔ تالیف: عبدالمنعم الجداوی۔ ترجمہ: کفایت اللہ سلفی

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٩٧)

شرک کا انجام

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سرورِ کائنات ﷺ سے مخاطب ہو کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الزمر: ٦٥]

''(اے نبی!) آپ کی اور آپ سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیا کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے۔''

شرک کی تعریف:

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و الوہیت اور اسما و صفات میں کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا شرک کہلاتا ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو پکارنا، یا وہ عبادتیں جو صرف اللہ کے لیے خاص ہیں، انھیں کسی دوسرے کے لیے ادا کرنا، یا اللہ کے لیے ادا کرنے میں کسی دوسرے کو شریک کر لینا، جیسے نذر و نیاز، خوف و امید اور محبت و تعظیم وغیرہ یہ سب شرک ہے۔

شرک ...قرآن کریم کی روشنی میں:

شرک، اللہ کے اسما و صفات میں ہو یا اس کی ربوبیت میں، چاہے شرک اس کی عبادات میں سے کسی عبادت میں ہو، ہر شکل میں یہ انتہائی ہلاکت انگیز، بلا خیز اور ایمان لیوا گناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورت انعام (آیت: ۸۸) میں اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ پیغمبروں کو نام بہ نام ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے:

﴿وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

’’اور اگر ان لوگوں نے بھی کہیں شرک کیا ہوتا تو ان سب کے تمام عمل برباد ہوجاتے۔‘‘

اندازہ کریں کہ جس گناہ سے باز رہنے کے لیے انبیاے کرام اور امام الانبیا ۔صلوات اللّٰہ وسلامہ علیہم أجمعین۔ کو اس قسم کا خطاب کیا گیا ہو۔ اگر کوئی امتی اس گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس کا کیا حشر ہوگا؟

جد الانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے سورت حج (آیت: ۲۶) میں فرمایا:

﴿ وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا ﴾

’’یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی، (تو انھیں ہدایت کی تھی کہ) میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔‘‘

قرآنِ کریم میں حضرت لقمان کی وصیتیں معروف ہیں جو انھوں نے اپنے بیٹے کو دورانِ وعظ کی تھیں۔ جب ان کا آخری وقت آ گیا تو انھوں نے اپنے بیٹے کو جو مختلف وصیتیں کیں، جن میں سب سے پہلی وصیت یہی تھی:

﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳]

’’اے میرے بیٹے! اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔‘‘

اب آپ اندازہ کریں، حضرت لقمان اپنے بیٹے کو کیا کہہ رہے ہیں کہ شرک بہت بڑا گناہ ہے اور اگر کوئی عام آدمی یہی گناہ کرے گا تو اسے کیسے معاف کیا جائے گا؟

آج اگر کوئی شخص کسی ملک کے حاکم کے خلاف بغاوت کرے اور اس کے متوازی حکومت قائم کرنا چاہے، یعنی اس کے خلاف حکومت قائم کرنا چاہتا ہو تو حاکم کے لیے وہ شخص انتہائی ناگوار ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اس باغی کی سزا قتل قرار پاتی ہے۔ اب جسارت دیکھیں اس بندے کی جو ملک الملوک اور شہنشاہِ کائنات کے خلاف بغاوت پر اتر آتا ہے اور اس کی عبادت میں غیر کو متوازی حیثیت دے دیتا ہے تو ایسا شخص غضبِ الٰہی کا مستحق کیوں نہ ہوگا؟

اللہ تعالیٰ انتہائی رؤف و رحیم ہے، اس کی رحمت کا آپ اندازہ کریں کہ جو اس کی عبادت کرتا ہے اور جو نہیں کرتا، دونوں کو رزق، صحت، مال و دولت سے نوازتا ہے اور عفو و غفور ہے۔ یعنی جس کو چاہے گا اس کو معاف کردے گا چاہے اس کے گناہ زمین سے لیکر آسمان تک ہی کیوں نہ ہوں،

مگر شرک کے معاملے میں سورۃ النساء (آیت: ۴۸) میں فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ بس شرک کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا (جس قدر بھی گناہ ہیں) وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا، اس نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھ کر بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔''

سورت مائدہ (آیت: ۷۲) میں تو اللہ تعالیٰ نے بڑے شدید لہجے میں مشرک کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾

''جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا (آخری) ٹھکانا نارِ جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا (اس دن) کوئی مددگار نہیں ہوگا۔''

کس دن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے... قیامت کے دن؟ جس دن ہر شخص کا حساب ہوگا۔ جو کچھ کسی نے کیا ہوگا، اسی کے حساب سے انعامات بھی ملیں گے اور عذاب بھی، یعنی عدالتِ الٰہی میں سب کے ساتھ عدل و انصاف ہوگا۔

ہم سب کو چاہیے کہ اس عارضی زندگی میں ہمیں جو وقت ملا ہے اس میں آنے والی دائمی زندگی کے لیے، جو نہ ختم ہونے والی ہے، کچھ ایسا کریں کہ جس کے بدلے میں ہمارا رب ہم پر راضی ہوجائے اور اپنی رحمت سے ہمارے گناہوں کو معاف کردے، ہم سب پر اپنے رحمتیں اور برکتیں نازل عطا فرمائے، ہم سب کو نارجہنم سے محفوظ فرمالے اور جنت الفردوس عطا فرمائے کیونکہ اس کی رحمت کے سوا ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔

شرک کی تردید اور اس کا انجام ... حدیثِ رسول ﷺ کی روشنی میں:

شرک کی مذمت و تردید اور اہلِ شرک کا انجام بد اللہ تعالیٰ کی کتاب کی روشنی میں تو بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرک کی آخرت نارِ جہنم ہی مقرر فرمائی ہے، اب نبی آخر الزمان ﷺ

کے چند ارشادات پیشِ کیے جارہے ہیں تاکہ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں شرک اور مشرک کا مقام متعین کیا جا سکے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابو داود و نسائی میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِجۡتَنِبُوا السَّبۡعَ الۡمُوبِقَاتِ))

''سات ہلاکت انگیز اور بلاخیز چیزوں سے بچو۔''

آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ کون کون سی ہیں؟ تب آپ ﷺ نے ان ساتوں کو ایک ایک کر کے شمار فرمایا، ان ساتوں میں سب سے پہلے جس کا نام لیا، وہ تھا:

((اَلشِّرۡكُ بِاللّٰهِ)) ''اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو (اس کی ذات وصفات یا عبادت میں) شریک کرنا۔''[1]

نبی کریم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی سے معلوم ہوا کہ شرک سب سے بڑا ہلاکت انگیز جرم اور بلاخیز گناہِ کبیرہ ہے۔ صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ نبیِ رحمت ﷺ نے اپنے صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سے مخاطب ہوکر فرمایا:

((أَلَا أُنَبِّئُكُمۡ بِأَكۡبَرِ الۡكَبَآئِرِ؟))

''کیا میں تمھیں کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے گناہ کے بارے میں آگاہ نہ کردوں؟''

نبی اکرم ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی تو صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے کہا: کیوں نہیں؟ تب آپ ﷺ نے چار گناہوں کی نشاندہی فرمائی اور ان چاروں میں سب سے پہلے جس کا نام لیا، وہ تھا:

((اَلۡاِشۡرَاكُ بِاللّٰهِ)) ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے والدین کی نافرمانی کرنا، جھوٹی گواہی دینا اور جھوٹ بولنا ذکر فرمائے۔[2]

اور مسلم شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((ثِنۡتَانِ مُوجِبَتَانِ)) ''دو چیزیں واجب کر دینے والی ہیں۔''

ایک صحابی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٥٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٣/ ٨١)

((مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً دَخَلَ النَّارَ، وَمَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً دَخَلَ الْجَنَّةَ))[1]

''جو آدمی اس حالت میں مر گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ (اس کی ذات و صفات یا اس کی عبادت میں) کسی کو شریک ٹھہراتا تھا تو وہ دوزخ کی آگ میں داخل ہوگا اور جو شخص اس حالت میں فوت ہوا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ (اس کی ذات وصفات یا اس کی عبادت میں) کسی کو شریک نہ ٹھہرایا، تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

صحیح بخاری و مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

((أَيُّ الذَّنْبِ أَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ: أَنْ تَدْعُوَ لِلّٰهِ نِدّاً وَ هُوَ خَلَقَكَ))[2]

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ) تو کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنائے، حالانکہ تجھے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل و زنا کا ذکر فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے سورت فرقان کی یہ آیت (۶۸) نازل فرما دی:

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴾

''(اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے وہ ہیں:) جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو نہیں پکارتے، نہ کسی کو ناحق قتل کرتے ہیں اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ان امور کا ارتکاب کرے وہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے۔''

بخاری شریف میں ارشادِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((اَلْكَبَائِرُ: اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَ قَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ))[3]

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، ناحق قتل کرنا اور جھوٹی

---

[1] مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٦١) مختصر صحيح مسلم (١/ ٣/ ٨٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٦٦٧٥) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٥٠)

قسم کھانا کبیرہ گناہ ہیں۔''

مسند احمد میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((أَوْصَانِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِعَشْرِ كَلِمَاتٍ))

''مجھے رسول اللہ ﷺ نے دس نصیحتیں فرمائیں۔''

ان میں سب سے پہلی نصیحت یہی تھی:

((لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ وَإِنْ قُتِلْتَ أَوْ حُرِّقْتَ))[1]

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک مت بنانا، چاہے تمھیں قتل کیوں نہ کر دیا جائے، یا آگ میں کیوں نہ جلا دیا جائے۔''

اب آپ خود اندازہ کریں کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے؟ اگر اس کے بدلے میں آگ میں جلنا پڑے تو بھی یہ جائز نہیں ہے اور ایک ہم ہیں اس دنیا کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے بڑے سے بڑا گناہ بھی کر گزرتے ہیں۔ آیئے! آج سب مل کر اللہ سے دعا کریں کہ جو گناہ ہم سے سرزد ہوگئے ہیں یا اللہ وہ ہمیں معاف فرمادے، ہمارے گناہوں پر درگزر فرما اور ہمارے حال پر رحم کر اور ہم سب کو گناہوں کی زندگی سے محفوظ فرمالے اور ہم سب کو اپنے محبوب بندوں میں سے شمار فرمالے۔ آمین ثم آمین

شرک اور اس کی سزا:

مشرک کی سزا اور اس کی بخشش نہ ہونے کے بارے میں ''غنية الطالبين'' (ص: ١٣٠) میں مرقوم ہے:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب لے گا۔ سوائے اس شخص کے جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، اس کا حساب نہیں لیا جائے گا، بلکہ اسے سیدھا جہنم میں جانے کا حکم دیا جائے گا۔''

نیز شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے ''فتوح الغیب'' میں لکھا ہے:

''شرک صرف بت پرستی ہی کا نام نہیں، بلکہ نفس پرستی بھی شرک ہے۔''

---

[1] مسند أحمد و طبراني كبير، صحيح الترغيب (١/ ٢٢٨) رقم الحديث (٥٦٩)

یعنی اللہ کے احکام اور اس کے فرامین کو چھوڑ کر خواہشات کی پیروی کرنا، رسم و رواج کی پابندی اور برادری کی خواہشات پر عمل پیرا ہونا بھی شرک ہے۔ قبروں پر سجدے کرنے والے پیر جیلانی رحمہ اللہ کے نظریہ توحید کے بارے میں ان ایمان افروز ارشادات پر غور فرمائیں۔ موصوف ''غنية الطالبين'' کے (ص: ۸۷) پر رقمطراز ہیں:

''حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں حیرہ کی طرف گیا تو دیکھا کہ لوگ اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ لوگ آپ کو سجدہ کیا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے بتاؤ، اگر تو میری قبر کے پاس سے گزرتا، تو کیا قبر کو سجدہ کرتا؟ میں نے عرض کی: نہیں، تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ غیر اللہ کو سجدہ کرو، تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں، کیونکہ اللہ نے مردوں کے عورتوں پر ایسے ہی حقوق مقرر فرمائے ہیں۔''

یہ بت یا صنم کیا ہے؟ اس سلسلے میں پیر جیلانی موصوف اپنی کتاب ''الفتح الربانی'' (مجلس: ۳۸) میں لکھتے ہیں:

''اے انسان! تو یہ کہتا ہے: ''لا إلٰه إلا الله'' ''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں'' حالانکہ تیرے دل میں کئی معبودانِ باطلہ جاگزیں ہیں۔ اللہ کو چھوڑ کر ہر وہ چیز جس پر تو بھروسا کرے یا امیدیں وابستہ کرے، وہ تیرا ''بت'' ہے۔''[1]

امام جیلانی رحمہ اللہ نے اپنے مریدوں کے نام جو آخری پیغام چھوڑا ہے، وہ ان کی کتاب ''فتوح الغیب'' میں مذکور ہے، جو کچھ یوں ہے:

''مرضِ وفات میں آپ کے صاحبزادے شیخ عبدالوہاب رحمہ اللہ نے عرض کی کہ مجھے ایسی وصیت فرمائیے جس پر میں آپ کے بعد عمل پیرا ہو سکوں تو انھوں نے فرمایا:

''تجھ پر لازم ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہ اور اس کی مخلوق میں سے کسی سے خوف زدہ نہ ہو، اللہ کے سوا کسی سے امیدیں اور حاجات وابستہ نہ کر۔ اپنے تمام کاموں کو اللہ کے

[1] مرشد جیلانی کے ارشاداتِ حقانی (ص: ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۰)

سپرد کر، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر بھروسا نہ کر اور ہر حاجت اسی سے طلب کر۔ اللہ کی توحیدِ ذات وصفات میں پختہ کار رہ، کیونکہ توحیدِ باری تعالی پر سب کا اجماع واتفاق ہے۔''[1]

شرک کے نقصانات

شرک ایک عظیم جرم کیوں ہے؟

بعض لوگ توحید کا بیان سن کر یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ دنیا میں گناہوں کی بہت ساری قسمیں ہیں۔ آج امتِ مسلمہ برائیوں کے دلدل میں گرفتار ہے، شراب نوشی، قتل وخوں ریزی، زنا کاری، اغوا، سود اور رشوت جیسے بڑے گناہ عام ہیں، اس کے باوجود صرف توحید ہی کا بیان کیوں کیا جاتا ہے؟ کیا دوسرے گناہوں کو مٹانا ضروری نہیں ہے؟ ایسے تمام لوگوں کی خدمت میں قرآن وسنت کی روشنی میں اس اشکال اور شبہہ کا جواب پیش کیا جارہا ہے، تاکہ وہ خوب اچھی طرح یہ جان سکیں کہ دعوت میں توحید ہی کو اولیت کیوں حاصل ہے اور شرک سب سے بڑا گناہ کیوں ہے؟

جواب:

ذیل میں ہم شرک کے چند نقصانات کا ذکر کررہے ہیں، جن سے اس گناہ کی ہولنا کی واضح ہوجاتی ہے اور اس شبہے کا ازالہ بھی خوب اچھی طرح ہوجاتا ہے۔

① شرک ایک ایسا گھناؤنا جرم ہے جس میں صفات وخصائصِ باری تعالیٰ میں مخلوق کو خالق کے مشابہ قرار دیا جاتا ہے اور مخلوق کو خالق کے ساتھ شریک کرنے میں مخلوق کو خالق کے برابر کیا جاتا ہے، حالانکہ مخلوق ہر لحاظ سے خالق کی محتاج ہے، نہ کہ اس کے برابر، اسی وجہ سے شرک سب سے بڑا ظلم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان: ١٣] ''شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

کسی چیز کو اس کے مقام سے ہٹا کر دوسری غیر مناسب جگہ رکھنا ظلم کہلاتا ہے، اس لیے کہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اب اگر کوئی شخص یہ عبادت کسی مخلوق کے لیے کرے تو یہ بھی ظلم ہے۔

---

[1] حوالہ سابقہ (ص: ١٥٣)

② شرک اتنا گھناؤنا اور سنگین جرم ہے کہ توبہ کے بغیر معاف نہیں کیا جاتا۔

③ اللہ تعالیٰ نے مشرک پر جنت حرام کردی ہے۔ شرک کرنے والا دائمی جہنمی ہے۔

④ شرک ایک ایسا گھناؤنا اور عظیم جرم ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کے گزشتہ سارے اعمال اور تمام نیکیاں مٹ جاتی ہیں۔

⑤ شرک اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر عرب کے زیرِ معاہدہ مشرکین کے لیے ایک خاص حکم نازل فرمایا کہ مدتِ معاہدہ ختم ہوجانے کے بعد مشرکوں کا خون اور مال حلال ہے، جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَ جَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبة: ٥]

''مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور پکڑ لو اور گھیر لو اور ہر گھات کی جگہ پر ان کی تاک میں بیٹھے رہو، پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے اور زکات دینے لگیں تو ان کی راہ چھوڑ دو، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا بہت مہربان ہے۔''

صحیح بخاری و مسلم میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

((أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَاِذَا قَالُوْا عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَ هُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا))[1]

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک لڑتا رہوں جب تک وہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' کا اقرار نہ کرلیں اور جب وہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' کا اقرار کرلیں تو مجھ سے اپنے خون و مال کی حفاظت کرلیں گے، مگر اس کے حق سے۔''

⑥ کیا ایسے لوگوں کے لیے کافی نہیں ہے کہ امامِ کائنات ﷺ نے شرک کو سب سے بڑا گناہ کہا ہے؟ اس لیے جب ہمارے آقا ﷺ اسے سب سے بڑا گناہ کہیں تو ہمیں اسے فوراً مان لینا چاہیے۔ اس امت کے لیے شرک کو جرمِ عظیم سمجھنے ہی میں سب سے بڑی کامیابی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢)

توحید ہی مقصدِ زندگی ہے اور مرکزِ توحید سے ہٹ جانا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اس کائنات میں عدل و انصاف کا اصل محور توحید ہے۔ اس روئے زمین پر توحید کے بغیر کبھی عدل قائم نہیں ہوسکتا۔ غور کیجیے کہ اس سے بڑی خیانت و ناانصافی اور اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہوگا کہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی پرستش کی جائے؟!

شرک اور اس کی اقسام:

شرک کی خباثت اور ہولناکی کو جاننے کے لیے شرک کی چند قسمیں بیان کی جارہی ہیں تاکہ آپ کو شرک کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوسکیں۔ شرک کی دو قسمیں ہیں:

① شرکِ اکبر۔ ② شرکِ اصغر۔

شرکِ اصغر کی پھر دو قسمیں ہیں:

① شرکِ جلی۔ ② شرکِ خفی۔

شرکِ اکبر کبھی جلی ہوتا ہے اور کبھی خفی، شرکِ اکبر جلی کی مثال: قبروں پر سجدہ کرنا۔

شرکِ اکبر خفی کی مثال جیسے اللہ کے سوا کسی اور کو نفع و نقصان کا مالک سمجھنا، غیر اللہ پر بھروسا کرنا۔ ذیل میں ہر ایک کی تعریف اور مثال ذکر کی جارہی ہے تاکہ مدعا کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

1 شرکِ اکبر:

کسی عبادت کو غیر اللہ کے لیے خاص کرنا یا اس عبادت میں غیر اللہ کو شریک کرنا شرکِ اکبر کہلاتا ہے، کیونکہ عبادت صرف اللہ کے لیے خاص ہے، جیسے غیر اللہ سے دعا کرنا، غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے لیے اس کی بارگاہ میں (مندر یا مزار پر یا جن وشیاطین کے لیے) جانور ذبح کرنا، نذر و نیاز کرنا، مُردوں، اصحابِ قبور یا جن وشیاطین سے خوف کھانا کہ کوئی تکلیف نہ پہنچادیں، یا کسی بیماری میں نہ مبتلا کردیں، اسی طرح غیر اللہ سے ایسی امیدیں وابستہ کرنا جو صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، مثلاً حاجت پوری کرنا، مصیبت دور کرنا وغیرہ۔ سورت یونس (آیت: ۱۸) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی

الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾

''اور یہ (لوگ) اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو اُن کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں اور نہ کچھ بھلا ہی کر سکتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔ کہہ دو کہ کیا تم اللہ کو ایسی چیز بتاتے ہو جس کا وجود اُسے نہ آسمانوں میں معلوم ہوتا ہے اور نہ زمین میں۔ وہ پاک ہے اور (اُس کی شان) ان کے شرک کرنے سے بہت بلند ہے۔''

2 شرکِ اصغر:

شرکِ اصغر سے بندہ دینِ اسلام سے خارج تو نہیں ہوتا، البتہ اس کی توحید میں کمی آ جاتی ہے اور یہ شرکِ اکبر تک رسائی کا ذریعہ ہوتا ہے، جیسا کہ سطورِ بالا میں ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں: شرکِ جلی اور شرکِ خفی۔

❀ شرکِ اصغر جلی:

یہ شرکیہ الفاظ اور شرکیہ افعال و اعمال ہوتے ہیں، جیسے غیر اللہ کی قسم کھانا، جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ كَفَرَ أَوْ أَشْرَكَ»[1]

''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی، اس نے کفر کیا یا شرک کیا۔''

شرکِ جلی کی دوسری مثال جیسے کسی شخص کا یہ کہنا کہ اگر اللہ اور فلان نہ ہوتا، جیسے کہا جائے اللہ کہ اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا [نعوذ باللہ] جبکہ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کہا جائے کہ جیسا اللہ نے چاہا، پھر فلاں شخص نے ہمارا کام کر دیا، اس لیے کہ لفظ ''ثم'' [پھر] ترتیب [تراخی] کے لیے آتا ہے، جس سے یہ بات خود بخود عیاں ہو جاتی ہے کہ بندے کی چاہت اللہ کی مشیت کے تابع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [التكوير: ٩]

''اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو اللہ رب العالمین چاہے۔''

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥)

جبکہ حرفِ ''واؤ'' مطلق جمع و اشتراک کے لیے آتا ہے، جس سے ترتیب و تعقیب کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا، جیسے کسی سے کہا جائے کہ میرے لیے تو بس اللہ اور تم ہو، یا یہ کہا جائے کہ ایسا صرف اللہ اور تمھاری برکت کے طفیل ہے۔ یہ شرکیہ کلمات ہیں۔

شرکیہ افعال اعمال کی مثال جیسے کڑے پہننا، مصائب کے ازالے کے لیے دھاگا باندھنا، نظرِ بد سے بچنے کے لیے تعویذ پہننا، ان اعمال کے ساتھ جب کسی کا یہ عقیدہ بھی ہو کہ انھیں پہننے سے مصیبتیں دور ہوجاتی ہیں، بلائیں ٹلتی ہیں تو یہ شرکِ اصغر ہے اور اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ یہ چیزیں بذاتِ خود دفعِ مصائب کا ذریعہ ہیں، تو یہ شرکِ اکبر ہے، کیونکہ اس میں غیر اللہ کے ساتھ اس تعلق و ربط کا اظہار ہو رہا ہے جو صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔

❀ شرکِ اصغر خفی:

یہ ارادوں اور نیتوں کا شرک ہوتا ہے، جیسے ریا کاری یا حصولِ شہرت کے لیے ایسے اعمال کیے جائیں جن سے بظاہر اللہ کی بندگی مقصود ہو مگر باطن میں اس سے ریا کاری یا شہرت و شاباشی اور لوگوں کی تعریف کا حصول مقصود ہو۔ ریا کاری سے بندے کے سارے اعمال تباہ و برباد ہوجاتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اخلاصِ عمل کی تعلیم دی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ [الكهف: ١١٠]

''تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے، اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔''

مسند احمد اور طبرانی میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((أَخْوَفُ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ. قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ مَا الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ؟ قَالَ: الرِّيَاءُ))[1]

''مجھے تمھارے متعلق جس چیز کا سب سے زیادہ ڈر ہے، وہ شرکِ اصغر ہے۔ لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ریا کاری

[1] مسند أحمد (٥/ ٤٢٨، ٤٢٩) طبراني كبير (٤/ ٢٥٣)

[دکھاوے کے لیے کوئی عمل کرنا]۔‘‘

جس طرح لوگوں کو دکھانے کے لیے کوئی دینی عمل کرنا شرکِ اصغر ہے، اسی طرح دنیاوی لالچ میں کوئی دینی کام کرنا بھی شرکِ خفی ہے، جیسے کوئی شخص صرف مال و دولت جمع کرنے کے لیے حج کرتا ہو، صرف تنخواہ کے لیے اذان دیتا ہو، یا امامت کراتا ہو، یا دعوت دیتا اور تبلیغ کرتا ہو، علم حاصل کرتا ہو یا جہاد کرتا ہو وغیرہ، ایسے لوگوں کے لیے نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان میں بڑی عبرت ہے:

((تَعِسَ عَبُدُ الدِّيُنَارِ وَ تَعِسَ عَبُدُ الدِّرُهَمِ تَعِسَ عَبُدُ الُخَمِيُصَةِ تَعِسَ عَبُدُ الُخَمِيُلَةِ اِنُ أُعُطِيَ رَضِيَ وَ اِنُ لَمُ يُعُطَ سَخِطَ))[1]

’’ہلاک ہوا دینار کا بندہ، ہلاک ہوا درہم کا بندہ ہلاک ہوا کالی چادر کا بندہ، ہلاک ہو مخملی چادر کا بندہ، اگر اسے دیا جاتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہوجاتا ہے۔‘‘

خالص کا مطلب ہی یہی ہے کہ اپنے تمام افعال و اعمال اور ارادہ و نیت میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو خالص سمجھا جائے اور اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو۔ شرکِ اکبر ہو یا شرکِ اصغر؛ یہ چیزیں توحیدِ خالص کے منافی ہیں۔

شرکِ اکبر اور شرکِ اصغر میں فرق:

جب عمومی طور پر شرک کا لفظ بولا جائے تو یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ اس سے مراد شرکِ اکبر ہے یا شرکِ اصغر؟ کیونکہ دونوں میں فرق ہے اور دونوں کے مرتکب کی سزائیں بھی مختلف ہیں، اگرچہ دونوں جرم ہیں، لیکن ہر ایک کی نوعیت جدا ہے۔ ذیل میں ان کا فرق بیان کیا جا رہا ہے:

① شرکِ اکبر سے بندہ ملتِ اسلامیہ سے خارج ہوجاتا ہے، جبکہ شرکِ اصغر سے خارج نہیں ہوتا۔

② شرکِ اکبر کا مرتکب ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں رہے گا، جبکہ شرکِ اصغر سے اگر کوئی جہنم میں گیا تو وہ اس میں ہمیشہ ہمیش نہیں رہے گا۔

③ شرکِ اکبر سے تمام اعمال برباد ہوجاتے ہیں جبکہ شرکِ اصغر سے سارے اعمال برباد نہیں ہوتے، لیکن ریا کاری سے اس عمل کی جزا نہیں ملتی ہے۔

④ شرکِ اکبر کے مرتکب شخص کا خون و مال حلال ہے، جب کہ شرکِ اصغر میں ایسا کچھ نہیں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري (٣/ ١٠٥٨) سنن الترمذي (٤/ ٥٨٨)

لیکن شرکِ اصغر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے معمولی سمجھا جائے، کیونکہ شرکِ اصغر کا مرتکب بھی عظیم خسارے میں ہوتا ہے۔ شرکِ اصغر بڑے سے بڑے گناہ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے قرآنی آیات کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے ہر قسم کے شرک کو ناقابلِ معافی قرار دیا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

عقیدہ توحید کے متعلق تعلیماتِ شیخ جیلانی رحمہ اللہ:

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی ذاتِ گرامی یا آپ کے مزار کو تو لوگوں نے شرک کا اڈا بنا لیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود عقیدہ توحید میں بڑے پختہ تھے اور اس سلسلے میں ان کی تعلیمات نہایت ایمان افروز ہیں، چنانچہ خالق کو چھوڑ کر کسی مخلوق سے مانگنے والے کو وہ بے عقل قرار دیتے ہیں، جیسا کہ ان کی تصنیف ''الفتح الربانی'' (۱/۴) پر لکھا ہے:

''وہی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے اور تمام اشیا اسی کے قبضے و اختیار میں ہیں۔ اے غیر اللہ سے طلب کرنے والے! تو عقلمند نہیں ہے۔ کیا کوئی ایسی چیز بھی ہے جو اللہ کے خزانوں میں نہ ہو، جبکہ خود اللہ تعالیٰ نے (سورت حجر، آیت: ۹۲۱ میں) فرمایا ہے: ''کوئی ایسی چیز نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہیں۔'' وہ ہر چیز کا فاعل صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھتے تھے اور اس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں مانتے تھے، جیسا کہ ان کی کتاب ''فتوح الغیب'' (مقالہ: ۳) میں لکھا ہے:

''ہر کام کا حقیقی فاعل صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ کے سوا حرکت دینے والا اور ٹھہرانے والا کوئی نہیں۔ خیر و شر، نفع و نقصان، منع و عطا، بسط و کشاد، موت و حیات، عزت و ذلت اور امیری و فقیری اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔''

صرف اللہ ہی کے نفع ونقصان پر قادر ہونے کے بارے میں انھوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''غنیۃ الطالبین'' (ص: ۱۱۵، طبع نول کشور) میں لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا ہے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ اس کے سوا کسی مخلوق کو کوئی چارہ کار نہیں۔ اگر تمام مخلوقات مل کر کسی کو نفع پہنچانا چاہیں جو اللہ نے اس کے مقدر میں نہیں لکھا تو وہ اسے نفع نہیں پہنچا سکتیں اور اگر تمام مخلوقات کسی کو نقصان پہنچانے کے

درپے ہو جائیں جو اللہ نے اس کی قسمت میں نہیں لکھا تو وہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتیں، جیسا کہ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

''اگر آپ کو اللہ تکلیف پہنچائے تو اسے اس کے سوا دور کرنے والا کوئی نہیں، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنا فضل وکرم پہنچاتا ہے۔''

پیر صاحب موصوف کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تقدیر کوئی نہیں بدل سکتا۔ چنانچہ وہ ''فتوح الغیب'' مقالہ (۴۲) میں لکھتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں ایک دفعہ نبی مکرم ﷺ کے پیچھے سواری پر سوار تھا، اچانک آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: اے لڑکے! تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کو نگاہ میں رکھ، (یعنی اس کے احکام وحدود کی حفاظت کر) اللہ تجھے اپنی حفاظت میں رکھے گا اور تو اسے مدد کرنے والا پائے گا۔ جب تو سوال کرے تو صرف اللہ ہی سے کر۔ جب تو مدد چاہے تو صرف اللہ ہی سے مدد مانگ، کیونکہ جو کچھ ہونے والا ہے، اسے لکھ کر تقدیر کا قلم خشک ہو چکا ہے۔ اگر تجھے تمام بندے ایسا فائدہ پہنچانا چاہیں جو تیری تقدیر میں نہیں لکھا ہے، تو وہ اس کام پر قدرت نہیں رکھتے اور اگر تمام لوگ ایسا نقصان پہنچانا چاہیں جو تیرے مقدر میں نہیں لکھا گیا تو وہ اس کام پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔''[1]

اس حدیث کو نقل کر کے موصوف فرماتے ہیں:

''ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث شریف کو اپنے دل کا آئینہ، اپنا اوڑھنا بچھونا اور ہر وقت کا موضوعِ گفتگو بنالے اور اپنی تمام حرکات وسکنات میں اس پر عمل کرے، تاکہ دنیا وآخرت میں سلامت رہے اور اللہ کی رحمت کے ساتھ عزت پائے۔''[2]

حاجت روا اور مشکل کشا کون؟

''فتوح الغیب'' (مقالہ: ۳۰) میں مام جیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

[1] مسند أحمد (۱/ ۲۹۳ تا ۳۰۳) صحیح الترمذي، رقم الحدیث (۲۰۴۳)

[2] مرشد جیلانی کے ارشاداتِ حقانی (ص: ۸۲، ۸٦، مولفہ مولانا محمد حنیف یزدانی)

''تجھے صرف ایک ہی سے مانگنا چاہیے اور تجھے دینے والا بھی صرف ایک ہی ہے۔ تیرا مقصود بھی ایک ہی ہے اور وہ ایک کون ہے؟ وہ تیرا پروردگار ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہوں کی پیشانیاں اور تمام مخلوق کے دل ہیں۔''

نیز اپنی کتاب ''الفتح الربانی'' (ص: ۱۵) میں لکھتے ہیں:

''اسی (اللہ) سے سب کچھ مانگو، غیراللہ سے نہ مانگو، اپنے جیسی مخلوق کے سامنے ذلیل نہ ہو، سوال بھی اسی سے کرو اور تیرا معاملہ صرف اسی کے ساتھ ہو، کسی دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔''

اسی کتاب ''الفتح الربانی'' میں آگے چل کر (ص: ۵۴۳) لکھتے ہیں:

''مومن لوگ اپنے دلوں میں صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور صرف اسی سے امید رکھتے ہیں۔ اپنی حاجتیں اسی کے سامنے پیش کرتے ہیں، کسی دوسرے کے سامنے نہیں۔ وہ صرف اسی دروازے کی طرف لوٹتے ہیں، کسی اور کی چوکھٹ پر نہیں جاتے۔''

اسی کتاب (ص: ۳۰۹) میں مزید لکھتے ہیں:

''تجھ پر افسوس ہے! اگر اللہ تجھے مخلوق کے ہاتھوں نفع پہنچانا چاہے گا تو نفع پہنچائے گا اور اگر نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے گا تو ایسا ہی ہوگا۔ وہی ان کے دلوں کو مسخر کرنے والا ہے اور وہی نرم یا سخت بنانے والا، وہی زندہ کرتا ہے، وہی مارتا ہے، وہی دینے والا اور وہی نہ دینے والا ہے، وہی عزت و ذلت، بیماری وصحت دینے والا ہے، وہی پیٹ بھرنے والا ہے اور وہی بھوکا رکھنے والا ہے، وہی پہنانے والا، اور وہی ننگا رکھنے والا ہے، وہی مونس اور وہی وحشت طاری کرنے والا ہے۔ وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن، وہی سب کچھ ہے، نہ کہ کوئی دوسرا۔''

''غنیة الطالبین'' (ص: ۱۱۳ عربی اردو مطبع نول کشور) میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے مقدر میں روزی لکھ دی اور تقسیم کر دی ہے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کرسکتا اور نہ اسے کوئی روک سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی درشتی وسختی واقع ہوسکتی ہے۔ نہ نعومت و نرمی اور کوئی شخص کل کی روزی آج نہیں کھا سکتا اور نہ زید کا حصہ (کسی دوسرے) عمر کو مل سکتا ہے۔''

"غنیۃ الطالبین" ہی (ص: ٦٦٣) میں لکھتے ہیں:

''اللہ کے بنائے ہوئے (اور اس کے حکم) کو کوئی رد نہیں کرسکتا۔ اور نہ اس کے بنائے ہوئے میں کوئی تبدیلی کرسکتا ہے۔ جسے اس نے عزت دی، اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا اور جسے اس نے ذلیل کر دیا، اسے کوئی عزت دینے والا نہیں، جسے اللہ نے جمعیت بخشی، اسے کوئی پراگندہ نہیں کرسکتا، (اس کا شیرازہ نہیں بکھیر سکتا) اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے۔''

"غنیۃ الطالبین" ہی (ص: ٧٥٧) میں رقمطراز ہیں:

''(تورات میں ہے:) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وہ شخص ملعون ہے جو کسی اپنے جیسی مخلوق پر بھروسا کرتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مجھے اپنی عزت و بزرگی اور جلال کی قسم! جو شخص میرے سوا کسی دوسرے سے امیدیں رکھتا ہے، میں اس کی امید ضرور قطع کروں گا اور اسے ان ہی لوگوں کے مابین ذلیل و خوار کروں گا۔ اسے اپنی قربت سے دور اور وصل سے محروم کردوں گا۔ آیا سختی کے وقت میرے سوا دوسروں سے امیدیں رکھتے ہو اور اپنے خیالات سے غیروں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہو؟ حالانکہ ان کے دروازوں پہ تالے پڑے ہیں اور ان کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہیں۔''[1]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة: ٢٥٧]

''اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے ان کو (کفر کے) اندھیرے سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لاتا ہے اور کافروں کے حمایتی طاغوت ہیں ان کو روشنی سے (ایمان کی جو اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کی طرف میں رکھی ہے) نکال کر (کفر کے) اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی ہیں، ہمیشہ اس میں رہیں گے۔''

[1] مرشد جیلانی کے ارشادات حقانی (ص: ١٠٣ تا ١٠٧)

یہاں آپ ذرا غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں نے کے متعلق کیا فرمایا ہے کہ ایمان والے میرے دوست ہیں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں، انھیں وہ اپنی آسمانی ہدایات کے ذریعے اندھیروں سے روشنی یعنی گمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف لے جاتا ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کو دوست بنانے سے انکار کرتے ہیں، اس کے علاوہ کسی اور کو دوست بناتے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں اور ان کا حشر کیا ہونے والا ہے؟ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکہف (آیت: ۱۰۲) میں فرمایا ہے:

﴿ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴾

''کیا یہ کافر یہ سمجھے ہیں کہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا حمایتی بنائیں ہم نے تو ان کے لیے دوزخ کی مہمانی تیار کر رکھی ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں کے ٹھکانے کے متعلق فرما رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کے علاوہ کسی اور کو کارساز بناتے ہیں یا اسے اپنا مددگار سمجھتے ہیں، قیامت کے دن وہاں کوئی کسی کے کام آئے گا نہ کوئی ولی اور نہ کوئی پیر ہی کام آئے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اِن سب کو جمع کرلے گا، گواہی کے لیے اور یہ وہاں کھلا انکار کر دیں گے، اولیاء اللہ اور صالحین ان کے خلاف گواہی دیں گے اور کہیں گے: اے اللہ! ہم نے انھیں نہیں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا دوست بناؤ، کیونکہ یہ بات ہمارے شایان شان نہیں تھی۔

مسلمانو! اگر آج آپ نے اپنے ''پیرانِ پیر'' کا دامن نہ چھوڑا تو اُس دن کہاں جاؤ گے؟ کیونکہ اس دن وہاں اور کوئی دامن نہیں ہوگا، سب کے سب ننگے ہوں گے، یہ نبی اکرم ﷺ کی حدیث بھی ہے جس کی راوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

وہاں نفسی نفسی کا عالم ہوگا، کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، اس لیے آج آپ کو اللہ تعالیٰ نے صحت اور وقت بھی دیا ہے، لہٰذا آپ لوگ اپنے عقیدے کی اصلاح کرلیں اور اپنے رب سے دوستی کرلیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دوست بنانا کوئی مشکل کام نہیں، بہت ہی آسان ہے۔ اسے دوست بنانے پر تمھارا کوئی خرچ نہیں آئے گا، تمھیں اس کو کھلانا پلانا نہیں پڑے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود

قرآنِ کریم میں فرمایا ہے:

﴿ مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ﴾ [الذاریات: ۵۷]

''میں ان سے طالبِ رزق نہیں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے (کھانا) کھلائیں۔''

اللہ ہی کے پاس تمام زمینوں اور آسمانوں کے خزانے ہیں۔ اس کو کسی کی محتاجی نہیں ہے۔ یہ محتاجی تو ان قبروں کے مجاوروں، نام نہاد پیروں اور دھوکا باز مولویوں کو ہے، اسی لیے وہ آپ کو قرآنِ کریم کے قریب پھٹکنے نہیں دیتے اور آپ کو اولیاء اللہ کی جھوٹی کرامتیں بیان کر کے اپنی محتاجی اور فقیری کو دور کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں سے بچنے کی کوشش کریں، اپنے اللہ پر توکل کریں اور اسی کو اپنا مشکل کشا بنائیں، وہی ہم سب کا خالق و مالک ہے، اس کی نافرمانی سے بچنا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرنی چاہیے، تاکہ ہمارا اللہ کریم ہم پر راضی ہوجائے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ کو ٹٹول کر دیکھیں! کہیں ہم سے کوئی ایسا کام تو نہیں ہو رہا جو نبی اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہ ہو؟

ہمیں اپنی زندگی کو نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارنا ہے اور جب تمام تر عبادات اور ہر قسم کے معاملات میں رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو سامنے رکھیں گے تب ہی ہم نبی مکرم ﷺ کے حقیقی اُمتی ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہوجائے گی، ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکہف (آیت: ۱۰۷، ۱۰۸) میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اُن کے لیے جنت کے باغ مہمانی ہوں گے۔

ہمیشہ ان میں رہیں گے اور وہاں سے مکان بدلنا نہ چاہیں گے۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ثابت قدم رکھے اور صحیح دین سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے طریقہ زندگی کو اپنا لیں جیسا کہ کہا گیا کیا ہے کہ نبی ﷺ ہی کا طریقہ نیک اعمال ہونے

کا ضامن ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اور مجھے جنت ہی نہیں بلکہ جنت الفردوس جو امتیوں کے لیے سب سے اونچا مقام ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے اللہ تعالیٰ وہ عطا فرمائے گا جہاں نہ غم ہوگا نہ کسی چیز کی کوئی پریشانی اور نہ کسی قسم کا فکر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو وہ نصیب فرمادے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. قبولیتِ عمل کی شرائط۔ تالیف: مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
2. مختصر کتاب التوحید۔ تالیف: مولانا انصار زبیر محمدی

مصادر ومراجع

① قرآن کریم۔

② تفسیر القرآن، امام ابن کثیر۔

③ تفسیر احسن البیان، حافظ صلاح الدین یوسف۔

④ ارکانِ ایمان ..ایک تعارف۔ تالیف: حافظ ڈاکٹر محمد اسحاق زاہد، مراجعہ وتقدیم: ابوعدنان محمد منیر قمر حفظہ اللہ

⑤ صحیح اسلامی عقیدہ، تالیف: شیخ حافظ بن احمد الحکمی، ترجمہ: مولانا مشتاق احمد کریمی۔

⑥ حقوقِ مصطفیٰ ﷺ، تالیف: ابوعدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑦ حراستِ توحید (اردو ترجمہ)۔ تالیف: الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ۔

⑧ حقیقتِ توحید۔ تالیف: ڈاکٹر صالح فوزان الفوزان، ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحمید و ڈاکٹر فضل الٰہی۔

⑨ سوئے حرم، ابوعدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑩ صحیح اسلامی عقیدہ۔ تالیف: علامہ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ۔ ترجمہ: مولانا مشتاق احمد کریمی۔

⑪ عبادت میں شرک، تالیف: مولانا عبدالمتین۔

⑫ قصص الانبیاء۔ امام ابن کثیر۔ دار السلام۔

⑬ قبولیتِ عمل کی شرائط، تالیف: ابوعدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑭ مختصر کتاب التوحید، تالیف: مولانا انصار زبیر محمدی۔

⑮ اسکرپٹ ریڈیو پروگرام از ابوعدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

گلدستہ دروسِ خواتین

2

فضائل قرآن

تالیف
محترمہ ام عدنان قمر

تنقیح و مراجعہ
فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ - ڈسکہ

ام القریٰ پبلی کیشنز
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

فون: 0333-8110896. 0321-6466422

قرآن کریم کے فضائل و برکات

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ [یونس: ۵۷]

''لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماریوں کی شفا اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ پہنچی ہے۔''

ہر طرح کی حمد و ثنا صرف اس ذاتِ پاک کے لیے ہے، جو ہمارا خالق، مالک اور رازق ہے، اس کے علاوہ ہمارا کوئی الٰہ نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ حی اور قیوم ہے، رحیم اور رحمٰن بھی ہے، اسی نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے قرآن مجید نازل فرمایا اور قیامت تک کے لیے قرآنِ کریم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا۔

ان گنت درود و سلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ پر جنھوں نے حقِ رسالت ادا کیا، سلام اس قلبِ مبارک پر جس پر قرآنِ مجید نازل ہوا اور اس دل و دماغ پر جس نے سب سے پہلے قرآنِ مجید حفظ کیا، سلام ہو اس پر جس ذاتِ مبارک نے قرآنِ مجید امت کو سنایا اور پڑھایا۔ وہ قرآن جو سرتا سر روشنی اور ہدایت ہے، جو برکت اور رحمت ہے، جو حق اور سچ ہے۔ دنیا بھر کے لوگو! قرآنِ کریم نازل فرمانے والے رب العالمین نے سورت طٰہٰ (آیت: ۱۲۳) میں وعدہ فرمایا ہے:

﴿ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰى﴾

''جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبختی ہی میں مبتلا ہوگا۔''

جو لوگ ایمان اور یقین کے طالب ہوں، ہدایت اور رحمت کے محتاج ہوں، مصائب و غموم میں مبتلا ہوں، بیماریوں، پریشانیوں اور دکھوں میں زندگی بسر کر رہے ہوں، خوف اور بھوک کے عذاب سے دوچار ہوں، امن و سلامتی اور خوشحالی کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہوں،

ذلت اور رسوائی کو اپنا مقدر سمجھتے ہوں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا قرآن کیا کچھ کہہ رہا ہے۔ لوگو! ذرا کان لگا کر قرآنِ کریم کی سورۃ التکویر (آیت: ۲۶) میں اُس کی پکار کو سنو! فرمانِ الٰہی ہے:

﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ﴾ ''لوگو! (مجھ سے منہ موڑ کر) کہاں جاتے ہو؟''

① فرمایا: مجھے چھوڑو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔

② بدبختی میں مبتلا ہو جاؤ گے ... پھر:

③ دُنیا میں ذلیل اور رسوا ہو گے۔

④ اور آخرت میں کیا ہوگا... شعلے اگلتی جہنم میں جھونک دیے جاؤ گے۔

تمھارے لیے اچھا یہی ہے کہ میری طرف پلٹ آؤ تاکہ تم پر رحم کیا جائے! جیسا کہ سورۃ الانعام (آیت: ۱۵۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾

''اور یہ کتاب بھی ہم ہی نے اتاری ہے، برکت والی، تو اس کی پیروی کرو اور (اللہ سے) ڈرو تاکہ تم پر مہربانی کی جائے۔''

اللہ رب العالمین کے قرآن کی پکار ہے کہ میری طرف آؤ گے تو ...:

① یقیناً برکت دیے جاؤ گے۔ ② یقیناً رحمت سے نوازے جاؤ گے۔

③ دنیا میں عزت اور افتخار پاؤ گے۔ ④ اور آخرت میں نعمتوں بھری جنت میں داخل ہو گے۔

قرآنِ کریم دُنیا کی تمام الہامی کتب سے بڑھ کر عزت و شرف، عظمت اور فضیلت والی کتاب ہے جو خیر و برکت سے مالا مال، ہدایت اور حکمت سے لبریز، شک و شبہہ سے بالاتر، حق و باطل میں فرق کرنے والی، جہالت کے اندھیروں سے نکال کر توحید کے نور سے منور کرنے والی اور ایمان لانے والوں کو جنت کی بشارت دینے والی اور انکار کرنے والوں کو جہنم سے ڈرانے والی ہے۔ بنی نوعِ انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت... قرآن مجید اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا کلام ہے، جس رات میں اللہ کا یہ کلام نازل ہوا، اس رات میں اتنی فضیلت عطا فرمائی کہ اس رات کی عبادت ہزار مہینے [۸۳ سال اور ۴ ماہ] کی عبادت سے افضل قرار دی گئی، جیسا کہ سورۃ القدر (آیت: ۱ تا ۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِيۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝ وَمَآ اَدۡرٰكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۝ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ﴾

''ہم نے اس (قرآنِ کریم) کو شبِ قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا اور تمھیں کیا معلوم کہ شبِ قدر کیا ہے؟ شبِ قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔''

قرآنِ کریم کی فضیلت میں اگر صرف یہی ایک آیت نازل کی گئی ہوتی تب بھی قرآن مجید کی عظمت اور فضیلت کے لیے کافی تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے قرآنِ کریم کے فضائل و برکات کے بارے میں جو احادیثِ مبارکہ ارشاد فرمائی ہیں، وہ اتنی زیادہ ہیں کہ اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے امتِ محمدیہ ﷺ کا ہر فرد اگر ساری زندگی اللہ کے حضور سجدے میں گزار دے، تب بھی حقِ شکر ادا نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام:

قرآنِ کریم کی فضیلت اور شرف و منزلت کے لیے یہ حقیقت تسلیم کرنا ہی کافی ہے کہ یہ یقیناً علیم وحکیم اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام ہے اور یہ اُسی کی طرف لوٹے گا۔ یہ قرآنِ کریم بلاشبہہ اللہ تعالیٰ ہی نے نازل فرمایا ہے اور حضرت جبریل علیہ السلام نے اسے اللہ تعالیٰ سے حاصل کیا اور رسول اللہ ﷺ کو من وعن ٹھیک اسی طرح پہنچا دیا، جس طرح انھوں نے اسے ربِ ذو الجلال سے حاصل کیا تھا، قرآنِ کریم بلاشبہہ اللہ رب العالمین کا کلام ہے، مخلوق نہیں ہے اور یہ کلام اس ذاتِ عالی کا کلام ہے جس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی وہ کلامِ پاک ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان سے مخاطب ہے اور بندہ مومن جب اللہ کا کلام قرآنِ کریم سنتا ہے تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور اس کا دل جیسے ابھی پرواز کر جائے گا، اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، کیونکہ قرآنِ کریم کی اثر انگیزی ہی بڑی زبردست ہے۔ اگر اس کلامِ الٰہی کو پہاڑ پر نازل کر دیا جاتا تو وہ بھی لرز جاتے اور اللہ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے،[1] جیسا کہ سورۃ الحشر (آیت: ۲۱) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلۡكَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ﴾

[1] شرح العقيدة الواسطية، محمد خليل هراس (ص: ۱۵۳، ۱۵٤)

''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ کر پاش پاش ہو جاتا ہے، اور یہ باتیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ فکر کریں۔''

پہاڑوں کی قوت و طاقت کے مقابلے میں انسانی دل کی کیا حیثیت ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اُسے اٹھانے کی قوت عطا کی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل اور رحمت سے سرفراز فرماتا ہے۔[1]

ربِ ذوالجلال نے ہمیں قرآنِ کریم کی جو عظیم دولت عطا کی ہے اور جس فضل و رحمت کا ہم پر فیضان کیا ہے، اسی پر ہماری ساری راحت و مسرت موقوف ہے اور ہمیں اسی متاعِ بے بہا پر خوشی محسوس کرنی چاہیے۔

ہدایت، رحمت اور بشارت:

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے بارے میں سورۃ النحل (آیت: ۸۹) میں فرمایا ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ [النحل: ۸۹]

''اور ہم نے تم پر (ایسی) کتاب نازل کی ہے کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہدایت، رحمت اور بشارت کی زبردست اہمیت کی وجہ سے اس کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے:

① اَلْهُدَىٰ: وہ ہدایت جس کے واضح بیان سے عقائد اور فہم کی اصلاح کی جائے اور گمراہی سے بچ کر قدم راہِ نجات کی طرف بڑھنے لگیں۔

② اَلرَّحْمَةُ: وہ رحمت جس کی بدولت دُنیا و آخرت دونوں زندگیوں کی خوش بختی حاصل کی جائے۔

③ بُشْرَىٰ: وہ بشارت جس میں دنیا و آخرت کی بھلائیوں اور مسرتوں کا وعدہ ہوا ہو۔ یہ تمام نعمتیں غیر مسلموں کے لیے نہیں، صرف مسلمانوں کے لیے ہیں، کیونکہ جب کافروں نے قرآنِ کریم سے منہ موڑلیا تو انھوں نے اپنے آپ کو ان تمام نعمتوں سے از خود محروم کر لیا۔ اللہ

[1] التذكار في أفضل الأذكار (ص: ٥٤)

رب العالمین نے اس کی دلیل سورت حٰم السجدہ (آیت: ۴۴) میں ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمائی ہے:

﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ﴾

''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جولوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے۔''

نیز سورت یونس (آیت: ۵۷) میں فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

''لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماریوں کی شفا اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ پہنچی ہے۔''

اور سورۃ الاحزاب کی (آیت: ۴۴) میں فرمایا:

﴿ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴾

''جس دن وہ اللہ سے ملیں گے اس دن ان کا تحفہ سلام ہوگا اوران کے واسطے اچھا اجر تیار ہے۔''

انسان کی حقیقی زندگی اور شفا وتندرستی کا انحصار دل پر ہے۔ سورۃ الحج (آیت: ۴۶) میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾

''کیا یہ لوگ زمین میں نہیں پھرے (ملکوں کی سیر نہیں کی، اگر سیر کرتے) تو ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے (حق بات) سمجھ لیتے یا کان ایسے ہو جاتے جن سے (نصیحت) سن لیتے، بات یہ ہے کہ آنکھیں تو (ان کی) اندھی نہیں ہیں، لیکن دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہیں۔''

یہ وحی الٰہی جو قرآنِ کریم کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے، آدمی کی روح اور زندگی

ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''خبردار! بے شک جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ صحیح اور صالح ہوتا ہے تو تمام بدن (کا فعل) صالح اور درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگاڑ اور فساد سے دو چار ہوتا ہے تو سارا بدن بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ خبردار! یہ ٹکڑا دل ہے۔''[1]

کسی شاعر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

دل کے بگاڑ سے بگڑتا ہے آدمی
جس نے اسے سنبھال لیا وہ سنبھل گیا

قرآنِ کریم دل کی روح اور اصلاحِ قلب کا موثر ترین عامل ہے۔ جب دل بیدار ہو جاتا ہے تو انسانی زندگی کے تمام گوشے قرآنی ہدایت کے نور سے منور ہو جاتے ہیں اور انسان اللہ کے فضل و رحمت کا حقدار بن جاتا ہے، جیسا کہ سورۃ الشوریٰ (آیت: ۵۲، ۵۳) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴾

''اور اسی طرح (اے نبی!) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تیری طرف بھیجی (اس سے پہلے) تجھ کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کتاب کیا چیز ہے؟ اور نہ ایمان معلوم تھا لیکن ہم نے قرآن کو ایک نور بنایا، ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اس قرآن سے راہ پر لگا دیتے ہیں اور تو بھی سیدھی راہ لوگوں کو دکھلاتا رہتا ہے، اس اللہ کی راہ جس کا (سب کچھ) ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں (سب کا مالک وہی) ہے، سن لے، اللہ تعالیٰ ہی تک سب کام پہنچیں گے۔''

اور سورت بنی اسرائیل (آیت: ۸۲) میں فرمایا ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩)

﴿ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾

’’اور ہم قرآن (کے ذریعے) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔‘‘

کیونکہ مومنوں کے لیے تو قرآنِ کریم ہر قسم کی راہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ [الإسراء: ۹]

’’بے شک یہ قرآن وہ راہ بتاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے۔‘‘

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں یہ واضح فرمایا ہے کہ بلاشبہ قرآنِ کریم تمام آسمانی کتابوں سے زیادہ عظیم، سب سے زیادہ جامع اور اللہ رب العالمین کی طرف سے سب سے آخر میں نازل ہونے والا بے مثل کلام ہے۔

قرآن...سابقہ کتابوں کا تصدیق کنندہ اور نگران:

سورۃ المائدہ (آیت: ۴۸) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾

’’اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان (سب) پر نگران ہے، تو جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان کا فیصلہ کرنا اور حق جو تمھارے پاس آ چکا ہے اس کو چھوڑ کر اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کے لیے ایک دستور اور طریقہ

مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی شریعت پر کر دیتا مگر جو حکم اس نے تمھیں دیے ہیں، ان میں تمھاری آزمائش کرنا چاہتا ہے، سو نیک کاموں میں جلدی کرو، تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر جن باتوں میں تمھیں اختلاف تھا وہ تمھیں بتا دے گا۔‘‘

قرآن مجید دوسری کتابوں پر نگران و نگہبان اس لیے ہے کہ دین کے اصول و کلیات تمام کتبِ سماویہ اور آسمانی تعلیمات میں یکساں اور مشترک ہیں۔ چنانچہ سورۃ الانبیاء (آیت: ۹۲) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴾

’’(مسلمانو!) تمھارا یہ مذہب ہے وہی ایک مذہب اور میں تمھارا مالک ہوں مجھ ہی کو پوجو (اور کسی کی پرستش نہ کرو)۔‘‘

قرآن سے پہلی کتب اور صحیفے اپنے اپنے وقت کے لیے تھے اور اس کا ایک حصہ تھے۔ یہ صحیفے ایک خاص وقت تک محفوظ رہے مگر بعد میں محفوظ نہ رہ سکے اور تحریف و تغیر کا شکار ہوگئے۔ قرآنِ کریم دائمی صحیفہ اور آخری کتاب ہے، اس میں دین کے تمام اصول و ضوابط کامل شکل میں پوری طرح آگئے ہیں۔ اسی لیے سورۃ المائدہ (آیت: ۳) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

’’آج ہم نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند فرمایا۔‘‘

غرض یہ کہ دین و دنیا کے ہر معاملے میں قرآنِ کریم سیدھی اور سچی راہ دکھاتا ہے اور امورِ خیر کی ترغیب دیتا ہے۔ ویسے بھی عظمتِ قرآن کے عظیم دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن کے دشمن قرآن پر ایمان نہ رکھنے کے باوجود اس کی عظمت کی گواہی دیتے آئے ہیں اور کہا جاتا ہے:

’’حق وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں۔‘‘

قرآن لے کر نازل ہونے والے فرشتے کی فضیلت:

قرآنِ کریم کی تعریف میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس فرشتے کی بڑی شان بیان فرمائی ہے جو ہمارے پیارے نبی ﷺ پر قرآن لے کر نازل ہوتا تھا، وہ فرشتہ حضرت جبریل علیہ السلام ہیں جو وحی الٰہی کے امین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں ان کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک جگہ سورۃ النحل (آیت: ۱۰۲) میں فرمایا ہے:

﴿ قُلۡ نَزَّلَهٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ هُدًى وَّ بُشۡرٰى لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ﴾

''کہہ دو کہ اس کتابِ مجید کو روح القدس تمھارے رب کی طرف سے سچائی کیساتھ لے کر نازل ہوئے ہیں تاکہ یہ مومنوں کو ثابت قدم رکھے اور حکم ماننے والوں کے لیے تو یہ ہدایت اور بشارت ہے۔''

اس آیتِ کریمہ میں روح القدس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں، جیسا کہ سورت مریم (آیت: ۱۷) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا﴾ ''ہم نے اس (مریم) کی طرف اپنی روح بھیجی۔''

یہاں روح کا معنی فرشتے ہیں، یعنی اپنے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ بھیجا (اور وہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے) القدس کے معنی ہیں: مقدس فرشتہ۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر حضرت جبریل علیہ السلام کو پانچ صفات سے متصف کیا ہے، سورۃ التکویر (آیت: ۱۹ تا ۲۱) میں فرمایا ہے:

﴿ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۞ ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ ۞ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ ۞ وَمَا صَاحِبُكُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ﴾

''بے شک یہ قرآن عزت والے زور والے پیغمبر (حضرت جبریل) کا پہنچایا ہوا ہے۔ عرش والے رب کے پاس اس کا بڑا درجہ ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے اور پھر وہ امانت دار ہے اور (اے مکہ والو!) تمھارا ساتھی (نبی ﷺ) دیوانہ نہیں ہے۔''

یہ پانچ صفات ہیں:

① وہ معزز ہیں۔ ② وہ صاحبِ قوت ہیں۔

③ رب العالمین کے ہاں ان کا بلند مرتبہ ہے۔

④ آسمانوں میں ان کی بات مانی جاتی ہے۔ ⑤ وہ امین بھی ہیں۔

ان کا ذکر اس وصف کے ساتھ بیان کرنے میں ان کا اکرام واحترام بھی ہے اور ان کے بلند مرتبے کا اظہار و اعلان بھی۔ یہ پانچوں صفات اس حقیقتِ کبریٰ کا ثبوت ہیں کہ قرآنِ عظیم کی سند بالکل معتبر و صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے نبی محمد ﷺ نے قرآنِ کریم حضرت جبریل علیہ السلام سے سنا اور حضرت جبریلِ امین نے رب العالمین سے سنا، چنانچہ اس سند کے بلند اور عظیم ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ یہ کتابِ مبین ہے۔ لَا رَیْبَ فِیْهِ...!

بہر حال قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی عظمتوں بھری کتاب ہے اور اس میں قصصِ انبیا یعنی پہلے نبیوں کے واقعات اور ان کی امتوں کے انجام اور ہمارے نبی ﷺ کے واقعات اور آپ ﷺ کے معجزے، قرآن کا اتباع نہ کرنے پر دنیا و آخرت میں عذاب کی وعید کی طرف اشارہ اور قرآنِ کریم کا اتباع کرنے والوں کے لیے جنت کی خوشخبریاں ہیں۔ لہٰذا دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل کرنے کی امید رکھتے ہوئے اس مبارک کتاب کے احکام کے مطابق عمل کریں، کیونکہ دُنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت اسی میں ہے، جیسا کہ سورۃ الاعراف (آیت: ۱۵۷) میں ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾

”وہ جو (محمد) رسول (اللہ) کی، جو نبی اُمی ہیں، پیروی کرتے ہیں جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ انھیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو اُن کے لیے حلال کرتے ہیں اور

ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام ٹھہراتے ہیں اور اُن پر سے بوجھ اور طوق جو اُن (کے سر) پر (اور گلے میں) تھے اتارتے ہیں تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انھیں مدد دی اور جو نور اُن کے ساتھ نازل ہوا ہے، اس کی پیروی کی، وہی مراد پانے والے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نور کے ساتھ تشبیہ دی ہے، کیونکہ وہ جہالت کے اندھیروں کو مٹا دیتا ہے۔ اس کی روشنی سے حق ظاہر ہوتا ہے اور وہ باطل کے مقابلے میں ممتاز ہوجاتا ہے، اس کے ذریعے سے ہدایت اور گمراہی اور بھلائی اور برائی کے مابین تمییز کی جاتی ہے۔ پس ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ قرآنِ عظیم کے نور سے روشنی حاصل کرے۔ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانے اور اس کے احکام بجالائے، اس کی منع کردہ باتوں سے اجتناب کرے اور اس کے واقعات اور مثالوں سے عبرت حاصل کرے۔ اس ساری گفتگو کے بعد کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے نورِ ہدایت سے محروم رہے اور بصیرت حاصل نہ کرے۔ جس شخص نے اس نور کو قبول کرلیا، اس کا اتباع کیا اور اس نورِ مبین میں جو کچھ ہے اس کے مطابق عمل کیا، وہی کامیاب اور دنیا و آخرت میں اپنے مطلوب کو پانے والا بامراد ہے۔ ایسا خوش قسمت شخص دین و دنیا کی بھلائیاں حاصل کرے گا اور جب احوال کی اصلاح ہوجائے تو کردار سیدھا، قدم ثابت اور دل مطمئن ہوجاتا ہے۔ بندے پر سکینت نازل ہوتی ہے، دل راضی ہوجاتا ہے اور وہ امن اور ایمان سے لطف اندوز ہوتا ہے، جیسا کہ سورۃ الرعد (آیت: ۲۸) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾

''آگاہ رہو! اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔''

کیا اس کے بعد بھی کوئی اور نعمت اور سامانِ راحت ہے؟ اس برکت کا سبب یہ ہے:

﴿ اِتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ [محمد: ۳]

''انھوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کی پیروی کی۔''

بندہ جب حق کی پیروی کرتا ہے تو وہ دنیا بھر میں سب سے اچھی حالت میں ہوتا ہے اور آخرت میں وہ دائمی نعمتوں سے سرفراز ہوگا۔

مسلمانوں پر قرآنِ کریم کے حقوق:

قرآنِ کریم کا ہم پر حق ہے کہ ہم اس پر اور اس میں نازل شدہ تمام اوامر پر ایمان لائیں اور اس بات پر بھی ایمان لایا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس کے رسول ﷺ پر نازل کیا گیا، نیز اس کے محفوظ ہونے پر ایمان لایا جائے۔ قرآنِ کریم ہی وہ کتاب ہے جو حکمتوں سے بھری ہوئی ہے اور اس کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس نے ہمیں یعنی انسانوں کو باہمی یگانگت کے رشتے میں جوڑنے کا گر بتا دیا کہ سب انسانوں کا ایک ہی پروردگار ہے۔ سب کو اسی کی بندگی کرنی چاہیے، اس کی وحدت و یکتائی میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ قرآنِ کریم بہت ساری فضیلتوں اور برکتوں سے بھرا ہوا ہے۔

سب سے افضل لوگ... قرآنِ کریم سیکھنے اور سکھانے والے:

بلاشبہ قرآنِ کریم کی تعلیم حاصل کرنا اور اس کی تعلیم کا اہتمام کرنا لوگوں کو اس کے معانی اور احکام سے روشناس کرانا نہایت افضل اور باعثِ تقربِ الٰہی اعمال میں سے ہے۔ قرآنِ کریم سیکھنے اور اس کی تعلیم کی ترغیب دینے والی احادیث بڑی کثرت سے وارد ہوئی ہیں، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جو شخص ان مبارک احکام کی تعلیم میں مشغول ہو وہ انبیا کے بعد افضل ترین لوگوں میں سے ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے بہترین وہ شخص ہے، جو قرآنِ کریم سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔''[1]

قرآن مجید کے پڑھنے اور نہ پڑھنے والوں میں فرق ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے مثال سے واضح فرمایا ہے:

''وہ مومن جو قرآن پڑھتا اور اس پر عمل کرتا ہے، نارنگی یا سنگترے کی طرح ہے جس کا ذائقہ بھی اچھا اور خوشبو بھی عمدہ ہے اور وہ مومن جو قرآن نہیں پڑھتا مگر اس کے مطابق عمل کرتا ہے، یہ کھجور کی طرح ہے، جس کا ذائقہ اچھا ہے مگر اس میں خوشبو نہیں اور اس منافق کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے مگر عمل نہیں کرتا اس پھول (گلِ ریحان) کے مانند

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٢٧)

ہے، جس کی خوشبو عمدہ مگر ذائقہ کڑوا ہے اور اس منافق کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا تُمے کی طرح ہے جس کا ذائقہ کڑوا ہے اور اس کی خوشبو بھی کڑوی ہے۔"[1]

تلاوتِ قرآن ...سراسر خیر ہی خیر ہے:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جسے قرآن مجید میں مہارت حاصل ہو وہ (روزِ قیامت) معزز اور فرمانبردار فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو قرآن پاک کی تلاوت مشکل کے ساتھ (اٹک اٹک کر) کرتا ہو تو اس کو دو اجر ملیں گے۔"[2]

دوہرے اجر والا:

دو اجر اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جبکہ وہ بڑی مشکل کے ساتھ ایک ایک لفظ کو جوڑ جوڑ کر اللہ تعالیٰ کے اس پاک کلام کی تلاوت کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث میں اس قسم کے لوگوں کے لیے دہرے اجر و ثواب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو اجر وثواب کی کوئی کمی نہیں، لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم قرآن کو سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں کیونکہ حدیث میں علم سیکھنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ قرآنِ پاک کی تلاوت کے متعلق ہی ایک اور حدیث ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کو اس کا درس دیتے ہیں تو ان پر سکینت اترتی ہے اور ان کو اللہ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور اللہ پاک اپنے قریبی فرشتوں میں ان کا ذکر فرماتے ہیں۔"[3]

یہ حدیث ان عظیم بشارتوں میں سے ایک ہے جن کی خوشخبری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو دی جو قرآنِ کریم کی تلاوت اور آپس میں ایک دوسرے کو اس کی تعلیم دینے کے لیے اکٹھے ہوتے

---

[1] صحيح البخاري، كتاب فضائل القرآن، باب خيركم...، رقم الحديث (٥٠٢٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٩)

ہیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ اس اجر وثواب میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ ان کا اجتماع مسجد میں ہو یا اس کے باہر کسی مدرسے یا گھر میں ہو، جو شخص بھی اس مبارک و مسعود مجلس میں حاضر ہوتا ہے وہ چار عظیم انعامات حاصل کرتا ہے:

① تلاوتِ قرآن کریم اور اس میں تدبر کرنے کے لیے جمع ہونے والوں کو جو پہلا انعام اور تحفہ دیا جاتا ہے، وہ ان پر نزولِ سکینت ہے جو طمانیت اور دلی راحت وسکون کا نام ہے۔ سکینت سے مراد ایسا سکون اور طمانیت ہے جس سے دل پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے اور اسے وحشتوں سے سکون میسر آ جاتا ہے۔[1]

اکثر اوقات دل حزن و ملال سے بھرا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جن کے دل و دماغ میں رنج نے آشیانہ بنا لیا اور وہ اپنے غموم و آلام سے نجات پانے کے لیے دم بدم نفسیاتی بیماریوں کی علاج گاہوں میں پناہ لیتے ہیں؟ وہ ان مجلسوں سے دور کیوں ہیں جن کے شرکا پر سکینت نازل ہوتی ہے؟ ان کے لیے ایک ہی راہِ نجات ہے کہ وہ نافرمانیوں سے بچیں، گناہوں کی زندگی ترک کر دیں اور راحت و سکینت کی ان نورانی محفلوں میں آ بیٹھیں جہاں قرآنِ کریم کی تعلیم دی جاتی ہے، تاکہ وہ اپنے دلوں سے گناہوں کی آلایش دھو ڈالیں، اپنے آپ کو پاکیزہ اور مطہر بنالیں اور تکالیف سے راحت اور سکون حاصل کرلیں۔[2]

② تلاوت و تدبرِ قرآن پر جو دوسرا انعام دیا جاتا ہے وہ ہے رحمتِ الٰہی۔ رحمت اہلِ قرآن کے قریب ہے بلکہ وہ ان مجالس کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے لیے ہر اس چیز سے بہتر ہے جسے اہلِ دنیا جمع کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ [الزخرف: ٣٢]

’’اور آپ کے رب کی رحمت اس سے بہت بہتر ہے، جو وہ جمع کرتے ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر چیز پر وسیع ہے اور اس نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے واضح ہے:

---

[1] تحفة الأحوذي (٨/ ١٥٦)

[2] أنوار القرآن (ص: ١٠٧، ١٠٨)

﴿ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾ [الأعراف: ۱۵٦]

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اہلِ قرآن اور اس کی تلاوت کرنے والوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔

③ تیسرا انعام یہ ہے کہ معزز فرشتے اپنے پر پھیلا کر اہلِ قرآن کو گھیر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ جلیل القدر صحابی حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی خوش الحان تلاوت سننے کے لیے معزز فرشتے آسمانوں سے زمین کے قریب آ گئے تھے۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''میں رات کو سورت بقرہ کی تلاوت کر رہا تھا... (اچانک) میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا تو ناگہاں دیکھا کہ سائبان کی مانند کوئی چیز ہے، جس میں چراغوں جیسی روشنی جھلملا رہی ہے، پھر وہ روشنی دور ہونے لگی حتی کہ میری نظر سے وہ سائبان نما چیز اوجھل ہوگئی۔ (یہ ماجرا سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو جانتا ہے وہ کیا تھا؟'' میں نے جواب دیا ''نہیں!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ فرشتے تھے جو تیری آواز سننے کے لیے تیرے قریب آ گئے تھے۔ اگر تو پڑھتا رہتا تو وہ یہیں صبح کر دیتے اور لوگ انھیں دیکھتے اور وہ (فرشتے) ان سے اوجھل نہ ہوتے۔''[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس میں تلاوتِ قرآن کی فضیلت عیاں ہے کہ وہ رحمت کے نزول اور فرشتوں کے حاضر ہونے کا سبب ہے۔''[2]

④ تلاوت و تدبر قرآن کرنے والوں کا تذکرہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں میں کرتا ہے۔ رحمتوں اور برکتوں کے علاوہ قرآنِ مجید وہ آئینہ ہے، جس میں مختلف عقائد، افکار و خیالات، متفرق اخلاق واعمال اور سیرت و کردار کے لوگ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں اور اس کسوٹی اور میزان پر اپنی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں۔ اس میں کہیں اشارتاً کہیں صراحتاً کہیں سابقہ اقوام و افراد کے حالات کے پیرائے میں اور کہیں براہِ راست قرآن کے مخاطب افراد کا تذکرہ موجود ہے، جیسا کہ سورۃ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠١٨)

[2] فتح الباري (٩/ ١٨)

الانبیاء (آیت: ۱۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾

''بلاشبہ ہم نے تمھاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے، جس میں تمھارا ہی تذکرہ ہے تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟''

امام ابو عبداللہ محمد بن نصر مروزی (۲۰۲۔۲۹۴ھ) نے اپنی کتاب ''قیام اللیل'' میں جلیل القدر تابعی اور حلم و بردباری میں ضرب المثل سردار احنف بن قیس رحمہ اللہ کا ایک عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے، جس سے اس آیت کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے؟

حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ ایک جگہ تشریف فرما تھے کہ انھیں سورۃ الانبیاء کی یہ (آیت: ۱۰) سنائی دی:

﴿ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾

یہ آیت سن کر وہ چونک پڑے اور فرمایا:

ذرا قرآن مجید لاؤ، میں اس میں اپنا تذکرہ تلاش کروں اور دیکھوں کہ میں کس درجے میں ہوں، کن لوگوں کے ساتھ ہوں اور میری کن سے مشابہت ہے؟ پھر کہنے لگے کہ قرآنِ کریم میں کچھ لوگوں کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے:

﴿ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٤]

''وہ (لوگ جو) اپنے رب کے حضور سجود اور قیام کر کے رات گزارتے ہیں۔''

پھر انھوں نے قرآن میں ان لوگوں کا تذکرہ پڑھا جو راتوں کو اپنے بستروں سے الگ ہو کر اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور وہ لوگ بھی سامنے آئے جو راتوں کو تھوڑا سا سوتے ہیں اور سحری تک اپنے اللہ سے استغفار کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں، اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دینے والوں اور کبیرہ گناہوں اور فواحش و منکرات سے بچنے والوں کا تذکرہ پڑھ کر کہنے لگے: ''میرا تو ان لوگوں میں شمار نہیں ہے۔''

پھر ورق گردانی کی تو قرآن میں کلمے کا انکار اور تکبر کرنے والوں اور اللہ وحدہٗ لا شریک کے ذکر سے ناخوش اور بتوں کی بات سے خوش ہونے والوں اور بے نماز، کھانا نہ کھلانے والوں اور

قیامت کا انکار کرنے والوں کا ذکر پڑھ کر فرمانے لگے:

''اے اللہ! ان لوگوں سے تیری پناہ! میں ان لوگوں سے بری ہوں۔''

اب وہ اپنے تذکرے کی تلاش میں قرآن پڑھتے پڑھتے سورۃ التوبہ کی آیت (۱۰۲) پر رک گئے، جس میں اللہ رب العزت نے ان لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿ وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''اور کچھ دیگر لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور ملے جلے عمل کیے۔ کچھ اچھے اور کچھ بُرے، امید ہے اللہ ان پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائے گا، بلاشبہ اللہ بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

اس موقع پر ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا: ''ہاں، ہاں! بے شک یہی میرا تذکرہ ہے۔''[1]

قرآن مجید... ایک معجزہ:

قرآن نے اپنے معجزہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور ان لوگوں کو دعوتِ مقابلہ دی ہے، جو اس کے کتابِ الٰہی ہونے کا انکار یا اس میں شک و شبہے کا اظہار کرتے ہیں۔ سورت بنی اسرائیل (آیت: ۸۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾

''(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہہ دے (ایک دو شخص تو قرآن کیا بنا سکتے ہیں) اگر سارے آدمی اور جن مل کر یہ چاہیں کہ اس طرح کا قرآن (بنا) لائیں تو بھی اس طرح کا (بنا کر) نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔''

پھر اس میں تخفیف کرتے ہوئے سورت یونس (آیت: ۳۸) میں فرمایا:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: مختصر قیام اللیل (ص: ٦٤ تا ٦٦)

''کیا یہ لوگ (قرآن کی نسبت) کہتے ہیں کہ اس کو پیغمبر نے بنایا ہے (اے پیغمبر!) کہہ دے: (اچھا) اگر تم سچے ہو تو ایک سورت تو اُس جیسی بنا لاؤ اور اُس کے سوا جن جن کو تم بلا سکو (اپنی مدد کے لیے) بلا لو، اگر تم سچے ہو۔''

رسول اللہ ﷺ سے پہلے جس قدر انبیا و رسل گزرے، ان سب کو اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے معجزات سے نوازا تھا جو ان کی نبوت و رسالت کی دلیل ہو سکتے تھے۔ چونکہ ان کی نبوت و رسالت ایک محدود وقت اور ایک مخصوص قوم کے لیے ہوتی تھی، اس لیے ان کے معجزات ان کے ہاتھوں ظاہر ہوتے تھے اور ان کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے تھے، لیکن حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت چونکہ عالمگیر اور دائمی ہے، یعنی جب تک یہ دنیا قائم ہے، آپ ﷺ کی رسالت برقرار رہے گی، اس لیے آپ ﷺ کو ایسا معجزہ دیا گیا جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہر نبی کو ایسا معجزہ دیا گیا جس کی بنا پر لوگ ایمان لا سکتے تھے اور جو معجزہ مجھے دیا گیا ہے وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف کی ہے۔''[1]

اس لیے جب آپ ﷺ سے معجزات کا مطالبہ کیا گیا تو سورۃ العنکبوت (آیت: ۱۵) والا یہ ارشادِ باری تعالیٰ نازل ہوا:

﴿ فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَ اَصۡحٰبَ السَّفِیۡنَةِ وَ جَعَلۡنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴾

''پھر ہم نے انھیں اور کشتی والوں کو نجات دی اور اس واقعے کو ہم نے تمام جہان کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا۔''

قرآنِ کریم میں انبیاے سابقین اور گزشتہ امم کے بارے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ بجائے خود قرآن کا ایک مستقل معجزہ ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے لیے ان کی اطلاعات کا سرچشمہ اور ماخذ، علمِ الٰہی کے فیض اور وحی کے سوا کچھ نہیں، یہ تمام واقعات وحی الٰہی کا کرشمہ ہیں، جیسا کہ سورت آل عمران (آیت: ۴۴) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡكَ وَ مَا كُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ اِذۡ یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ

---

[1] صحيح البخاري، باب فضائل قرآن ، رقم الحديث (٤٩٨١)

اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ﴾

''یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تجھ کو بھیجتے ہیں (یعنی وحی سے تجھ کو یہ خبریں معلوم ہوتی ہیں) اور تو ان کے پاس اس وقت نہیں تھا جب وہ اپنے اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے پوسے، نہ تو اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔''

پھر سورت ہود (آیت: ۴۹) میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَآ اِلَیْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾

''(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبریں ہیں جن کو ہم (وحی کے ذریعے سے) تجھ کو بھیجتے ہیں، اس سے پہلے (قرآن اترنے سے پہلے) نہ تو ان کو جانتا تھا نہ تیری قوم والے، (تو کافروں کے ستانے پر) صبر کیے رہ بے شک جو پرہیزگار ہیں انہی کا انجام اچھا ہوتا ہے۔''

قرآن مجید نے کفار کے اس الزام کی کہ یہ واقعات آپ کی پرانی یا قلمی یادداشت ہیں، تردید کرتے ہوئے سورۃ الفرقان (آیت: ۵، ۶) میں فرمایا ہے:

﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰى عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا﴾

''اور کہتے ہیں (قرآن ہے کیا) اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھوا رکھی ہیں، وہ صبح اور شام اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ (اے پیغمبر! ان کافروں سے) کہہ دے قرآن تو اس (اللہ) نے اتارا ہے جو آسمان اور زمین کی چھپی بات (غیب کی بات) جانتا ہے، بے شک وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

چنانچہ ان شکوک وشبہات کا اظہار کرنے والوں کے لیے سورۃ العنکبوت (آیت: ۴۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾

''اور (اے پیغمبر!) قرآن (اترنے) سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ اپنے

ہاتھ سے اس کو لکھ سکتا تھا (کیونکہ تو اُمّی تھا نہ پڑھا نہ لکھا) اگر پڑھا لکھا ہوتا یہ جھوٹے (دغاباز) ضرور شبہہ کرتے۔‘‘

چونکہ عرب قرآن مجید کے اولین مخاطب تھے، یہ علم وفن سے کورے اَن پڑھ لوگ تھے، مگر فصاحت وبلاغت ان کا پیدایشی وصف اور کمال تھا، جس میں وہ اپنے آپ کو ساری دنیا سے ممتاز سمجھتے تھے۔ بلکہ دوسروں کو اپنے مقابلے میں عجمی (گونگے) قرار دیتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کو مقابلے کا چیلنج دیا۔ اگر قرآن کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس چیلنج کو قبول کرنے کے لیے تمام انسانوں میں سب سے زیادہ باصلاحیت عرب ہی تھے۔ عرب سرداروں نے قرآن اور صاحبِ قرآن کو مغلوب کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ وہ مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو سمیت ہر متاع پر حملہ آور ہوئے، لیکن یہ جرأت نہ کر سکے کہ قرآن کے مقابلے میں کوئی کلام پیش کریں۔

قرآنِ کریم میں یہ پیشین گوئی بھی موجود ہے کہ وہ قرآن کا یہ چیلنج قبول نہیں کر سکتے، جیسا کہ سورت بقرہ (آیت: ۲۳،۲۴) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَ ادۡعُوۡا شُهَدَآءَ كُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَةُ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ﴾

’’اور اگر تم کو شک ہے اس کلام (قرآن) میں جو ہم نے اتارا اپنے بندے پر تو ایک ہی سورت اس کے جوڑ کی بنا لاؤ اور جو حمایتی تمھارے اللہ تعالیٰ کے سوا ہوں ان کو بھی بلا لو اور ان سے بھی (اس سورت کے بنانے) میں مدد لو اگر تم سچے ہو۔ اگر ایسا نہیں کرتے اور ہرگز ایسا نہ کرسکو گے تو اس آگ سے بچو، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں (بجائے لکڑیوں کے وہ اس میں جلیں گے) وہ منکروں کے لیے تیار ہے۔‘‘

اس چیلنج کے قبول کرنے کے محرکات اور دواعی موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں لیکن آج تک کوئی شخص، کوئی گروہ اور کوئی قوم قرآنِ کریم کا مقابلہ نہیں کرسکی اور نہ آیندہ ہی کر سکے گی۔

قرآنِ کریم سیکھنے اور سکھلانے کی فضیلت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”علم سیکھنے کے لیے جو شخص گھر سے نکلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں۔“[1]

قرآن کا علم حاصل کرنے والوں سے فرشتے محبت کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنے پر پھیلاتے ہیں۔ قرآن مجید کا علم سیکھنے والوں کے لیے زمین و آسمان کی ہر چیز استغفار کرتی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص علم کی خاطر سفر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔ فرشتے طالب علم سے خوش ہو کر اپنے پر (اس کے قدموں کے نیچے) بچھاتے ہیں۔ طالب علم کے لیے زمین و آسمان کی ہر چیز حتیٰ کہ پانی کے اندر مچھلیاں بھی مغفرت کی دعا کرتی ہیں۔[2]

اسی طرح قرآنِ کریم سکھانے والے پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نازل فرماتے ہیں۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا، جن میں سے ایک عالم اور دوسرا عابد تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”عالم کو عابد پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی مجھے تم میں سے کسی عام آدمی پر حاصل ہے۔“

پھر ارشاد فرمایا:

”بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والوں پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے ان کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں، نیز زمین وآسمان کی ساری مخلوق حتیٰ کہ اپنی بلوں میں چیونٹیاں اور (پانی میں) مچھلیاں تک ان کے لیے رحمت کی دعا کرتی ہیں۔“[3]

قرآن مجید یاد کرنے کی فضیلت:

جس شخص کو جتنا زیادہ قرآن یاد ہوگا، جنت میں اس کے درجات اتنے ہی زیادہ بلند ہوں گے۔[4]

قرآنِ پاک زبانی یاد کرنے والے کی جنت میں تاج پوشی کی جائے گی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں جنت کی بادشاہت کا پروانہ اور بائیں ہاتھ میں ہمیشگی کا پروانہ عطا کیا جائے گا۔ زبانی قرآن

1. صحیح مسلم، کتاب الذکر و الدعاء، رقم الحدیث (٦٨٥٣)
2. سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١/ ١٨٢)
3. صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٦٨٥)
4. سنن الترمذي، أبو اب فضائل القر آن (٣/ ٢٣٩٩)

مجید یاد کرنے والا قیامت کے روز معزز فرشتوں کی صف میں ہوگا۔[1]

زبانی یاد شدہ قرآن مجید کو مسلسل یاد رکھنے کا اہتمام کرنا واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قرآن یاد کرنے والے کی مثال ایسی ہے، جیسے پاؤں سے باندھا ہوا اونٹ، اگر اس کے مالک نے اس کی نگرانی کی تو موجود رہا، نہ کی تو بس نکل گیا۔"[2]

غفلت کی وجہ سے قرآن مجید یاد کرکے بھلا دینے پر سزا ہے، چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ معراج سے متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص قرآن یاد کرکے بھلا دیتا ہے اور فرض نماز پڑھے بغیر سو جاتا ہے، اس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا۔"[3]

❀❀❀❀❀

[1] سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني، رقم الحديث (٢٨٢٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٤٣)

قرآنِ کریم سے تعلق

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿ وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴾ [طٰہٰ: ١٢٤]

”اور جس نے میری کتاب (قرآن) سے منہ موڑ لیا (دنیا میں) اس کی زندگی تنگ (گزرے گی) اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔“

قرآنِ کریم کے ساتھ نبیِ رحمت ﷺ کا تعلق:

حضرت مطرف اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا:

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا، آپ ﷺ کے سینے سے رونے کے سبب ہنڈیا کے ابلنے جیسی آواز آرہی تھی۔“[1]

یعنی نبی اقدس ﷺ جب قیام اللیل میں قرآنِ کریم کی تلاوت فرماتے تو اس قدر روتے کہ سینے سے ہنڈیا کے ابلنے جیسی آواز آتی ۔ دورانِ سفر بھی آپ ﷺ قرآن مجید کی تلاوت فرماتے رہتے تھے۔[2]

اللہ کے پیارے نبی ﷺ رات کو سونے سے قبل سورت بنی اسرائیل، سورۃ السجدہ، سورۃ الزمر، سورت ملک، مسبحات، (جو سورتیں سَبَّحَ یا یُسَبِّحُ یا سُبْحَانَ سے شروع ہوتی ہیں) اور معوذات (سورت اخلاص، سورۃ الفلق اورسورۃ الناس) کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

نبی رحمت ﷺ رمضان المبارک میں ہر سال قرآن مجید حضرت جبریلِ امین علیہ السلام کو سنایا کرتے تھے۔ جس سال آپ ﷺ نے وفات پائی، اس سال آپ ﷺ نے دو مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کو

[1] سنن أبي داود (١/ ٧٩٩)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٠٤٧)

قرآن مجید سنا یا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ تلاوتِ قرآن میں سب سے زیادہ خوش الحان تھے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو عشا کی نماز میں سورۃ التین پڑھتے ہوئے سنا ہے اور میں نے ایسا خوش الحان کسی کو نہیں پایا۔[1]

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خوبصورت آوازوں میں تلاوتِ قرآن سن کر آپ ﷺ بہت خوش ہوتے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے اور صحابہ کرام کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

اللہ کے نبی ﷺ قیام اللیل میں بہت لمبی قراءت فرماتے، حتیٰ کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک سوجھ جاتے تھے۔ قیام اللیل کی ایک ہی رکعت میں رسول اللہ ﷺ نے سورت بقرہ، سورت نساء اور سورت آل عمران کی تلاوت فرمائی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک رات نماز پڑھی، آپ ﷺ نے سورت بقرہ کی تلاوت شروع کی، میں نے خیال کیا کہ آپ ﷺ سو آیات کے بعد رکوع کریں گے، لیکن آپ ﷺ مسلسل پڑھتے گئے، میں نے سوچا آپ ﷺ پوری سورت دو رکعتوں میں پڑھیں گے، لیکن آپ ﷺ پڑھتے گئے، میں نے سوچا اب آپ ﷺ سورت مکمل کر کے رکوع کریں گے، لیکن آپ ﷺ نے سورت نساء شروع کر دی اور اسے مکمل کیا اور پھر آپ ﷺ نے سورت آل عمران شروع کر دی حتی کہ اسے بھی مکمل کیا۔[2]

قرآنِ کریم کے فضائل و برکات کی وجہ سے رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ کو کم عمر ہونے کے باوجود محض اس لیے طائف کا گورنر بنایا کہ انھیں وفد کے باقی ارکان میں سب سے زیادہ قرآن مجید یاد تھا۔ حضرت عثمان بن ابو العاص کہتے ہیں:

> ”جب مجھے رسول اللہ ﷺ نے (طائف کا) گورنر مقرر فرمایا، اس وقت مجھے سورۃ البقرہ آتی تھی۔ میں نے عرض کی: ”یا رسول اللہ ﷺ! مجھے قرآن بھول جاتا ہے۔“ آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ”اے شیطان! عثمان کے دل سے نکل جا۔“ اس کے بعد جب بھی میں نے کوئی چیز یاد کرنا چاہی کبھی نہیں بھولی۔“[3]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، رقم الحديث (١٠٣٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨١٦)

[3] سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني، رقم الحديث (٢٩١٨)

رسولِ کریم ﷺ نے یمن کے دونوں حصوں کا گورنر دو ایسے صحابہ (حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما) کو بنایا جو قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت کرنے والے تھے۔

قرآن مجید سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لگاؤ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تو قرآن مجید سننے سنانے کا شوق ظاہر فرماتے۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عام طور پر سات دنوں میں قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے۔

① حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جناب جبریل علیہ السلام کے لہجے میں قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔[2]

② حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سالم، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم نے اپنی زندگیاں قرآنِ مجید پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔[3]

③ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑے رقیق القلب یعنی نرم دل انسان تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تو مسلسل آنسو بہتے رہتے۔ تلاوت میں اس قدر رقت ہوتی کہ مشرکینِ مکہ کے بچے، عورتیں اور مرد جمع ہو جاتے اور کھڑے ہو کر قرآن مجید سنتے رہتے۔[4]

④ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سورت طور کی تلاوت فرما رہے تھے، جب وہ سورت طور (آیت: ۷) پر پہنچے:

﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴾ ''بے شک تیرے رب کا عذاب واقع ہونے والا ہے۔''

تو رونے لگے، بہت روئے حتیٰ کہ بیمار پڑ گئے اور لوگ آپ کی عیادت کے لیے آنے لگے۔[5]

⑤ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہلِ زبان تھے۔ ان کے سامنے قرآن اترتا تھا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ انھیں پڑھ کر سناتے، اس کے معانی و مطالب اور حقائق و معارف سکھاتے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ سمجھاتے تھے۔ امام ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: ہمیں قرآن کی تعلیم دینے والے صحابہ کرام حضرت عثمان بن عفان اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ نے بتایا کہ جب وہ دس

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٣٩١)

[2] سنن ابن ماجه (١/ ١١٤)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٩٩٩)

[4] صحیح البخاي، رقم الحدیث (٣٩٠٥)

[5] الجواب الکافي (ص: ٧٧١)

آیات سیکھ لیتے تھے تو اس وقت تک ان سے آگے نہ بڑھتے جب تک کہ ان آیات کے علم و عمل کو نہ سیکھ لیتے۔ انھوں نے کہا: اسی طرح ہم نے پڑھا اور علم وعمل سیکھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب کوئی سورت بقرہ اور سورت آل عمران پڑھ لیتا تھا تو وہ ہماری نظروں میں جلیل القدر آدمی ٹھہرتا تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے صرف سورت بقرہ کے حفظ کرنے میں آٹھ برس صرف کر دیے تھے۔[1]

ظاہر ہے یہ آٹھ برس محض الفاظ یاد کرنے پر صرف نہیں ہوئے تھے، بلکہ یہ قرآن کی حکمت، اس کے حقائق و معارف جاننے اور ان پر عمل پیرا ہونے پر صرف ہوئے تھے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اتارا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر بھی اسے جاری کیا اور پڑھایا، اسی طرح اس کے معانی و مطالب کی بھی تعلیم دی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ [القيامة: ١٩]

''پھر اس کا بیان اور توضیح بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔''

اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حکمت بھی اتاری گئی، تنہا قرآن نہیں اتارا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پڑھنا، اس کے معانی و مطالب سمجھنا اور اس پر عمل کرنا سیکھا۔ قرآن مجید کے بے حد وحساب فضائل نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قرآنِ کریم کی تلاوت، تحفیظ، تدریس اور تعلیم کا ایسا والہانہ جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ بیشتر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی زندگیاں قرآن مجید کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔

٦ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بچپن ہی میں دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہوگئے تھے۔ ایمان لانے کے بعد سفر و حضر میں سائے کی طرح نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے اور قرآن مجید سیکھنے میں گہری دلچسپی لیتے۔ ایک رات دورانِ نماز اونچی آواز میں تلاوت کر رہے تھے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور کھڑے ہو کر تلاوت سنتے رہے، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا:

''جسے یہ بات پسند ہو کہ وہ قرآنِ کریم کو اسی لہجے میں پڑھے جس میں وہ نازل ہوا ہے

---

[1] مجموع الفتاوى لابن تيمية (١٣/ ٣٣١)

تو وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت کا انداز اپنائے۔‘‘

⑦ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے شوقِ تلاوت کا یہ عالَم تھا کہ قرآنِ مجید حفظ کرنے کے بعد رات بھر میں سارا قرآن ختم کر لیتے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا: ’’مجھے ڈر ہے تمھاری عمر لمبی ہوگی اور عمر بھر یہ پابندی کرنی تمھارے لیے مشکل ہوگی، لہٰذا مہینے بھر میں ایک مرتبہ قرآن مجید ختم کیا کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اچھا! سات دن میں ختم کر لیا کرو۔‘‘ اس سے زیادہ کم کرنے کی اجازت نہ دی۔[1]

⑧ حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ ایمان لانے کے بعد دن رات قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتے۔ قرآنِ مجید اپنے چہرے پر رکھ لیتے اور فرماتے: ’’میرے رب کی کتاب، میرے رب کا کلام‘‘ اور پھر خشیتِ الٰہی سے رونے لگتے۔

⑨ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہر وقت تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھتے رہتے۔

⑩ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پہلی رات سو جاتے اور پچھلی رات اٹھ کر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے۔[2]

⑪ حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام سالم رضی اللہ عنہ اس قدر پرسوز آواز میں تلاوت فرماتے کہ پاس سے گزرنے والوں کے قدم تھم جاتے۔ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک کھڑے ہو کر ان کی تلاوت سنتے رہے اور اس قدر خوش ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا یوں بیان فرمائی:

’’اُس اللہ کا شکر ہے جس نے میری امت میں ایسی تلاوت کرنے والے لوگ پیدا فرمائے ہیں۔‘‘

⑫ **صدیق القرآن:** حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ تلاوت کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ’’صدیقِ قرآن و سنت‘‘ کے نام سے مشہور تھے۔ غزوہ ذات الرقاع سے واپسی پر اسلامی لشکر نے ایک پہاڑ کے دامن میں پڑاؤ کیا۔ رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ’’آج رات پہرہ کون دے گا؟‘‘ حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ اور ان کے دینی بھائی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فوراً بول اٹھے: ’’یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم پہرہ دیں گے۔‘‘ پہرے کا وقت شروع ہوا تو

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤١)

حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ’’آپ رات کے پہلے حصے میں سونا پسند کریں گے یا پچھلے حصے میں؟‘‘ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’میں پہلی رات آرام کروں گا اور پچھلی رات پہرہ دوں گا۔‘‘ حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے پہرے کا وقت ضائع کرنا پسند نہ کیا، وضو کر کے اللہ کے حضور قیام میں مصروف ہوگئے۔ دلسوز اور شیریں آواز میں سورت کہف کی تلاوت کرنے لگے۔ دشمن تعاقب میں تھا۔ اس نے دور سے کھڑا پہرے دار دیکھا تو اسے تیر کا نشانہ بنایا جو حضرت عباد رضی اللہ عنہ کے جسم میں پیوست ہوگیا۔ حضرت عباد رضی اللہ عنہ تلاوت پاک میں اس قدر محو تھے کہ تیر نکالا اور اسے دور پھینک دیا، لیکن تلاوت بدستور جاری رکھی، دشمن نے دوسرا تیر پھینکا، وہ بھی نشانے پر جا لگا۔ تلاوتِ قرآن میں مگن حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے وہ تیر بھی جسم سے نکال پھینکا اور تلاوت جاری رکھی۔ دشمن نے تیسری مرتبہ پھر تیر مارا تو وہ بھی نشانے پر لگا، خون کا فوارہ پھوٹنے لگا، تب حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے نماز ختم کی اور ساتھی کو جگایا۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو گھبرا کر فرمایا: ’’عباد! تم نے مجھے پہلا تیر لگنے پر کیوں نہ جگا دیا؟‘‘ حضرت عباد رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ’’اللہ کی قسم! اگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ذمے داری کا احساس نہ ہوتا تو میری جان چلی جاتی تب بھی میں نماز اور تلاوت کا سلسلہ منقطع نہ کرتا۔[1]

تعلیماتِ قرآن کے نتائج:

① قرآنِ کریم کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کے اس گہرے تعلق ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ ان تمام فیوض و برکات سے مالا مال تھے، جن کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ وہ لوگ اپنی انفرادی زندگی میں ایمان، تقویٰ، نیکی، اللہ اور اس کے رسول سے محبت، توکل، قناعت، امانت، دیانت، صداقت، صبر اور شکر جیسے اوصافِ حمیدہ سے اس طرح متصف تھے کہ ان کے بعد دوبارہ ایسے انسان پیدا ہی نہ ہوں گے۔

② سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن مجید پر عمل کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا میں عزت، عظمت، عروج اور ایسا غلبہ عطا فرمایا، جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

③ یہ قرآن مجید کی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے کفار کی طاقت، قوت اور اسلحے کا خوف جاتا رہا۔

④ مسلمان کسی ٹیکنالوجی اور ایجاد کے بغیر پوری دنیا پر چھا گئے۔ عہدِ نبوت کو تو چھوڑیے، عہدِ صحابہ اور عہدِ تابعین میں جب مسلمان عرب ملکوں سے نکل کر دور اجنبی سرزمینِ اندلس پر پہنچے تو مورخین لکھتے ہیں: ''اندلس پر مسلمانوں کی اتنی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ اسلامی لشکر کو کوئی روکنے والا نہ تھا۔ طارق بن زیاد رحمہ اللہ جدھر رخ کرتے فتح و کامرانی ان کے ہمرکاب چلتی۔ (اندلسی خود پیش قدمی کر کے صلح کرتے) طارق بن زیاد رحمہ اللہ آگے آگے علاقے فتح کرتے جاتے اور موسیٰ بن نصیر رحمہ اللہ ان کے پیچھے پیچھے صلح ناموں اور معاہدوں کی تصدیق کرتے جاتے۔''

اندازہ فرمائیں ۹۲ھ میں طارق بن زیاد رحمہ اللہ صرف سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ جبر الٹر (جبلِ طارق) پر اترے۔ وہاں کے حاکم تھیوڈومیر سے مقابلہ ہوا۔ تھیوڈومیر شکست کھا کر فرار ہوا اور اپنے بادشاہ راڈرک کو لکھا:

''ہمارے ملک پر ایسے آدمیوں نے حملہ کیا ہے کہ ان کا وطن معلوم ہے نہ ان کی اصلیت کہ کہاں سے آئے ہیں، زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اترے ہیں۔''

⑤ دنیا میں اس عزت، عروج اور غلبے کا وعدہ قرآن مجید کو مضبوطی سے تھامنے اور اس پر عمل کرنے سے مشروط ہے۔ آج اگر ہم دنیا میں مغلوب اور بے توقیر ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآنِ مجید کو ترک کر دیا ہے اور معاشرہ ایمان، نیکی، تقویٰ، امانت، صداقت اور شجاعت کے بجائے شرک، بدعات، ظلم، بے رحمی، قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ، زنا، جوا، بے حیائی، بدامنی اور بدحالی میں مبتلا ہے جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کو ترک کر دیا ہے۔

اگر ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اعلیٰ و ارفع اقدار کا چلن عام کرنا چاہتے ہیں اور اپنی ذلت اور پستی کو عزت اور وقار میں بدلنا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآنِ مجید کی طرف پلٹ آنا چاہیے۔

بقول حکیم الامت علامہ اقبال ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر

سورت طٰہٰ (آیت: ۱۲۳) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰی ﴾

’’پس جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبختی ہی میں مبتلا ہوگا۔‘‘

قرآنِ کریم سے فیض یاب ہونے والے:

قرآنِ کریم گذشتہ چودہ صدیوں سے پوری دنیا کے انسانوں کو مسلسل نورِ ہدایت سے منور کر رہا ہے۔ جس طرح یہ پہلوں کے لیے ہدایت تھا، اسی طرح پچھلوں کے لیے بھی ہدایت ہے۔ قرآن مجید کے فیوض و برکات حاصل کرنے والوں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

① ڈاکٹر عبد الرحمٰن پارکر:

امریکی ریاست واشنگٹن کے ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ایک روز اپنے والد سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوال کیا تو والد نے کہا:

’’میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور مجھے زندگی میں اس کی ضرورت بھی کیا ہے، جبکہ ہر آسایش میسر ہے؟‘‘

لمحہ بھر کے لیے قرآن مجید کی ان آیات کریمہ پر غور فرمائیں:

﴿ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی ﴾ [العلق: ٦، ٧]

’’ہرگز نہیں! انسان سرکشی اختیار کرتا ہے، جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔‘‘

ڈاکٹر پارکر کہتے ہیں:

’’اپنے والد کا یہ جواب سن کر میں نے یہودیت، عیسائیت اور ہندومت کی مقدس کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان میں سوائے تضادات اور اختلافات کے کچھ نہ پایا۔ اسلام کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ یہ وحشیوں، پاگلوں اور جنونیوں کا مذہب ہے، لہٰذا قرآن کے مطالعہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں مجھے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا، جہاں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی جو مجھے اپنے گھر لے گیا، اس نوجوان کے والد نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ان کی باتوں میں مجھے خلوص، صداقت اور محبت محسوس ہوئی۔ نہایت سادہ اور صاف الفاظ میں انھوں نے مجھے اسلام کے متعلق کچھ

بنیادی باتیں بتائیں۔ ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ کچھ مدت کے بعد مجھے اپنی ملازمت کے سلسلے میں بہار کے جنگلوں میں جانا تھا۔ رخصت کرتے ہوئے نوجوان کے والد نے مجھے چند کتابیں دیں جن میں محمد پکتھال کا انگریزی ترجمے والا قرآن مجید بھی تھا۔ بہار کے جنگلوں میں تنہائی میسر تھی۔ ماحول بھی قدرت کی دل فریبیوں اور رعنائیوں سے معمور تھا۔ خیال آیا کہ قرآنِ مجید کا مطالعہ ہی کیا جائے۔

''قرآن مجید کھولا تو سورت کوثر سامنے آگئی۔ پڑھنا شروع کیا۔ چھوٹے چھوٹے بول میرے دل میں تیر ونشتر کی طرح پیوست ہوتے چلے گئے۔ الفاظ کے ترنم نے میرے کانوں میں رس گھولنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں ان میں کیا جادو تھا کہ میری زبان بے اختیار انھیں دہرانے لگی۔ میں پڑھتا چلا گیا اور یوں محسوس کیا کہ آبِ حیات کے قطرے مرجھائے ہوئے پھولوں کو تازگی اور شگفتگی بخش رہے ہیں۔ دل چاہا کہ قرآن پاک کی پاکیزہ تعلیمات پر ایمان لے آؤں، لیکن مادہ پرست ماحول میں پرورش پائے ہوئے ذہن کا کبر وغرور، شکوک وشبہات پیدا کر رہا تھا۔ دل اور دماغ میں کشمکش شروع ہوگئی۔ بہار سے واپس لکھنو آیا تو آتے ہی مولوی صاحب سے ملا، اپنے شکوک وشبہات پیش کیے۔ مولوی صاحب نے نہایت حکیمانہ اور مدلل انداز سے میرے شکوک وشبہات رفع کیے۔ قلب و ذہن میں ابدی صداقت کو سینے سے لگا لینے کا بے پناہ جذبہ اُمڈ آیا تھا، آنکھیں بے یقینی کے اندھیرے سے نکل کر ایمان کی روشنی کا مشاہدہ کرنے کے لیے بے تاب ہوگئیں اور زبان پر بے ساختہ کلمہ شہادت جاری ہوگیا:

«اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ»

② ڈاکٹر غرینیہ:

فرانس میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور فرانسیسی پارلیمنٹ کے رکن بنے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''میری جوانی سمندری سفر میں گزری۔ سمندر کے نظاروں اور سفروں کا شوق ہی گویا میرا مقصدِ زندگی تھا۔ اس شوق کے علاوہ میرا دوسرا مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا۔ یہی ذوق مجھے

مطالعہ قرآن تک لے آیا۔ ایک روز میں قرآن مجید کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ نظریں سورت نور کی ایک آیت پر جم گئیں جس میں گمراہ شخص کی مثال سمندری نظارے کے حوالے سے بیان کی گئی تھی:

﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ [النور: ٤٠]

''یا (ان کے اعمال) گہرے سمندر کے اندھیروں کی طرح ہیں، جس کو ایک موج نے ڈھانک رکھا ہے، اس کے اوپر ایک موج ہے، اس کے اوپر بادل ہے، (الغرض) کئی اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک، اگر کوئی اپنا ہاتھ نکالے (تو اس قدر اندھیرا ہے کہ) اس کو دیکھ نہ سکے اور جس کو اللہ (اپنی ہدایت کی) روشنی نہ دے اس کو روشنی کہاں ملے گی۔''

جب میں نے یہ آیت پڑھی تو میرا دل تمثیل کی عمدگی اور اندازِ بیان سے بے حد متاثر ہوا اور میں نے خیال کیا کہ اس کتاب کے مصنف (محمد ﷺ) ضرور ایسے شخص ہوں گے جن کے دن رات میری طرح سمندروں میں گزرے ہوں گے، لیکن اس کے باوجود مجھے حیرت اس بیان کے مختصر مگر جامع اور بلیغ الفاظ اور اسلوب پر تھی، گویا بات کہنے والا خود رات کی تاریکی، بادلوں کے گہرے سائے اور موجوں کے طوفان میں ایک جہاز پر کھڑا ہے اور ڈوبتے شخص کی حالت دیکھ رہا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ محمد عربی ﷺ امی (اَن پڑھ) شخص تھے اور انھوں نے زندگی بھر سمندری سفر نہیں کیا۔ اس انکشاف کے بعد میرا دل روشن ہوگیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ محمد ﷺ کی آواز نہیں بلکہ اُس ہستی کی آواز ہے، جس نے سمندروں سمیت کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ میں نے قرآنِ مجید کا دوبارہ مطالعہ شروع کیا۔ اب میرے سامنے مسلمان ہوئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ شرح صدر کے ساتھ کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔''[1]

[1] ''ہم مسلمان کیوں ہوئے؟'' ڈاکٹر عبدالغنی فاروق۔

③ محترمہ لیلیٰ:

پولینڈ کے ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئیں، پھر اپنے خاندان کے ہمراہ کینیڈا منتقل ہوگئیں۔ دورانِ تعلیم لیلیٰ کی ملاقات ایک مسلمان لبنانی طالب علم سے ہوئی، دونوں اپنی ملاقاتوں میں مذہب پر بحث کرتے۔ باعثِ نزاع بات یہ تھی کہ ''اللہ ایک یا تین؟'' لیلیٰ کہتی ہیں کہ لبنانی طالب علم کا یہ جملہ ''اللہ صرف ایک ہے'' ہر وقت میرے ذہن میں گونجتا رہتا، تاہم مجھے پورا یقین تھا کہ ایسی سوچ رکھنے والا پاگل ہے۔ دو تین ماہ اسی اُدھیڑ بُن میں گزر گئے۔ ایک روز میں اپنے گھر والوں کے ساتھ چرچ گئی تو مجھے پہلی بار چرچ والوں کی یہ بات عجیب سی محسوس ہوئی کہ ''اللہ، اس کا بیٹا اور روح القدس تینوں مل کر ایک بنتے ہیں۔'' ان الفاظ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میں سوچنے لگی: ''اگر اللہ ایک ہے تو اس کے بیٹے اور روح اللہ کا کیا مطلب ہے؟'' یہ تثلیث کا معاملہ تو عقلی اعتبار سے بالکل ہی ناقابلِ فہم تھا، جبکہ ایک مسلمان لبنانی نوجوان کی بات قابلِ فہم تھی کہ ''اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔'' اسی کشمکش کو ختم کرنے کے لیے میں نے قرآنِ مجید کا مطالعہ شروع کیا۔ میرے لیے قرآن مجید کا مطالعہ ایک مسرور کن تجربہ تھا۔ رات کو جب سارے لوگ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوتے تو میں قرآن مجید کا مطالعہ شروع کر دیتی۔ اس دوران میں آنکھیں برستی رہتیں اور میں منہ تکیے پر رکھ کر روتی رہتی۔ میں بہت خوش تھی اور شکر گزار تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے علم وعرفان سے نوازا تھا۔ اب میں زیادہ دیر تاریکی اور جہالت سے سمجھوتہ نہیں کرسکتی تھیں۔ کرسمس کا موقع آیا، مزید ضبط کا یارا نہ رہا تو میں نے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ توقع کے مطابق مجھے فوراً گھر سے نکال دیا گیا۔ دل اس خیال سے دکھی تھا کہ گھر والے چھوٹ رہے ہیں، لیکن اس خیال سے ذہن سکون سے معمور ہوگیا کہ میں نے اپنے رب کو پا لیا ہے۔

④ محترمہ سمیہ:

امریکہ کے ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ مائیکرو بیالوجی میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ سمیہ کہتی ہیں کہ عیسائیت میں میرے لیے سب سے زیادہ ناقابلِ فہم بات عقیدہ تثلیث تھی۔ ایک اللہ وہ جو زمین و آسمان کا خالق اور مالک ہے، دوسرا اللہ وہ جس نے ہمارے گناہ معاف کروانے کے لیے قربانی دی، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تیسرا اللہ روح القدس! پھر کس خدا کی عبادت

کریں اور کس سے مانگیں؟ دورانِ تعلیم سمیہ کی ایک مسلمان لڑکے سے دوستی ہوئی۔ سمیہ نے اپنے دوست سے اس پریشانی کا اظہار کیا تو اس نے سمیہ کو مطالعے کے لیے قرآنِ مجید فراہم کر دیا۔ سمیہ کہتی ہیں:

''قرآن مجید کے مطالعے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی، اسے پڑھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ واقعی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں اور انعامات کا ذکر تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ اتنا مہربان ہے کہ وہ شرک کے سوا تمام گناہ معاف کر دے گا۔ میں قرآن پڑھتے ہوئے بے اختیار رونے لگی۔ میری روح کی گہرائیوں میں چھپا ہوا کرب اور درد باہر آنے لگا، مجھے اپنی حماقتوں، نادانیوں اور غفلتوں پر رونا آیا اور سچ کو پا لینے پر مسرت بھی ہوئی۔ قرآن مجید کی سائنسی توجیہات پڑھ پڑھ کر میں حیران ہوئی۔ قرآن مجید نے سائنس کے ہر شعبے کے بنیادی اصولوں کی نشاندہی آج سے چودہ سو سال قبل کر دی تھی، جبکہ اُس وقت ان اصولوں کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، تب مجھے یقینِ کامل ہو گیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ ہی کی نازل کردہ کتاب ہے اور میں نے قبولِ اسلام کا فیصلہ کر لیا۔ درود و سلامتی ہو حضرت محمد ﷺ پر کہ ان کی زندگی سارے مسلمانوں کے لیے اسوہ حسنہ ہے۔''

⑤ محترمہ مریم:

امریکہ میں پیدا ہوئیں۔ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دورانِ تعلیم چند مسلمان طالبات سے ان کی دوستی ہوگئی۔ محترمہ مریم اپنے ایمان لانے کا واقعہ یوں بیان کرتی ہیں کہ میں ایک روز اپنی مسلمان سہیلی کو ملنے اس کے گھر گئی اور ساتھ مٹھائی کا تحفہ بھی لے گئی، مگر اس نے مٹھائی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ وہ روزے سے تھی۔ میں نے وہ دن اس کے ساتھ بڑے تعجب سے گزارا کہ مسلمان کس طرح بھوک اور پیاس برداشت کرتے ہیں اور پھر معمولات کے کام بھی کرتے ہیں۔ ایک روز میری سہیلی نے مجھے افطار پر مدعو کر لیا، حالانکہ میں روزے سے نہیں تھی۔ میرے لیے اسلام کو جاننے کا یہ اچھا موقع تھا۔ میں نے ان کے مزاج و اطوار کو قریب سے دیکھا۔ روزہ رکھنے کا سبب بھی معلوم کیا۔ افطار کے بعد وہ سارے لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ امام صاحب نے جب قرآن مجید کی تلاوت شروع کی تو اسے سنتے ہی میرے دل پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوگئی۔ مجھے بعد میں

معلوم ہوا کہ امام صاحب اس روز نماز میں سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کر رہے تھے۔ مجھے تلاوت سن کر بڑا سکون اور اطمینان محسوس ہوا، بغیر کسی علم کے کہ میں کیا سن رہی ہوں؟ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے حق مل گیا ہے۔ میں نے اپنی اس کیفیت کا اظہار اپنی مسلمان سہیلی سے کیا تو اس نے مجھے مطالعے کے لیے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ، کچھ کتابیں اور چند کیسٹیں دیں۔ کچھ دنوں کے بعد میں اپنے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی۔[1]

امرِ واقعہ یہ ہے کہ جو بھی شخص ہدایت کی نیت سے قرآنِ مجید کا مطالعہ کرتا ہے، اسے ہدایت ضرور نصیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ [العنكبوت: ٦٩]

''وہ لوگ جو ہماری طرف آنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، ہم انھیں اپنے راستے ضرور دکھاتے ہیں۔''

''قرآنِ کریم کے فضائل و برکات'' کا درس لکھنے کے دوران میں مجھے ان خوش نصیب نو مسلم مردوں اور خواتین کے حالات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا، تو اس دوران میں دو باتیں میں نے واضح طور پر محسوس کیں:

اولاً: ہر شخص کی ہدایت کا سبب کسی نہ کسی طرح قرآن مجید ہی بنا۔

ثانیاً: قرآنِ مجید کا مطالعہ کرنے کے بعد جو لوگ شعوری طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، ان کی زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب برپا ہوا کہ انھوں نے اپنی بقیہ ساری زندگی دینِ اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دی یا کم از کم ان کے اندر دینِ اسلام کی کوئی نہ کوئی گراں قدر خدمت سرانجام دینے کی شدید تڑپ پیدا ہوگئی۔

امریکہ کے عیسائی گھرانے میں پیدا ہونے والی خاتون ''بیکی ہاپکنز'' اسلام لانے کے بعد جس جذبے سے سرشار ہوگئیں، اس کا اظہار انھوں نے درج ذیل الفاظ میں کیا:

''اگر میں دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ پر چڑھ سکتی اور میری آواز ہر اس آدمی تک پہنچ سکتی جو اسلام سے بے خبر ہے تو میں چلاّ چلاّ کر انھیں بتاتی کہ مجھے میرے سوالات کے

---

[1] دو ماہی مجلّہ ''تحفہ نسواں'' لاہور (جون، جولائی ۲۰۰۴ء)

جوابات قرآن سے مل گئے ہیں۔ اب میں جانتی ہوں سچائی کیا ہے۔ دنیا کا ہر شخص اس سچائی کے ملنے پر اگر سو سال تک روزانہ سو بار اللہ کا شکر ادا کرے، تب بھی اس کا حقِ شکر ادا نہیں ہوسکتا۔''[1]

قرآن مجید شفا ہے:

قرآنِ کریم کی کثرت سے تلاوت اور سماعت نفاق، حسد، بغض، لالچ، بخل، شکوک وشبہات اور وساوس جیسی بیماریوں سے شفا بخشتی ہے، اس کتاب سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور رحمت حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ سورت یونس (آیت: ۵۷) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

''لوگو! تمھارے پاس تمھارے مالک کی طرف سے نصیحت آئی اور دلوں میں جو (کفر، شرک اور شک کی) بیماریاں ہیں، ان کی دوا اور ہدایت اور رحمت ایمانداروں کے لیے۔''

سورت بنی اسرائیل (آیت: ۸۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾

''اور ہم قرآن میں سے جو اتارتے ہیں، وہ تندرستی اور رحمت ہے، مسلمانوں کے لیے اور کافروں کو تو اور زیادہ نقصان دیتا ہے۔''

سورت حم السجدہ (آیت: ۴۴) میں فرمایا ہے:

﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ﴾

''(اے میرے نبی!) کہہ دیجیے کہ یہ تو ایمان والوں کے لیے ہدایت وشفا ہے۔''

قرآنِ مجید کی کثرت سے تلاوت اور سماعت دل کی پریشانی، خوف، گھبراہٹ اور بے چینی جیسی بیماریوں کا شافی علاج ہے، جیسا کہ سورۃ الرعد (آیت: ۲۸) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ﴾

---

[1] تحفۂ نسواں، نومسلمات نمبر (جون/جولائی ۲۰۰۴، صفحہ نمبر ۱۵۰)

''جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں۔''

اس کو سن کر دل اللہ تعالیٰ کی جانب مائل ہوتے اور اس سے خوشی محسوس کرتے ہیں، پھر اللہ کے ذکر کے وقت اطمینان وسکون محسوس کرتے ہیں اور اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اُن کا مولیٰ اور مددگار ہے۔ اِسی لیے فرمایا:

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد: ۲۸]

''خبردار رہو! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ہے، جس سے دل اطمینان وسکون حاصل کرتے ہیں۔

اپنی رائے سے قرآن مجید کی تفسیر کرنے کی سزا:

قرآنِ کریم کے حوالے سے کوئی ایسی بات کہنا جو شریعت کا مطلوب اور منشا نہ ہو، یہ تفسیر بالرائے کی صورت ہے۔ سورت حم السجدہ (آیت: ۴۰) میں اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾

''جو لوگ ہماری آیتوں کا (جان بوجھ کر) ٹیڑھا مطلب نکالتے ہیں، وہ ہم پر چھپے ہوئے نہیں ہیں (ان کا حال ہم کو معلوم ہے) بھلا جو کوئی دوزخ میں ڈالا جائے وہ بہتر ہے یا جو قیامت کے دن بے کھٹکے (امن سے) آئے؟ (لوگو! تم دنیا میں) جو چاہو سو کر لو وہ تمھارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔''

قرآنی آیت کی من مانی تفسیر کرنے والے اللہ کے غضب میں مبتلا ہوں گے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾

[المؤمن: ۳۵]

''اور خدا کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں کسی دلیل کے بغیر جو ان کے پاس آئی ہو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور ایمان والوں کے نزدیک ان کے یہ جھگڑے بہت برے ہیں، جو کوئی غرور والا اینٹھو ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دل پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔''

قرآن مجید کے اصل مدعا کو نظر انداز کر کے غلط معنی پہنانا، اسلاف کی تفسیر سے ہٹ کر نئے نئے نکات پیدا کرنا، سیاق و سباق سے الگ کر کے آیات کا مفہوم لینا اور آیات کی من مانی تفسیر کرنا کفر ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔''[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے قرآن کے معاملے میں علم کے بغیر بات کی تو وہ قیامت کے روز آگ کی لگام میں جکڑا ہوا آئے گا اور جس کسی سے دینی مسئلہ پوچھا گیا اور اس نے چھپایا تو وہ بھی قیامت کے روز آگ کی لگام میں جکڑا ہوا آئے گا۔''[2]

قرآن مجید کی کسی آیت کو ناپسند کرنے کی سزا:

جو شخص قرآنِ کریم کی کسی ایک بھی آیت، حکم، قانون یا فیصلے کو ناپسند کرے، وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ سورت محمد (آیت: ۸، ۹) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ﴾

''اور جو کافر ہیں وہ تباہ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے کام برباد کر دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے جو اتارا، اس کو انھوں نے پسند نہیں کیا تو اللہ نے بھی ان کے (نیک) کام (سب) اکارت کر دیے۔''

یاد رہے کہ قرآنِ کریم کی کسی ایک آیت کو ناپسند کرنا سارے قرآن کو ناپسند کرنے کے برابر ہے۔ کسی آیت کے حکم کو ناپسند کرنے کی ایک صورت تو بلا واسطہ ہے، مثلاً کوئی شخص حجاب کی آیت یا حکم کو ناپسند کرے، اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص براہِ راست حجاب کو تو برا نہ کہے، لیکن کفار کے ہاں رائج بے حجابی کو حجاب سے بہتر سمجھتے، ان دونوں کا حکم ایک جیسا ہے۔

مسلمانوں کو ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآنِ مجید کی کسی ایک آیت، ایک حکم، ایک

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٣)

[2] الترغيب و الترهيب، رقم الحديث (٢٥١)

قانون یا ایک فیصلے کو بھی ناپسند کرنا سارے قرآنِ مجید کے احکام، قوانین اور فیصلوں کو ناپسند کرنے کے برابر ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کے احکام اور قوانین کے مقابلے میں دوسرے قوانین بہتر سمجھنے والے شخص کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے شیخ الاسلام علامہ عبد العزیز بن باز رحمہ اللہ نے پانچ صورتوں میں سے کسی بھی ایک صورت پر یقین رکھنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے:

① جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین اور نظامِ حیات اسلامی شریعت سے بہتر ہیں یا ان کے برابر ہیں یا ان کے مطابق فیصلے قبول کرنے جائز ہیں، وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔
② وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ بیسویں صدی میں اسلام پر عمل کرنا ناممکن ہے یا مسلمانوں کا اسلام پر عمل کرنا مسلمانوں کی پسماندگی کا باعث ہے، وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔
③ وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹنا، یا شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنا عصرِ حاضر میں مناسب نہیں، وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔
④ وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ دینِ اسلام بندے اور رب کے درمیان (ذاتی) تعلق تک محدود ہے اور زندگی کے دیگر مسائل سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔
⑤ وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ دنیاوی معاملات اور شرعی حدود میں غیر اسلامی قانون کا فیصلہ قبول کرنا جائز ہے، وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے، خواہ اس کا عقیدہ یہ نہ ہو کہ غیر اسلامی قانون اسلامی شریعت سے بہتر ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ دین کا معاملہ بڑا نازک ہے، یہ کوئی کھیل تماشا نہیں کہ محض اپنی پسند یا ناپسند کے مطابق کسی حکم پر عمل کر لیا جائے اور کسی کو ترک کر دیا جائے یا کسی کو اچھا سمجھ لیا جائے اور کسی کو برا کہہ دیا جائے۔ سورۃ البقرۃ (آیت: ۲۰۸) میں اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴾

''مسلمانو! پوری مسلمانی میں آجاؤ (یا سب مسلمان مل کر ایک ہو جاؤ) اور شیطان کی راہوں پر مت چلو، بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔''

شریعت کے بعض حصوں پر ایمان لانا اور بعض حصوں پر ایمان نہ لانا، یہود و نصاریٰ کا فعل

تھا، جس کی انھیں سخت سزا دی گئی۔ سورۃ البقرۃ (آیت: ۸۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَ تُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ اِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَ تَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ﴾

''پھر تم وہی ہو جو اپنوں کا خون کرتے ہو اور ناحق زبردستی بعضے لوگوں کی مدد لے کر اپنے لوگوں میں سے ایک فرقے کا دیس نکالا کرتے ہو (یعنی ایک فرقہ کو زبردستی اپنا مددگار بنا کر اپنی ذات والوں کو شہر بدر کرتے ہو) پھر جن لوگوں کا دیس نکالا کرتے ہو اگر وہ قید ہو کر تمھارے پاس آئیں تو تم چھڑائی (فدیہ) بھر کر ان کو چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔ کیا (اللہ کی) کتاب میں سے کچھ مانتے ہو کچھ نہیں مانتے؟ پھر جو لوگ تم میں ایسا کریں ان کا بدلہ اور کیا ہے، یہی کہ دنیا میں رسوا ہوں اور قیامت کے دن سخت عذاب میں لوٹ پڑیں اور اللہ تمھارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے۔''

اہلِ ایمان کو اس قبیح جرم سے باز آجانا چاہیے، ورنہ ان کے لیے بھی وہی سزا ہوگی جو اہلِ کتاب کو دی گئی۔ دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں شدید ترین عذاب...!

قرآنِ کریم کی کسی ایک آیت یا حکم کا استہزا کرنے کی سزا:

نزولِ قرآن کے وقت بھی بعض لوگ قرآنی آیات اور احکام کا مذاق اڑاتے تھے، ان میں کافر، مشرک اور منافقین سبھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

① اللہ تعالیٰ نے جب تحویلِ قبلہ کی آیت: ﴿فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴] ''پس اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف پھیر دو۔'' نازل فرمائی تو اس کا یوں مذاق اڑایا گیا کہ سمجھ نہیں آتی کہ محمد ﷺ کا صحیح قبلہ کس طرف ہے؟ اگر پہلا صحیح تھا تو اسے کیوں چھوڑا گیا اور اگر دوسرا صحیح ہے تو پھر پہلا غلط تھا اگر محمد ﷺ واقعی اللہ کے نبی ہوتے تو بیت المقدس

کو چھوڑ کر بیت اللہ کو اپنا قبلہ نہ بناتے؟

② انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لیے جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً﴾ [البقرۃ: ۲۴۵]

''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے تاکہ اللہ اسے دگنا، چوگنا کر کے واپس کر دے۔''

تو ان لوگوں نے اس آیت کا مذاق یوں اڑایا کہ لیجیے صاحب! اب اللہ میاں بھی غریب ہو گئے اور قرض مانگنے لگے۔

③ جہنم کے داروغوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جب سورۃ المدثر کی آیت (۳۰) نازل فرمائی:

﴿ عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾ ''جہنم پر انیس داروغے مقرر ہیں۔''

تو ابوجہل نے اس کا مذاق یوں اڑایا کہ محمد ﷺ کے مددگار تو صرف انیس ہیں، ہماری تعداد اتنی زیادہ ہے کہ دس دس یا سو سو آدمی بھی ایک داروغہ پر غالب آئیں تو کافی ہوں گے۔ ایک دوسرے کافر نے ٹھٹھا لگا کر کہا: ''تم لوگ دو کو سنبھال لینا باقی سترہ کے لیے میں اکیلا کافی ہوں۔''

کفار و مشرکین اور منافقین کی یہ روش آج بھی جاری ہے۔ آیاتِ حدود کا مذاق، آیاتِ حجاب کا مذاق، آیاتِ تعددِ ازواج کا مذاق، آیاتِ قیامت کا مذاق اور آیاتِ عذاب کا مذاق، قرآنی آیات کے علاوہ بعض دیگر شرعی احکام مثلاً ڈاڑھی، شرعی لباس، برقعہ، مسجد، مدرسہ اور نماز وغیرہ کا مذاق اڑانا تو اب ایک خاص طبقے کا فیشن بن چکا ہے، لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ قرآنِ کریم کی کسی آیت، حکم، قانون یا فیصلے کا مذاق اڑانا نواقضِ اسلام میں سے ہے اور ایسا کرنے والا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

پس اے اہلِ ایمان! اللہ تعالیٰ سے ڈر جائیں، اعتدال پسندی اور روشن خیالی کے شوقِ فضول میں اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی بے ادبی یا گستاخی نہ کر بیٹھنا، نہ اللہ کی آیات اور احکام کا مذاق اڑانے والوں سے کوئی تعلق یا میل جول رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں ذلت اور رسوائی مقدر بن جائے اور آخرت میں حسرت و ندامت کے ساتھ روشن خیال لوگوں کی دوستی پر یہ کہہ کر آنسو بہانے پڑیں:

﴿ قَالَ یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَبَیْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ﴾ [الزخرف: ۳۸]

''کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق اور مغرب کی دوری ہوتی (تو) بہت برا ساتھی ہے۔''

لیکن اُس دن اعتراف کا کیا فائدہ...؟

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ﴾ [التوبة: ٦٥، ٦٦]

''اور (اے پیغمبر!) اگر تو ان (منافقوں) سے پوچھے (کہ یہ کیا باتیں ہیں؟) تو کہیں گے: ہم تو یونہی گپ شپ اور دل لگی کرتے تھے۔ (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دے: کیا تم اللہ تعالیٰ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی ٹھٹھا لگاتے ہو۔ بہانے مت کرو (باتیں نہ بناؤ) تم ایمان لا کر (ایمان کا دعویٰ کر کے) پھر کافر ہوگئے، اگر ہم تم میں سے بعضوں کے قصور معاف بھی کریں تو بعضوں کو ان کے قصور وار ہونے کی وجہ سے سزا دیں گے۔''

پس ایسے شخص کی قیامت کے روز سزا وہی ہوگی جو کفار کی ہے، یعنی ابدی جہنم۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَ اتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا﴾

[الكهف: ١٠٦]

''یہ دوزخ کی سزا ان کو اس لیے ملے گی کہ انھوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں اور پیغمبروں کی ہنسی اُڑائی۔''

قرآنی آیات کا مذاق اڑانے کی سزا جہنم ہے، جیسا کہ سورۃ الکہف (آیت: ۱۰۶) میں اللہ رب العزت کا فرمان ہے۔ قرآنی آیات کا مذاق اڑانے والوں کو قیامت کے روز ذلیل و رسوا کرنے کے لیے کسی بھولی بسری چیز کی طرح نظر انداز کر دیا جائے گا، جیسا کہ سورۃ الجاثیہ (آیت: ۳۴، ۳۵) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ﴾

''اور (ان سے) کہہ دیا جائے گا: آج ہم تم کو بھلا دیں گے (تمھارا خیال چھوڑ دیں گے) جیسے تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی تمھاری مدد کرنے والا نہیں۔ یہ اس کی سزا ہے جو تم نے (دنیا میں) اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو ہنسی ٹھٹھا بنایا تھا (ان سے مسخرہ پن کرتے تھے) اور دنیا کی زندگی نے تم کو فریب دے رکھا تھا (تم اس کے دھوکے میں آگئے تھے) تو آج یہ لوگ (کبھی) دوزخ سے نہ نکالے جائیں گے اور نہ ان کو منانے کا موقع دیا جائے گا۔''

یاد رہے قرآن مجید کی کسی آیت کا استہزا یعنی قرآن کے کسی حکم یا قانون یا فیصلے کا استہزا اور رسول اکرم ﷺ کی کسی حدیث، حکم یا فیصلے کا استہزا یا نبی رحمت ﷺ کی کسی سنت کا مذاق سب باتیں اسی حکم میں ہیں۔ سورت لقمان (آیت: ٦) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ یَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ﴾

''اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو واہی (لغو بیکار اور اللہ کو بھلانے والی) باتیں مول لیتے ہیں اس لیے کہ بن سمجھے بوجھے اللہ تعالیٰ کی راہ سے (لوگوں کو) بہکا دیں اور اللہ کی راہ کو ہنسی ٹھٹھا بنائیں، ان لوگوں کو (قیامت کے دن) تکلیف کا عذاب ہوگا۔''

عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن مجید کا مذاق اڑانے والے مرتد شخص کا عبرتناک انجام:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عیسائی آدمی مسلمان ہوا تو اس نے سورت بقرہ اور سورت آل عمران پڑھ لی اور رسولِ اکرم ﷺ کے لیے (وحی کی) کتابت کرنے لگا، لیکن بعد میں مرتد ہوگیا۔ کہنے لگا: محمد (ﷺ) کو تو کسی بات کا پتا نہیں ہے، جو کچھ میں لکھ کر دیتا ہوں بس وہی کہہ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب اسے موت دی تو عیسائیوں نے اسے (قبر میں) دفن کر دیا، صبح ہوئی تو (لوگوں نے دیکھا کہ) زمین نے اسے باہر نکال پھینکا ہے۔ عیسائیوں نے کہا: یہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا کام ہے، چونکہ وہ ان کے دین سے بھاگ کر آیا ہے، لہٰذا انھوں نے اس کی قبر کھود کر لاش باہر نکال پھینکی ہے۔ عیسائیوں نے اس کے لیے دوبارہ (نئی) قبر کھودی اور اسے (پہلے کی نسبت) بہت گہرا بنایا اور (لاش کو دفن کر دیا) جب صبح ہوئی تو (لوگوں نے دیکھا کہ) زمین نے

اسے پھر باہر نکال پھینکا ہے، عیسائیوں نے پھر الزام لگایا کہ یہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا کام ہے، چونکہ وہ ان کے دین سے بھاگ کر آیا ہے۔ پھر انھوں نے (تیسری مرتبہ) اس کے لیے قبر کھودی اور اتنی گہری بنائی جتنی گہری وہ بنا سکتے تھے۔ صبح ہوئی تو (لوگوں نے دیکھا کہ) زمین نے اسے پھر نکال باہر پھینکا ہے، تب انھیں یقین ہو گیا کہ یہ مسلمانوں کا کام نہیں ہے (بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے) چنانچہ عیسائیوں نے اس کی لاش ایسے ہی چھوڑ دی۔[1]

قرآن مجید میں شک کرنے کی سزا:

قرآنِ کریم کی کسی آیت، حکم یا فیصلے میں شک کرنے کی سزا جہنم ہے۔ سورت حدید (آیت: ۱۳ تا ۱۵) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾

”جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمانداروں سے کہیں گے: (ذرا تو ٹھہرو) ہم کو آنے دو، ہم بھی تمھاری روشنی سے سلگا لیں۔ ان سے کہا جائے گا: پیچھے لوٹ جاؤ (یعنی دنیا میں پھر جاؤ) وہاں روشنی ڈھونڈھ لو، پھر اس کے بعد ایماندار اور منافق کے بیچ میں ایک دیوار کی آڑ کر دی جائے گی، اس میں ایک دروازہ ہوگا، اس کے اندر کی طرف تو رحمت (بہشت) ہوگی اور اس کے ادھر (جدھر منافق ہوں گے) باہر کی طرف (اللہ کا) عذابِ جہنم ہوگا۔ منافق ایمانداروں سے پکار پکار کر کہیں گے: کیا (دنیا میں) ہم تمھارے ساتھ نہ تھے اور وہ کہیں گے البتہ تھے تو سہی مگر تم نے (نفاق کر کے) خود اپنے آپ کو بلا میں ڈالا اور تم انتظار کرتے تھے (دل سے ہمارے خیر خواہ نہ تھے) اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨١)

اللہ (اور پیغمبر کی طرف سے) تم کو شک ہی رہا اور (واہی تباہی) امیدوں آرزؤوں نے تم کو دھوکے میں ڈال کر رکھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آن پہنچا (تم مرگئے اور شیطان نے) تم کو (نہ چھوڑا) اللہ کے باب میں فریب ہی دیتا رہا تو آج کے دن نہ تم سے چھڑائی میں کچھ لیا جائے گا (فدیہ وغیرہ منظور ہوگا) اور نہ (دوسرے) کافروں سے، تم (سب) کا ٹھکانا دوزخ ہے، وہی تمھاری رفیق ہے اور وہ بری جگہ ہے۔"

اسی طرح سورت قٓ (آیت: ۲۴، ۲۵) میں اللہ تعالیٰ اعلان فرما رہے ہیں:

﴿ اَلۡقِیَا فِیۡ جَهَنَّمَ کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیۡدٍ ۙ مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ مُعۡتَدٍ مُّرِیۡبِ ﴾

"دونوں جا کر ہر ناشکرے شریر، بھلائی سے روکنے والے، حد سے بڑھ جانے والے، (ایمان کی باتوں میں) شک کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دو۔"

قرآن مجید میں شک کرنے والے قیامت کے روز ایمان لانا چاہیں گے لیکن انھیں ایمان لانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ قرآن کریم میں شک کرنے سے مراد ہے:

① قرآنِ مجید کے منزل من اللہ ہونے میں شک کرنا۔

② قرآنِ مجید میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کی صداقت میں شک کرنا۔

③ قرآنِ کریم میں جو احکام دیے گئے ہیں، ان میں انسانیت کی فلاح اور نجات ہونے کے بارے میں شک کرنا۔

④ توحید، رسالت اور آخرت کے بارے میں جو عقائد بیان کیے گئے ہیں، ان میں شک کرنا۔

⑤ قرآنِ مجید میں بیان کیے گئے معجزات کے بارے میں شک کرنا۔

⑥ کائنات کے بارے میں بیان کیے گئے ابدی حقائق مثلاً سورج، چاند اور دیگر تمام سیاروں کی حرکت میں شک کرنا۔

قرآنِ کریم سے اعراض کی سزا:

قرآنِ مجید سے اعراض کرنے والا دنیا میں تکلیف دہ زندگی بسر کرے گا، جیسا کہ سورت طٰہٰ (آیت: ۱۲۴) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیۡشَةً ضَنۡکًا وَّ نَحۡشُرُهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اَعۡمٰی ﴾

''اور جس نے میری کتاب (قرآن) سے منہ موڑ لیا (دنیا میں) اس کی زندگی تنگ (گزرے گی) اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔''

قرآنِ کریم سے غفلت برتنے والوں پر دنیا میں اللہ تعالیٰ ایسا شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو انھیں اس فریب میں مبتلا رکھتا ہے کہ وہ راہِ راست پر ہیں۔ ان کے متعلق قرآنِ کریم کی سورۃ الزخرف (آیت: ۳۶، ۳۷) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۞ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾

''اور جو کوئی اللہ کی یاد سے آنکھ چرائے (غفلت کرے) ہم اس پر ایک شیطان تعینات کر دیتے ہیں وہ (ہر وقت) اس کے ساتھ رہتا ہے اور یہ شیطان ان کافروں کو (اللہ کی) راہ سے روکتے ہیں اور کافر سمجھتے ہیں کہ وہ ٹھیک راستے پر ہیں۔''

قرآنِ مجید سے اعراض کا مطلب اس پر ایمان نہ لانا بھی ہے، مزید برآں ایمان لانے کے بعد اس کی تلاوت نہ کرنا، اسے سمجھنے کی کوشش نہ کرنا، اس پر عمل نہ کرنا، اسے چھوڑ کر کسی دوسری کتاب کو ترجیح دینا، اس کے مطابق فیصلے نہ کرنا اور اس کی تعلیم و تدریس اور دعوت کو ترک کر دینا بھی اعراض میں شامل ہے۔ قرآنِ مجید سے اعراض کرنے والے دنیا میں ذلیل اور رسوا ہوں گے اور ان کو قبر میں شدید عذاب دیا جاتا ہے۔ قیامت کے روز اپنی قبروں سے اس حال میں اٹھیں گے کہ ان کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پتھرائی ہوئی ہوں گی۔ قرآنِ کریم کی سورت طٰہٰ (آیت: ۱۰۲) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا﴾

''جس دن صور پھونکا جائے گا اور گناہگاروں (مشرکوں اور کافروں) کو ہم اس دن اکٹھا کریں گے ان کی آنکھیں نیلی (یا اندھی) ہوں گی (اور منہ کالے)۔''

سورت بنی اسرائیل (آیت: ۷۲) میں ان کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

﴿ وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا﴾

''اور جو اس دنیا میں اندھا رہا (اس نے ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کیا) وہ آخرت میں

اور زیادہ اندھا اور راہ سے دور بھٹکا ہوگا (وہاں نجات کا راستہ نہ ملے گا)۔‘‘

قرآنِ کریم سے اعراض کرنے والوں کے خلاف قیامت کے روز خود رسولِ اکرم ﷺ مقدمہ دائر کروائیں گے۔ سورۃ الفرقان (آیت: ۳۰) میں اللہ رب العزت نے فرمایا ہے:

﴿ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴾

’’اور پیغمبر (اس وقت) یہ عرض کرے گا (میں کیا کروں) میری قوم اس قرآن کو چھوڑ بیٹھی تھی۔‘‘

اس کے بعد آپ غور کریں کہ پھر ٹھکانا کہاں ہوگا؟ یاد رہے جس نے عمل کرنے کے بجائے مال کمانے کے لیے قرآنِ کریم کا علم حاصل کیا، ان کے لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’جس نے وہ علم حاصل کیا جس سے اللہ کی رضا حاصل ہو (وہ درست ہے) لیکن جو اسے دنیاوی مفادات کے لیے حاصل کرتا ہے وہ جنت کی خوشبو نہیں پا سکے گا۔‘‘[1]

جس نے فخر جتلانے یا بڑا بننے کے لیے قرآن کا علم حاصل کیا، اس کے لیے آگ ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا:

’’علم اس لیے حاصل نہ کرو کہ علما پر فخر جتلاؤ یا جہلا سے جھگڑا کرو یا مجالس میں بڑے بن جاؤ، جو شخص ایسا کرے گا، اس کے لیے آگ ہے آگ۔‘‘[2]

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ قرآنِ کریم پڑھنے اور اس پر عمل نہ کرنے والوں کے ہونٹ جہنم میں آگ کی قینچیوں سے کاٹے جائیں گے۔[3]

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں قرآن کریم کا قرب نصیب فرما دے اور اسے پڑھنے سمجھنے اور عمل کرنے والا بنا دے اور ہمیں اس کی ہدایت نصیب فرما دے کیونکہ انسان کی ہدایت کے لیے قرآنِ مجید ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس لیے انسان کے ازلی دشمن شیطان نے اسے قرآنِ کریم سے دور رکھنے کے لیے بے شمار رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں، جس کی وجہ سے ہم اللہ کی اس نعمت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٢)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٤)

[3] صحيح الجامع الصغير للألباني، رقم الحديث (١٢٨)

اسی دشمن سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے کئی مقامات پر حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے واقعہ کو ذکر کیا ہے، اس میں شیطان اور ابنِ آدم کے مابین ان کے باپ آدم علیہ السلام سے لیکر تا ابد عداوت کے معاملے سے خبردار کیا گیا ہے۔ یہ قصہ مختلف انداز سے اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ انسان شیطان کی سرکشی اور اس کے شر سے اچھی طرح آگاہ ہو جائے اور شیطان کے جال سے بچ جائے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں سب سے بڑی نعمت قرآنِ مجید ہے حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کی ساری برکتیں اور بھلائیاں سمیٹ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآنِ مجید کی صورت میں ہماری جھولی میں ڈال دی ہیں۔ قرآنِ مجید اپنے پڑھنے والوں کے لیے باعثِ سکینت، باعثِ رحمت، باعثِ ہدایت اور باعثِ شفا ہے۔ زندگی اور موت کے فتنوں سے پناہ مہیا کرنے والا اور زمین اور آسمانی آفات سے تحفظ فراہم کرنے والا ہے۔

انسانی زندگی کی کون سی حاجت اور مشکل ایسی ہے جس کا حل قرآنِ کریم نے پیش نہ کیا ہو؟ کون سا درد یا روگ ایسا ہے جس کا علاج نہ بتایا ہو؟ کون سا ایسا سوال ہے جس کا جواب نہ دیا ہو؟ اس دنیا کے بعد عالمِ برزخ میں بھی قرآنِ کریم اہلِ ایمان کے لیے باعثِ رحمت اور باعثِ نجات ہوگا۔

برزخ کے بعد آخرت میں بھی قرآنِ مجید اہلِ ایمان کے لیے باعثِ شفاعت، بلندی درجات کا ذریعہ اور باعثِ عزت ہوگا۔ انسان قدم قدم پر قرآنِ مجید کا محتاج ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی کم و بیش نوے فیصد اکثریت قرآنِ کریم کے فضائل سے ناآشنا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں قرآنِ مجید کا تصور بس اس حد تک ہے کہ یہ ہماری مقدس کتاب ہے جسے چھونے سے قبل وضو کرنا چاہیے، یا اس کو پکڑتے ہی چومنا اور آنکھوں پر لگانا ضروری ہے یا پھر شادی بیاہ کے موقع پر بیٹیوں کو ہدیہ دینا، یا گھر سے رخصت کرتے ہوئے اس کے سائے سے گزارنا، لڑائی جھگڑے کے موقع پر قسم کھانا اور گواہی کے لیے استعمال کرنا، جنات دور کرنے کے لیے اس کی سورتوں کا عمل کرنا، یا اس کا تعویذ بنانا، اس سے فال نکالنا، یا پھر ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کرنا، کیا یہی اس کے اصل مقاصد ہیں، جن کے لیے قرآنِ کریم نازل کیا گیا ہے؟ مسلمانو! ایسا ہرگز نہیں، قرآنِ کریم ان کاموں کے لیے نہیں نازل کیا گیا، بلکہ قرآنِ کریم اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ ہم اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں، لیکن ہماری غفلت اور بے پروائی کا عالم یہ ہے کہ ہم

اس کی تلاوت، تحفیظ، تعلیم اور تدریس کے فوائد اور فضائل سے آگاہ نہیں۔ سورت یونس، (آیت: ۵۷) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لیے شفا ہے اور راہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔''

یعنی جو قرآنِ کریم کو دل کی توجہ سے پڑھے اور اس کے معانی و مطالب پر غور کرے، اس کے لیے قرآنِ کریم نصیحت ہے اور اس کے مواعظ کی مثال ڈاکٹر و طبیب کی طرح ہے جو مریض کو ان چیزوں سے روکتا ہے جو اس کے جسم وصحت کے لیے نقصان دہ ہوں۔ قرآنِ کریم بھی ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں سے وعظ ونصیحت کرتا ہے اور ان نتائج سے آگاہ کرتا ہے، جن سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی صورت سے دو چار ہونا پڑے اور ان کاموں سے بھی روکتا ہے، جن سے انسان کی اخروی زندگی برباد ہوسکتی ہے، یعنی دلوں میں توحید و رسالت اور عقائد کے بارے میں جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں، ان کا ازالہ اور کفر و نفاق کی جو گندگی و پلیدی ہوتی ہے، اس کو صاف کرتا ہے۔ یہ قرآن مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہے۔ ویسے تو یہ قرآنِ کریم سارے جہان والوں کے لیے ہی ہدایت و رحمت کا ذریعہ ہے، لیکن اس سے فیض یاب صرف اہلِ ایمان ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں صرف انھی کے لیے اسے ہدایت و رحمت قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ سورت بنی اسرائیل (آیت: ۸۲) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾

''یہ قرآنِ کریم جو ہم نازل کر رہے ہیں مومنون کے لیے تو سراسر شفا اور رحمت ہے مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔''

کاش! ہم جان سکیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآنِ کریم عطا فرما کر ہم پر کتنا بڑا احسان کیا

ہے۔ کاش ہم جان سکیں کہ قرآنِ مجید سے غفلت برت کر ہم اپنے آپ پر کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں۔ جو لوگ آج اپنی آنکھوں سے غفلت کی پٹی نہیں اتاریں گے، یقیناً وہ قیامت کے روز حسرت و یاس سے اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہیں گے:

﴿سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ﴾ [القلم: ٢٩]

''پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہم ہی ظالم تھے۔''

ایک افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ اکثر والدین اپنے بچوں کی تعلیم کا آغاز دنیاوی تعلیم سے کرتے ہیں۔ معیاری سے معیاری سکول تلاش کرتے ہیں۔ اچھا لباس، اچھا کھانا پینا، اچھا رہن سہن مہیا کرتے ہیں، بچوں کے ہر طرح کے ناز ونخرے دیکھتے ہیں اور پیسا پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ خود ہر طرح کی تکلیف اور مصیبت برداشت کرتے ہیں تاکہ بچہ اچھی سے اچھی تعلیم حاصل کر کے کسی اونچے اور اعلیٰ منصب پر فائز ہو، یہ سب کچھ کس لیے کہ آدمی سکون کی زندگی بسر کر سکے، کیا آپ جانتے ہیں کہ اتنا سب کرنے کے باوجود ان کا بچہ اونچے اور اعلیٰ منصب پر فائز ہوگا کہ نہیں؟ ہرگز نہیں جانتے کیونکہ مرتبہ و منصب اور عزت و ذلت سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، صرف دنیا کی تعلیم حاصل کر لینے سے منصب و مقام نہیں ملتا۔ جو والدین اپنے بچوں کے لیے قرآنی تعلیم کے لیے سرے سے ہی کوئی فکر نہیں کرتے اور نہ قرآنی تعلیم کے لیے کوئی پیسہ خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں، یہی وہ والدین ہیں جو اپنی اولاد کی دینی تعلیم سے محرومی کا باعث بنتے ہیں۔

غور فرمائیے! کیا یہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں کہ قرآنی تعلیم سے محروم اولاد نہ صرف یہ کہ اپنے والدین کی خدمت گار اور وفادار ثابت نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات اپنے والدین کی ذلت اور رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ جو اولاد اس دنیا میں ذلت اور رسوائی کا باعث بنے گی، وہ آخرت میں اپنے والدین کے کس کام آئے گی؟ جبکہ قرآنی تعلیم سے آراستہ اولاد نہ صرف اس دنیا میں اپنے والدین کی خدمت گار اور وفادار ثابت ہوتی ہے بلکہ آخرت میں بھی اپنے والدین کے لیے صدقہ جاریہ بنتی ہے۔

اپنی اولاد کو قرآنِ کریم سکھانے والے والدین کو قیامت کے دن ساری دنیا کے سامنے ایسے قیمتی لباس پہنائے جائیں گے جو دنیا وما فیہا سے بڑھ کر ہیں، لہٰذا تمام والدین کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ اپنی اولاد کو قرآنِ مجید کی تعلیم سے محروم رکھ کر وہ کتنا بڑا خسارا مول لے رہے ہیں۔ یہ نہ صرف

اپنے آپ پر ظلم ہے بلکہ اولاد پر بھی ظلمِ عظیم ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ [الزمر: ١٥]

''کہہ دو حقیقی زیاں کار وہ ہیں جو اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو قیامت کے دن نقصان میں ڈال دیں گے، یاد رکھو! کھلم کھلا نقصان یہی ہے۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور تمام اہلِ ایمان کو اپنے فضل وکرم سے اس خسارے سے محفوظ فرمائے اور اپنے پاک کلام قرآنِ کریم کو پڑھنے، اس کو سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں جذبہ پیدا فرما دے۔ آمین۔ بلاشبہ قرآنِ عظیم کا عامل جس فقید المثال جزا کا منتظر ہے، وہ جنت کے کئی درجات ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ [الأنعام: ١٣٢]

''اور ہر ایک کے لیے ان اعمال کی وجہ سے درجے ہیں جو انھوں نے کیے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا نافرمانی کرنے والے کے لیے اس کے عمل کے مطابق منازل و مراتب ہیں۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ عمل کو ٹھیک اس کے عمل کے مطابق ہی اس کے انجام و مقام تک پہنچائے گا۔ اگر اعمال اچھے ہیں تو اچھائی کے درجے ملیں گے، برے ہیں تو برے درجے ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ بندے کو ہمیشہ اعمال کے مطابق ہی نتائج وعواقب پیش آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عظیم پر عمل کرنے والے شخص سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اسے پاکیزہ زندگی عطا فرمائے گا۔ سورۃ النحل (آیت: ٩٧) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

''جس نے نیک عمل کیے، مرد ہو یا عورت، جبکہ وہ مومن ہو تو ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ہم انھیں ضرور ان کا اجر وثواب (بدلہ) اس سے بہتر دیں گے جو وہ عمل کرتے تھے۔''

پس ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ قرآن عظیم کے نور سے روشنی حاصل کرے، اس کے عقائد کے مطابق اعتقاد رکھے، اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانے، اس کے احکام بجالائے، اس

کی منع کر دہ باتوں سے اجتناب کرے اور اس کے واقعات اور مثالوں سے عبرت حاصل کرے۔

اس ساری گفتگو کے بعد کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے نورِ ہدایت سے محروم رہے اور بصیرت حاصل نہ کرے۔ جس شخص نے اس نور کو قبول کر لیا، اس کا اتباع کیا اور اس میں جو کچھ ہے اس کے مطابق عمل کیا، وہی کامیاب اور دنیا و آخرت میں اپنے مطلوب کو پانے والا ہے۔ ایسا خوش قسمت فرد ہی دین و دنیا کی بھلائیاں حاصل کرے گا اور ان کے شرور سے نجات پا جائے گا، کیونکہ جو شخص قرآن مجید کی تعلیمات پر مضبوطی سے جما رہے گا، وہ ہر دور میں گمراہیوں سے محفوظ رہے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى﴾ [طٰهٰ: ۱۲۳]

"جس نے میری ہدایت کی پیروی کی وہ نہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا نہ (آخرت میں) نامراد ہوگا۔"

دنیاوی اور برزخی زندگی کی طرح اُخروی زندگی میں بھی انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سب سے زیادہ محتاج ہوگا اور یہ رحمت بھی قرآن مجید کے ذریعے ہی حاصل ہوگی۔ میدانِ حشر ہو یا میزان، صراط ہو یا جنت؛ ہر جگہ قرآنِ مجید اپنے حاملین کے لیے رحمت کا مژدہ بن کر آئے گا۔ یہ کتابِ الٰہی تمام انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے، لیکن اس چشمہ فیض سے سیراب صرف وہی لوگ ہوں گے، جو آبِ حیات کے متلاشی اور خوفِ الٰہی سے سرشار ہوں گے۔ جن کے دل میں مرنے کے بعد اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر جواب دہی کا احساس اور اس کی فکر ہی نہیں اور اس کے اندر ہدایت کی طلب یا گمراہی سے بچنے کا جذبہ ہی نہیں ہوگا تو اسے ہدایت کہاں سے اور کیونکر حاصل ہوسکتی ہے؟

آنکھ والا تیری قدرت کا تماشا دیکھے
دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر السعدی۔
3. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
5. عظمتِ قرآن۔ تالیف: فضیلہ الشیخ محمد منیر قمر حفظہ اللہ
6. فضائلِ قرآن مجید۔ تالیف: فضیلہ الشیخ محمد اقبال کیلانی حفظہ اللہ

قرآن کریم کی بعض سورتوں اور آیات کے فضائل و برکات

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [یونس: ۵۷]

''لوگو! تمھارے پاس تمھارے مالک کی طرف سے نصیحت آئی اور دلوں میں جو (کفر اور شرک کی) بیماریاں ہیں ان کی دوا ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ایمانداروں کے لیے۔''

قرآنِ کریم مومنوں کے لیے سارے کا سارا ہی باعثِ رحمت اور برکت ہے لیکن اس میں سے بعض سورتوں اور آیات کے فضائل بھی نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائے ہیں، جیسے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھنے کی بہت فضیلت ہے۔

① بسم اللہ کی فضیلت:

شریعت میں تمام اہم کاموں کے شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ کھانے، ذبح کرنے، وضو اور جماع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھو۔ تاہم قرآنِ کریم کی تلاوت کے وقت ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سے پہلے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' پڑھنا بھی ضروری ہے۔ سورۃ النحل (آیت: ۹۸) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾

''جب تم قرآن کریم پڑھنے لگو تو شیطانِ رجیم سے اللہ کی پناہ مانگو۔''

بسم اللہ کے فضائل و برکات کے متعلق حضرت وحشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! ہم کھانا کھاتے ہیں لیکن سیر نہیں ہوتے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''شاید تم لوگ الگ الگ کھانا کھاتے ہو؟'' انھوں نے عرض کی: ہاں، یا رسول اللہ ﷺ!''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''کھانا اکٹھے کھایا کرو اور اس پر اللہ کا نام لیا کرو، اللہ تعالیٰ تمھارے کھانے میں برکت ڈال دے گا۔''[1]

جس کھانے سے قبل بسم اللہ نہ پڑھی جائے اس کھانے میں شیطان بھی شریک ہو جاتا ہے اور برکت اٹھالی جاتی ہے اور جس چیز پر ''بسم اللہ'' پڑھ لی جائے، شیطان اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا، جیسے سورۃ الرحمٰن (آیت: ۷۸) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ تَبٰرَكَ اسۡمُ رَبِّكَ ذِی الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ ﴾

''(اے پیغمبر!) تیرے مالک کا نام بڑی برکت کا ہے جو عزت اور بزرگی والا ہے۔''

بسم اللہ پڑھنے سے انسان شیطان کے حملے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ایک صحابی سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا، اچانک میں گرا اور ٹھوکر کھائی تو میں نے کہا: ''ہلاک ہو شیطان!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسے نہ کہو کہ شیطان ہلاک ہو، اس سے شیطان کی تعظیم ہوگی اور وہ اکڑ کر گھر کے برابر ہو جائے گا اور وہ سمجھے گا کہ میرے پاس اسے گرانے کی طاقت ہے۔ اگر بسم اللہ پڑھو گے تو اس سے شیطان حقیر اور ذلیل ہو گا حتیٰ کہ مکھی کے برابر ہو جائے گا۔''[2]

② سورت فاتحہ کی فضیلت:

سورت فاتحہ قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت ہے، جس کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ فاتحہ کے معنی آغاز و ابتدا کے ہیں، اس لیے اسے ''اَلْفَاتِحَة''، یعنی فاتحہ الکتاب کہا جاتا ہے۔ اس کے اور بھی متعدد نام احادیث سے ثابت ہیں، مثلاً:

① ام القرآن ② سبع مثانی (جو نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہے) ③ قرآنِ عظیم

[1] سنن ابن ماجه (٢/ ٢٦٥٧)

[2] صحيح. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٨٢)

④ سورۃ الحمد ⑤ سورۃ الشکر ⑥ سورۃ الدعا ⑦ سورۃ الشافی

اس سورت کے ناموں کی کثرت اس کی فضیلت اور عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ سورت فاتحہ سارے قرآن مجید کا نچوڑ ہے۔[1] سورت فاتحہ جیسی فضیلت رکھنے والی سورت امتِ محمدیہ ﷺ سے پہلے کسی امت کو نہیں دی گئی۔ سورت فاتحہ کا دوسرا نام قرآن عظیم بھی ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! سورت فاتحہ جیسی سورت نہ تورات میں نازل کی گئی، نہ انجیل میں، نہ زبور میں، یہ سات آیتیں ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور یہی قرآنِ عظیم ہے جو میں دیا گیا ہوں۔''

سورت فاتحہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگو گے سو پاؤ گے۔ سورت فاتحہ تمام جسمانی عوارض کے لیے شفا ہے۔ اس میں جادو، جنون، مرگی اور سایہ جیسی بیماریوں سے شفا ہے۔

حضرت خارجہ بن صلت رضی اللہ عنہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ (دورانِ سفر) وہ ایک قوم کے پاس سے گزرے تو وہ لوگ ان کے پاس آئے اور کہا: ''تم اس آدمی (حضرت محمد ﷺ) کے پاس سے خیر و برکت لے کر آئے ہو، لہٰذا ہمارے آدمی کو دم کر دو، پھر وہ ایک آدمی کو لائے جو دیوانہ تھا اور اس کو رسیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ صحابی نے تین دن صبح و شام سورت فاتحہ پڑھ کر اسے دم کیا۔ صحابی جب سورت فاتحہ پڑھ لیتے تو معمولی سی تھوک منہ میں جمع کرکے اس پر پھونک مار دیتے۔ تین دن کے بعد وہ آدمی ہشاش بشاش ہو گیا، جیسے قید سے آزاد ہو گیا ہو۔ ان لوگوں نے صحابی کو اس کا کچھ معاوضہ دیا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور ساری بات بتائی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کھا لو، میری عمر جس کے ہاتھ میں ہے، اس ذات کی قسم! بعض لوگ جھوٹے دم کرکے معاوضہ لیتے ہیں، تم نے تو سچا دم کرکے معاوضہ لیا ہے۔''[2]

ہمارے لیے یہ بہترین علاج ہے۔ لہٰذا امتِ مسلمہ کو اس پر عمل کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

---

[1] سنن الترمذي (٣/ ٢٣١١)

[2] سنن أبي داود (٢/ ٢٩١٨)

نماز میں سورت فاتحہ کی اہمیت:

سورت فاتحہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا واجب ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''اس شخص کی نماز نہیں ہوتی، جس نے سورت فاتحہ نہیں پڑھی۔''[1]

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں اس کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، جس کا نصف حصہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی رحمت و ربوبیت اور عدل و بادشاہت کے بیان میں ہے اور نصف حصے میں دعا و مناجات ہے جو بندہ اللہ کی بارگاہ میں کرتا ہے۔ لہٰذا میرا بندہ جو سوال کرے گا، اسے ملے گا۔ جب بندہ کہتا ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندے نے میری تعریف کی۔'' کیونکہ تعریف کا اصل مستحق اور حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے، اس کا استعمال کسی اور کے لیے جائز نہیں ہے۔

یہ کلمہ شکر بھی ہے جس کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' میزان کو بھر دیتا ہے۔[2]

جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ''بہت بخشش کرنے والا بڑا مہربان۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندے نے میری ثنا کی۔''

اور ایک مرتبہ یوں فرمایا: ''بندے نے اپنے کام میرے سپرد کر دیے۔''

اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ''انصاف کے دن کا مالک۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔''

اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٤۔ ٣٩٦)

[2] صحيح مسلم (١/ ٢٢٣)

''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان معاملہ ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا اسے ملے گا۔''

جب بندہ کہتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ''ہم کو سیدھی (اور سچی) راہ دکھا۔''

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾

''ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا (یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کا راستہ) اور ان لوگوں کی جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی۔''

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''اس بندے کی دعا بھی قبول ہوتی اور اس کے علاوہ جس چیز کا سوال کرے گا وہ بھی اسے دوں گا۔''[1]

اس لیے صراط مستقیم پر چلنے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہود و نصاری دونوں کی گمراہیوں سے بچ کر رہیں۔ سورت فاتحہ کے آخر میں آمین کہنی چاہیے، نبی اکرم ﷺ نے اس کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے، اس کے مختلف معنی بیان کیے گئے ہیں، جن میں ایک یہ بھی ہے: اے اللہ! ہماری دعا قبول فرما لے۔

③ سورت بقرہ کی فضیلت:

سورت بقرہ کی بہت فضیلت ہے، جس گھر میں اس کی تلاوت ہوتی رہے:

① اس گھر میں شیطان اور جن داخل نہیں ہو سکتے۔

② سورۃ البقرہ کی تلاوت اور سماعت جادو کا بہترین علاج ہے۔

③ کوئی جادوگر سورت بقرہ پر غالب نہیں آ سکتا۔

④ سورت بقرہ کی تلاوت کرنے سے گھر میں خیر و برکت رہتی ہے۔

⑤ سورت بقرہ کی تلاوت ترک کرنے سے گھر خیر و برکت سے محروم ہو جاتا ہے۔

⑥ قیامت کے روز سورت بقرہ اپنے پڑھنے والوں کی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کرے گی۔[2]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۷۸)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۷٤)

سورت بقرہ قرآن مجید کی چوٹی ہے:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآنِ کریم کی چوٹی سورت بقرہ ہے، جس گھر میں سورت بقرہ پڑھی جائے، شیطان سنتے ہی اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔''[1]

اس سورت کی آخری دو آیات کی تو بہت ہی فضیلت ہے۔ رات سونے سے پہلے سورت بقرہ کی آخری دو آیات پڑھنے والا ہر آفت سے محفوظ رہتا ہے۔ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے رات کے وقت (سونے سے پہلے) سورت بقرۃ کی آخری دو آیات پڑھ لیں وہ اس کے لیے کافی ہوں گی۔'' سورت بقرہ کی آخری دو آیات جادو کا اثر ختم کرنے کی زبردست تاثیر رکھتی ہیں۔[2]

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب لکھی اور اس میں سے دو آیات رکھیں، جن پر سورۃ البقرہ ختم ہوتی ہے۔ اگر یہ آیات مسلسل تین رات تک پڑھی جائیں تو شیطان اس گھر کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔''[3]

سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے جو حاجت طلب کی جائے وہ پوری ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک روز جنابِ جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے اوپر سے دروازہ کھلنے کی زوردار آواز سنی، اپنا سر اٹھایا اور (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو) بتایا کہ یہ آسمانوں کے دروازں میں سے ایک دروازہ ہے، جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھلا۔ اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا ہے جو آج سے پہلے کبھی زمین پر نازل نہیں ہوا۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام کہا اور عرض کی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خوشخبری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو ایسے نور عطا کیے

---

[1] سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني، رقم الحديث (٥٨٨)

[2] صحيح البخاري، كتاب فضائل قرآن، باب فضائل سورة البقره، رقم الحديث (٥٠٠٩)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١) أبواب فضائل القرآن، باب ما جاء في سورة البقرة (٣/ ٢٣١١)

گئے ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کیے گئے۔ ① فاتحۃ الکتاب اور ② سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات۔ جو شخص یہ دو آیات پڑھے گا اسے اس کی مانگی ہوئی چیز ضرور دی جائے گی۔[1]

④ سورت آل عمران کی فضیلت:

قیامت کے روز سورۃ البقرہ اور سورت آل عمران، قرآن مجید کی قیادت کرتی ہوئی آئیں گی اور اپنے پڑھنے والوں کے بخشوانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کریں گی۔ حضرت نواس بن سمعان کلابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

قیامت کے روز قرآن مجید لایا جائے گا اور جو لوگ قرآن پر عمل کرتے تھے وہ بھی لائے جائیں گے۔ سورت بقرہ اور سورت آل عمران آگے آگے ہوں گی۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں سورتوں کی تین مثالیں دیں، جنھیں میں آج تک نہیں بھولا:

1. وہ دونوں سورتیں بادل کے دو ٹکڑوں کی طرح ہوں گی ... یا
2. دو کالے رنگ کی چھڑیاں ہوں گی جن میں روشنی چمک رہی ہو گی ... یا
3. دو قطاریں پرندوں کی ہوں گی اور وہ اپنے پڑھنے والے اور عمل کرنے والے کی طرف سے جھگڑا کریں گی۔''

لہٰذا یہ دونوں سورتیں بڑی برکت والی ہیں، ہر مسلمان کو ان کی تلاوت کرنی چاہیے، تاکہ گھروں میں خیر و برکت نازل ہوتی رہے اور شیطان کے شر سے بچنے کا علاج بھی۔

⑤ آیۃ الکرسی کی فضیلت:

آیۃ الکرسی قرآن مجید کی تمام آیات میں سے اعلیٰ اور افضل آیت ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابو المنذر! کیا تجھے معلوم ہے کہ تمھارے پاس کتاب اللہ میں کون سی آیت سب سے افضل ہے؟'' میں نے عرض کی: ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے (دوبارہ) فرمایا: ''اے ابو المنذر! کیا تجھے معلوم ہے کہ کتاب اللہ میں سے تمھارے پاس کون سی آیت سب سے افضل ہے؟'' میں نے عرض کی: ﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ (یعنی پوری آیت الکرسی) آپ ﷺ نے میرے سینے پر

[1] صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ الفاتحۃ و خواتیم سورۃ البقرۃ (۱۸۷۷)

(شاباش دینے کے لیے) ہاتھ پھیرا اور فرمایا: ''ابو المنذ ر! تجھے علم مبارک ہو۔''[1]

سونے سے پہلے آیۃ الکرسی پڑھنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جو چوری ڈاکا اور دیگر نقصانات سے اس کی حفاظت کرتا ہے، نیز شیطان کی بری حرکتوں مثلا وساوس، جادو اور خوف وغیرہ سے محفوظ رکھتا ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے صدقہ فطر کی حفاظت کے لیے مجھے محافظ مقرر فرمایا، (اس دوران میں) ایک شخص آیا اور اس نے غلے سے لپیں بھر بھر کر نکالنی شروع کر دیں، میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا: ''میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر جاؤں گا۔'' وہ کہنے لگا: ''میں محتاج آدمی ہوں، بال بچے دار ہوں اور سخت حاجتمند ہوں''، (لہٰذا معاف کر دو) چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''ابو ہریرہ! گذشتہ رات تمھارے قیدی کا کیا بنا؟'' میں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے اپنی شدید حاجت کا اظہار کیا اور بال بچوں کا شکوہ کیا تو میں نے اس پر رحم کیا اور اسے چھوڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''خبردار رہنا، اس نے جھوٹ بولا ہے اور وہ پھر آئے گا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا، لہٰذا میں اس کی گھات میں بیٹھ گیا۔ وہ آیا اور غلے میں سے لپیں بھرنے لگا، میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ اب تو میں تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ضرور لے کر جاؤں گا۔ اس نے کہا: مجھے چھوڑ دے میں غریب ہوں، عیالدار ہوں، آیندہ نہیں آؤں گا۔ لہٰذا میں نے رحم کرتے ہوئے اسے پھر چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

''اے ابو ہریرہ! تمھارے قیدی نے کیا کیا؟'' میں نے عرض کی: ''یا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے اپنی شدید ضرورت کا شکوہ کیا اور عیال داری کا واسطہ دیا تو مجھے اس پر رحم آ گیا، لہٰذا میں نے آج اسے پھر چھوڑ دیا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''خبر دار رہنا، اس نے تجھ سے جھوٹ بولا ہے، وہ پھر آئے گا۔'' چنانچہ میں تیسری بار اس کی گھات میں بیٹھ گیا، وہ آیا اور پھر غلہ بھرنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا: ''یہ تیسری بار ہے، اب تو میں تمھیں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۸۵)

جاؤں گا۔ ہر بار تو وعدہ کرتا ہے کہ میں نہیں آؤں گا، لیکن پھر آجاتا ہے۔''

اس نے کہا: ''اچھا میں تمھیں ایسے کلمات بتاتا ہوں، جن سے اللہ تجھے فائدہ دے گا، لیکن اس کے بدلے تو مجھے چھوڑ دے۔'' (میں نے پوچھا) ''وہ کلمات کیا ہیں؟'' اس نے کہا: ''جب تو (رات کو سونے کے لیے) اپنے بستر پر آئے تو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کر، ایک فرشتہ ساری رات تیری حفاظت کرے گا اور صبح تک شیطان تیرے پاس نہیں آئے گا۔''

(یہ سن کر میں نے) اسے پھر چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو نبیِ رحمت ﷺ نے دریافت فرمایا: ''ابو ہریرہ! کل رات تیرے قیدی نے کیا کیا؟'' میں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ! اس نے کہا: میں تجھے ایسے کلمات سکھاتا ہوں جن سے اللہ تجھے نفع پہنچائے گا، چنانچہ (اس کے بتانے پر) میں نے اسے چھوڑ دیا۔''

آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''وہ کلمات کیا ہیں؟'' میں نے عرض کی: ''اس نے بتایا کہ جب تو (رات کو) اپنے بستر پر آئے تو اول سے آخر تک آیۃ الکرسی پڑھ لیا کر، اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ رات بھر تیری حفاظت کرے گا اور شیطان بھی تمھارے قریب نہیں آئے گا۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ خیر اور بھلائی کے بہت زیادہ حریص ہوتے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کچھ نہیں کہا بلکہ فرمایا:

> ''ہاں! اس نے تجھ سے سچی بات کہی ہے، لیکن وہ خود جھوٹا ہے، تجھے معلوم ہے تین راتوں سے تیرا واسطہ کس سے رہا ہے؟'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: نہیں! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ شیطان تھا۔''[1]

آیۃ الکرسی شیاطین کے شرور وفتن سے محفوظ رکھنے والی آیت ہے، چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس کھجوروں کے گودام تھے۔ (ایک روز) انھوں نے کھجوروں میں کچھ کمی محسوس کی تو رات کو نگرانی کے لیے بیٹھ گئے۔ اچانک ایک بالغ لڑکے کی عمر جیسا لڑکا آیا اور آکر سلام کہا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا: ''جن ہو یا انسان؟''

اس نے جواب دیا: ''جن ہوں۔'' حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اچھا اپنا ہاتھ دکھاؤ۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١١)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ہاتھ دیکھا تو اس کا ہاتھ کتے کی طرح تھا اور اس پر کتے جیسے بال بھی تھے، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے (تعجب سے) کہا: ''کیا جن ایسے ہوتے ہیں؟'' اس نے جواب دیا: ''(ہاں اور) جنوں کو معلوم ہے کہ ان میں میرے جیسا طاقتور کوئی نہیں۔''

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''یہاں کیسے آئے ہو؟'' جن نے کہا: ''ہمیں پتا چلا تھا کہ تم صدقہ کرنا پسند کرتے ہو، لہٰذا تمھارے کھانے سے اپنا حصہ لینے آئے ہیں۔'' حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''ہمیں (انسانوں کو) کون سی چیز تم سے محفوظ رکھ سکتی ہے؟'' جن نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''کیا سورت بقرہ سے آیۃ الکرسی: ﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ پڑھ سکتے ہو؟'' حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں! پڑھ سکتا ہوں۔'' جن نے کہا: ''جب تو صبح کے وقت اسے پڑھے گا تو شام تک ہم سے پناہ میں آجائے گا اور جب شام کو پڑھ لے گا تو صبح تک پناہ میں آجائے گا۔'' حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: صبح ہوئی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور رات کا سارا واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر ارشاد فرمایا: ''خبیث نے سچ کہا۔''[1]

آیۃ الکرسی کی بہت فضیلت ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

> ''جس نے ہر (فرض) نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی، اس کے اور جنت میں داخل ہونے کے درمیان موت کے علاوہ کوئی رکاوٹ نہیں۔''[2]

٦ سورت کہف کی فضیلت:

اسی طرح سورت کہف کی بھی بہت فضیلت ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''جس نے سورت کہف کی پہلی دس آیات یاد کر لیں، وہ فتنہ دجال سے بچا لیا گیا۔''[3]

اصحابِ کہف وہ نوجوان تھے، جنھوں نے اپنے زمانے کے ظالم اور جابر بادشاہ کے مظالم سے تنگ آکر ایک غار میں پناہ لے لی تھی۔ سورت کہف (آیت: ۹) میں اصحابِ کہف کا ذکر شروع

---

[1] حسن. رواه الحاكم، رقم الحديث (٢١٠٨)

[2] صحيح. سنن النسائي، رقم الحديث (٢١٠٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٣٢)

ہوتا ہے اور آیت (۱۰) میں غار میں پناہ لیتے وقت انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا مانگی تھی، اس کے الفاظ یہ آئے ہیں:

﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا﴾

''مالک ہمارے! ہم کو اپنی رحمت عنایت فرما اور ہمارا کام اچھی طرح سے بنا دے (ہمیں اپنے مقصد میں آسانی سے کامیاب کر دے)۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ظالم بادشاہ کے ظلم سے انھیں پناہ دی۔ دجال بہت بڑا فتنہ ہوگا۔ اصحابِ کہف کی مانگی ہوئی دعا دجال کے فتنے سے لوگوں کو محفوظ رکھے گی۔ سورت کہف کی آخری دس آیات تلات کرنے والا فتنہ دجال سے محفوظ رہے گا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے سورت کہف اس طرح پڑھی جس طرح نازل ہوئی ہے تو وہ اس کے لیے قیامت کے روز نور ہوگی، مکے سے لے کر اس کی جائے قیام تک، اور جس نے سورت کہف کی آخری دس آیات پڑھیں، فتنہ دجال اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''[1]

جمعہ کے روز سورت کہف کی تلاوت کرنے والے کے لیے دو جمعوں کے درمیان ایک نور روشن کیا جاتا ہے۔ ''نور'' سے مراد اللہ کی طرف سے خاص راہنمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باقاعدگی سے ہر جمعہ سورت کہف پڑھنے والے کو دین اور دنیا کے تمام معاملات میں اگر کوئی مشکل یا پریشانی آئے تو اللہ تعالیٰ سیدھی راہ کی طرف اس کی راہنمائی فرماتے ہیں۔ لہٰذا ہر مسلمان کو جمعہ کے روز اس سورت کی تلاوت کرنی چاہیے۔

⑦ سورت سجدہ اور سورت ملک کی فضیلت:

ان دونوں سورتو ں کے ساتھ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت پیار تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات سونے سے قبل ان کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک نہ سوتے جب تک سورت سجدہ (الم، تنزیل الکتب...) اور سورت ملک کی تلاوت نہ فرما لیتے۔[2]

---

[1] سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٥١)

[2] سنن الترمذي (٣/ ٢٣١٥)

سورت ملک کی روزانہ تلاوت عذابِ قبر سے محفوظ رکھتی ہے اور قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لیے اللہ کے ہاں سفارش کرے گی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''قرآن مجید میں تیس آیات کی ایک سورت ہے وہ (اس کے پڑھنے والے کے لیے) سفارش کرے گی حتیٰ کہ اسے بخش دیا جائے گا اور یہ سورت ملک ہی ہے۔''

لہٰذا ہمیں سورت ملک خود بھی پڑھنی چاہیے اور اپنے بچوں کو بھی پڑھنے کی تلقین کرنی چاہیے۔

⑧ سورۃ الاعلیٰ کی فضیلت:

رسول اللہ ﷺ نمازِ عیدین اور نمازِ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۃ الاعلی اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ نمازِ وتر کی پہلی رکعت میں بھی سورۃ الاعلی اور دوسری رکعت میں سورۃ الکافرون اور تیسری میں سورۃ الاخلاص پڑھنا مسنون ہے۔[1]

⑨ سورت واقعہ اور سورت مرسلات کی فضیلت:

اسی طرح سورت واقعہ اور المرسلات کی بہت فضیلت ہے۔ ان سورتوں میں بیان کیے گئے قیامت کے ہولناک واقعات آخرت کی فکر پیدا کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! آپ تو بوڑھے ہوگئے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''مجھے سورت واقعہ، سورت مرسلات، سورۃ النبا اور سورۃ التکویر نے بوڑھا کر دیا ہے۔''[2]

⑩ سورۃ النبا اور سورۃ التکویر کی فضیلت:

سورۃ النبا کی تلاوت سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اسی طرح سورۃ التکویر کی تلاوت کرنے والا کھلی آنکھوں سے قیامت کے مناظر دیکھتا ہے۔[3] (یہ ترمذی کی حدیث ہے)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اپنی آنکھوں سے قیامت کا منظر دیکھنا پسند کرتا ہے، اسے سورۃ التکویر، سورۃ الانفطار اور سورۃ الانشقاق کی تلاوت کرنی چاہیے۔''[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٢٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩٧)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٣٣)

[4] مصدر سابق

⑪ سورۃ الکافرون کی فضیلت:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سورۃ الاخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور سورۃ الکافرون ایک چوتھائی قرآنِ کریم کے برابر ہے۔''[1]

سورت کافرون کی تلاوت کرنے سے یقیناً ایک چوتھائی قرآنِ مجید کی تلاوت کا ثواب مل جاتا ہے یا سورت اخلاص کی تلاوت کرنے سے ایک تہائی قرآن کی تلاوت کا ثواب مل جاتا ہے، لیکن قرآن مجید کی باقاعدہ تلاوت سے قاری کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، مثلاً ایمان میں اضافہ ہونا، تقویٰ اور نیکی میں اضافہ ہونا، اللہ کا ڈر پیدا ہونا، جنت کی طلب اور جہنم سے پناہ کی فکر کرنا، مسائل اور احکام سے آگاہ ہونا، ان تمام فوائد سے سورت اخلاص اور سورۃ الکافرون کا قاری محروم رہتا ہے۔ اجر وثواب کے اعتبار سے، اگرچہ برابر ہے، باقی امور کے اعتبار سے نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

سورۃ الکافرون، مومن کو شرک سے بری کرنے والی سورت ہے، چنانچہ حضرت فروہ بن نوفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی چیز بتایئے جو میں سوتے وقت پڑھوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھو، یہ شرک سے بری کرنے والی سورت ہے۔[2]

سورۃ الکافرون اور معوذتین پڑھ کر دم کرنا زہریلے جانور کے کاٹے کا بہترین علاج ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نماز کے دوران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھو نے کاٹ لیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

''اللہ لعنت کرے بچھو پر، یہ نمازی کو چھوڑتا ہے نہ غیر نمازی کو۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی اور نمک منگوایا اور (دونوں کو ملا کر کاٹنے کی جگہ پر) ملا اور ساتھ سورۃ الکافرون اور معوذتین پڑھ کر دم کیا۔[3]

لہٰذا اسی سنت پر تمام مسلمانوں کو بھی عمل کرنا چاہیے۔

---

[1] صحيح سنن الترمذي (٣/ ٢٣١٨)

[2] سنن الترمذي (٣/ ٢٧٠٩)

[3] سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني، رقم الحديث (٥٤٨)

⑫ سورت اخلاص کی فضیلت:

اسی طرح سورت اخلاص کے بھی بہت فضائل و برکات ہیں۔ سورت اخلاص پڑھنے والوں سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں۔ اس کی کثرتِ تلاوت جنت میں لے جانے کا باعث ہے۔ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ آخر تک دس بار پڑھی، اس کے لیے اللہ تعالیٰ جنت میں ایک گھر تعمیر کرتے ہیں۔''[1]

شیطان کے وسوسوں سے بچنے کے لیے سورۃ الاخلاص پڑھ کر بائیں جانب تین مرتبہ تھوکنا چاہیے۔

⑬ سورۃ الفلق کی فضیلت:

سورۃ الفلق اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ پسند ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم (اونٹنی پر) سوار تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پر رکھ دیا اور عرض کی: ''مجھے سورت ہود اور سورت یوسف پڑھائیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کے نزدیک سورت فلق سے بہتر سورت تم کوئی نہیں پڑھ سکتے۔''[2]

⑭ معوذتین کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کے لیے معوذتین سے بہتر کوئی سورت نہیں۔ معوذتین آفاتِ سماویہ مثلاً طوفان، زلزلہ، سیلاب، قحط سالی اور آندھی وغیرہ سے بھی اللہ کی پناہ مہیا کرتی ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے بعد معوذتین پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ انسانوں کی نظرِ بد اور جن و شیاطین کے اثرات مثلاً جادو، سایہ، جنون، وساوس، حسد اور شیطانی خیالات وغیرہ سے بچنے کے لیے معوذتین سے بڑھ کر موثر کوئی دعا نہیں۔

سورت اخلاص، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی فضیلت اتنی ہے کہ تورات، زبور، انجیل حتیٰ کہ قرآن مجید میں بھی ان جیسے فضائل کی کوئی دوسری سورت نہیں۔ تمام قسم کے شیطانی شرور وفتن، وساوس اور دیگر مصائب و آلام سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کے لیے ان تینوں سورتوں سے بہتر کوئی سورت نہیں پائی گئی جس کے ذریعے پناہ مانگی جاسکے۔[3]

---

[1] صحيح. مسند أحمد (٣/ ٤٣٧)

[2] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٩٥٣)

[3] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٩٥٤، ٥٤٩٤)

⑮ بعض قرآنی آیات وکلمات کے فضائل:

قرآنِ کریم کی مکمل سورتوں کی طرح بعض قرآنی آیات کی فضیلت بھی ہے، جیسے:

﴿ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ [البقرة: ١٦٣]

اسے پڑھ کر جو دعا مانگی جائے گی وہ قبول ہوتی ہے۔ نبی رحمت ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

''اسمِ اعظم کے واسطے سے جو دعا مانگی جائے گی، وہ اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔''[1]

اسی طرح سورۃ البقرہ کی دعا:

﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ [البقرة: ٢٠١]

والی دعا کثرت سے مانگنے سے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی اکثر دعا یہی ہوتی تھی:

''یا اللہ! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں آگ سے بچالے۔'' (یہ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے)

اسی طرح بعض کلمات کو بہت فضیلت حاصل ہے، مثلاً ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہنے کی فضیلت کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اس حال میں مرے کہ اسے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا علم (یقین) ہو تو وہ جنت میں جائے گا۔''[2]

''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا اقرار قیامت کے روز شفاعت کا باعث ہوگا۔[3]

''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا کثرت سے وظیفہ اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب بندہ سچے دل سے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہتا ہے تو اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ عرش تک پہنچ جاتا ہے، بشرطیکہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٧٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦)

اللّٰہُ“ کے بعد اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے شرک کی نفی اور توحید کا اقرار کرنے والا اور اس پر اعتقاد رکھنے والا ہو اور کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔“[1]

”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“ افضل ذکر ہے۔ ایک مرتبہ ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“ کہنے سے جنت میں ایک درخت لگتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”معراج کی رات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! میری طرف سے اپنی امت کو سلام پہنچانا اور انھیں بتانا: جنت کی زمین بڑی زرخیز ہے اور اس کا پانی بڑا ثمر آور ہے، اس کی جگہ خالی ہے اور اس میں درخت لگانا: ”سُبْحَانَ اللّٰہ“، ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ“، ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“ اور ”اَللّٰہُ أَکْبَرُ“ کہنا ہے۔“[2]

امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فرد کو یہ حدیث پڑھنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلام کے جواب میں ”و علیہ السلام“ کہنا چاہیے۔

⑰ ”سُبْحَانَ اللّٰہِ“ اور ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ“ کہنے کی فضیلت:

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اگر کوئی شخص سو بار ”سُبْحَانَ اللّٰہ“ کہے تو اس کے نامہ اعمال میں ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور ہزار گناہ مٹا دیے جاتے ہیں۔“[3]

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”طہارت نصف ایمان ہے۔ (ایک مرتبہ) ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہ“ کہنا ترازو کو نیکیوں سے بھر دیتا ہے۔ ”سُبْحَانَ اللّٰہ“ اور ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہ“ کہنا زمین و آسمان کے درمیان ساری جگہ کو (نیکیوں سے) بھر دیتا ہے۔ نماز (دنیا و آخرت میں چہرے) کا نور ہے۔ صدقہ دلیل اور صبر روشنی ہے۔ قرآن مجید (قیامت کے روز) تیرے حق میں یا تیرے خلاف گواہی دے گا۔ ہر آدمی جب صبح اٹھتا ہے تو اس کی جان گروی ہوتی ہے جسے یا تو وہ

---

[1] صحیح سنن الترمذي للألباني، رقم الحديث (٢٨٣٩)

[2] سنن الترمذي (٣/ ٢٧٥٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٥٣)

(نیکی کر کے) آزاد کرالیتا ہے (یا گناہ کر کے) ہلاک کر لیتا ہے۔"[1]

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے سب سے بہتر کلمہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" ہے۔ یہ کلمہ ایک مرتبہ کہنے سے جنت میں ایک درخت بھی لگتا ہے۔

⑲ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَام کہنے کی فضیلت:

دعا مانگنے سے پہلے "ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ" کا کہنا قبولیتِ دعا کا باعث ہے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"(دعا کرتے ہوئے) "يَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ" کے الفاظ لازم پکڑو۔"[2]

⑳ "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ" کہنے کی فضیلت:

شدید رنج وغم اور مصیبت میں یہ کلمات کہنے سے اللہ تعالیٰ رنج وغم دور کر دیتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت انھوں نے ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ کہا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت کہا جب (بعض) لوگوں نے اہلِ ایمان سے کہا:

"بے شک لوگوں نے تمھارے خلاف ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا ہے، لہٰذا ان سے ڈرو۔"

یہ سن کر ان کا ایمان اور بھی بڑھ گیا اور انھیں نے جواب دیا:

﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ [آل عمران: ١٧٣]

"اللہ ہم کو بس کرتا ہے وہ اچھا کام بنانے والا ہے۔"[3]

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ میدانِ بدر میں تشریف لے گئے۔ ابوسفیان کو سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ اپنے دو ہزار کے لشکر کے ساتھ راستے ہی سے ہی واپس پلٹ گیا۔

غرض قرآنِ کریم کے بے شمار فضائل ہیں اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ ان کو جانے اور ان کا علم حاصل کرے۔ قرآن مجید کا علم حاصل کرنے کے بعد اسے ترک کرنے یا اس پر عمل نہ کرنے

---

[1] مختصر صحيح مسلم للألباني، رقم الحديث (١٢٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٩٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٣)

والے کا سر جہنم میں بار بار پتھر سے کچلا جائے گا۔ چنانچہ تمام والدین کو چاہیے کہ جب بچہ بولنا سیکھے تو سب سے پہلے اسے ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهَ“ سکھایا جائے۔ پھر جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی بچے کو قرآنِ کریم کی چھوٹی چھوٹی سورتیں زبانی یاد کروانا ضروری ہے، یعنی چھوٹی عمر ہی میں بچے کو قرآنِ کریم کی تعلیم دلوانی شروع کر دینی چاہیے، کیونکہ قرآن مجید کے علم وفہم کے بغیر اس پر عمل ممکن نہیں ہے اور عمل کے بغیر قرآن کے برکات وثمرات سے فیض یاب ہونے کی تمنا کرنا دیوانے کا خواب ہے۔

قرآن مجید عظیم ہے اور ہمیشہ عظیم رہے گا۔ ہر طرح کی حمد وثنا صرف اُس ذات کے لیے جس نے یہ کتابِ ہدایت نازل فرمائی اور بے حد وحساب درود وسلام اُس ہستی پر جن کے ذریعے قرآن مجید ہم تک پہنچا اور صلاۃ وسلام ان پاکباز ہستیوں پر، جنھوں نے قرآنِ مجید کی تعلیم، تدریس، تبلیغ اور دعوت کے مقدس فریضے کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔ 2. تفسیر السعدی۔
3. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
4. قرآن کی عظمتیں اور اس کے معجزات۔ تالیف: فضیلہ الشیخ محمد بن احمد الدوسری حفظہ اللہ۔
ترجمہ: پروفیسر حافظ عبد الرحمٰن ناصر حفظہ اللہ
5. عظمتِ قرآن۔ تالیف: فضیلہ الشیخ محمد منیر قمر حفظہ اللہ
6. فضائلِ قرآن مجید۔ تالیف: فضیلہ الشیخ محمد اقبال کیلانی حفظہ اللہ
7. قرآن مجید کے مسلمانوں پر حقوق۔ تالیف: فضیلہ الشیخ قاری صہیب احمد حفظہ اللہ

گلدستہ دروسِ خواتین

3

سیرة نبینا محمد ﷺ



تالیف
محترمہ ام عدنان قمر حفظہا اللہ

تنقیح و مراجعہ
فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ - ڈسکہ

ام القریٰ پبلی کیشنز
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

فون: 0333-8110896. 0321-6466422

اتباع الرسول ﷺ

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ﴾ [الأعراف: ۳]

’’(لوگوں) جو تمھارے مالک کی طرف سے تم پر (قرآن و حدیث) اترا اس کی پیروی کرو اور اس (اللہ کے یا قرآن و حدیث) کے سوا دوسرے چہیتوں کی پیروی مت کرو، تم بہت کم نصیحت لیتے ہو۔‘‘

اتباعِ رسول ﷺ کا مفہوم و مقصود یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جو کام خود کیا یا کرنے کا حکم فرمایا، یا کسی کو کرتے دیکھا اور اسے منع نہ فرمایا ہو، اسے اپنایا جائے۔ نیز جو کام آپ ﷺ نے خود کیا، نہ کرنے کا کسی کو حکم دیا ہو، بلکہ اس سے روکا ہو، ایسا کام کرنے سے اجتناب کیا جائے، اسی کا نام اتباعِ رسول ﷺ یا اتباعِ سنت ہے جو ہمارے لیے ذریعہ نجات ہے۔

کوئی کام بہ ظاہر کتنا ہی اچھا کیوں نہ نظر آتا ہو، اگر وہ سنت کے مطابق نہیں ہے تو وہ اللہ کو قبول نہیں ہے، مثلاً ایک کام ہے تو اچھا اور نیک بھی ہے مگر اس کو ادا کرنے میں ایسا رویہ اختیار کریں کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے پیش قدمی کے ضمن میں آجائے تو یہ ٹھیک نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ [الحجرات: ۱]

’’مومنو! (کسی بات کے جواب میں) اللہ اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سنتا جانتا ہے۔‘‘

سورۃ النساء (آیت: ۸۰) میں ارشاد فرمایا:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴾

''جو شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اُس نے اللہ کی فرمانبرداری کی اور جو نافرمانی کرے تو اے پیغمبر! تمھیں ہم نے اُن کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔''

اللہ تعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے امام المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہمارے لیے ایک بہترین نمونہ اور ایک مثالی شخصیت بنا دیا اور دین کو آپ ﷺ پر مکمل کر دیا۔ ہم نے کوئی بھی کام کرنا ہو، چاہے وہ دین کا ہو یا دنیا کا، تو ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس مثالی شخصیت کی طرف رجوع کریں اور ہمیں وہاں سے ہر قسم کی راہنمائی ملے گی، کیونکہ دین مکمل ہو چکا ہے اور کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے کہ شاید رسول اللہ ﷺ سے دین کی کوئی بات رہ گئی ہو اور اس معاملے میں ہمیں دربارِ رسالت سے راہنمائی نہ مل سکے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے دین کی کوئی بات ہم سے چھپالی ہے، اس نے حضرت محمد ﷺ پر بہت بڑا الزام لگایا۔''[1]

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جس نے اسلام میں کوئی بھی نیا کام کیا اور اس کو وہ نیکی سمجھتا ہے تو گویا وہ اس بات کا قائل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رسالت میں خیانت کی اور کچھ نیک کاموں کو ہم سے چھپایا جو ہم پر ظاہر نہیں کیے۔''

ایسا ہرگز نہیں۔ ۹ھ میں نبی اکرم ﷺ نے حج کیا، جو نبی مکرم ﷺ کا پہلا اور آخری حج تھا، یہ حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے۔ اس سال نبی اکرم ﷺ کے ساتھ میدانِ عرفات میں ایک لاکھ چوالیس ہزار صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم کا عظیم مجمع احکامِ الٰہی کی تعمیل کے لیے موجود تھا۔ آپ ﷺ نے اپنی اونٹنی قصوا پر سوار ہو کر حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ ارشاد فرمایا، جسے بجا طور پر ''انسانی حقوق کا منشور'' کہا جا سکتا ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۵۸)

جب خطبے سے فارغ ہوئے تو اسی جگہ سورۃ المائدہ (آیت: ۳) نازل ہوئی جس میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ﴾ ''میں نے آج تمھارے دین کو مکمل کر دیا ہے۔''

قیامت تک جو چیز بھی دین میں داخل تھی وہ رسول اللہ پر اتاری جا چکی ہے اور یہ سچ ہے کہ دین مکمل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کبھی اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ جو چیز اس دن دین کا کام نہیں تھی، وہ آج بھی دین کا کام نہیں ہو سکتی۔ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''میں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی ہے جو تمھیں اللہ سے قریب کرنے والی ہو اور میں نے اسے کرنے کا حکم تمھیں نہ دیا ہو اور کوئی بھی ایسی چیز نہیں چھوڑی ہے جو تمھیں اللہ سے دور کرنے والی ہو، مگر میں نے تمھیں اس سے منع نہ کر دیا ہو۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں اپنی امت کو آگاہ فرما دیا تھا کہ میری امت بھی بنی اسرائیل کے نقشِ قدم پر چل پڑے گی [وہ اپنے نبی کے بعد رفتہ رفتہ] ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے اور ہماری امت ان سے بھی ایک قدم آگے ہی ہوگی، کیونکہ یہ ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی، ان میں سے صرف ایک گروہ جنتی ہوگا باقی سب فرقے جہنمی ہوں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ [جہنم سے نجات پانے والا] گروہ کونسا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ گروہ جو اس طریقے پر قائم ہوگا جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

اب جو شخص بھی جہنم سے نجات پانے والے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہو اسے چاہیے کہ وہ ہر معاملے میں وہ طریقہ اختیار کرے جو حضرت محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا تھا۔

ہر موقع پر خواہ وہ خوشی کا ہو یا غمی کا، اس کا تعلق عبادت سے ہو یا معاملاتِ دنیا سے، ہر انسان کا فرض ہے وہ اس کا پتا لگائے اور دیکھے کہ اس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا کیا طریقہ تھا؟

مومن اپنا ہر کام ''وحی الٰہی'' یعنی قرآن مجید اور صحیح احادیث میں بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کرتا ہے اور غافل شخص اس کا کچھ لحاظ نہیں کرتا، اس طرح بدعات کا شکار ہو جاتا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم شریف وغیرہ میں ہے کہ قیامت کے دن ایک جماعت حوض کوثر کی طرف بڑھے گی، مگر فرشتے ان کو آگے بڑھنے نہیں دیں گے۔ آپ ﷺ فرمائیں گے کہ یہ میری امت کے

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٥)

لوگ ہیں، ان کو آنے دو۔ فرشتے کہیں گے: اے اللہ کے نبی (ﷺ)! آپ نہیں جانتے کہ یہ لوگ آپ کے بعد بدعتوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ سن کر نبی اکرم ﷺ فرمائیں گے:

''دوری ہو۔ پھٹکار ہو ان لوگوں پر جو میرے بعد دین کو بدلنے لگ گئے۔''[1]

وہ کیسا بُرا وقت ہوگا جب نبی کریم ﷺ خود دھتکار دیں گے۔ کیا بربادی کا اس سے بھی زیادہ برا کوئی منظر ہوسکتا ہے؟ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے تمام معاملات میں اسی دورِ رسالت کی طرف رجوع کریں اور اسی طریقے کی پیروی کریں اور اس سے قدم باہر نہ نکالیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تم رسول اللہ ﷺ کے طریقے کی پیروی اپنے اوپر لازم کرلو، جس شخص نے بھی اس طریقے سے قدم باہر نکالا وہ گمراہ ہوگیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امامانِ دین میں سے کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے طریقے سے ایک بالشت پھر بھی باہر قدم نکالنے کی جراَت نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے وہ ہی اختیار کیا جس کی تعلیم رسول برحق ﷺ نے دی اور جس پر عمل پیدا ہونے کا حکم معبودِ برحق نے ان کلمات کی صورت میں دیا:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [الحشر: ۷]

''اور (مسلمانو) جو پیغمبر ﷺ تم کو دے تو اس کو لے اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (پیغمبر ﷺ کا خلاف نہ کرو) بے شک اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے۔''

کیونکہ ہر وہ کام اور ہر وہ طریقہ جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو اور اسے دین کا کوئی کام سمجھ کر کیا جائے تو وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمرائی جہنم میں لے جانے والی ہے۔ لہٰذا بدعات سے بچنا سخت ضروری ہے اور کسی چیز سے بچنے کے لیے اس سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

بدعت کسے کہتے ہیں؟

ہر وہ کام جسے ہم دین وثواب کا کام سمجھ کر کرتے گئے اور اس کا کوئی سراغ رسول اللہ ﷺ

---

[1] صحیح البخاري، کتاب الرقاق وکتاب الفتن، صحیح مسلم، کتاب الطهارة وکتاب الفضائل وکتاب الزهد، مسند أحمد (۲/ ۳۰۰۔ ۴۰۸، ۳/ ۲۸، ۵/ ۲۲۳، ۲۲۹)

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں نہ ملتا ہو۔ نیز ہر وہ کام منکر ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہو، جیسا کہ سورۃ النساء (آیت: ۵۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾

''مومنو! اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحبِ حکومت ہیں اُن کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہوجائے تو اُس میں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔''

سورۃ النساء کی آیت (۶۵) کے نزول کا ایک سبب:

اس آیت کی شانِ نزول میں ایک یہودی اور مسلمان کا واقعہ عموماً بیان کیا جاتا ہے جو بارگاہِ رسالت سے فیصلے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کروانے گیا جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسلمان کا سر قلم کر دیا۔ لیکن سنداً یہ واقعہ صحیح نہیں ہے جیسا کہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی وضاحت کی ہے۔ صحیح واقعہ یہ ہے جو اس آیت کے نزول کا سبب ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا، جو رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد تھے اور ایک آدمی کا کھیت سیراب کرنے والے نالے کے پانی پر جھگڑا ہوگیا۔ معاملہ نبی مکرم ﷺ تک پہنچا، آپ ﷺ نے صورت حال کا جائزہ لے کر جو فیصلہ دیا تو وہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے حق میں تھا، جس پر دوسرے آدمی نے کہا کہ آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ وہ آپ کا پھوپھی زاد ہے۔[1]

اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [النساء: ٦٥]

''تمھارے رب کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمھیں منصف نہ بنائیں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٨٥)

اور پھر جو فیصلے تم ان میں کر دو اُس سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی نہ پائیں بلکہ اُس کو خوشی اور فرمانبرداری سے مان نہ لیں تب تک یہ مومن نہیں ہوسکتے۔''

اس آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی کسی بات یا فیصلے سے اختلاف تو کجا، دل میں انقباض بھی محسوس کرنا ایمان کے منافی ہے۔ یہ آیت منکرینِ حدیث کے لیے تو ہے ہی دیگر افراد کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے جو قولِ امام کے مقابلے میں حدیث صحیح سے انقباض ہی محسوس نہیں کرتے بلکہ یا تو کھلے لفظوں میں اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں یا اس کی دور از کار تاویل کرکے یا ثقہ راویوں کو ضعیف باور کرا کے مسترد کرنے کی مذموم سعی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے ایسے لوگوں کو، اگر ان میں سے کسی کو کہیں کہ بھائی! آپ قرآن اور حدیث کی مخالفت کر رہے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے بڑے بزرگوں کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہے، ہم بھی وہی کریں گے، یعنی وہی مکے کے مشرکین والا جواب۔ میری بہن! اگر آپ نے ایسا ہی کرنا ہے تو پھر رسول ﷺ کو بھیجنا اور ان پر قرآن کا نازل کرنا بے مقصد ہوا، ان کے حساب سے اگر ہم نے اپنی مرضی سے دین کو اپنایا تو پھر جان رکھو کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

﴿ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴾ [الفرقان: ۲۷، ۲۸]

''اور اس دن ظالم شخص اپنے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کر کھائے گا اور کہے گا ہائے! کاش میں نے پیغمبر کے ساتھ رشتہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے افسوس! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ کے نافرمانوں کے ساتھ دوستی اور وابستگی نہیں رکھنی چاہیے، ورنہ پچھتانا پڑے گا، لیکن اس وقت کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہاں پچھتانے سے بہتر ہے کہ دین کے ہر معاملے میں تحقیق سے کام لیں، کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ آپ جنت میں جائیں۔ اس لیے سوچیں اور سورۃ الاحزاب (آیت: ۶۶ تا ۶۸) پر غور کریں جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا

الرَّسُوْلَا ۝ وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا﴾

''اس دن ان کے چہرے آگ میں الٹائے جائیں گے (حسرت و افسوس سے) کہیں گے کہ اے کاش! ہم اللہ کی فرمانبرداری کرتے اور رسول اللہ کا حکم مانتے۔ اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑے لوگوں کا کہا مانا، انھوں نے ہم کو راہ راست سے گمراہ کر دیا اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو انھیں دگنا عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت نازل فرما۔''

آپ غور کریں کہ کسی قوم یا مذہب کا نام نہیں ہے، صرف بزرگوں اور پیروں کی پیروی کرنے والوں ذکر کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے ان بڑوں او بزرگوں کی پیروی کی، لیکن آج ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے ہمیں تیرے پیغمبروں سے دور رکھ کر راہ راست سے بھٹکائے رکھا۔ آبا پرستی اور تقلیدِ اکابر آج بھی لوگوں کی گمراہی کا باعث ہے۔ کاش! مسلمان آیت الٰہی پر غور کر کے ان پگڈنڈیوں سے نکلیں اور قرآن و حدیث والے صراط مستقیم کو اختیار کرلیں کیونکہ نجات صرف اور صرف اللہ اور رسول کی پیروی ہی میں ہے نہ کہ آبا و اجداد کے فرسودہ طریقوں کے اختیار کرنے میں۔ لیکن آج ہماری زندگی کی گاڑی اُسی سڑک پر جا رہی ہے، دین و دُنیا کے معاملے میں ہم ذرا بھی غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہیں، دینِ اسلام کے کاموں میں اپنی مرضی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ یہ اسلام اللہ تعالیٰ کا دین ہے، کسی کے گھر کا بنایا ہوا قانون و اصول نہیں ہے کہ ہم خود ہی بنائیں اور پھر بدل دیں، اسلام میں رد و بدل یا اضافے کا حق اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی نہیں دیا ہے، حتیٰ کہ نبی اکرم ﷺ کو بھی نہیں، کیونکہ دینِ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مکمل کر دیا ہے، جیسے کہ خود اس کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ [آل عمران: ١٩]

''حقیقتاً اللہ کے نزدیک جو دین ہے وہ اسلام ہی ہے۔''

اسلام کیا ہے؟ اسلام وہ آسمانی قانون اور شریعت ہے جسے اللہ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے بندوں کے لیے بنایا۔ ہر نبی اور رسول نے لوگوں کو اسلام ہی کی دعوت دی۔ اس دعوت کی ابتدا حضرت

نوح علیہ السلام سے ہوئی اور انتہا حضرت محمد ﷺ پر ہوئی، جس کا اعلان اللہ تعالیٰ نے ان کلمات میں فرمایا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدة: ٣]

''آج میں نے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور تمھارے لیے دینِ اسلام سے راضی ہوگیا ہوں۔''

قرآن مجید کے یہ پاکیزہ کلمات اس بات کی دلیل ہیں کہ شریعت کی تکمیل جناب رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہوچکی ہے اور تکمیلِ دین کا یہ واضح ترین اعلان حجۃ الوداع کے موقع پر ہوا جس کے صرف پونے تین ماہ (۸۱ دن) بعد آپ ﷺ وفات پاکر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ اب اللہ اور رسول ﷺ کے تابع فرمان بندوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کی بتائی ہوئی تعلیمات پر عمل کریں اور ان کے مقابل ان باتوں، کاموں اور رسم و رواج کو نہ اپنائیں جن کے احکام اور جن کا ثبوت قرآن و حدیث سے نہ ملتا ہو، اسی بات کو اسلام کے دائرہ عمل میں رہنا کہتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم ذرا بھی تحقیق نہیں کرتے اور جب تحقیق کا دامن ہم سے چھوٹ گیا اور ہم باپ دادا کی بات ماننے لگے تو پھر یہی کریں گے۔ مثلاً اگر کسی کا کوئی عزیز فوت ہوگیا ہے تو اس کے گھر والے پہلے تیسرا پھر ساتواں اور پھر چالیسواں مناتے ہیں۔ ایک اور رسم جو ہر سال آتی ہے وہ ہے گیارھویں شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام پر دینا جو [گیارہ] ربیع الثانی کو کرتے ہیں۔ گیارھویں کی یہ رسم نہ صرف بدعت ہے بلکہ شرک ہے کیونکہ اس میں غیر اللہ کے نام پر جانور پالا اور ذبح کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بوقتِ ذبح اللہ ہی کا نام پکارا جاتا ہے، لیکن نیت تو دل میں یہی ہوتی ہے کہ یہ پیرانِ پیر کی نیاز ہے، لہٰذا باوجود تکبیر پڑھ کر ذبح کرنے کے یہ جانور حرام ہی رہا ہے اور دلیل اس کے حرام ہونے کی یہ فرمانِ رسول ہے:

((اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) [1] ''اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔''

اسی حدیث میں ہجرت جیسے عظیم فعل کے بارے میں فرمایا کہ جس نے ہجرت خالصتاً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر کی تو یہ اجر و ثواب کے لیے ہوگی، اگر کسی نے اپنی کسی غرض یا کسی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١)

عورت کے سبب ہجرت کی تو اللہ کی طرف سے ایسی ہجرت کا کوئی اجر نہیں۔

یہی معاملہ غیر اللہ کے ذبیحے کا ہے، اگرچہ اس پر ذبح کے وقت "بِسْمِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ أَكْبَرُ" کہہ کر ہی چھری پھیری گئی ہو لیکن نیت گیارہویں کے موقع پر ذبح کی تھی، اس عمل کی وجہ سے اس قسم کا کھانا کھانے سے ممانعت کی گئی ہے۔ یہ ذبح اور فاتحہ خوانیاں جائز ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ نہ صرف حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی بلکہ ہر نبی کے نام کی نذر و نیاز اور فاتحہ ضرور کرتے اور اس عمل کی تلقین امتِ مسلمہ کو بھی ضرور فرماتے۔ لہٰذا گیارھویں کو شرک اور بدعت کی جاہلانہ رسم سے زیادہ کچھ اور نہیں سمجھنا چاہیے۔

محافلِ عرس:

مزارات پر عُرس اور سالانہ میلا لگانا بھی برصغیر کے بدعتی مسلمانوں کے رسم و رواج ہیں جن کو دین میں شامل کیا گیا ہے۔ جب ان بزرگوں کی تاریخِ وفات یا میلاد آتی ہے تو نہ صرف ان کی قبروں پر بلکہ ان کے گھروں میں بھی عرسوں کے اہتمام ہوتے ہیں۔ جن میں قرآن خوانیوں کے علاوہ لنگر و تبرک بھی تقسیم ہوتا ہے، لوگ وہاں ثوابِ دارین حاصل کرنے کے نقطہ نظر سے شرکت کرتے ہیں، قبروں پر چراغاں ہوتا ہے، عنبر اور اگر بتیاں سلگائی جاتی اور چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔

کچھ قبروں پر غلافِ کعبہ کی مانند نہ صرف غلاف چڑھایا جاتا ہے بلکہ غسلِ کعبہ کی طرح انھیں عرقِ گلاب وغیرہ سے غسل دیا جاتا ہے۔ اکثر مزارات میں نام نہاد دروازے بھی ہوتے ہیں جو صرف عرس کے مواقع پر کھولے جاتے ہیں۔ ان دروازوں سے گزر کر جاہل سمجھتے ہیں کہ اب ان پر بہشت واجب ہوگئی ہے، یہ شیطان نے انھیں الٹا سبق پڑھا دیا ہے۔ اگر یہ لوگ توبہ کے بغیر مریں تو ان پر ان نام نہاد بہشت کے دروازوں سے گزرنے کے سبب جنت نہیں بلکہ جہنم واجب ہوجائے گی۔

مسجدِ حرام جہاں اللہ کا گھر ہے، مسجدِ نبوی جسے خود اللہ کے رسول ﷺ نے تعمیر کیا ہے، جن کا مقدس ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے، ان کے دروازوں سے گزرنے والوں کے بارے میں یہ ضمانت نہیں ہے کہ اس پر جنت واجب ہوجاتی ہے۔ جب ان مقدس مسجدوں کا یہ عالم ہے تو پھر ان شرک کے اڈوں میں بنے دروازوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ آپ خود ہی اندازہ کریں۔

قبروں پر عمارتیں اور مسجد بنانے والوں پر نبی اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، کس قدر افسوس

کی بات ہے کہ جو لوگ آج خود کو اہلِ سنت کہتے ہیں، وہی نبی کریم ﷺ کی احادیث کو قابلِ عمل نہیں سمجھتے۔ معلوم نہیں روزِ محشر کس منہ سے آپ ﷺ کے سامنے جائیں گے اور کس منہ سے آپ ﷺ کی شفاعت کے حقدار بن سکیں گے...؟

مزاروں پر عرس اور میلاد دراصل دورِ جاہلیت کی رسم ہے جسے شیطان اور اس کے چیلوں نے پھر سے مسلمانوں کے درمیان پھیلا دیا ہے۔ برصغیر، ایران و عراق اور ترکی و مصر وغیرہ میں ان مزارات کی صورت میں اپنے اڈے قائم کر دیے ہیں۔ آج بندگانِ الٰہی اپنے الٰہ حقیقی کی عبادت سے بے خبر شیطان کی راہوں پر چلتے ہوئے قبروں کی پوجا کرتے، ان پر سجدے کرتے، نذر و نیاز کرتے، شفا اور اولاد یابی یا فتح پانے کی فریادیں کرتے اور اپنی ہر قسم کی حاجتیں مانگنے میں کھو کر رہ گئے ہیں، انھیں اللہ یاد آتا ہے اور نہ اللہ کا گھر۔ نماز چھوٹ سکتی ہے لیکن جمعرات کو مزار پر حاضری نہیں چھوٹ سکتی، کیونکہ یہی ان کے لیے بندہ نواز و مشکل کشا ہے اور ان کا حاجت روا سب یہی ہے۔

ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سے ڈرنا چاہیے اور انھیں نبی کریم ﷺ کی اس حدیث پر غور کرنا چاہیے جس میں ہے کہ رحلت سے صرف پانچ دن قبل، بدھ کے روز آپ ﷺ کو بیماری سے کچھ افاقہ ہوا اور آپ ﷺ نے جب طبیعت ذرا ہلکی محسوس کی تو مسجد میں تشریف لائے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے فرمایا:

"تم سے پہلے ایک قوم گزری ہے جو انبیا اور نیک لوگوں کی قبروں پر سجدے کرتی تھی، تم ایسا نہ کرنا۔"

آپ ﷺ نے مزید فرمایا:

"یہودیوں اور نصرانیوں پر اللہ کی لعنت ہو، جنھوں نے انبیا (علیہم السلام) کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔"[1]

اور ارشاد فرمایا:

"میرے بعد میری قبر کو ایسا نہ بنا دینا کہ اس کی پرستش ہوا کرے۔"[2]

اور یہ بھی فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٦٢)

[2] موطأ الإمام مالك (ص: ٦٥)

’’اس قوم پر اللہ کا سخت غضب ہے جس نے قبورِ انبیا کو مساجد بنایا۔ دیکھو! میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں۔ دیکھو! میں تبلیغ کر چکا ہوں۔ آخر میں فرمایا: الٰہی! تو اس بات پر گواہ رہنا، الٰہی! تو اس بات پر گواہ رہنا۔‘‘

ان آخری نصیحتوں میں نبی کریم ﷺ نے جس بات کا بار بار اعادہ کیا، جسے بار بار دہرایا، وہ یہ تھی کہ انبیا اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر اللہ کی لعنت ہو اور اس بات کی سخت تاکید فرمائی کہ تم نیک لوگوں اور اولیاء اللہ کی قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، ان کی پوجا نہ کرنے لگنا۔

یہ وہ باتیں ہیں جنھیں آپ ﷺ عمر بھر دہراتے رہے۔ ساری زندگی قبر پرستی جیسے شرک سے بچنے کی تاکیدیں کرتے رہے۔ قبروں کو پکا بنانے، ان پر عمارتیں تعمیر کرنے، ان پر دیے جلانے اور ان پر مجاور بن کر بیٹھنے سے روکتے رہے، تاکہ آپ ﷺ کی امت کے افراد اس شرک میں مبتلا نہ ہونے پائیں۔ حیاتِ طیبہ کے آخری ایام میں پھر بطورِ خاص قبر پرستی کے شرک سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ مگر افسوس کہ آج حبِ مصطفیٰ ﷺ کے دعوے اور عشقِ رسول ﷺ کے نعرے لگانے والے بے شمار مسلمان اس شرک میں مبتلا ہیں۔ پکی قبریں بنانے کو سعادت سمجھتے ہیں، ان پر دیے جلانے کو واجب بنائے بیٹھے ہیں اور ان پر مجاور بن بیٹھنے کو درجہ ولایت قرار دیتے ہیں۔

آپ حضرات خود اپنی ایمانداری سے فیصلہ کریں کہ نبی اکرم ﷺ کی صریح نافرمانی کرنے والے ایسے لوگوں کو حبِ مصطفیٰ ﷺ کے نعرے کہاں تک زیب دیتے ہیں؟ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر ہماری ایک بات یاد رکھیں کہ یہ عرس اور میلے قبر پرستی کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ فرق بس اتنا رہ گیا ہے کہ ہندو بتوں کی پوجا کرتا ہے اور آج کا مسلمان قبروں کی پوجا کر رہا ہے۔

آج کے قبر پرستوں کے نام نبی مکرم ﷺ کا پیغام:

تم میری تربت کو صنم نہ بنانا
تم نہ کرنا میری قبر پہ سر کو خم
تم کچھ مجھ سے کم نہیں بندہ ہونے میں
ہم تم برابر ہیں بے چارگی میں

مجھے دی ہے اس نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا ایلچی بھی

نبی اکرم ﷺ کے اس پیغام سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب قبرِنبوی ﷺ سجدہ گاہ نہیں بن سکتی تو پھر دیگر افراد کی قبریں کس کھاتے میں آ سکتی ہیں؟

اگر آپ نے اپنے ایمان کو سلامت رکھنا ہے تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈریں، اس کے علاوہ کسی اور سے ڈریئے نہ کسی سے کچھ مانگیے۔ قرآنِ کریم کی سورت آل عمران (آیت: ۱۰۲) میں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ارشاد فرمارہا ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾

''مومنو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اپنی ذات سے ڈرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا یہ قبروں والے بزرگ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، کیونکہ سارے اختیارات اللہ وحدہٗ لا شریک کے ہاتھ میں ہیں، وہی نفع اور نقصان کا مالک ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو دوست بنانے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی اور کو دوست بناتے ہیں، وہ کون لوگ ہیں اور ان کا حشر کیا ہونے والا ہے؟ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی سورۃ الکھف (آیت: ۱۰۲) میں اعلان فرما رہا ہے:

﴿ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴾

''کیا یہ کافر یہ سمجھے ہیں کہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا حمایتی بنائیں، ہم نے تو ان کے لیے دوزخ کی مہمانی تیار کر رکھی ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں کے ٹھکانے کے متعلق فرما رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کے علاوہ کسی اور کو کارساز بناتے ہیں یا اسے اپنا مددگار سمجھتے ہیں، قیامت کے دن وہاں کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، نہ کوئی ولی اور نہ کوئی پیر۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کو گواہی کے لیے جمع کر لے گا اور یہ وہاں کھلا انکار کر دیں گے، بلکہ اولیاء اللہ اور صالحین ان کے خلاف ہی گواہی دیں گے اور کہیں گے: اے اللہ! ہم نے انھیں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا دوست مت بناؤ،

کیونکہ یہ بات ہمارے شایانِ شان نہیں تھی۔

مسلمانو! اگر آج آپ نے پیروں کا دامن نہ چھوڑا تو اس دن کہا جاؤ گے؟ کیونکہ اس دن وہاں اور کوئی دامن نہیں ہوگا۔ وہاں نفسی نفسی کا عالم ہوگا، کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، اس لیے آج آپ کو اللہ تعالیٰ نے صحت اور وقت بھی دیا ہے، لہٰذا آپ لوگ اپنی اصلاح کرلیں اور اپنے رب سے دوستی کریں کیونکہ وہ ہم سب کا خالق و مالک ہے، اس کی نافرمانی سے بچنا چاہیے جس کے لیے ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرنی چاہیے تاکہ ہمارا اللہ کریم ہم پر راضی ہو جائے۔ اس کے لیے ہم اپنے دل و دماغ کو ٹٹول کر دیکھیں، کہیں ہم سے کوئی ایسا کام تو نہیں ہو رہا جو نبی اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہ ہو، کیونکہ ہمیں اپنی زندگی کو نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارنا ہے اور جب تمام تر عبادات اور ہر قسم کے معاملات میں رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو سامنے رکھیں گے تب ہم نبی اکرم ﷺ کے حقیقی امتی ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے گی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکہف (آیت: ۱۰۷، ۱۰۸) میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴾

''البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے ان کی مہمانی فردوس کے باغ ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، کبھی ان کو چھوڑنا نہ چاہیں گے۔''

اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے طریقہ زندگی کو اپنالیں گے تو جنت الفردوس جو سب سے اونچا مقام ہے، امتیوں کے لیے جس کا اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ وہ عطا فرمائے گا، جہاں غم ہوگا نہ کوئی پریشانی کسی چیز کی اور نہ کسی قسم کی کوئی فکر ہوگی۔

شیخ جیلانی کی تعلیمات اور ان کا عقیدہ توحید:

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کی ذاتِ گرامی یا ان کے مزار کو تو لوگوں نے تبرک کا ذریعہ بنالیا ہے، لیکن وہ خود عقیدہ توحید میں بڑے پختہ تھے۔ اس سلسلے میں ان کی تعلیمات نہایت ایمان افروز ہیں۔ چنانچہ خالق کو چھوڑ کر کسی مخلوق سے مانگنے والے کو وہ بے عقل قرار دیتے ہیں،

جیسا کے ان کی تصنیف ''الفتح الربانی'' (۱/۴) میں لکھا ہے:

''وہی تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا ہے اور تمام اشیا اسی کے قبضہ واختیار میں ہیں۔ اے غیر اللہ سے طلب کرنے والے! تو عقلمند نہیں ہے۔ کیا کوئی ایسی چیز بھی ہے جو اللہ کے خزانوں میں نہ ہو، جبکہ خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات (آیت: ۲۱) میں فرمایا ہے:

''کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کے خزانے ہمارے پاس نہیں۔''

''اس لیے تجھے صرف ایک اللہ ہی سے مانگنا چاہیے۔ تجھے دینے والا بھی صرف ایک ہے اور تیرا مقصود بھی ایک ہی ہے اور وہ تیرا پروردگار ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہوں کی پیشانیاں (سروں کے تاج) اور تمام مخلوق کے دل ہیں۔''

ایسے ہی اللہ سے سب کچھ مانگو، غیر اللہ سے نہ مانگو، اپنے جیسی مخلوق کے سامنے ذلیل نہ ہو، سوال بھی اُسی سے کرو اور تیرا معاملہ صرف اسی کے ساتھ ہو، کسی دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ اسی کتاب ''الفتح الربانی'' میں آگے چل کر (ص: ۵۴۳) پر لکھتے ہیں:

''مومن لوگ وہ ہیں جو اپنے دلوں میں صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، صرف اسی سے امید رکھتے اور اپنی حاجتیں اسی کے سامنے پیش کرتے ہیں، کسی دوسرے کے سامنے نہیں، وہ صرف اسی دروازے کی طرف لوٹتے ہیں، کسی اور کی چوکھٹ پر نہیں جاتے۔''

"غنية الطالبين" (ص: ۷۵) میں رقمطراز ہیں:

''(تورات میں ہے:) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وہ شخص ملعون ہے جو کسی اپنے جیسی مخلوق پر بھروسا کرتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مجھے اپنی عزت و بزرگی اور جلال کی قسم! جو شخص میرے سوا کسی دوسرے سے امیدیں رکھتا ہے، میں اس کی امید ضرور قطع کروں گا اور اسے انہی لوگوں کے مابین ذلیل و خوار کروں گا۔ اسے اپنی قربت سے دور اور وصل سے محروم کروں گا، کیا سختی کے وقت میرے سوا دوسروں سے امیدیں رکھتے ہو اور اپنے خیالات سے غیروں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہو؟ حالانکہ ان کے دروازوں پر تالے پڑے ہیں اور ان کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہیں۔''

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے ربِ کریم ہی کو پکارا کریں کیونکہ اللہ کا قرآن بھی ہمیں یہی کہتا

ہے۔سورۃ البقرہ (آیت: ۱۸۶) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾

''اور (اے پیغمبر!) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمھارے) پاس ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں، تو ان کو بھی چاہیے کہ میرے احکام کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک راستہ پائیں۔''

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے کہ میں ایک دفعہ نبی مکرم ﷺ کے پیچھے سواری پر سوار تھا، اچانک آپ ﷺ نے مجھے فرمایا:

''اے لڑکے! تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کو نگاہ میں رکھ (یعنی اس کے احکام وحدود کی حفاظت کر) اللہ تجھے اپنی حفاظت میں رکھے گا، اور تو اسے مدد کرنے والا پائے گا، اور جب تو سوال کرے تو صرف اللہ ہی سے کر، جب تو مدد چاہے تو صرف اللہ ہی سے مدد مانگ، کیونکہ جو کچھ ہونے والا ہے، اسے لکھ کر تقدیر کا قلم خشک ہو چکا ہے۔ اگر تجھے تمام بندے ایسا فائدہ پہنچانا چاہیں جو تیری تقدیر میں نہیں لکھا ہے، تو وہ اس کام پر قدرت نہیں رکھتے اور اگر تمام لوگ تمھیں ایسا نقصان پہنچانا چاہیں جو تیرے مقدر میں نہیں لکھا ہے، تو وہ اس کام پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔''[1]

اس حدیث کو نقل کر کے موصوف فرماتے ہیں:

''ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث شریف کو اپنے دل کا آئینہ، اپنا اوڑھنا بچھونا اور ہر وقت کا موضوعِ گفتگو بنالے اور اپنی تمام حرکات وسکنات میں اس پر عمل کرے، تاکہ دُنیا وآخرت میں سلامت رہے اور اللہ کی رحمت کے ساتھ عزت پائے۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے فرمانبردار بندے بنائے اور اتباعِ رسول ﷺ کی توفیق عطا فرمائے، ہمارا ہر کام یعنی ہر قسم کی عبادت سنتِ رسول ﷺ کے موافق ہو، ہمیں ہر قسم کی

[1] مسند أحمد (١/ ٢٩٣، ٣٠٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٤٣)

بدعات اورشرک سے پاک کردے اور ہمارے ہر عمل کو خالص اپنی رضاو رحمت سے قبول فرما لے اور ہمارا خاتمہ بالخیراور دینِ اسلام پر ہو۔آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
2. قبولیت عمل کی شرائط۔ تالیف: ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
3. بدعت۔تعریف، اقسام واحکام۔ تالیف: الشیخ صالح بن فوزان الفوزان،ترجمہ: اسرارالحق عبیداللہ
4. چند بدعات اوران کا تعارف۔ مصنف: علامہ سعید بن عزیز یوسف زئی
تہذیب وتنقیح: ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

مکی دور میں دعوت کے مراحل، مشرکین کی ایذا رسانیاں سفرِ طائف اور اسرا و معراج

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ [الشعراء: ٢١٤]

''اور اپنے نزدیک کے رشتے داروں کو ڈرا۔''

مکی دور میں دعوت کا پہلا مرحلہ: خفیہ تبلیغ:

منصبِ رسالت پر سرفراز ہونے کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے تئیس (۲۳) سالوں کے دوران میں دعوت الی اللہ کا جو کام شروع فرمایا، ان میں سے پہلے مکی دور کے تیرہ (۱۳) سالوں کو ہم تین مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، جن میں سے پہلا مرحلہ ''خفیہ دعوت'' کا تھا، جو ابتدائی تین سال کے عرصے پر مشتمل ہے۔

اس مرحلے میں آپ ﷺ نے علانیہ دعوت و تبلیغ کا کام نہیں کیا، بلکہ خفیہ طور پر لوگوں کو دعوتِ توحید دیتے اور شرک کی برائی بیان کرکے اس سے روکتے تھے۔ اس مرحلے میں اسلام قبول کرنے والے سابقینِ اوّلین میں سے سب سے پہلی آواز جو آپ ﷺ کی تائید میں اٹھی، وہ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قلبِ مبارک سے بلند ہوئی تھی، پھر آپ ﷺ کے غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، آپ ﷺ کے چچیرے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب اور آپ ﷺ کے گہرے دوست حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ تمام حضرات دعوت و تبلیغ کا آغاز کرنے کے پہلے دن ہی مسلمان ہو گئے تھے اور ان قریبی حضرات کا ایمان لانا، جو نبی ﷺ کی چالیس [۴۰] سالہ زندگی کی حرکات و سکنات تک سے واقف تھے، آپ ﷺ کی اعلیٰ صداقت و راست بازی کی قوی دلیل ہے۔[1]

[1] رحمة للعالمين (١/ ٤٩)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ایک معزز کاروباری آدمی تھے، انھوں نے بھی تبلیغِ اسلام کا کام شروع کر دیا۔ اسی طرح حضرت عثمان غنی، زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ اور عمر فاروق کے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہم اور عورتوں میں سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی اُمّ فضل، اسماء بنت عمیس، اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہن مسلمان ہوئیں۔ یہ سب حضرات و خواتین اسلام کا ہراوَل دستہ ثابت ہوئے اور ان کے علاوہ بھی کثیر تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے، جن میں ورقہ بن نوفل بھی ہیں۔

امام حاکم مستدرک میں ایک روایت لائے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَسُبُّوا وَرَقَةَ فَإِنِّي رَأَيْتُ لَهُ جَنَّةً أَوْ جَنَّتَيْنِ»[1]

''ورقہ کو گالی مت دو، کیوں کہ میں نے اس کے لیے ایک جنت یا دو جنتیں دیکھی ہیں۔''

امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔''

بعثت کے بعد رسول اللہ ﷺ نہایت راز داری کے ساتھ فریضہ تبلیغ ادا فرماتے رہے، اس مدت میں بہت سی مبارک ہستیوں نے دعوتِ حق پر لبیک کہا اور پھر اسے اپنے حلقہ اثر میں پھیلا نے کی بھرپور کوشش کی، اس طرح اسلام کا نورِ ہدایت اندر ہی اندر جہالت کی تاریکیوں کو نابود کرنے لگا، اس زمانے میں اہلِ حق چھپ چھپ کر مکے کی سنسان گھاٹیوں میں نماز پڑھتے تھے، تاکہ مشرکین کو ان کے قبولِ اسلام کا پتا نہ چل سکے، لیکن کفارِ مکہ کو کسی طور یہ خبر مل ہی گئی کہ ان کے کچھ لوگوں نے محمد ﷺ کا لایا ہوا نیا دین قبول کر لیا ہے اور ان کی اور ان کے باپ دادوں کی عبادات کے طریقے چھوڑ کر ایک نیا طریقہ عبادت ایجاد کر لیا ہے، چنانچہ وہ غم و غصے کی حالت میں اس ٹوہ میں رہنے لگے کہ کسی مسلمان کو اس کے طریقے پر عبادت کرتے دیکھیں تو اس پر ظلم کرتے ہوئے اسے عبادت سے روکیں۔

اسی زمانے میں دو تین واقعات ایسے پیش آئے جن میں نماز پڑھنے والے حق پرستوں پر مشرکوں نے یورش کر دی، گو دینِ حق کے سرفروشوں نے ان کا منہ پھیر دیا، لیکن اس بات کا سخت اندیشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں مشرکینِ مکہ سے کھلم کھلا تصادم شروع نہ ہو جائے۔ اس وقت رحمتِ عالم ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ حالات ایسی صورت اختیار کریں، رسول اللہ ﷺ کا خیال تھا کہ

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٠٩)

مسلمانوں کو مکے میں کوئی ایسی محفوظ جگہ مل جائے، جہاں کفار کے حملے کا ڈر نہ ہو تو وہ وہیں جمع ہو کر نماز پڑھ لیا کریں۔ ابھی ایسی جگہ کی تلاش جاری تھی کہ ایک دن انیس بیس برس کی عمر کے ایک خوبصورت وخوش لباس نوجوان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

"یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، میرا وسیع مکان کوہِ صفا کے دامن میں، بیت اللہ کے قریب واقع ہے، میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں، مسلمان اس میں جمع ہو کر جو چاہیں کریں، مشرکین کی مجال نہیں کہ وہ اس مکان میں داخل ہوسکیں۔"

رحمتِ عالم ﷺ اس پرستارِ حق نوجوان کے جذبہ ایثار پر بہت مسرور ہوئے، اُن کو دعا دی اور ان کی فیاضانہ پیشکش کو شرفِ قبول بخشتے ہوئے اس مکان کو مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت وتبلیغ کا مرکز بنا دیا، یہ نوجوان جن کے گھر کو اسلام کا پہلا مرکز اور مسلمانوں کی پناہ گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت ان کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس تھی، اٹھتی جوانی میں لوائے توحید تھام کر ہر قسم کے مصائب و آلام کو دعوت دینا کسی سعید روح ہی کا کام ہوسکتا تھا، بنو مخزوم کے اس جوان سعادت مند نے یہ کام کر دکھایا اور ہر طرح کے خطرات کے ساتھ اپنا مستقبل مکے کے دریتیم ﷺ سے وابستہ کر دیا، یہ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کا جذبہ ایثار ہی تھا، جس نے اللہ کے رسول ﷺ کو خوش کیا، ان کو خوش کیا تو اللہ کو خوش کیا اور اللہ نے ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر کو اس عظیم قربانی کے عوض ان انتہائی مشکل حالات میں "دار الاسلام" بننے کا لازوال اور عظیم شرف بخشا۔

رسول اللہ ﷺ اس مشکل اور کٹھن زمانے میں دار ارقم ہی میں تشریف فرماتے رہے، یہیں آ کر اہلِ حق رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوتے تھے اور مکان کا دروازہ بند کر کے نماز پڑھتے تھے اور لوگ بھی اسی جگہ آ کر اسلام قبول کرتے، رسول اللہ ﷺ کے فیوض اور برکات سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ یہ دار ارقم مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا۔

خلاصہ:

دعوت وتبلیغ کے کام کو مخفی طور پر انجام دینے کے باوجود اسلام قبول کرنے والے اہلِ ایمان کی ایک مختصر سی جماعت بن گئی اور آہستہ آہستہ اس نئے دینِ اسلام کی خبر قریشِ مکہ تک پہنچ گئی۔ مگر انھوں نے سرِ دست اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ دَرپردہ تبلیغ کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ تین سالہ

دور مکمل ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی اکرم ﷺ کو علانیہ تبلیغ کرنے اور قریش کے باطل نظریات اور بت پرستی کی کھلے طور پر تردید کرنے کا حکم دے دیا۔[1]

دوسرا مرحلہ... علانیہ تبلیغ:

جب سورت شعراء کی آیت ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] نازل ہوئی جس میں حکم تھا: ''اپنے خاندان کے لوگوں اور قرابت داروں کو نارِ جہنم سے ڈرائیں۔'' تو اس آیت کے نزول کے ساتھ ہی حکمِ ربانی پر عمل کرتے ہوئے آپ ﷺ نے تبلیغ کا کام شروع کر دیا، یہ علانیہ دعوت و تبلیغ کا مرحلہ بعثت کے چوتھے سال کے آغاز سے شروع ہو کر دسویں سال تک جاری رہا۔

معروف محدث و مورخ امام ابن اثیر رحمہ اللہ اپنی تاریخِ اسلام ''الکامل'' میں لکھتے ہیں:

''ایک دن نبی اکرم ﷺ نے خاندانِ بنی ہاشم کو جمع کیا، تاکہ انھیں تبلیغ کریں، جب وہ جمع ہوگئے تو ابولہب نے الٹی سیدھی ہانکنی شروع کر دیں۔ جس کی وجہ سے آپ ﷺ اپنا مدعا بیان نہ کر سکے۔ اگلے دن پھر سب کو دعوت دی اور چالیس پینتالیس آدمی جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے انھیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں تمھارے لیے بالخصوص اور عامتہ الناس کے لیے بالعموم رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے ذکرِ موت، فکرِ آخرت اور اعمالِ خیر و شر کے انجام اور جنت و دوزخ کا ذکر کیا اور پوچھا کہ اس دعوت میں تم میں سے میرا ساتھ کون دے گا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو ابھی نوعمر ہی تھے، وہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں آپ ﷺ کا ساتھ دوں گا۔''

قبولِ اسلام کے وقت ان کی عمر کل نو یا دس سال تھی اور ان میں خفیہ دعوتی مرحلے کے تین سال جمع کریں تو اس وقت ان کی عمر کل بارہ یا تیرہ سال بنتی ہے۔[2]

آپ ﷺ کے چچا ابو طالب نے بھی کہا کہ یوں تو آپ ﷺ کا سارا خاندان یہاں جمع ہے اور میں بھی ان میں سے ایک ہوں، البتہ میں اپنی طرف سے حلفیہ یقین کرتا ہوں کہ میں تاحینِ حیات آپ ﷺ کا ساتھ دیتا رہوں گا۔ آپ ﷺ جو کہنا چاہیں کہیں، میں آپ کے دشمنوں کا راستہ

---

[1] فقه السیرة (ص: ۱۰۰) الرحیق المختوم (ص: ۸۸)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: البدایة والنهایة (۳/ ۲۴ تا ۲۶)

روکوں گا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے:

’’اِنَّ نَفْسِيْ لَا تُطَاوِعُنِيْ عَلٰی فِرَاقِ دِيْنِ عَبْدِ الْمُطَّلَبِ‘‘

’’میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ میں اپنے باپ عبدالمطلب کا دین چھوڑ دوں۔‘‘

پھر واقعی ابو طالب نے عمر بھر دینِ اسلام کو قبول کیا نہ ایمان لائے، مگر نبی ﷺ کی حمایت کا حق ادا کر دیا۔[1]

بخاری اور مسلم شریف میں ہے کہ جب آیت: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَ قْرَبِيْنَ﴾ نازل ہوئی تو نبی اکرم ﷺ کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور مختلف خاندانوں کے نام لے لے کر آوازیں دیں، جب وہ جمع ہو گئے، تو فرمایا:

’’اگر میں تمھیں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر ہے، جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم مان جاؤ گے؟ ان سب نے کہا:

’’مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كِذْباً‘‘ ’’ہم نے آپ (ﷺ) کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔‘‘

تب آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَاِنِّيْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ»

’’میں تمھیں عذابِ شدید سے ڈرانے والا ہوں۔‘‘

یہ سنتے ہی ابولہب اٹھا اور بھڑک کر کہا:

’’تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا‘‘

’’تو ہلاک ہو جائے، کیا تو نے ہم سب کو صرف اسی لیے جمع کیا تھا؟‘‘

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے تیسویں پارے کی سورت لہب نازل فرمائی ہوئی۔[2]

اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝

---

[1] الكامل لابن الأثير كما نقله محمد الغزالي في فقه السيرة (ص: ٣_١٠٢) رحمة للعالمين (١/ ٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧)

فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿۵﴾ [سورة اللهب]

''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود بھی) ہلاک ہوگیا، اس کا مال اور اس کی کمائی کچھ اس کے کام نہ آئی۔ وہ عنقریب شعلہ مارتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا اور اس کی بیوی بھی (جہنم جائے گی) جو لکڑیاں اٹھائے پھرتی ہے۔ اس کی گردن میں پوستِ کھجور کی بٹی ہوئی رسی ہے۔''

ابولہب کا انجام:

ابولہب کا اصل نام عبد العُزّیٰ تھا، اپنے حسن و جمال اور چہرے کی سرخی کی وجہ سے اسے ابولہب ''شعلہ فروزاں'' کہا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اپنے انجام کے اعتبار سے بھی اسے جہنم کی آگ کا ایندھن بننا تھا۔ یہ نبی اکرم ﷺ کا حقیقی چچا تھا، لیکن آپ ﷺ کا شدید دشمن تھا، اس نے جب نبی کریم ﷺ کو بد دعا دی اور کہا کہ تو ہلاک و برباد ہو جائے تو بد دعا کے ان الفاظ کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اس کی ہلاکت اور بربادی کی خبر بھی دے دی، چنانچہ جنگِ بدر کے چند روز بعد یہ عدسہ بیماری میں مبتلا ہوا، جس میں طاعون کی طرح گلٹی سی نکلتی ہے، اس میں اس کی موت واقع ہوگئی اور تین دن تک اس کی لاش یوں ہی پڑی رہی حتیٰ کہ سخت بدبودار ہوگئی۔ بالآخر اس کے لڑکوں نے بیماری کے پھیلنے اور عار کے خوف سے، اس کے جسم پر دور ہی سے پتھر اور مٹی ڈال کر اسے دفنا دیا۔

ابولہب کو جن چیزوں پر تکبر اور غرور تھا وہ کیا تھیں؟ اس کی کمائی اور اس کی رئیسانہ حیثیت، جاہ و منصب اور اس کی اولاد بھی اس میں شامل ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی گرفت آئی تو کوئی چیز اس کے کام نہ آسکی۔ اس کی بیوی ام جمیل بنت حرب بھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ دشمنی میں اپنے خاوند سے کم نہ تھی اور یہ جہنم میں اپنے خاوند کی آگ پر لکڑیاں لا لاکر ڈالے گی تاکہ آگ مزید بھڑکے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہوگا، یعنی جس طرح یہ دنیا میں اپنے خاوند کی اس کے کفر و عناد میں مددگار تھی، آخرت میں بھی عذاب میں اس کی مددگار ہوگی۔[1]

بعض کہتے ہیں کہ وہ کانٹے دار جھاڑیاں ڈھو ڈھو کر لاتی اور نبی اکرم ﷺ کے راستے میں لا کر بچھا دیتی تھی اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ کفارِ قریش کے پاس جا کر نبی کریم ﷺ کی غیبت کرتی اور

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/ ٧٣١)

انھیں آپ ﷺ کی عداوت پر اکساتی تھی۔[1]

اس کے گلے میں جو رسی ہوگی، وہ مضبوط بٹی ہوئی مونج کی یا پوستِ کھجور کی ہوگی یا آہنی تاروں کی ہوگی جیسا کہ مختلف لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ دنیا میں گلے میں رسی ڈالے رکھتی تھی، جسے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہنم میں اس کے گلے میں جو طوق ہوگا، وہ آہنی تاروں سے بٹا ہوا ہوگا، ''مَسَدٌ'' سے تشبیہ، اس کی شدت اور مضبوطی کو واضح کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ واللہ اعلم

صحیح بخاری و مسلم شریف ہی میں ہے کہ جب آیت ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] نازل ہوئی تو آپ ﷺ اٹھے اور فرمایا:

''اے قریش کے لوگو! اپنی جانوں کو جہنم کی آگ سے بچالو، حکمِ الٰہی کے سامنے میں تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اے بنی عبدالمطلب! میں حکمِ الٰہی کے سامنے تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اے میرے چچا عباس! میں حکمِ الٰہی کے سامنے تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اے میری پھوپھی صفیہ! میں حکمِ الٰہی کے سامنے تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا اور آخر میں اپنی بیٹی کو مخاطب کر کے فرمایا:

((يَا فَاطِمَةَ بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! سَلِيْنِيْ مِنْ مَالِي مَا شِئْتِ، لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا))[2]

''اے میری پیاری بیٹی فاطمہ بنت رسول اللہ (ﷺ)! مجھ سے میرے مال میں سے جو کچھ چاہو مانگو اور لے لو، لیکن (قیامت کے دن) حکمِ الٰہی کے سامنے میں تمھارے کسی کام نہیں آسکوں گا۔''

کفار و مشرکین کی ایذا رسانی:

علانیہ دعوت و تبلیغ کا حکم ملتے ہی نبی رحمت ﷺ نے نہ صرف اہلِ خاندان و قبیلہ بلکہ عام لوگوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دینا شروع کر دیا تھا اور خاص طور پر جب سورت حجر کی آیت

---

[1] فتح الباري (۸/ ۹۴۳، ۹٤٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲٦۰۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۰٤)

(۹۴) ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ نازل ہوئی تو اس میں حکم تھا کہ ''آپ ﷺ لوگوں کو احکامِ الٰہی صاف صاف سنائیے اور مشرکین کی پروا مت کیجیے۔'' لہٰذا اب آپ ﷺ میدانِ دعوت و تبلیغ میں مزید سرگرمِ عمل ہو گئے، کبھی تنہا اور کبھی چند جانثاروں کے ہمراہ دار ارقم سے نکل کر لوگوں کو صاف صاف اسلام کی دعوت دیتے اور شرک سے دور رہنے کی تلقین فرماتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور وہی لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی امانت و دیانت، صدق اور اعلی کردار کی تعریفیں کیا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے جانی دشمن بن گئے، بہر حال مخالفت کے ان طوفانوں میں دعوتِ حق کا کام برابر جاری رہا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ عکاظ، مجنّہ اور ذی المجاز نامی میلوں میں جا نکلتے۔ جہاں دور دراز سے لوگ آتے تھے۔ وہاں ان کو توحید و رسالت کی دعوت دیتے تھے۔[1]

یہی وہ دَور ہے جس میں کفار نے حضرت عمار بن یاسر اور اوّل شہیدہ فی الاسلام حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم کو تکلیفیں پہنچائیں اور انھیں برداشت کرتے دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:

''اے آلِ یاسر! صبر کرو، تمھارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔''[2]

بلال و خباب اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو دل گداز تکلیفیں دیں اور خود نبی رحمت ﷺ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں۔ آپ ﷺ کے راستوں میں کانٹے بچھائے گئے۔ گھر کے سامنے گندگی پھینکی، عفونت پھیلائی، دورانِ نماز وسجدہ آپ ﷺ کی پشت مبارک پر اونٹ کی غلاظت بھری اوجڑی ڈالی گئی۔ آپ ﷺ کو (نعوذ باللہ) دیوانہ، شاعر، کاہن اور جادوگر کہا گیا اور آپ ﷺ کو قتل کرنے کی سازشیں کی گئیں۔ مگر وہ کیا جانیں کہ ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت تک دین پہنچانے کے لیے جس صبر و تحمل، عفو و درگزر اور شفقت و رحمت کا طرزِ عمل اختیار فرمایا، وہ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ایک ایسا عظیم الشان پہلو ہے، جس کی رفعتوں اور بلندیوں کا ادراک کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

---

[1] رحمة للعالمين (١/ ٥٤) فتح القدير للشوكاني بحواله فوائد سلفيه شيخ محمد عبده الفلاح آيت مذكوره.

[2] سيرة ابن إسحاق (١/ ٢٠٣) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٨٩، ٣٨٨) وقال: صحيح علىٰ شرط مسلم، و صححه الألباني، فقه السيرة (ص: ١٠٧، ١٠٨)

غور فرمائیے! چالیس سال کی عمر کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منصبِ نبوت سے سرفراز فرمایا۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے، جس میں ہر انسان اپنی عزت و احترام کے معاملے میں بہت حساس ہوتا ہے۔ چالیس سال تک امین و صادق کہلانے کے بعد جب آپ ﷺ کو لوگ جھوٹا، پاگل، شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہوں گے تو آپ ﷺ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ نے ان گالیوں اور طعنوں کے جواب میں کبھی ایک لفظ تک اپنی زبان سے نہیں نکالا۔

آپ ﷺ کی نبوت کا مقصد بھی وہی تھا جو آپ ﷺ سے پہلے تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا تھا، یعنی لوگوں کو اللہ کی توحید اپنانے اور شرک سے بچنے کی طرف بلائیں، جیسا کہ سورت نحل (آیت: ۳۶) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾

’’اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں (کی پرستش) سے اجتناب کرو۔‘‘

چنانچہ یہی آپ ﷺ کی دعوت کا بھی بنیادی نقطہ تھا اور آپ ﷺ اسی دعوت کی تکمیل کے لیے رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین بنا کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ تن تنہا تھے۔ بچپن ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ آپ ﷺ کے پاس کوئی دولت و جاگیر نہیں تھی اور نہ کوئی پولیس فوج تھی۔ آپ ﷺ کا تمام تر اثاثہ صرف اللہ رب العزت پر اعتقاد و اعتماد اور حسنِ سیرت کی بلندی تھی۔ آپ ﷺ اسی پونجی کے بل بوتے پر غارِ حرا سے نکلے اور ہر خطرے، ہر مزاحمت، ہر مصیبت اور طرح طرح کے فتنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے، پورے عزم و ثبات سے کامل (۲۳) برس تک گمراہ انسانوں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے رہے۔ جب آپ ﷺ نے انسانوں کو ان کی تخلیق کے اصل مقصد اور اس دنیا کی اصلی حقیقت سے آگاہ فرمایا اور ربِ ذوالجلال کی بندگی کی دعوت دی تو سب سے پہلی جو دعوت تھی وہ کیا تھی؟ وہ دعوت ’’لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه‘‘ کی تھی اور آپ ﷺ آخر دم تک تن، من اور دھن سے تبلیغِ دینِ حنیف کے عظیم الشان کام میں اسی طرح مصروف رہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو تمام جہان والوں پر رحمت کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے سورۃ الانبیاء (آیت: ۱۰۷) میں فرمایا ہے:

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾

''اور (اے نبی!) ہم نے تمھیں تمام جہانوں کے لیے رحمت (بنا کر) بھیجا ہے۔''

اس لیے آپ ﷺ تمام انسانوں اور جنوں کے لیے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر، سراپا رحمت ہیں۔ آپ ﷺ سب کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف دعوت دیتے تھے، تاکہ آپ ﷺ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں، جیسا کہ سورۃ الاعراف (آیت: ۱۵۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾

''(اے نبی!) کہہ دو کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا (اُس کا رسول) ہوں، (وہ) جو آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی بخشتا اور وہی موت دیتا ہے تو اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسول نبی اُمی پر، جو خود بھی اللہ پر اور اُس کے تمام احکام پر ایمان رکھتا ہے، ایمان لاؤ اور اُن کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''

صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے انبیا میں سے کسی کو بھی نہیں دی گئی تھیں:

① میری ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ مدد کی گئی ہے۔

② میرے لیے ساری زمین کو مسجد اور پاک بنا دیا گیا ہے، میری امت سے کوئی بھی شخص جہاں نماز کو پائے، وہیں نماز پڑھ لے۔

③ میرے لیے مالِ غنیمت کو حلال قرار دے دیا گیا ہے، جبکہ مجھ سے پہلے یہ کسی کے لیے حلال نہ تھی۔

④ مجھے شفاعت عطا کی گئی ہے۔

⑤ ہر نبی کو بطورِ خاص ان کی قوم ہی کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، جبکہ مجھے تمام لوگوں کی طرف

مبعوث کیا گیا ہے۔''[1]

صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مجھے ہر سیاہ و سرخ کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔''

امام مجاہد نے کہا ہے کہ ''اس سے مراد جن و انس ہیں۔''[2]

سورۃ الاحقاف (آیت: ۲۹) میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ﴾

''اور جب ہم نے جنوں میں سے کئی شخص تمھاری طرف متوجہ کیے کہ قرآن سنیں تو جب وہ آپ کے پاس آئے تو (آپس میں) کہنے لگے کہ خاموش رہو، جب (پڑھنا) تمام ہوا تو اپنی برادری کے لوگوں میں واپس گئے کہ (ان کو) نصیحت کریں۔''

لہٰذا آپ ﷺ سب جہانوں کے لیے رحمت اور ساری مخلوقات پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہیں، مومنوں کے لیے تو خاص طور پر اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہیں، کیونکہ ان کے لیے نبی رحمت ﷺ انتہائی خیر خواہ تھے، ان کی تکلیف اپنی تکلیف سمجھتے تھے۔ آپ ﷺ ان پر انتہائی شفیق و مہربان تھے، حتیٰ کہ ان کے والدین سے بھی بڑھ کر شفقت فرماتے تھے۔

اسی بنا پر آپ ﷺ کا حق دیگر تمام حقوق سے مقدم ہے، سورۃ الاحزاب (آیت: ۶) میں فرمانِ الٰہی ہے کہ انسان کو اپنی جان سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، لیکن رسول اللہ کی ذات مومن کی جان سے بھی زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو تمام عمدہ اخلاق کا حامل بنایا۔ بے شمار لوگ آپ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کی بنا پر اسلام میں داخل ہوئے۔ کوئی آپ ﷺ کی سخاوت و شرافت سے متاثر ہوا، کوئی آپ ﷺ کی نرمی اور صبرِ جمیل پر فدا ہوگیا۔ کوئی آپ ﷺ کے تحمل و بردباری سے گھائل ہوا اور کوئی آپ ﷺ کی شجاعت اور قوت سے حیرت زدہ ہوگیا۔ غرض کوئی وصفِ جلیل ایسا نہیں جس سے آپ ﷺ بہرہ ور نہ ہوئے ہوں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٠٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣، ٣٣٥)

ہجرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

اسلامی سالِ نو کی آمد اپنے ساتھ جو پیغام اور یادیں لاتی ہے، اُن میں سے تاریخِ اسلام بلکہ پوری تاریخِ انسانی کا اہم واقعہ ''ہجرتِ رسول ﷺ'' بھی ہے، جس نے اسلامی تاریخ کو ایک نیا سنہری موڑ دیا۔ ہر نیا سال نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کو ہجرت کی یادیں تازہ کر دیتا ہے۔

یہ واقعہ ہجرت ساڑھے چودہ سو برس پہلے رونما ہوا تھا، جبکہ نبی اکرم ﷺ کو مبعوث ہوئے تیرہ برس ہو چکے تھے۔ نبوت ملنے کے بعد جب آپ ﷺ نے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینا شروع کیا، اہلِ قبیلہ، اہلِ مکہ اور قرب و جوار کے لوگوں کو بتایا کہ ہر قسم کی عبادت اور نذر و نیاز کا مستحق صرف ایک اللہ ہے۔ حاجت روائی اور مشکل کشائی کرنے والا بھی صرف وہی ایک مختارِ کُل ہے، تو فطرتِ سلیمہ کے مالک سعادت مند لوگ مسلمان ہونا شروع ہو گئے۔ اُدھر مشرکینِ مکہ نے جب اسلامی تعلیمات کے اس سیلِ نور کو پھیلتے دیکھا تو بگڑ گئے۔ نبی اکرم ﷺ کو بُرا بھلا کہا، تکلیفیں پہنچائیں، دھمکیاں دیں اور لالچ کے ذریعے بھی دعوتِ اسلام کی راہ روکنا چاہی، لیکن آپ ﷺ نے ان کی تکلیفوں اور دھمکیوں سے دبنے کے بجائے تبلیغِ دین کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور ان کے ہر لالچ کو نوکِ پا سے ٹھوکر مار دی۔

معجم طبرانی کبیر و اوسط، ابن جریر اور مسند ابی یعلی کی ایک متکلم فیہ روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں اور کہیں کہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ چھوڑ دوں، تب بھی یہ ممکن نہیں، یہاں تک کہ اللہ کا دین غالب ہو جائے یا اس کی راہ میں مجھے موت آ جائے۔''[1]

قریشِ مکہ نے اپنے ہتھکنڈوں کے باوجود مسلمانوں کو روز بروز بڑھتے دیکھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایذائیں پہنچانا شروع کر دیا اور ان پر ظلم و ستم کے وہ پہاڑ توڑے کہ پڑھ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن جریر (٢/ ٦٧) البدایة (٣/ ٤٨) و تعلیقات الألباني علی فقه السیرة (ص: ١١٤، ١١٥)

ہجرتِ حبشہ:

ہجرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ واقعہ (ہجرتِ حبشہ) بعثتِ نبوی ﷺ کے پانچ سال بعد ماہِ رجب میں رونما ہوا۔ اس ہجرتِ اولیٰ میں نبی اکرم ﷺ کے دو ہرے داماد ذوالنورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں قافلہ حبشہ کی طرف روانہ ہوا۔ ان کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی لختِ جگر زوجہ عثمان رضی اللہ عنہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے بعد یہ پہلے افراد تھے، جنھوں نے اللہ کے راستے میں ہجرت کی۔ ان لوگوں کو رات کے اندھیرے میں روانہ کیا گیا اور وہ اللہ کی مہربانی سے کامیاب ہوگئے اور یہ اس طرح حبشہ پہنچ گئے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں تھا جو ان کے مظالم سے بچ سکے۔ جب مصیبت حد سے تجاوز کرگئی تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی اور خود مکہ ہی میں قیام کیا کہ شائد اہلِ مکہ مستقبل میں راہِ راست پر آجائیں۔

سوشل بائیکاٹ:

قریشِ مکہ نے جب دیکھا کہ اسلام کی دعوت مکہ سے نکل کر قرب و جوار اور حبشہ تک پہنچ گئی ہے، اور ادھر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے اور مسلمانوں کی تعداد روز بروز تیزی سے بڑھ رہی تھی، ان حالات میں وہ ایک جگہ جمع ہوئے، آپس میں مشورہ کیا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب سے تمام تعلقات ختم کر دیے جائیں، اس طرح خاندانِ نبوت کا سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا۔

چنانچہ آپ ﷺ نے اہل وعیال سمیت ایک پہاڑی گھاٹی ''شِعْبِ ابی طالب'' میں پناہ لی اور اس میں تین سال تک محصور رہے۔ اس دوران میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کھانے کی جگہ پتوں سے پیٹ بھرنا پڑا۔ بچے بھوک سے بلبلاتے اور ظالم قہقہے مارتے رہے اور یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔[1]

اس سوشل بائیکاٹ کی تفصیلات بڑی جانگداز ہیں اور اس ظالمانہ بائیکاٹ لکھنے والے شخص منصور بن عکرمہ اور زاد المعاد میں علامہ ابن القیّم کے بقول بغیض بن عامر بن ہاشم کو اللہ تعالیٰ نے یہ سزا دی کہ اس کا دستاویز لکھنے والا ہاتھ فالج زدہ (شل) ہوگیا۔[2]

---

[1] البداية و النهاية (٣/ ٨٤)

[2] زاد المعاد لابن القيم (٢/ ٤٦)

اس دوران میں کوئی ایسی تکلیف نہ تھی جو آپ ﷺ نے اور اہلِ بیت نے برداشت نہ کی ہو۔ بالآخر محاصرہ ختم ہوا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر انچاس برس کی تھی۔

غم کا سال:

شِعْبِ ابی طالب سے مسلمانوں کو نجات تو مل گئی، لیکن وہاں گزارے جانے والے تین سالوں نے بہت سوں کی صحت خراب کر دی۔ گھاٹی سے نبی اکرم ﷺ شہر میں تشریف لائے تو جلدی بعد ہی ابو طالب بیمار ہوگئے اور چند ماہ بعد چچا ابو طالب فوت ہوگئے اور ابو طالب کی وفات کے چند ہی روز بعد آپ ﷺ کی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی انتقال فرمایا، اس طرح ابھی آپ ﷺ مہربان چچا ابو طالب کی وفات کے صدمے سے دوچار تھے کہ ایک اور غم برداشت کرنا پڑا۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی مشکل ترین حالات میں اللہ کے دین کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا، لہٰذا ان کی وفات کا صدمہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ ان کی میت کو آپ ﷺ نے خود قبر میں اتارا، چنانچہ اس سال کا نام آپ ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک سے ''عام الحزن'' رکھا۔ اسلامی تاریخ میں یہ سال عام الحزن کے نام ہی سے مشہور ہے، اس کا مطلب ''غم کا سال'' ہے۔

اہلِ طائف کا سنگدلانہ سلوک:

ابو طالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد کفارِ مکہ کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ پہلے کی نسبت اور زیادہ آپ ﷺ کو تنگ کرنے لگے، نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ آپ ﷺ کے لیے گھر سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ ادھر ابو طالب کی وفات کے بعد ابو لہب، بنو ہاشم کا سردار بنا۔ اس نے شروع ہی سے اعلان کر دیا تھا کہ آپ ﷺ اپنے افعال اور اعمال کے خود ذمے دار ہوں گے۔ اس اعلان کا مطلب آپ ﷺ کو برادری سے خارج کرنا تھا کہ جو بھی چاہے، آپ ﷺ کو قتل کر دے (معاذ اللہ) قبیلہ آپ ﷺ کی حمایت نہیں کرے گا۔ آخر کار آپ ﷺ نے طائف تشریف لے جانے کا ارادہ فرمایا، تاکہ بنو ثقیف کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں، وہ اسلام قبول کرلیں تو ٹھیک ہے، ورنہ انھیں اس بات پر قائل کریں گے کہ وہ آپ ﷺ کو اپنے ہاں چین سے بیٹھ کر کام کرنے دیں۔ مکہ سے طائف کا سفر آپ ﷺ نے پیدل طے کیا۔ اس سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ صرف آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ ﷺ نے وہاں پہنچنے کے بعد چند دن

آرام فرمایا۔ پھر ثقیف کے سرداروں سے ایک ایک کرکے ملاقات شروع کی اور پیغامِ حق سنایا مگر وہ اہلِ مکہ سے بھی زیادہ سنگ دل ثابت ہوئے۔ انھوں نے آپ ﷺ کی کوئی بات نہ مانی بلکہ آپ کو سخت لہجے میں کہہ دیا کہ یہاں سے چلے جائیں اور وہاں سے کچھ لڑکوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا۔ انھوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھا لیے اور وہ پتھر آپ ﷺ کو مارنے لگے۔ یہ ظالم اور وحشی لوگ عالمِ انسانیت کی سب سے بڑی شخصیت سے بدزبانی بھی کرتے اور پتھر بھی برساتے تھے۔ ان پتھروں سے آپ ﷺ لہولہان ہوگئے۔ اس کثرت سے خون نکلا کہ آپ ﷺ کے دونوں جوتے پاؤں کے ساتھ چپک گئے۔ رسول اللہ ﷺ انتہائی غم اور پریشانی کی حالت میں چلتے ہوئے ایک باغ میں پہنچے اور باغ کی ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے۔ اس حالت میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی:

”الٰہی! میں تجھ سے اپنی کمزوری اور بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی ناقدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ یا ارحم الرحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تو ہی میرا بھی رب ہے، تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے جو میرے ساتھ ناروا سلوک کرے؟ یا کسی دشمن کے جس کو تو نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو کوئی پروا نہیں، میرے لیے تیری عافیت زیادہ بہتر ہے، میں تیرے چہرے کے اُس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں دور ہوگئیں اور جس کی وجہ سے دنیا اور آخرت کے معاملات درست ہوئے کہ تو مجھ پر اپنا غضب نازل کرے، یا تیرا عتاب مجھ پر نازل ہو، مجھے تو تیری رضا مطلوب ہے، یہاں تک کہ تو خوش ہو جائے اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔“

اس دعا کے بعد آپ ﷺ قرن المنازل کے قریب پہنچے تو آسمان پر ایک بادل سا چھا گیا، آپ ﷺ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حضرت جبریل علیہ السلام نظر آئے۔ انھوں نے پکار کر کہا:

”آپ ﷺ کی قوم نے جو جواب آپ ﷺ کو دیا ہے، اللہ نے اسے سن لیا ہے۔ اب یہ پہاڑوں کا منتظم فرشتہ اللہ نے بھیجا ہے، آپ ﷺ جو حکم دینا چاہیں، اسے دے سکتے ہیں۔“

پھر پہاڑوں کے فرشتے نے آپ ﷺ کو سلام کرکے عرض کی: ”آپ ﷺ حکم دیں تو دونوں طرف کے پہاڑ ان لوگوں پر الٹ دوں؟“ آپ ﷺ کی بے پایاں رحمت دیکھیں کہ

آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں پر بھی عذاب نہ آنے کی دعا کی، بلکہ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"نہیں! میں ایسا کلمہ نہیں کہوں گا، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا فرمائے گا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گی۔"

طائف سے واپسی پر آپ ﷺ نے چند روز نخلہ کے مقام پر قیام فرمایا۔ آپ ﷺ پریشان تھے کہ آپ ﷺ مکہ کیسے جائیں؟ طائف کا حال ان لوگوں تک پہنچ گیا ہوگا، اب کفار پہلے سے کہیں بڑھ کر ستائیں گے۔ پھر چند روز بعد آپ ﷺ مکے کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشادگی کی امید تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ قریش کی طرف سے شر کا اندیشہ بھی تھا، اس لیے آپ ﷺ نے احتیاط فرمائی۔ مکے کے پاس پہنچ کر غارِ حرا میں ٹھہر گئے، وہاں سے آپ ﷺ نے ایک شخص کے ذریعے سے مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا۔ مطعم کا دادا نوفل بن عبد مناف رسول اللہ ﷺ کے جدِ اعلیٰ ہاشم بن عبد مناف کا بھائی تھا اور عبد مناف قریش کے قبیلوں میں سب سے زیادہ معزز شاخ تھی، چنانچہ مطعم بن عدی نے ہامی بھر لی۔ اس نے اور اس کے بیٹوں نے ہتھیار سجا لیے اور نبی کریم ﷺ کو آنے کا پیغام بھیجا، اس طرح آپ ﷺ مکے میں داخل ہوئے۔ مطعم نے قریش میں یہ اعلان بھی کیا کہ وہ محمد (ﷺ) کو پناہ دے چکا ہے، چنانچہ قریش نے بھی اس کی پناہ کو تسلیم کیا اور کوئی شرارت نہ کی۔

شقِ صدر اور اسرا و معراج:

معراج النبی ﷺ کے دو حصے ہیں: اسرا اور معراج۔ اسرا سے مراد ہے راتوں رات نبی اکرم ﷺ کا مکے سے بیت المقدس تک تشریف لے جانا، جبکہ معراج سے مراد ہے عالمِ بالا میں تشریف لے جانا۔

یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ جب نبی رحمت ﷺ کو بارِ رسالت اٹھائے تقریباً نصف عہدِ نبوت گزر گیا اور کفار و مشرکین کی طرف سے ایذا رسانی کی حد ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے کفار کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو دیے جانے والے مصائب و آلام کا اثر کم کرنے، میدانِ دعوت و تبلیغ میں لگنے والے ذہنی و جسمانی زخموں کو مندمل کرنے، آپ ﷺ کی دل جمعی و حوصلہ افزائی اور عزت نوازی و

شرف افزائی کے لیے ایک ایسی عظیم و مبارک سیاحت کا انتظام فرمایا جو نہ صرف ایک سیاحت و زیارت تھی، بلکہ آپ ﷺ کے نبی و رسولِ برحق ہونے پر دلالت کرنے والے کثیر معجزات میں سے ایک عظیم الشان معجزہ بھی تھی۔ یہ معجزہ ماہ ربیع الاول کی 26 یا 27 لیکن مشہور روایت کے مطابق نبوت کے بارہویں سال ماہِ رجب کی ستائیس (۲۷) تاریخ اور بدھ کی رات کو پیش آیا۔ جبکہ آپ ﷺ کی عمر شریف باون (۵۲) سال ہوچکی تھی۔[1]

عالمِ ملکوت کے اس سفر پر روانگی سے قبل آپ ﷺ اس رات حطیم یا حجرِ کعبہ میں آرام فرما رہے تھے۔ اس وقت آپ ﷺ پر نیند اور بیداری کے درمیان والی حالت طاری تھی۔ ایسے میں حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ انھوں نے آپ ﷺ کا سینہ چاک کیا اور آبِ زمزم سے دھو کر ایمان اور حکمت سے بھر دیا، پھر آپ ﷺ کے پاس سواری کے لیے ایک جانور لایا گیا۔ اس کا نام براق تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ اس کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ جہاں تک نظر جاتی تھی اسکا قدم وہاں پڑتا تھا۔ تیز و برق رفتاری کی بنیاد ہی پر اس کو براق کہا گیا تھا۔ اس سواری پر بیٹھ کر آپ ﷺ مسجدِ اقصیٰ تک گئے۔ پھر وہاں پہنچ کر حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو براق سے اترنے کے لیے کہا، پھر آپ ﷺ مسجدِ اقصیٰ میں داخل ہوگئے۔ وہاں آپ ﷺ نے تمام انبیا علیہم السلام کی امامت فرمائی اور دو رکعت نماز ادا کی۔[2]

اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس دو پیالے لائے۔ ان میں سے ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب تھی۔ دونوں پیالے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ کو ان میں سے جو چیز پسند ہو نوش فرمایئے۔ آپ ﷺ نے دودھ پسند فرمایا۔ یہ دیکھ کر حضرت جبریل علیہ السلام فرما اٹھے:

> ’’آپ ﷺ نے فطرت پائی، آپ ﷺ کو ہدایت نصیب ہوئی اور آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کی امت کو بھی۔ اگر آپ ﷺ شراب پسند فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔‘‘

اب آپ ﷺ کو بیت المقدس سے آسمانِ دنیا تک کا سفر کرنا تھا، آپ ﷺ کے لیے پہلے آسمان کا دروازہ کھلوایا گیا۔ وہاں آپ ﷺ نے تمام بنی نوعِ انسان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو

---

[1] طبري (١/ ٨٠ اردو) الرحیق (ص: ١٥٥)

[2] الفتح الرباني (٢٠/ ٢٥٥)

دیکھا، انھیں سلام کیا، انھوں نے آپ ﷺ کے سلام کا جواب دیا، مرحبا کہا اور آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا۔ اس وقت آپ ﷺ نے دیکھا کہ ان کے دائیں طرف انسانوں کا ایک بہت بڑا گروہ تھا۔ اسی طرح ایک گروہ ان کی بائیں طرف تھا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام دائیں طرف والے گروہ پر نظر ڈالتے تو مسکراتے، یہ سعادت مندوں کی روحیں تھیں۔ جب وہ بائیں طرف والوں کو دیکھتے تو رو دیتے، وہ بدبختوں کی روحیں تھیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو دوسرے آسمان پر لے جایا گیا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دروازہ کھلوایا۔ دروازہ کھلا تو آپ ﷺ نے وہاں دو خالہ زاد بھائیوں حضرت یحییٰ بن زکریا اور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہم السلام کو دیکھا اور انھیں سلام کیا۔ ان دونوں نے آپ ﷺ کے سلام کا جواب دیا۔ آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا اور خوش آمدید کہا۔

اس کے بعد آپ ﷺ تیسرے آسمان پر پہنچے۔ تیسرے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نصف حسن عطا فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ آپ ﷺ کو خوش آمدید کہا۔ آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا۔ اس کے بعد پھر آپ ﷺ کا سفر شروع ہوا۔ آپ ﷺ کو چوتھے آسمان پر لے جایا گیا۔ چوتھے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت ادریس علیہ السلام کے ساتھ ہوئی۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے ساتھ بھی اسی طرح ملاقات ہوئی۔ پھر آپ ﷺ پانچویں آسمان پر تشریف لے گئے۔ یہاں آپ ﷺ کی ملاقات حضرت ہارون علیہ السلام سے ہوئی، آپ ﷺ نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے جواب میں مرحبا کہا اور آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا۔

اس کے بعد آپ ﷺ کو چھٹے آسمان پر لے جایا گیا۔ وہاں آپ ﷺ کی ملاقات حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے ہوئی۔ اسی طرح ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بھی آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا اور آپ ﷺ کو خوش آمدید کہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت اپنی کمر بیتِ معمور سے لگائے بیٹھے تھے۔[1]

بیتِ معمور کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور پھر قیامت تک کبھی ان کی باری نہیں آتی، یعنی جو فرشتے ایک بار داخل ہوگئے، پھر داخل نہیں

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٦٧٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٢)

ہوں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے فرشتے اتنی تعداد میں ہیں کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

ساتویں آسمان سے آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا، یہ ایک بیری کا درخت تھا۔ اس کے پتے ایسے تھے جیسے ہاتھی کے کان ہوں۔ اس کے بیر بڑے کونڈوں یا گھڑوں جیسے تھے۔ پھر اس پر سونے کے پتنگے اور جو جو کچھ اللہ کو منظور تھا، چھا گیا۔ اس طرح بیری کا وہ درخت اس قدر خوب صورت ہوگیا کہ کوئی انسان اس کی خوب صورتی کو بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت آپ ﷺ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے اس قدر قریب ہوئے کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو احکم الحاکمین کے پاس لے جا کر شرفِ ہم کلامی سے نوازا گیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کے لیے پانچ نمازیں دن اور رات میں فرض فرمائیں جو اس سفرِ معراج کا تحفہ ہیں۔

اس سفر میں آپ ﷺ نے جنت و دوزخ بھی دیکھے اور اہلِ عذاب کے مختلف گروہ دیکھے:

① یتیموں کا مال کھانے والوں کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ آگ کے انگارے منہ سے کھاتے ہیں اور وہ آگ ان کی دبروں (جائے پاخانہ) سے نکلتی ہے۔

② سود خوروں کو دیکھا کہ ان کے پیٹ اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر پاتے۔

③ زانیوں کو دیکھا کہ وہ پاکیزہ گوشت کو چھوڑ کر بدبودار گوشت کھا رہے ہیں۔

④ غیر محرم لوگوں کے سامنے بے پردہ جانے والی عورتوں کو اس حال میں دیکھا کہ وہ پستانوں کے بل لٹکائی ہوئی ہیں۔

اسی رات آپ ﷺ کی واپسی ہوئی، یہ سب کچھ ایک رات کے تھوڑے سے حصے میں ہوگیا۔ صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے معراج کا حال بیان فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو کچھ دکھایا، اس کے بارے میں آپ ﷺ نے تفصیل سے سنایا تو قوم نے اس کے بارے میں بھی آپ ﷺ کو جھٹلایا۔ اس واقعے کو ماننے سے صاف انکار کر دیا، بلکہ آپ ﷺ کا مذاق اڑایا۔ کسی نے سن کر حیرت ظاہر کی اور کسی نے مارے حیرت کے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ کچھ لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس دوڑے گئے۔ انھیں خبر دی کہ آپ کے دوست یہ کہہ رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی

بھی کیا شان ہے! ان کی زبانی ساری بات سن کر بولے: ”میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں۔“

اس پر کہا گیا: ”تو آپ بھی ان کی تصدیق کرتے ہیں؟“

جواب میں انھوں نے کہا:

”میں تو اس سے بھی دور کی باتوں میں نبی مکرم ﷺ کی تصدیق کرتا ہوں۔ صبح و شام آسمان سے جو خبریں آتی ہیں، میں ان میں بھی آپ ﷺ کو بالکل سچا مانتا ہوں۔“ [1]

آپ نے جب کفار کو یہ جواب دیا تو اسی روز سے آپ کا لقب ”صدیق“ ہوگیا۔ اب کفار نے نبی اکرم ﷺ کو آزمانے کا فیصلہ کیا، اکٹھے ہوکر آپ ﷺ کے پاس آئے اور بولے:

”آپ بیت المقدس کے بارے میں بتائیں، یعنی اس کے کتنے دروازے ہیں؟ کتنے ستون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔“

آپ ﷺ نے معراج کی رات سے پہلے بیت المقدس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ معراج کی رات میں بھی آپ ﷺ نے دیکھا ضرور تھا لیکن آپ ﷺ نے وہاں دروازے اور ستون وغیرہ گنے نہیں تھے کہ فوراً ان کی بات کا جواب دے دیتے، چنانچہ اس مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی مدد فرمائی اور بیت المقدس کو آپ ﷺ کے سامنے ظاہر کر دیا۔

آپ ﷺ دیکھتے گئے اور نشانیاں بتاتے گئے۔ یہ نشانیاں سن کر کفار حیرت زدہ ہوگئے اور آپ ﷺ کی تردید نہ کر سکے، بلکہ یہ کہا کہ جہاں تک اوصاف کا تعلق ہے تو آپ ﷺ نے بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کیے ہیں۔ غرض سب باتیں بالکل واضح طور پر بیان فرمائیں۔ یہ سب کچھ سن کر بھی وہ اپنے کفر پے ڈٹے رہے۔ ان کافروں کے متعلق سورت سبا (آیت: ۳۴ تا ۳۶) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

”اور ہم نے جب کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) بھیجا تو وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ جس چیز کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو، ہم اس کو نہیں مانتے اور یہ (مکہ کے)

[1] الفتح الرباني (٢٠/ ٢٦٤)

کافر کہتے ہیں کہ ہم مال اور اولاد (مسلمانو!) تم سے زیادہ رکھتے ہیں اور جب دنیا میں ہم تم سے اچھے ہیں تو (آخرت میں بھی) ہم کو عذاب نہیں ہوسکتا۔ (اے پیغمبر!) کہہ دے! میرا مالک جس کو چاہتا ہے فراغت کے ساتھ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، تنگی کے ساتھ دیتا ہے، اکثر لوگ (اس مصلحت کو) نہیں جانتے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آپ ﷺ سابقہ انبیاے کرام کے اسوہ حسنہ کو پیشِ نظر رکھیں کہ اس نے جس نبی کو بھی کسی بستی میں بھیجا تو بستی کے خوش حال لوگوں نے تو اس نبی کی تکذیب کی، مگر کمزور لوگوں نے اتباع کی، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا تھا:

﴿ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ﴾ [الشعراء: ١١١]

''وہ کہنے لگے کیا ہم تیری بات مان لیں جبکہ تیری پیروی تو رذیل لوگوں نے کی ہے۔''

''أرذلُ'' کی جمع ہے: ''أرذلون''، جاہ و مال نہ رکھنے والے اور اس کی وجہ سے معاشرے میں کمتر سمجھے جانے والے اور انہی میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو حقیر سمجھے جانے والے پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

سورت ہود (آیت: ٢٧) میں فرمایا ہے:

﴿ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ﴾

''تب اس کی قوم کے سردار جو کافر تھے (نوح سے) کہنے لگے کہ ہم تو تجھے اپنے جیسا انسان ہی دیکھتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جنھوں نے تیری پیروی کی ہے، یہ لوگ واضح طور پر سوائے نیچ لوگوں کے اور کوئی نہیں جو بے سوچے سمجھے تمھاری پیروی کر رہے ہیں ہم تو تمھاری کسی قسم کی برتری اپنے اوپر نہیں دیکھ رہے بلکہ تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔''

اسی طرح قومِ صالح علیہ السلام کے متکبر امرا نے کہا تھا:

﴿ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ [السباء: ٣٤]

''جس چیز کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو، بلاشبہہ ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں۔ (ہم اس پر ایمان لائیں گے نہ اس کی اتباع کریں گے)۔''

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان خوش حال اور تکذیب کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ انھوں نے اموال و اولاد کی کثرت پر فخر کیا اور یہ عقیدہ رکھا کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت اور ان کے ساتھ خصوصی تعلق ہے اور یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ دنیا میں تو انھیں مال و اولاد سے کثرت سے نوازے، پھر آخرت میں انھیں عذاب دے، فرمایا کہ یہ ان کا خام خیال ہے۔

سورۃ المومنون (آیت: ۵۵، ۵۶) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾

''یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم جو اُن کی مال اور اولاد سے مدد کرتے ہیں، تو اُن کو بھلائی پہنچانے میں جلدی کرتے ہیں، ہرگز نہیں ان لوگوں کو (ہمارا اصل مقصد) معلوم نہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا ہے کہ اے میرے نبی! کہہ دیں کہ میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے، روزی فراخ کر دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا:

''تمھارا مال اور اولاد ایسی چیزیں نہیں کہ تمھیں ہمارا مقرب بنا دیں اور اگر ہم نے تمھیں مال اور اولاد دی ہے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ ہمیں تم سے محبت اور خصوصی تعلق ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''بے شک اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں، تمھارے مالوں اور تمھاری اولادوں کی طرف نہیں دیکھتا ہے، بلکہ وہ تمھارے دلوں اور عملوں کی طرف دیکھتا ہے۔''[1]

معراج کے بعد آپ ﷺ مسلسل مکے میں مقیم رہے۔ ہر طرف سے مصائب و آلام کا سامنا تھا۔ سب کچھ سہتے تھے، مگر دعوتِ حق سے منہ نہ موڑتے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے مدینے کے انصار کو مشرف بہ اسلام ہونے کی توفیق عطا فرمائی اور اس کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہجرتِ مدینہ کی اجازت

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٦٢٨) مسند أحمد (٢/ ٥٣٩)

دی گئی اور وہ جوق در جوق خفیہ روانہ ہونے لگے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ کیونکہ کامیابی و کامرانی اور دنیا و آخرت کی سعادت اسی سے حاصل ہوسکتی ہے، جیسا کہ سورۃ الاحزاب (آیت: ۲۱) میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾

''(مسلمانو!) تم کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی پیروی کرنا تھی جو اُن لوگوں کے لیے اچھی ہے جو اللہ تعالیٰ اور پچھلے دن (قیامت) سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتے ہیں۔''

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے کہ ''ایمان کا مزہ اس نے چکھا اور اس کی لذت اسے ملی جو اللہ کو اپنا رب، دینِ اسلام کو اپنا دین اور محمد ﷺ کو اپنا رسول اور ہادی ماننے پر دل سے راضی ہوگیا۔''

وصلى الله وسلم على نبينا محمد و علىٰ آله و صحبه أجمعين.

مراجعِ درس

1. تفسير ابن كثير.
2. تفسير أحسن البيان. فضيلة الشيخ حافظ صلاح الدين يوسف
3. سيرة إمام الأنبياء ﷺ. تالیف: شیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. فضائلِ رحمة للعالمين. تالیف: مولانا محمد اقبال کیلانی
5. مختصر السيرة النبوية. تالیف: مولانا عبد الخالق خلیق

ہجرتِ رسول ﷺ، اعمال و اخلاق حیاتِ مبارکہ کے آخری دن اور وفات

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورت آل عمران (آیت: ۱۳۴) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴾

''جو فراغت اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کیے جاتے ہیں اور غصہ پی جاتے ہیں (باوجود قدرت کے کسی کو تکلیف نہیں دیتے) اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں (ان کا قصور معاف کر دیتے ہیں) اور اللہ پسند کرتا ہے احسان کرنے والوں کو۔''

ہجرتِ رسول ﷺ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے لیکن تاحال نبی اکرم ﷺ کو اجازت نہیں ملی تھی، تاہم اہلِ مکہ کی اس قدر سختیوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بھی ہجرت کی اجازت دے دی۔ سفر جاری کرنے سے پہلے آپ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تین دن تک غارِ ثور میں رہے، پھر ساحل کی راہ سے روانہ ہوئے۔ اس غار میں نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تین دن قیام فرمایا۔ اس دوران میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا وہاں بکریاں لے جا کر دودھ پہنچاتیں اور حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما قریش کی خبریں آپ ﷺ تک پہنچایا کرتے تھے۔ قریشِ مکہ تلاش میں سرگرداں غار کے منہ تک بھی پہنچ گئے۔

بخاری و مسلم شریف میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اگر ان (کفار) میں سے کوئی اپنے قدموں کے نیچے دیکھ لیتا تو ہمیں پا لیتا اور قسم اٹھا کر فرمایا: مجھے اپنی جان کا کوئی خطرہ

نہیں، مجھے ڈر ہے تو صرف یہ کہ آپ ﷺ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''ڈریں نہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔'' پھر فرمایا:

''اے ابوبکر! تمھارا ان دو ساتھیوں (کے محفوظ و مامون ہونے) کے بارے میں کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا خود اللہ تعالیٰ ہو؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی ذات سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے محبت کی ایسی مثالیں پیش کیں کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے اور تاریخ کسی اور شخص کے بارے میں ایسی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کتبِ سیرت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نبی اکرم ﷺ سے بے پناہ محبت، جانثاری اور فداکاری کے بے شمار واقعات موجود ہیں، ان میں سے یہاں چند ایک مثالیں درج ذیل ہیں:

① زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو کفار نے پکڑ لیا اور انھیں قتل کرنے کے ارادے سے حرم سے باہر لے گئے۔ راستے میں ابوسفیان نے (جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) ان سے کہا کہ میں تمھیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، بتاؤ کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ تمھاری جگہ محمد (ﷺ) کو (نعوذ باللہ) پھانسی دی جاتی اور تم گھر میں آرام سے رہتے؟ زید بن دثنہ نے جواب دیا:

''اللہ کی قسم! مجھے یہ بات بھی گوارہ نہیں کہ میں چھوڑ دیا جاؤں اور اس رہائی کے بدلے محمد (ﷺ) کو اسی جگہ رہتے ہوئے جہاں آپ (ﷺ) اس وقت تشریف فرما ہیں کوئی کانٹا بھی چبھے۔''

یہ سن کر ابوسفیان حیران رہ گیا اور یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ ہم نے کسی کو کسی سے ایسی محبت کرتے نہیں دیکھا جیسی محبت اصحابِ محمد (ﷺ) محمد (ﷺ) سے کرتے ہیں۔

② ''حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کفار کی ایک سازش میں ان کی زد میں آگئے۔ کفار نے انھیں چند دن تک بھوکا پیاسا قید رکھا، پھر انھیں سولی پر لٹکانے کے لیے ایک مقام پر لے آئے۔ تختہ دار پر کھڑا کرنے کے بعد ان ظالموں نے کہا: اگر اسلام چھوڑ دو تو جان بخشی ہوسکتی ہے مگر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا جواب تھا کہ جب اسلام نہ رہا تو جان رکھ کر کیا کروں گا؟ ظالم کفار نے نہ صرف انھیں سولی پر لٹکایا بلکہ نیزوں سے ان کے جسم کو اذیت بھی دینے لگے۔ ایک شقی القلب نے نیزوں سے جگر چھید کر کہا: اب تو تم ضرور یہ پسند کرتے ہوگے کہ میری جگہ محمد (ﷺ)

ہوتے اور میں چھوٹ جاتا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نہایت جوش سے بول اٹھے: ”اللہ کی قسم! مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ میری جان بچ جائے اور اس کے عوض محمد (ﷺ) کے پائے مبارک میں کانٹا چبھے۔“

③ غزوہ احد میں رسول اللہ ﷺ سے بے پناہ محبت اور جانثاری کی کئی مثالیں سامنے آئیں، مسلم تیر اندازوں کے ایک دستے کی غلطی سے مسلمانوں کو وقتی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور کفار کی فوج پشت سے حملہ آور ہوئی تو ایک موقع ایسا بھی آیا کہ رسولِ رحمت ﷺ جو سارے عالم کے لیے رحمت بن کر تشریف لائے تھے، بے رحم دشمنانِ اسلام کے نرغے میں آگئے۔ اس وقت آپ ﷺ کے قریب چند جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے ہاتھوں اور اپنے سینوں سے ڈھال کا کام کیا۔ آپ ﷺ کی طرف آنے والے ہر تیر کو ہاتھ اور سینے سے روکتے رہے۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے ستر (۷۰) سے زیادہ تیر اپنے ہاتھ اور سینے سے روکے۔ ان شدید زخموں کے سبب ان کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے شل ہو گیا تھا۔ ایک موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے لیے ڈھال بنے ہوئے تھے، کہنے لگے: یا رسول اللہ (ﷺ)! میرے ماں باپ آپ (ﷺ) پر قربان، آپ (ﷺ) سر سے نہ اٹھائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کا کوئی تیر آپ (ﷺ) تک پہنچ جائے، میرا سینہ آپ (ﷺ) کے لیے حاضر ہے یعنی جب تک مجھ میں جان ہے، آپ ﷺ تک دشمن کا کوئی تیر نہیں پہنچ سکتا۔“

④ اسی غزوے میں رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ بھی پھیل گئی۔ یہ خبر جب مدینہ پہنچی تو ایک انصاری خاتون بے اختیار میدانِ احد کی طرف نکل پڑیں۔ اس غزوے میں اس عورت کا باپ، بھائی، بیٹا اور شوہر سب شہید ہوگئے تھے۔ وہ جب ان پر سے گزرتی تو لوگ یکے بعد دیگرے اسے خبر دیتے کہ یہ تمھارا باپ ہے، یہ بیٹا، یہ بھائی اور یہ تمھارا شوہر ہے، لیکن وہ ہر مرتبہ بے چینی سے پوچھتی کہ رسول اللہ ﷺ کس حال میں ہیں؟ وہ کہتے کہ آپ ﷺ آگے ہیں، وہ کہتی کہ مجھے دکھاؤ کہ میں اپنی آنکھوں سے، دیکھ لوں۔ جب چہرہ مبارک پر نظر پڑی تو بے اختیار کہنے لگی: یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، آپ ﷺ سلامت موجود ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رسول اللہ ﷺ سے بے پناہ محبت اور جانثاری کی بے نظیر مثالیں سیرت میں موجود ہیں جن سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ اہل ایمان سے جس محبت نبوی کا مطالبہ کیا گیا تھا، ان کے نزدیک ماں باپ، اولاد اور اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب رسول اللہ ﷺ ہوں۔ یقیناً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے ایسی ہی محبت کر کے دکھائی۔ ان کے ہاں صرف محبت اور عشق رسول ﷺ کے دعوے نہیں تھے، بلکہ عمل سے وہ اس کا ثبوت بھی فراہم کرتے تھے۔

بہر حال ہماری بات ہجرتِ رسول ﷺ کے متعلق ہو رہی تھی اور اس میں آپ ﷺ کے رفیق سفر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیار اور بے پناہ محبت کا یہ عالم تھا کہ دورانِ سفر حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کبھی آپ ﷺ کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے۔ کبھی دائیں تو کبھی بائیں، آپ ﷺ نے پوچھا: ابو بکر کیا بات ہے؟ تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! جب پیچھا کرنے والوں کا خیال آتا ہے تو پیچھے ہو جاتا ہوں اور جب یہ خدشہ سامنے آئے کہ راستے میں کوئی گھات لگا کر نہ بیٹھا ہو تو آگے ہو جاتا ہوں اور اسی طرح دائیں بائیں بھی چلتا ہوں کہ خدانخواستہ کوئی دشمن وار کرے تو مجھ پر ہو اور آپ ﷺ سلامت رہیں۔[1]

یہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ پیار اور محبت کی انتہا تھی کہ آپ ﷺ تک کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ مکے سے مدینے تک کا یہ سفر اس طرح پیار محبت اور جانثاری کے عالم میں جاری رہا اور بالآخر آپ ﷺ مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

وصولِ مدینہ:

نبی رحمت ﷺ اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سفرِ ہجرت سے پہلے تین دن غارِ ثور میں رکے رہے، جب قریشِ مکہ کا جوشِ تلاش کچھ ٹھنڈا ہوا تو حسبِ پروگرام راستوں کا ماہر گائیڈ عبداللہ بن اریقط دو سواریاں لایا، جن پر نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفیقِ سفر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سوار ہو کر مدینہ منورہ کو روانہ ہوگئے۔ قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ غارِ ثور سے مدینے کی جانب روانگی یکم ربیع الاول بروز پیر (۱۶ر ستمبر ۶۲۲ء) کو ہوئی۔[2]

---

[1] البدایة و النهایة (۳/ ۱۸۰)

[2] رحمة للعالمین (۱/ ۸۷)

مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے آپ ﷺ (۸/ ربیع الاول ۱۳/ نبوت بروز پیر ۲۳/ ستمبر ۶۲۲ء) قریبی بستی قبا پہنچے اور وہاں قیام فرمایا اور وہیں مسجد قبا کی بنیاد رکھی جو اسلام میں سب سے پہلی مسجد تعمیر ہوئی جس کے بارے میں قرآن پاک نے ﴿اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى﴾ کے الفاظ میں گواہی دی کہ یہ تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر ہوئی ہے اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

''جو آدمی گھر سے وضو کر کے اس مسجد میں جائے اور (دو رکعت) نماز ادا کرے، اسے عمرے کا ثواب ملتا ہے۔''

قیامِ قبا کے بعد آپ ﷺ بارہ ربیع الاول (یکم) ہجری بروز جمعہ سوار ہو کر بنی سالم کے گھروں تک پہنچے تو جمعہ کا وقت ہوگیا۔ آپ ﷺ نے وہیں سو آدمیوں کے ساتھ جمعہ پڑھا۔ یہ اسلام میں پہلا جمعہ تھا (اور وہ مسجد آج تک مسجدِ جمعہ کے نام سے معروف ہے) آپ ﷺ نمازِ جمعہ کے بعد اسی دن مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔[1]

وہاں پہنچ کر حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان میں ٹھہرے۔ پھر مسجدِ نبوی تعمیر کی، مسجد نبوی ﷺ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے والی اس جگہ میں تعمیر کروائی، جہاں آپ ﷺ کی اونٹنی بیٹھی تھی۔ مسجد سے لگا ہوا اپنا حجرہ تعمیر فرمایا اور یہ وہی حجرہ ہے، جس میں آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری دن گزارے اور وہی حجرہ آپ ﷺ کی آخری آرام گاہ بن گیا۔

آپ ﷺ کی عملی زندگی:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

رسول اللہ ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ عدل و انصاف فرماتے اور گھر والوں کے ساتھ اخلاقِ عالیہ سے پیش آتے اور جب بھی آپ ﷺ اپنے گھر میں تشریف لاتے تو اطلاع دے کر داخل ہوتے۔ جب اندر پہنچتے تو سلام کرتے۔ جب کسی کے یہاں تشریف لے جاتے تو سیدھے دروازے کے سامنے نہ آجاتے بلکہ دائیں یا بائیں پہلو سے آتے اور فرماتے: ''السلام علیکم''۔ آپ ﷺ کی سنت تھی کہ جب مجلس میں آتے تو سلام کرتے اور جب جاتے تو سلام کرتے۔ ہمیشہ زبان سے

[1] رحمة للعالمين (۱/ ۹۱ تا ۹۴)

جواب دیتے۔ ہاتھ یا انگلی کے اشارے یا سر کی حرکت سے کبھی جواب نہ دیتے، البتہ نماز کی حالت میں اشارے سے جواب دے دیتے تھے۔ جب آپ ﷺ کو چھینک آتی تو منہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھ لیتے جس سے یا تو آواز بالکل دب جاتی یا بہت کم ہوجاتی۔

آپ ﷺ کے سونے کے آداب:

آپ ﷺ کبھی بستر پر سوتے، کبھی چٹائی پر، کبھی چارپائی پر، کبھی زمین پر۔ بستر کے اندر کھجور کے ریشے بھرے ہوتے تھے۔ دائیں کروٹ پر لیٹتے۔ دایاں ہاتھ دائیں رخسار کے نیچے رکھتے۔ آپ ﷺ کی آنکھیں سوتی تھیں، مگر قلبِ مبارک ہمیشہ بیدار رہتا تھا۔ اس لیے جب آپ ﷺ سو جاتے تو کوئی نہ اٹھاتا، یہاں تک کہ آپ ﷺ خود اٹھ جاتے۔ جب بیدار ہوتے تو مسواک کرتے۔

آپ ﷺ ہمیشہ اچھے نام پسند فرماتے اور بُرے نام رکھنے سے روکتے تھے۔ اگر کوئی ناپسندیدہ نام ہوتا تو اسے تبدیل فرما دیا کرتے تھے۔

آپ ﷺ کا خطاب:

آپ ﷺ ہر خطبہ [تقریر] حمد وثنا سے شروع کرتے تھے۔ خطبہ کبھی طویل ہوتا تھا کبھی مختصر، خطبہ دیتے وقت کبھی عصا پر ٹیک لگاتے اور کبھی کمان پر۔

آپ ﷺ نہایت فصیح اور شیریں بیان تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر بولتے اور ایک ایک فقرہ اس طرح الگ الگ کرکے بولتے کہ مخاطب پوری طرح گفتگو یاد کرلیتا۔ اکثر جملے کو تین مرتبہ دہراتے، تاکہ خوب ذہن نشین ہوجائے۔ بلاضرورت کبھی نہ بولتے۔ اکثر خاموش رہتے۔ آپ ﷺ کے الفاظ جچے تلے ہوتے تھے۔ مطلب سے ایک لفظ بھی کم یا زیادہ نہ ہوتا تھا۔

آپ ﷺ کے ناپسندیدہ کام:

اگر کوئی بات ناگوار ہوتی تو چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ بدخلقی، سخت کلامی، فحش گوئی اور شور وغل سے آپ ﷺ بہت دور تھے۔

آپ ﷺ کی مسکراہٹ:

ہنسی بس یہاں تک تھی کہ لبوں پر مسکراہٹ ظاہر ہوجاتی۔ اگر بہت زیادہ ہنستے تو باچھیں کھل جاتیں اور ڈاڑھیں نظر آنے لگتیں۔

آپ کا رونا:

اسی طرح رونا بھی تھا۔ صرف آنکھوں سے آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ اگر بہت ہوا تو آنکھیں اشکبار ہوجاتیں اور گریہ کی آواز سینہ سے نکلتی معلوم ہوتی۔ رات کو صلوٰۃِ تہجد میں آپ ﷺ اکثر رویا کرتے تھے۔

آپ کا چلنا:

آپ ﷺ تیز رفتاری سے چلتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا گویا پہاڑی پر سے ڈھلوان کی طرف اتر رہے ہیں، آپ ﷺ جوتا پہن کر بھی چلتے اور برہنہ پاؤں بھی۔ آپ ﷺ کا دستور تھا کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم ساتھ ہوتے تو انھیں آگے کرتے اور خود پیچھے چلتے۔ کمزوروں کو سہارا دیتے۔ پیدل چلنے والوں کو اپنے ساتھ سوار کرلیتے۔ ان کے حق میں دعا فرماتے۔

ذکر وعبادت:

نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرتے تھے۔ کثرت سے تکبیر وتہلیل، تسبیح وتحمید اور حوقلہ (لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ) اور استغفار کے ساتھ ساتھ ہر موقع پر خصوصی ذکر کرتے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے۔

آپ ﷺ کی نمازیں:

صلات (نماز) کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا یہ حال تھا کہ کم ازکم چالیس رکعتیں ہر دن پڑھا کرتے تھے۔ ۱۷ رکعتیں فرائض، ۱۲ رکعتیں سنت موکدہ اور گیارہ رکعتیں تہجد آپ ﷺ کا روزانہ کا معمول تھا۔ ان کے علاوہ بھی دیگر نوافل صلاۃ الضحیٰ وغیرہ پڑھا کرتے تھے، لیکن ان کی پابندی نہیں کرتے تھے۔

آپ ﷺ کا صدقہ کرنا:

صدقہ وخیرات کے متعلق نبی رحمت ﷺ کی سنتِ طیبہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے پاس جو کچھ ہوتا صدقہ کر دیتے۔ جو بھی آپ سے سوال کرتا اسے عطا فرما دیتے۔ لینے والے کو حاصل کرنے میں جتنی خوشی ہوتی اس سے زیادہ خوشی آپ ﷺ کو دینے میں ہوتی تھی۔

آپ ﷺ کے روزے:

صوم (روزہ) سے متعلق آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی مہینا صوم رکھے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ خاص طور پر سوموار اور جمعرات اور چاند کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ کا صوم رکھا کرتے۔

لباس اور اکل وشرب:

جسم مبارک پر قمیص ہوتی جو نہایت پسند خاطر تھی۔ اس کی آستینیں صرف ہاتھ کے گٹوں تک ہوتی تھیں۔ آپ ﷺ سر پر عمامہ پہنتے تھے اور عمامہ کا شملہ شانوں کے درمیان پشت پر رہتا تھا۔ آپ ﷺ نے سرخ دھاری دار جوڑا بھی پہنا ہے، سبز اور سیاہ رنگ کا کپڑا بھی، سفید رنگ کا کپڑا آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھا۔ ویسے جس قسم کا کپڑا میسر آجاتا پہن لیتے۔ کسی خاص صنف پر اصرار نہ تھا۔ آپ ﷺ اچھے سے اچھا کپڑا بھی استعمال کرتے اور معمولی سے معمولی بھی، حتیٰ کہ پیوند تک لگا لیتے۔ آپ جوتے اور موزے بھی پہنتے تھے۔ آپ نے چاندی کی انگوٹھی بھی پہنی ہے، جس پر ''محمد رسول اللہ'' نقش تھا۔

آپ ﷺ کا کھانا پینا:

اکل وشرب میں آپ ﷺ کی سنت یہ تھی کہ جو کھانا موجود ہوتا اسی پر اکتفا کرتے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کھانے کی مذمت نہیں کی، جو مرغوب ہوا وہ کھا لیا، ورنہ خاموشی کے ساتھ چھوڑ دیا۔ بارہا ایسا ہوا کہ گھر میں بالکل کھانا نہ رہا۔ بسا اوقات بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر تک باندھ لیے اور تین تین دن تک غذا کے بغیر بھوکے رہے ہیں۔

پانی ہمیشہ بیٹھ کر پیتے لیکن کبھی کبھار کھڑے ہو کر پینا بھی ثابت ہے۔ جب پانی پیتے تو پیالہ منہ سے ہٹا کر تین مرتبہ سانس لیتے۔ بسم اللہ سے شروع کرتے اور الحمدللہ پر ختم کرتے۔ کھانے میں بھی یہی دستور تھا۔

آپ ﷺ کا قضائے حاجت کا طریقہ:

قضائے حاجت میں آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ اگر سخت زمین پر پیشاب کرنا ہوتا تو چھینٹے اڑنے کے خوف سے کسی لکڑی سے کرید کر زمین نرم کر لیتے۔ آپ ﷺ بیٹھ کر پیشاب کیا کرتے تھے۔ استنجا ہمیشہ بائیں ہاتھ کرتے۔

مکارمِ اخلاق:

بردباری، قوتِ برداشت، قدرت پاکر درگزر کرنا اور مشکلات پر صبر ایسے اوصاف تھے، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی تربیت کی تھی۔ آپ ﷺ نے کبھی اپنے نفس کے لیے انتقام نہ لیا، البتہ اگر اللہ کی حرمت پامال کی جاتی تو اللہ کے لیے انتقام لیتے۔

آپ ﷺ سب سے زیادہ سخی اور فیاض تھے۔ شجاعت، بہادری اور دلیری میں بھی آپ ﷺ کا مقام سب سے بلند اور معروف تھا۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ حیا دار و پست نگاہ تھے۔ سب سے زیادہ عادل، پاک دامن، راست باز اور امانت دار تھے۔ اس کا اعتراف آپ ﷺ کے دوست اور دشمن سب کرتے ہیں۔

آپ ﷺ سب سے بڑھ کر عہد کی پابندی اور صلہ رحمی فرماتے۔ لوگوں کے ساتھ سب سے زیادہ شفقت اور رحم و مروت سے پیش آتے تھے۔ آپ ﷺ کے چہرے پر ہمیشہ بشاشت رہتی۔ کسی کی مذمت کرتے، عار دِلاتے اور نہ عیب جوئی کرتے تھے۔ جو شخص نامناسب بات بولتا اس سے رخ پھیر لیتے۔ حاصل یہ کہ آپ ﷺ بے نظیر صفاتِ کمال سے آراستہ تھے اور انھیں خوبیوں کی بدولت لوگ آپ ﷺ کی طرف کھنچے چلے آتے اور دلوں میں آپ ﷺ کی محبت بیٹھ جاتی۔

گزر بسر:

پیارے نبی ﷺ نے مکے کی زندگی میں حصولِ معاش کے لیے تجارت و مزدوری کی۔ آپ ﷺ مالِ تجارت لے کر شام، یمن، حبشہ اور بحرین وغیرہ جاتے تھے۔ مزدوری کے سلسلے میں فرمایا:

”میں مکے والوں کی بکریاں چند قیراط پر چرایا کرتا تھا۔“[1]

مدینے کی زندگی میں مالِ غنیمت کا ایک مخصوص حصہ آپ ﷺ کے لیے ہوتا تھا۔ اسی طرح آپ ﷺ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو خیبر کی بٹائی زمین سے سو وَسق غلہ خرچ کے لیے عنایت فرماتے تھے۔[2]

اس حدیث سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیارے نبی اکرم ﷺ کے لیے کتنا غلہ پیدا ہوتا تھا اور آپ ﷺ کتنے بڑے امیر تھے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کی شانِ بے نیازی کا عالم یہ تھا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٥٠)

[2] سنن البيهقي (٦/ ١١٦)

کہ کئی کئی دنوں تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ صرف پانی اور کھجور پر گزارہ ہوتا تھا۔ سچ ہے ع

سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

سیرتِ طیبہ کے مذکورہ بالاحقائق سے دو باتیں روزِ روشن کی طرح واضح ہیں:

اولاً: رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ واقعی بلا امتیاز ہر ایک کے لیے سر تاپا رحمت تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴾ [الأنبياء: ۱۰۷]

''ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

آپ ﷺ یقیناً ویسے ہی تھے۔

ثانیاً: یہ پروپیگنڈا بالکل باطل اور غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام صرف اور صرف اپنی اعلیٰ و ارفع تعلیمات اور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کے باعث پھیلا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے دس بیس نہیں سیکڑوں ایسی مثالیں مل جائیں گی کہ آپ ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں کو بڑی فراخ دلی سے معاف فرمایا۔ لیکن آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں ہی نہیں بلکہ ساری کی ساری ۶۳ سالہ زندگی میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملے گی کہ آپ ﷺ نے کسی پر ظلم یا زیادتی کی ہو، کسی کو ناحق قتل کیا ہو یا کروایا ہو، کسی کو گالی دی ہو یا لعن طعن کیا ہو، حتیٰ کہ کسی کو نازیبا یا ناشائستہ کلمہ کہا ہو، کسی سے بدتمیزی کی ہو، یا کسی سے استہزا کیا ہو۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ساری دنیا کے سامنے موجود ہے، ہمارے نبی ﷺ نے لوگوں کو دینِ اسلام کی دعوت دی اور یہ وہ دینِ اسلام ہے، جس سے زیادہ کوئی مذہب رواداری، حسنِ سلوک اور صلح و سالمیت کا داعی نہیں، مگر صلح اپنے انسانی حقوق میں ہوتی ہے۔ اللہ کے قانون اور دین کے اصولوں میں کسی صلح اور مصالحت کی کوئی گنجایش نہیں۔ اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے، ہر قسم کی عزت و سرفرازی صرف اور صرف اسلام میں ہے، جو بھی اسلام کو چھوڑ کر کسی اور مذہب میں عزت تلاش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا آخری لشکر:

رومیوں کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے ہاں اگر کوئی شخص مسلمان ہو جاتا تو اس کی جان پر بن جاتی اور وہ اس پر بہت ظلم کرتے اور اُسے بہت ستاتے۔ ان کے اس فخر اور غرور کو توڑنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ۱۱ھ میں ایک بڑے لشکر کی تیاری کا حکم فرمایا۔

آپ ﷺ کا ارادہ یہ تھا کہ اس لشکر کے ذریعے سے روم کی سرزمین کو روند کر رومیوں کو خوف زدہ کر دیا جائے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان حدود میں رہنے والے عرب قبائل کا اعتماد بحال کیا جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے سات سو فوجیوں کا ایک لشکر تیار کر دیا۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو اس کا سالار مقرر فرمایا۔ یہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے فرزند تھے۔ آپ ﷺ نے ۲۸ صفر ۱۱ھ کو اس لشکر کے ساتھ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ روانہ کرتے وقت آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے جھنڈا درست فرمایا اور اسے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے ہاتھ میں دیا۔

اس لشکر میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم شامل تھے، لیکن فوج کی قیادت آپ ﷺ نے ایک نوجوان صحابی حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سونپی تھی۔ جلیل القدر صحابہ میں سے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما مدینہ منورہ میں ٹھہر گئے تھے، کیونکہ آپ ﷺ بیمار تھے اور انھیں تیمارداری کی خاطر رکنا پڑا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے اجازت لے کر آپ ﷺ کی عیادت کے لیے آجاتے اور پھر واپس لشکر میں چلے جاتے۔

۲۹/ صفر ۱۱ھ کو رسول اکرم ﷺ کے مرض الموت کی ابتدا ہوئی۔ آپ ﷺ کے مرض کے دوران میں ہی یہ سریہ روانہ ہوا، لیکن مقامِ صرف [مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک مقام] تک پہنچتے پہنچتے آپ ﷺ کا مرض شدت اختیار کر گیا، لہٰذا وہیں سے لشکر کو واپس آنا پڑا۔

آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری دن:

۱۲/ ربیع الاول، پیر کے دن، صبح فجر کے وقت نبی کریم ﷺ نے حجرہ مبارکہ کا پردہ ہٹا کر مسجد کی طرف دیکھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فجر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ نمازِ باجماعت کا ایمان افروز منظر دیکھ کر آپ ﷺ کے رُخِ انور پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مسلسل بیماری کی وجہ سے کمزوری بہت زیادہ ہوگئی

تھی، چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سہارا لے کر لیٹ گئے۔ آپ ﷺ کی علالت سر درد سے شروع ہوئی۔ پھر اس قدر تیز بخار چڑھا کہ کپڑے کے اوپر سے ہاتھ نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہ مرض تیرہ یا چودہ دن مسلسل رہا اور بالآخر یہی بیماری ''مرض الموت'' ثابت ہوئی۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ پہلے جب کبھی آپ ﷺ بیمار ہوتے تو یہ دعا پڑھا کرتے اور اپنے ہاتھوں کو جسمِ اطہر پر پھیر لیا کرتے:

«اَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ، لَا شِفَآءَ اِلَّاشِفَاءُ كَ شِفَآءً لَا يُغَادِرُ سَقَماً»

''اے نسلِ انسان کے پالنے والے! خطر کو دور فرما دے اور صحت عطا کر۔ شفا دینے والا صرف تُو ہی ہے اور صرف اسی شفا کا نام شفا ہے جو تو عنایت کرتا ہے۔ ایسی صحت عطا فرما کہ کوئی تکلیف باقی نہ چھوڑے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: آپ ﷺ کے مرض الموت کے دنوں میں مَیں نے یہ دعا پڑھی اور نبی اکرم ﷺ کے مبارک ہاتھوں پر دم کرکے چاہا کہ وہ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر پر پھیر دوں مگر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے اور فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَالْحِقْنِيْ بِالرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى» [1]

''اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھے رفیقِ اعلیٰ کے ساتھ ملا دے۔''

آپ ﷺ کی اس شدید تکلیف سے بے چین ہو کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

''ہائے! میرے والد کو کتنی تکلیف ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''بیٹی آج کے بعد تمھارے باپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''جب آپ ﷺ کی تکلیف بہت بڑھ گئی تو آپ ﷺ باقی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے اجازت لے کر میرے گھر میں منتقل ہو گئے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤٤)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ مرضِ وفات میں فرمایا کرتے تھے:

''عائشہ! میں اس کھانے کی تکلیف مسلسل محسوس کر رہا ہوں جو میں نے خیبر میں کھایا تھا، لیکن اب تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کھانے کے زہر سے میری شہ رگ کٹ رہی ہے۔''[1]

جس زہر کی نبی اکرم ﷺ تکلیف محسوس کر رہے تھے، وہ زہر یہودیوں نے آپ ﷺ کو کیوں دیا؟ اُن کی آپ کے ساتھ کیا عداوت تھی اور انھوں نے آپ ﷺ کو زہر آلود گوشت کیوں کھلایا؟ اس کی اصل وجہ جاننے کے لیے کچھ وضاحت ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر آپ یہ نہیں جان سکتے کہ یہودی، نبی اکرم ﷺ اور اسلام کے دشمن کیسے بنے؟

دراصل یمن کا نیا بادشاہ ''ذونواس'' یہودی تھا۔ اس نے اپنے ملک کا حکمران بنتے ہی یہ اعلان کروا دیا تھا کہ یہاں کوئی عیسائی بن کر نہیں رہ سکتا، اگر یمن میں کسی کو رہنا ہے تو یہودی بن کر رہنا ہو گا، ورنہ موت قبول کرنا ہوگی۔ جو لوگ سچے دل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے، انھوں نے موت کو تو گلے لگا لیا لیکن اپنا مذہب تبدیل نہ کیا۔ یوں ذونواس نے بیس ہزار سے زیادہ عیسائیوں کو آگ کے گڑھوں میں ڈال کر ہلاک کر ڈالا، مگر دوس خوش قسمت رہا، وہ اپنے بیوی بچوں سمیت بھاگنے میں کامیاب ہو گیا اور روم پہنچ گیا۔

روم پہنچتے ہی دوس نے بادشاہ کے پاس پہنچ کر ساری داستان کہہ سنائی۔ بادشاہ نے اپنے ماتحت حکمران کو حکم دیا کہ وہ ذونواس پر حملہ کر دے۔ اس وقت حبشہ میں ایک انتہائی ظالم حکمران کی حکومت تھی۔ اس کا نام ابرہہ تھا۔ ابرہہ نے ستر ہزار کا لشکر لے کو ذونواس پر حملہ کر کے اس کے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

سیکڑوں بلکہ ہزاروں یہودیوں کو قتل کر کے یمن پر قبضہ کرلیا۔ یہودیوں کی اچھی خاصی تعداد یمن سے جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ ان لوگوں نے عرب کے شمالی علاقے کا رخ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودیوں نے اپنی مذہبی کتاب تورات میں پڑھ رکھا تھا کہ اللہ کا آخری نبی فاران کی چوٹیوں سے ظاہر ہوگا۔ تورات میں اس علاقے کی نشانی یہ بتائی گئی تھی کہ وہاں کھجوروں کے درخت ہوں گے اور خوب زرخیزی ہوگی، یوں انھوں نے یثرب، قریظہ، تیما، وادِی القریٰ، فدک

[1] صحیح البخاري، باب مرض النبي ﷺ، رقم الحدیث (٤٤٢٨)

اور خیبر کے علاقوں میں رہائش اختیار کرلی، یہ سارے علاقے مل کر وادیِ فاران کہلاتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اللہ کا آخری نبی یہاں آئے گا اور وہ اس کی حمایت سے اپنے دشمنوں کو شکست دیں گے اور ایک بار پھر اپنے اپنے علاقے پر قبضہ کرلیں گے۔ انھیں یہ بھی یقین تھا کہ یہ آخری نبی انھی میں سے پیدا ہوگا، کیونکہ جتنے نبیوں کو وہ جانتے تھے، سارے بنی اسرائیل یعنی یہودیوں ہی سے آئے تھے۔ یہودیوں نے یہاں آکر خوب محنت کی، فصلیں کاشت کیں، کھجوروں اور انگوروں کے باغات لگائے۔

جلد ہی وہ یہاں کے امیر لوگ بن گئے۔ انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے بڑے بڑے قلعے اور حویلیاں تعمیر کیں۔ اس لیے یہ بات ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہود عرب کے اصل باشندے نہیں، بلکہ دوسرے علاقوں سے بھاگ کر آئے ہوئے تھے۔

ان کے اردگرد یثرب کے علاقے میں دو بڑے قبیلے تھے: ''اَوْس'' اور ''خَزْرَج'' انھوں نے دیکھا کہ ان قبیلوں کے آپس کے تعلقات اچھے نہیں، لڑائی کرنے کرانے اور پھوٹ ڈالنے میں تو وہ پہلے ہی سے ماہر تھے، انھوں نے ان دونوں قبیلوں کو بھی آپس میں خوب لڑایا۔ لڑائی کے لیے اوس اور خزرج کے لوگوں کو تلواریں اور دوسرا اسلحہ خریدنے کے لیے جو رقم درکار ہوتی، وہ انھیں مہیا کرتے اور اس پر بہت سارا سود یعنی ناجائز منافع بھی لیتے۔ یوں اوس اور خزرج کے اکثر لوگ ان کے مقروض رہتے تھے۔ یہودی قرض دیتے وقت تو بڑے اخلاق سے پیش آتے مگر جب قرض کی مدت ختم ہوتی تو بڑے بے لحاظ اور ظالم بن جاتے۔ وہ ان کے باغات کے پھلوں پر قبضہ کرلیتے، ان کی زمینیں ضبط کرلیتے، اگر کوئی ان سے لڑتا تو وہ دھمکی دیتے کہ جلد ہی ہمارے خاندان میں ایک نبی پیدا ہونے والا ہے، جب وہ آئے گا تو وہ اس کے ساتھ مل کر اپنے دشمنوں کو ختم کر ڈالیں گے۔

انھی حالات میں یہود کو اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ میں بنی اسماعیل کے ایک شخص نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے، مگر انھوں نے اس خبر کو کوئی اہمیت نہ دی بلکہ ان کے اندر حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ سوچنے لگے کہ آخری نبی تو بنی اسرائیل یعنی یہود کے ہاں پیدا ہونا چاہیے، یہ ہمارے مخالفوں کے درمیان کیسے پیدا ہوگیا؟

بنی اسماعیل کو وہ اپنا مخالف کیوں سمجھتے تھے؟ اس کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام تھے۔ تمام یہودی حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد اور ان کی قوم کے لوگ تھے۔ خاندانی طور پر وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی قوم کو جاہل سمجھتے اور ان سے نفرت کرتے، وہ سمجھتے کہ اللہ بھی بنی اسماعیل سے ناراض ہے، اسی لیے ان کے ہاں کوئی نبی پیدا نہیں ہوا۔ اب جب انھیں بنی اسماعیل کے ہاں ایک نبی کے ظاہر ہونے کی خبر ملی تو وہ حیران بھی ہوئے اور حسد کا شکار بھی!

کچھ ہی مدت بعد انھیں یثرب میں یہ خبر سننے کو ملی کہ اوس اور خزرج کے کئی قبیلے اس نبی پر ایمان لے آئے ہیں اور جلد ہی وہ یثرب بھی تشریف لانے والے ہیں۔ اس خبر سے پہلی مرتبہ ان کے کان کھڑے ہوئے۔

وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ اب کیا کریں؟ ابھی وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ پورے یثرب میں یہ خبر پھیل گئی کہ مکے میں قریش کی جس ہستی نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، وہ تشریف لے آئے ہیں۔

یہود کے لیے یہ بڑی پریشانی کا دن تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اوس اور خزرج کے بڑے بوڑھے، مرد، عورتیں، بچے؛ سبھی اس نبی کی آمد پر بہت خوش ہیں اور شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ ان کے لیے اس میں پریشانی کی بات یہ تھی کہ اوس اور خزرج کو تو انھوں نے ہمیشہ سے آپس میں لڑائے رکھا تھا، اب وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ ایک مذہب کے ماننے والے بن کر دونوں میں اتحاد ہو جانا تھا۔

یہودیوں کے لیے دوسری پریشانی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ سے یہ شور مچاتے آ رہے تھے کہ آنے والا نبی ان کے خاندان میں سے ہوگا۔ وہ بنی اسماعیل علیہ السلام اور دوسرے عربوں کو جاہل، گنوار اور دیہاتی کہتے تھے۔ انھیں طعنے دیتے اور مذاق اڑاتے کہ تمھارے اندر سے کبھی کوئی نبی پیدا نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ اب اس خبر نے تو ان کے تن بدن میں آگ لگا دی اور پھر وہ دن آن پہنچا، جس دن یثرب کی قسمت جاگ اٹھی۔ اس کا نام بدل کر ''مَدِيْنَةُ النَّبِي ﷺ'' یعنی نبی اکرم ﷺ کا شہر قرار پایا۔ اللہ کے آخری اور سچے نبی حضرت محمد ﷺ یثرب سے چند میل کے فاصلے پر ایک بستی قبا میں عارضی طور پر ٹھہر گئے۔[1]

[1] رحمة للعالمين (۱/ ۱۰۲) سید سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ)

آپ کے قیام کی خبر سن کر ایک یہودی سردار ''حییّ بن اَخطب'' اپنے بھائی کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ سے ملنے گیا، انھوں نے آپ ﷺ سے خوب سوال جواب کیے۔ جب وہ گھر آئے تو ''حیی بن اَخطب'' کی بیٹی ''صفیہ'' نے محسوس کیا کہ آج اس کے والد اور چچا بڑے تھکے تھکے اور بوجھل طبیعت کے ساتھ گھر آئے ہیں۔ حیی بن اَخطب کی بیٹی باپ کو اس حالت میں دیکھ کر سخت پریشان ہوئی۔ وہ اس کی طبیعت معلوم کرنے اس کے پاس گئی۔ قریب پہنچی تو دیکھا کہ دونوں بھائی آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

اس کے چچا ابو یاسر بولے: ''کیا یہ وہی ہیں، جن کا ہم مدت سے انتظار کر رہے تھے اور اگر وہی ہیں تو پھر کیا رائے ہے آپ کی؟'' ابو یاسر نے پوچھا: حیی بن اخطب نے نفرت بھری آواز میں کہا:

''نفرت، دشمنی ...زندگی بھر!''[1]

واقعی دونوں بھائی ساری زندگی اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ (حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کر لیا اور ان کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے ہوا اور آج پوری مسلمان امت انھیں ام المومنین کا درجہ دیتی ہے)۔

یہودی دیکھ رہے تھے کہ یثرب کی بستی میں لوگ تیزی سے اسلام قبول کر رہے ہیں اور اس موقع پر اگر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی کھلم کھلا مخالفت کی تو اوس اور خزرج ان کے دشمن ہو جائیں گے۔ یوں حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے آپ ﷺ کو مدینے کا سردار تو مان لیا لیکن آپ ﷺ پر ایمان نہ لائے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ ﷺ کو پہچاننے کے بعد سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لاتے اور آپ ﷺ کے سچے نبی ہونے کی تصدیق کرتے، کیونکہ ان کی کتاب تورات کی پیشین گوئی کے مطابق اللہ کے نبی فاران ہی کے علاقے میں سے ظاہر ہوئے تھے لیکن ان ضدی اور جھگڑالو لوگوں کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ کسی دوسرے خاندان میں پیدا ہوں۔ اپنی اسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ایمان لانا تو دور کی بات، الٹا وہ آپ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف درپردہ سازشوں میں مصرف ہوگئے۔ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور آپ ﷺ کو بدنام کرنے کا کوئی

---

[1] سيرة النبي ﷺ لابن هشام (١/ ٥١٨، ٥١٩)

موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

ادھر اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیشہ ان سے درگزر سے کام لیا اور ان کے دلوں پر برابر دستک دیتے رہے کہ ہوسکتا ہے، وہ ایمان لے آئیں، لیکن یہ اللہ کا قانون ہے کہ جو جانتے بوجھتے، بات سمجھ میں آجانے کے باوجود حق کا انکار کرے، اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے...یعنی پھر اس میں سچی بات ماننے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ وہ اس معاملے میں بالکل اندھا ہو جاتا ہے اور یہود بھی رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے، جاننے اور پرکھنے کے بعد آپ ﷺ کا انکار کر چکے تھے۔ اس لیے وہ بھی آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے ہو چکے تھے، سنتے کان رکھنے کے باوجود بہرے ہو چکے تھے۔ ان کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے دشمنی کی انتہا اس وقت ہوئی، جب انھوں نے آپ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔

ہوا یوں کہ یہود کے قبیلے بنونضیر کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ ﷺ ایک اہم معاملے میں بات چیت کرنے ان کے ہاں تشریف لا رہے ہیں۔ تب انھوں نے ایسا منصوبہ بنایا جس سے ان کے خیال میں نَعُوذُ بِاللّٰہِ آپ ﷺ کا کام بھی تمام ہو جاتا اور ان پر الزام بھی نہ آتا۔ چنانچہ جب آپ ﷺ اپنے تین صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ان کی مجلس میں تشریف لے آئے تو آپ ﷺ کو ایک مکان کی دیوار کے ساتھ بٹھایا گیا۔

دوسری طرف طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک یہودی عمرو بن حجاش چکی کا بھاری پتھر لے کر چھت پر چڑھ گیا۔ اس نے دیوار کے اوپر سے پتھر کو لڑھکانا تھا، تاکہ آپ ﷺ اس پتھر سے کچل دیے جائیں، لیکن اللہ اپنے رسولوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ اس کے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے اور کوئی ان پر غالب نہیں آسکتا۔ چنانچہ ابھی ابن حجاش چھت پر پہنچا ہی تھا کہ وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو یہودیوں کی اس سازش کے بارے میں بتا دیا گیا۔ آپ ﷺ فوراً اپنی نشست سے اٹھ گئے اور مدینے کی طرف چل دیے۔

آپ ﷺ کا انداز ایسا تھا کہ جیسے آپ ﷺ کو کوئی اہم کام یاد آگیا ہو اور ابھی واپس آجائیں گے، اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم وہیں بیٹھ کر آپ ﷺ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے، لیکن جب آپ ﷺ خاصی دیر کے بعد بھی واپس نہ آئے تو سب پریشان ہوکر واپس آگئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب آپ ﷺ

سے یوں بتلائے بغیر واپس آنے کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے ساری حقیقت بیان فرما دی۔[1]

یہود بھی عجیب قوم تھی صرف تین صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں وہ خفیہ طریقے سے ایک سازش کے تحت آپ ﷺ کو شہید کرنا چاہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ اگر انھوں نے کھلم کھلا یہ کام کیا تو اوس اورخزرج کے مسلمان ان کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ اس لیے انھوں نے یہ سازش تیار کی تھی۔

اس سازش کی سزا کے طور پر یہودیوں کے اس قبیلے یعنی بنونضیر کو حکم دیا گیا کہ وہ دس دن کے اندر اندر اس علاقے سے چلے جائیں، ورنہ ان کو ختم کر دیا جائے گا۔[2]

یہ یہودی یہاں سے نکل کر خیبر کے علاقے میں چلے گئے۔ خیبر پہلے ہی یہودیوں کا گڑھ تھا۔ مزید یہودیوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی نفرتیں اور بڑھ گئیں اور وہ ایک مرتبہ پھر نئی سازشوں میں مصروف ہوگئے۔

حیی بن اَخطب اور دوسرے یہودیوں نے اب پورے عرب کو مسلمانوں کے خلاف اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے ایسی ترکیبیں لڑائیں کہ پورے عالم عرب کو اسلام کے خلاف متحد کر دیا اور ہر طرف سے فوجیں مدینے کی طرف بڑھنے لگیں۔ اس کے نتیجے میں غزوہ احزاب یعنی خندق کی جنگ لڑی گئی۔ غزوہ خندق صرف یہود کی سازشوں کی وجہ سے لڑی گئی۔[3]

عرب کی تاریخ میں اتنی فوج پہلے کبھی اکٹھی نہیں ہوئی تھی، چنانچہ مدینے کو بچانے کے لیے خندق کھودی گئی اور مسلمانوں نے اللہ کی مدد اور اپنی ایمانی قوت سے اس جنگ میں بھی فتح پائی اور سازشِ یہود ایک دفعہ پھر ناکام ہوگئی۔

رسول اللہ ﷺ اچھی طرح جانتے تھے کہ اب عرب میں اسلام کے اصل اور حقیقی دشمن صرف اور صرف یہود ہی ہیں۔ خندق کی جنگ نے پورے عرب کی اسلام دشمن طاقتوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منتشر کر دیا تھا۔ اب صرف یہود باقی تھے اور ان کا سازشی وجود کسی بھی وقت خندق کی جنگ جیسے حالات دوبارہ پیدا کرسکتا تھا۔ چنانچہ جب کفارِ مکہ سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہوگیا تو آپ ﷺ نے ان سازشیوں کو سبق سکھلانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک مدینے سے یہود مکمل طور پر نکالے جاچکے

---

[1] سيرة النبي ﷺ لابن هشام (٣/ ١٩٩) زاد المعاد لابن القيم (٣/ ١٢٧) سنن الطبري (٣/ ٢٦)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٧٤، ٥٧٥) زاد المعاد (٣/ ٧١، ١١٠)

[3] رحمة للعالمين، سيد سليمان منصور پوری (ص: ١٢٤) زاد المعاد (٣/ ٢٧٤)

تھے اور اب ان کا مرکز خیبر تھا۔

آپ ﷺ نے خیبر کو فتح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ جس رات اسلامی لشکر خیبر میں داخل ہو کر خیمہ زن ہوا، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''کل میں جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے اور جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ محبت کرتے ہیں۔'' رات بھر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم انتظار میں رہے کیونکہ وہ سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے سچی محبت کرتے تھے۔

صبح آپ ﷺ نے پوچھا کہ علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کہاں ہیں؟ بتایا گیا کہ ان کی آنکھ دکھ رہی ہے۔ آپ ﷺ نے انھیں بلا بھیجا، پھر ان کی آنکھ میں اپنے منہ کا لعاب ڈال کر دعا کی تو ان کی آنکھ بالکل ٹھیک ہوگئی۔ اللہ نے اپنے نبی کے ہاتھوں معجزہ کر دکھایا۔ اب مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی راہنمائی میں یہودیوں پر حملہ آور ہوئے۔

خیبر میں یہود کے آٹھ مضبوط قلعے تھے۔ ان میں سے پہلا قلعہ ناعم تھا۔ اس قلعے کا سردار ''مرحب'' تھا۔ وہ یہودیوں کا سب سے طاقتور پہلوان مانا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سو آدمیوں سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ مرحب بڑے غرور اور تکبر سے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکار رہا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت عامر رضی اللہ عنہ مقابلے پر آئے۔ مقابلہ شروع ہوا اور دونوں کی تلواریں آپس میں ٹکرانے لگیں۔ مرحب نے ایک بھرپور وار کیا تو حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے اپنی ڈھال پر اسے روکا۔ مرحب کی تلوار ڈھال کے اندر پھنس گئی۔ حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیچے سے وار کیا۔ انھوں نے اس کی ٹانگ کاٹنا چاہی تھی لیکن تلوار چھوٹی ہونے کے سبب ایسا نہ ہوسکا۔ ان کی تلوار پھسل کر ان کے اپنے گھٹنے پر لگی اور وہ زخمی ہوگئے۔

مرحب نے فتح کا نعرہ لگایا اور پھر للکارا۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ سامنے آئے۔ انھوں نے مقابلے کے آغاز ہی میں مرحب کے سر پر ایک بھرپور وار کیا۔ مرحب وہیں پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کے بعد مرحب کا بھائی یاسر میدان میں آیا۔ اس کے مقابلے میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آئے۔ انھوں نے یاسر کو جہنم رسید کیا۔

انفرادی مقابلوں کے بعد عام جنگ شروع ہوئی اور شدید مقابلے کے بعد یہودی دوبارہ قلعے میں جا چھپے۔ آخر کئی دن کی لڑائی کے بعد یہ ناعم قلعہ فتح ہوگیا۔[1]

---

[1] صحيح البخاري، باب غزوة خيبر (٢/ ٦٠٣) صحيح مسلم، باب غزوة خيبر (٢/ ١٢٢)

ناعم قلعے کے بعد یہود کے باقی قلعے بھی ایک ایک کرکے فتح ہوتے گئے۔ جب خیبر کا پورا علاقہ فتح ہوگیا تو نبی اکرم ﷺ نے ان سازشیوں کے ختم ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہودیوں نے بھی جب دیکھا کہ اب ہماری طاقت ختم ہوگئی ہے تو انھوں نے آپ ﷺ سے صلح کا اعلان کر دیا اور آپ کی اطاعت قبول کرلی۔[1]

آپ ﷺ نے مدینہ واپسی کا اعلان کیا، مگر واپسی سے ایک دن قبل زینب بنت حارث نام کی ایک یہودی عورت نے پیغام بھیجا کہ وہ آپ ﷺ کی دعوت کرنا چاہتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ دعوت قبول کرلی۔

زینب بنت حارث کوئی عام عورت نہ تھی۔ یہ مشہور سردار و پہلوان مرحب کی بہن تھی، جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ مرحب کے بعد اس کا دوسرا بھائی یاسر بھی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا۔ آپ ﷺ نے خیال کیا کہ اگر زینب نے دعوت دی ہے تو اسے قبول کرلینا چاہیے، تاکہ اس کے دل میں دشمنی کا زہر ختم ہو جائے، لیکن زینب نے یہ دعوت دشمنی کے زہر کو ختم کرنے کے لیے نہیں بلکہ آپ ﷺ کو اس زہر سے ہلاک کرنے کے لیے کی تھی۔

اس نے یہ معلوم کروا لیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو بکری کا بھنا ہوا گوشت پسند ہے، اسے اپنی نگرانی میں تیار کرایا، پھر جو حصہ آپ ﷺ کو پیش کیا جانا تھا، اس میں خوب زہر ملا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے گوشت کے اس حصے کا نوالہ منہ میں ڈالا تو فوراً تھوک دیا۔ دراصل نوالے نے اللہ کے حکم سے آپ ﷺ کو بتا دیا تھا کہ اس میں زہر ہے۔ آپ ﷺ کا ایک معجزہ یہ بھی ظاہر ہوا کہ بھنے ہوئے گوشت نے بول کر آپ ﷺ کو بتادیا کہ مجھے زہر لگایا گیا ہے۔

آپ ﷺ نے فوراً زینب کو طلب فرمایا اور اس گھناؤنی حرکت کی وجہ پوچھی؟ وہ بڑی ڈھٹائی سے بولی:

> ”میں نے گوشت میں زہر اس لیے ملایا تھا کہ اگر آپ ﷺ کوئی بادشاہ ہیں تو ہماری آپ ﷺ سے جان چھوٹ جائے گی اور اگر آپ ﷺ سچے نبی ہوئے تو آپ ﷺ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

آپ ﷺ نے اس کا عذر قبول کر لیا اور اسے معاف کر دیا، نبی اکرم ﷺ اپنی ذات کے

---

[1] زاد المعاد لابن القیم (۲/ ۱۳۶)

لیے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے، بلکہ عفو و درگزر کا معاملہ کرتے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہوا کہ زہر آلود گوشت کی ایک بوٹی کھانے سے حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے اور ان کے خاندان والے مقدمہ لے کر آپ ﷺ کے سامنے حاضر ہوگئے کہ انھیں انصاف دلایا جائے۔ زینب کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے قتل کی سازش میں معاف کر دیا، لیکن یہ دوسروں کا معاملہ تھا، جس میں آپ ﷺ کے پاس اسے معاف کرنے کا حق نہیں تھا۔

دوسری طرف حضرت بشر رضی اللہ عنہ کے خاندان والوں نے مطالبہ کر دیا کہ زینب کو انصاف کے مطابق سزا ملے، چنانچہ انصاف ہوا اور زینب کو قتل کر دیا گیا۔ یوں اس یہودی عورت نے اپنی سازش کو چھپانے کے لیے جو کہانی گھڑی تھی، اللہ نے اس کا پول کھول دیا۔ اس کی سازش نہ صرف ناکام ہوئی بلکہ اسے سزا بھی مل گئی۔[1]

نبی ﷺ کے اس معجزے کو دیکھتے ہوئے بھی یہودی ایمان نہ لائے بلکہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں اور زیادہ سرگرم ہوگئے۔ ان کی سازشیں اس وقت سے اب تک جاری ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو ان کی ہر سازش کو ناکام بنا دیا اور اسلام کو ساری دنیا میں پھیلا دیا، لیکن آج یہود کی سازشیں مسلمانوں کے خلاف کامیاب ہو رہی ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ایمان مضبوط ہیں اور نہ ہم اس طرح کے مسلمان ہیں، جس طرح کے ایمان صحابہ رضی اللہ عنہم کے تھے۔ جب تک ہمارے ایمانوں میں مضبوطی نہیں آئے گی تب تک ہم ان مکار دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنانے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے ایمانوں کی حفاظت فرمائے اور ہمیں سچے مسلمان بننے کی توفیق عطا فرمائے، تاکہ ہم اسلام کے دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنا سکے۔ آمین

وصیتیں اور وفاتِ مصطفیٰ ﷺ:

خیبر میں زہر آلود گوشت چبانے کے بعد آپ ﷺ تین سال تک زندہ رہے، حتیٰ کہ مرضِ وفات میں مبتلا ہوگئے۔[2]

---

[1] فتح الباري (٧/ ٤٩٧) السيرة لابن هشام (٣/ ٣٣٨، ٣٣٩) رحمة للعالمين (٢/ ٢٦٨، ٢٧٠)

[2] فتح الباري (٨/ ١٣١)

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر یہ فضلِ عظیم ہے کہ نبی کریم ﷺ اس وقت تک فوت نہیں ہوئے جب تک آپ ﷺ پر دین مکمل نہیں کر دیا گیا۔ بخاری شریف میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب حجۃ الوداع کے خطبہ سے فارغ ہوئے تو اسی جگہ سورۃ المائدۃ کی تیسری آیت نازل ہوئی:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے اور میں نے تمھارے لیے دینِ اسلام کو پسند فرمایا ہے۔''

آپ ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں بھی اشارہ فرما دیا تھا:

''اے لوگو! شاید میں اور تم آیندہ کبھی اس مقام پر اکٹھے نہ ہو سکیں۔''

رحلت سے چھ ماہ قبل سورت نصر نازل ہو چکی تھی، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝﴾

''جب اللہ تعالیٰ کی نصرت آ گئی اور (حق وصداقت کو) فتح نصیب ہو گئی اور آپ دیکھیں گے کہ لوگ فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ پھر آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ ساتھ تسبیح کریں اور اس سے مغفرت مانگیں۔ یقیناً وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

اس سورت کے نزول سے بھی آپ ﷺ سمجھ گئے تھے کہ اس میں کوچ کی طرف اشارہ ہے۔[1]

آغازِ صفر ۱۱ھ میں سرورِ کائنات ﷺ نے سفرِ آخرت کی تیاری شروع فرما دی۔ ایک دن میدانِ اُحد کو تشریف لے گئے اور شہداے اُحد کے لیے دعا کی اور واپس آ کر لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا:

''لوگو! میں تم سے آگے جانے والا ہوں اور تمھاری شہادت دینے والا ہوں۔ واللہ! میں اپنے حوض کو یہاں سے دیکھ رہا ہوں۔''[2]

---

[1] طبراني عن جابر، رحمة للعالمين (١/ ٢٤٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨١٦)

پھر ایک رات کی نیم شبی میں جنت البقیع تشریف لے گئے اور آسودگانِ بقیع کے لیے دعا فرمائی۔

علامہ زرقانی نے ''شرح المواہب'' میں نقل کیا ہے کہ ایک دن آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کرکے ارشاد فرمایا:

''مرحباً مسلمانو! اللہ تم کو اپنی رحمت میں رکھے، تمھاری شکستہ دلی کو دور فرمائے، تمھیں رزق دے اور تمھاری مدد فرمائے۔ تمھیں با امن و امان رکھے، میں تمھیں تقوے کی وصیت کرتا ہوں۔''

اس خطبے کے آخر میں فرمایا:

''سلام تم سب پر اور ان لوگوں پر جو بذریعہ اسلام میری بیعت میں داخل ہوں گے۔''[1]

آپ ﷺ اپنی امت کو ایسے روشن راستے پر چھوڑ کر گئے جس کی راتیں بھی دن کی طرح روشن ہیں۔ جو شخص اسے چھوڑے گا اپنی ہلاکت کو خود دعوت دے گا۔

آخری وصیتیں:

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی رحمت ﷺ نے ''رفیقِ اعلیٰ'' کی طرف انتقال سے قبل جو آخری چند نصیحتیں فرمائیں، انھی میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلصَّلٰوۃَ، اَلصَّلٰوۃَ، وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ»[2]

''نماز کا خاص خیال رکھنا، نماز کا خاص خیال رکھنا اور ان لوگوں (غلاموں کنیزوں) کا بھی خیال رکھنا جو تمھاری ملکیت میں ہیں۔''

نیز فرمایا:

''تم سے پہلی قوموں نے اپنے نبیوں اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا، مگر تم ایسا ہر گز نہ کرنا۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے بعد فرمایا:

''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، کیوں کہ انھوں نے انبیائے کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔''

---

[1] رحمة للعالمين (١/ ٢٤٤، ٢٤٥)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٦٣٧)

آگے فرمایا:

’’میرے بعد میری قبر کو ایسا نہ بنا دینا کہ اس کی پرستش ہوا کرے۔‘‘

آخر میں فرمایا:

’’اس قوم پر اللہ کا سخت غضب ہے، جس نے قبورِ انبیا (علیہم السلام) کو مساجد بنایا۔ دیکھو! میں تمھیں اس فعل سے منع کرتا رہا ہوں۔ دیکھو! میں تبلیغ کر چکا ہوں۔ یا الٰہی! تو اس بات پر گواہ رہنا۔ یا الٰہی! تو اس بات پر گواہ رہنا۔‘‘

نبی مکرم ﷺ نے اس وصیت کو کئی بار دہرایا اور اس کے بعد آپ ﷺ پر نزع کی حالت طاری ہوگئی۔ اس وقت سرورِ کائنات ﷺ کو سہارا دیتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے پسِ پشت اس طرح بیٹھی تھیں کہ آپ ﷺ کا سرِ اقدس ان کے سینے پر تھا۔ بخاری شریف میں ہے:

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ان آخری لمحات میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) آگئے، ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی، نبی اکرم ﷺ نے مسواک پر نظر ڈالی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں سمجھ گئی کہ آپ ﷺ مسواک کرنا چاہتے ہیں، میں نے پوچھا تو آپ ﷺ نے اثبات میں سرِ اقدس کو ہلایا۔ میں نے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے مسواک لے کر آپ ﷺ کو دی، مگر نقاہت کی وجہ سے آپ ﷺ سے وہ چبائی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا: اگر ارشاد ہو اور پسند فرمائیں تو میں نرم کر دوں؟ آپ ﷺ نے سر کے اشارے سے ہاں فرمایا، میں نے (اپنے دانتوں سے) مسواک چبائی اور نرم کر کے دی تو آپ نے اچھی طرح مسواک کی، اس وقت پانی کا پیالہ آپ ﷺ کے پاس رکھا تھا۔ آپ ﷺ پانی میں ہاتھ ڈبوتے اور اپنے چہرۂ انور پر پھیر لیتے۔ ان آخری لمحات میں آپ ﷺ کا چہرہ مبارک کبھی سرخ ہو جاتا اور کبھی زرد پڑ جاتا، آپ ﷺ زبانِ مبارک سے بار بار یہ فرماتے:

«لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، إِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ»[1]

’’اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے۔ بیشک یہ سکرات الموت (سب کے لیے) ہیں۔‘‘

نبی رحمت ﷺ کا آخری وقت قریب آگیا۔ جب مسواک فرما چکے تو آپ ﷺ نے اپنے

[1] صحيح البخاري، باب مرض النبي ﷺ (٢/ ٦٤٠)

دستِ مبارک کو اٹھا کر انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا:

«اَللّٰھُمَّ! فِي الرَّفِيْقِ الْأَعْلٰی»

''اے اللہ! رفیقِ اعلیٰ [آسمانی ساتھیوں] کے پاس آنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا: ''اوہو! اب آپ ﷺ ہمارے پاس رہنا پسند نہیں فرمائیں گے۔'' میں سمجھ گئی کہ یہ وہی وقت ہے، جس کے بارے میں آپ تندرستی کے زمانے میں ہمیں آگاہ فرمایا کرتے تھے۔[1]

اس کے بعد آپ ﷺ کی نگاہیں اوپر کو جم گئیں اور ہونٹ ہلنے لگے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کان لگا کر سنا تو آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے صادر ہونے والے آخری کلمات یہ تھے:

«مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ»

''(اے اللہ!) ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ۔ اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما۔''

آخر میں تین مرتبہ فرمایا:

«وَأَلْحِقْنِي بِالرَّفِيْقِ الْأَعْلَىٰ، اَللّٰهُمَّ! الرَّفِيْقَ الْأَعْلَىٰ»[2]

''اے اللہ! مجھے رفیقِ اعلیٰ کے ساتھ ملا دے۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی آپ رضی اللہ عنہا کا اٹھایا ہوا دستِ مبارک گر گیا اور جسمِ اطہر سے روحِ انور پرواز کر گئی۔ آہ! مکہ مکرمہ میں طلوع ہونے والا ماہِ عرب وعجم (٦٣) برس تک ساری دنیا کو نورِ توحید سے منور کرنے کے بعد سوموار کے روز مدینہ منورہ کی پاک زمین میں غروب ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء (آیت: ٣٤) میں سچ ہی فرمایا ہے:

﴿ وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴾

''(اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے (بھی) کسی فرد بشر کو دائمی زندگی نہیں عطا کی۔ اگر آپ فوت ہوگئے تو کیا دوسرے ہمیشہ رہیں گے؟''

---

[1] صحيح البخاري، باب مرض النبي ﷺ، رقم الحديث (٤٤٤٠)

[2] صحيح البخاري، باب مرض النبي ﷺ (٢/ ٦٤٠) باب آخر ما تكلم به النبي ﷺ (٢/ ٦٣٨، ٧٣٩)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے پورے یقین سے کہا ہے:

''نبی کریم ﷺ کی وفات شہادت تھی۔''[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو نبوت کے اعزاز و اکرام کے ساتھ ساتھ وفاتِ شہادت کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔[2]

آپ ﷺ اس شہادت کے ساتھ ہی اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس پہنچے۔آپ ﷺ کی وفات ۱۲/ ربیع الاول سن ۱۱ھ (مطابق ۶/ جون ۶۳۲ء) یوم دوشنبہ [سوموار] کو چاشت کے وقت ہوئی اور اس وقت آپ ﷺ کی عمرِ مبارک تریسٹھ سال تھی۔

آپ ﷺ کی وفات کے دل فگار و جگر پاش واقعہ کا اثر اہلِ بیتِ رسول ﷺ کے علاوہ عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی بڑا گہرا اثر پڑا، جو صرف اس ایک مثال ہی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

امام ابن ہشام (۴/ ۲۲۴) نقل کرتے ہیں کہ حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ (جیسے شیر دل اور صاحبِ جلال شخص) کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ نبی اکرم ﷺ فوت ہوگئے ہیں، بلکہ سراسیمگی کے عالم میں فرمانے لگے کہ آپ ﷺ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح چالیس دن کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس گئے ہیں۔ جیسے وہ تورات لینے کے لیے طورِ سینا پر گئے تھے۔آپ ﷺ واپس آجائیں گے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ فوت ہوگئے ہیں، ان کی گردنیں مار دیں گے۔

آپ ﷺ کی وفات کے صدمے کا اثر دیکھیں کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جیسا مدبر انسان ہوش کھو بیٹھا۔ بخاری شریف میں مذکور ہے کہ اتنے میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ گھر میں داخل ہوئے، آپ ﷺ کے چہرہ انور سے کپڑا ہٹایا، جبینِ اقدس کو بوسہ دیا، آنسو بہائے اور فرمایا:

''بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي، لَا يَجْمَعُ اللّٰهُ عَلَيْكَ مَوْتَتَيْنِ، اَمَّا الْمَوْتَةُ الَّتِي كُتِبَتْ عَلَيْكَ فَقَدْ مِتَّهَا''[3]

''میرے ماں، باپ آپ ﷺ پر فدا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر دو موتیں وارد نہیں کرے گا، یہی ایک موت تھی جو آپ ﷺ پر لکھی ہوئی تھی اور آگئی ہے۔''

[1] البداية والنهاية (٤/ ٢١١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥١٢، ٤٥١٣)

[3] صحيح البخاري عن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما، الفتح الرباني (٢١/ ٢٥٠)

نبی مکرم سرورِ عالم ﷺ کے جانکاہ حادثۂ وفات پر آپ ﷺ کی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے کہا:

”يَا أَبَتَاهِ اَجَابَ رَبّاً دَعَاه“ (پیارے باپ ﷺ نے دعوتِ حق کو قبول فرما لیا)

”يَا اَبَتَاهِ اِلَىٰ جَنَّةِ الْفِرْدَوْسَ مَاْوَاه“ (والدِ گرامی نے فردوسِ بریں میں نزول فرمالیا)

”يَا أَبَتَاهِ إِلَى الْجِبْرَيْلِ نَنْعَاهُ“ (ہم اپنے والدِ گرامی کی تعزیت حضرت جبریل علیہ السلام سے کریں گے)

آگے فرمایا:

یا الٰہی! روحِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو روحِ محمد ﷺ کے پاس پہنچا دے۔

یا الٰہی! مجھے دیدارِ رسول ﷺ سے مسرور کر دے۔ یہ بات انھوں نے کیوں کہی تھی؟ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو وفات سے پہلے یہ بشارت دی تھی کہ میرے خاندان والوں میں سے سب سے پہلے تم مجھے ملوگی۔

یا الٰہی! اس مصیبت کے ثواب سے تو مجھے بے نصیب نہ رکھ اور روزِ محشر مجھے شفاعتِ محمد ﷺ سے محروم نہ فرما۔

زوجہ رسول ﷺ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سرورِ کونین ﷺ کی وفات کے دلفگار موقع پر کہا:

صد افسوس! وہ نبی جس نے فقر کو غنا پر اور مسکینی کو تونگری پر ترجیح دی۔

صد افسوس! وہ نبی دین پرور، جو اُمت کی فکر میں کبھی پوری رات آرام سے نہ سویا۔ جس نے ہمیشہ استقامت و استقلال سے نفس کے ساتھ محاربہ و مقابلہ کیا۔ جس نے منہیات کو لمحہ بھر بھی نگاہِ التفات سے نہ دیکھا۔ یعنی منع کردہ چیزوں کو لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں دیکھا۔ جس نے برّ و احسان کے دروازے اربابِ فقر و احتیاج پر کبھی بند نہ کیے۔ یعنی فقیروں حاجت مندوں کے لیے مدد اور احسان کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتے تھے۔ جس کے ضمیرِ منیر کے دامن پر دشمنوں کی تکلیفوں اور ایذاؤں کا ذرہ بھر بھی غبار نہ بیٹھا۔ دشمنوں کے بارے میں کبھی دل میں شکوہ و شکایت نہ رکھی، ہر وقت اُن کے لیے ہدایت کی دعا کی۔

صد حیف! وہ کہ جس کے موتیوں جیسے دانت پتھر سے توڑے گئے۔ جس کے رخِ انور کو زخمی کیا گیا۔ آج وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔[1]

غسل اور تکفین و تدفین:

رسولِ رحمت ﷺ کی وفات کے صدمے کی وجہ سے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سراسیمگی حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی وفات کا یقین نہ آنے کا واقعہ جو ہم نے ذکر کیا ہے، اسی کے پیشِ نظر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باتیں سنیں، ان کی حالت دیکھی، تو فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ! بیٹھ جاؤ۔'' مگر وہ غم و کرب سے اس قدر مغلوب تھے کہ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے سامنے پا کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کی طرف لپک آئے۔ تب انھوں (صدیق رضی اللہ عنہ) نے وفاتِ مصطفیٰ ﷺ کے اعلان کا خطبہ ارشاد فرمایا، جو بخاری شریف میں یوں مذکور ہے کہ حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

''مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ''

''تم میں جو شخص حضرت محمد ﷺ کی عبادت کیا کرتا تھا (وہ سمجھ لے) وہ تو وفات پا گئے ہیں اور جو کوئی اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا، اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے، اسے ہرگز موت نہیں آئے گی۔''

اس کے بعد سورت آل عمران کی آیت (۱۴۴) تلاوت فرمائی:

﴿ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴾

''محمد بھی تو ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی کتنے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ فوت ہو جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو جو کوئی الٹا پھرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکر گزار بن کر رہیں

[1] مدارج النبوة بحواله رحمة للعالمين (١/ ٢٥١)

گے، انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔‘‘

بخاری شریف ہی میں حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’اللہ کی قسم! جب میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ آیت تلاوت کرتے سنا تو میری ٹانگوں میں سکت نہ رہی، میرے پاؤں میرا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوگئے اور مجھے یقین آ گیا کہ نبی اکرم ﷺ وفات پا گئے ہیں۔‘‘[1]

الغرض بارہ ربیع الاوّل کو خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا غم سے نڈھال ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اشکبار ہیں۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سراسیمہ و پریشان بلکہ سرگرداں ہیں۔ اہلِ بیت پر مصیبتوں کا پہاڑ آ گرا۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن بحرِ غم میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ صحابہ رسول ﷺ کا یہ عالم ہے کہ مدینے کی گلیوں میں کہرام مچا ہوا تھا، ایک وہ لوگ تھے، جن کی یہ حالت تھی! اور ایک آج کا عاشقِ رسول و فدائے مصطفیٰ ﷺ ہے کہ اسی بارہ ربیع الاوّل یا بارہ وفات کو جشن مناتا ہے!! خدارا کچھ تو عقل و فکر سے کام لیں ...!

یاد رہے کہ امتِ اسلامیہ میں سب سے پہلا اختلاف یہی رونما ہوا تھا کہ نبی اکرم ﷺ فوت ہوگئے ہیں یا زندہ ہیں اور قرآنِ پاک سے استدلال کرتے ہوئے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے واضح کر دیا تھا کہ آپ ﷺ فوت ہو گئے ہیں جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس طرح سب سے پہلے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جس مسئلہ پر اجماع و اتفاق ہوا وہ یہی تھا کہ نبی ﷺ وفات پا گئے ہیں۔ اس اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کے باوجود اگر کوئی شخص آج یہ کہے کہ نبی ﷺ نے وفات نہیں پائی بلکہ آپ ﷺ زندہ اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں تو ایسا شخص گویا قرآن کی آیات کا انکار کرتا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآن فہمی بلکہ ان کی عقل و دانش پر بدظنی کرنے کا ارتکاب کرتا ہے۔

الغرض پیر کے روز آپ ﷺ نے وفات پائی، مگر آپ ﷺ کی تجہیز و تکفین کا کام اگلے دن منگل کو شروع ہوا، اس تاخیر کی متعدد وجوہات تھیں۔ مثلاً:

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس ناگزیر واقعہ پر عدمِ یقین۔

☆ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا خطاب اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ سمیت تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس امرِ حق پر یقین۔

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٦٤٠، ٦٤١)

☆ غروب آفتاب سے پہلے تجہیز و تکفین کے لیے وقت کا ناکافی ہونا وغیرہ۔

لہٰذا منگل کے روز آپ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا۔ حضرت فضل بن عباس اور اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے پردہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غسل دیا اور آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی اس موقع پر موجود تھے، بلکہ بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے بھی پردہ کیا۔ غسل دینے کے بعد آپ ﷺ کو تین سفید سوتی کپڑے کی چادروں میں کفن دیا گیا۔ بخاری و مسلم شریف میں ہے کہ ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا۔[1]

غسل اور کفن سے فارغ ہوئے تو سوال پیدا ہوا کہ آپ ﷺ کو دفن کہاں کیا جائے؟ تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا ہے:

((لَنْ یُّقْبَرَ نَبِيٌّ اِلَّا حَیْثُ یَمُوْتُ))[2]

''کوئی نبی جہاں بھی فوت ہوا، اسے وہیں دفن کیا جاتا ہے۔''

لہٰذا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں آپ ﷺ کے بسترِ مرگ کے مقام پر ہی قبر کھودنا تجویز ہوا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے لحد والی قبر کھودی، جنازہ تیار ہوگیا، جو حجرے کے اندر ہی رکھا تھا۔ لہٰذا پہلے گھر والوں اور اہلِ خاندان اور پھر مہاجرین و انصار مردوں، عورتوں اور بچوں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ میں امام کوئی نہ تھا۔ حجرے کی تنگ دامانی کی وجہ سے دس دس شخص اندر جاتے اور نماز پڑھ کر نکل آتے۔ یہ سلسلہ لگاتار شب و روز جاری رہا۔ اس لیے تدفینِ مبارک منگل اور بدھ کی درمیانی رات کو یعنی رحلت سے تقریباً بتیس گھنٹے بعد عمل میں آئی۔[3]

سنن ابو داود میں ہے کہ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر کو حضرت علی، فضل بن عباس، اسامہ بن زید اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم نے قبرِ شریف میں اتارا تھا۔[4]

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ رَحْمَةٍ لِّلْعَالَمِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

---

[1] سيرت النبي ﷺ، سيد سليمان ندوي رحمہ اللہ (٢/ ١٨٥)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: الفتح الرباني مع بلوغ الأماني (٢١/ ٢٥٥، ٢٥٦)

[3] رحمة للعالمين (١/ ٢٥٣)

[4] تفصیلات کے لیے صحیح بخاری و صحیح مسلم، باب مرضی النبی اور وفات النبی وغیرہ دیکھیں۔

رسولِ رحمت ﷺ کی سیرت مبارکہ کا یہ ایک انتہائی مختصر سا خاکہ تھا جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے، ورنہ بقول شاعر ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

سورت آل عمران (آیت: ۵۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾

''اے ہمارے پالنے والے معبود! ہم تیری اتاری ہوئی وحی پر ایمان لائے اور ہم نے تیرے رسول ﷺ کی اتباع کی، پس تو ہمیں گواہوں میں لکھ لے۔''

نبی کریم ﷺ انبیا علیہم السلام کی معیت کی بہت خواہش رکھتے تھے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو یہ دُعا کرتے رہنا چاہیے کہ موت کے بعد اللہ تعالیٰ ہمیں جنتِ نعیم میں انبیاے کرام علیہم السلام کا پڑوس نصیب فرمائے۔ اے اللہ! اپنے رحم و کرم سے ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرما۔ اے اللہ! ہم بہت گناہگار ہیں۔ ہمارے گناہوں کو معاف فرما دے۔ آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ حافظ صلاح الدین یوسف
3. سیرت امام الانبیاء ﷺ۔ تالیف: شیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. پیغمبرِ رحمت ﷺ۔ تالیف: ڈاکٹر سعید بن علی بن وہف قحطانی
ترجمہ: شیخ الحدیث حافظ محمد امین صاحب
5. مختصر السيرة النبوية. تالیف: عبد الخالق خلیق
6. رہبر و راہنما۔ تالیف: مولانا محمد عبد الجبار
7. فضائلِ رحمت للعالمین۔ تالیف: محمد اقبال کیلانی
8. مکار دشمن؛ سلسلۂ معجزاتِ نبویہ۔ تالیف: نعیم احمد بلوچ

جشنِ میلاد

یومِ ولادت پر ہے... یا... یومِ وفات پر...؟

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ الانفال (آیت: ۴۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

''اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا کہا مانو اور آپس میں (ناحق اختلاف کے لیے) جھگڑا نہ کرو (اگر کرو گے) تو بودے بن جاؤ گے اور تمھاری ہوا جاتی رہے گی اور لڑائی کی تکلیفوں پر صبر کرو، کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

عید میلاد النبی ﷺ منانے یا نہ منانے کے مسئلے سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت کب ہوئی اور آپ ﷺ نے کس دن وفات پائی؟ تا کہ کہیں غلطی سے آپ ﷺ کی وفات پر خوشیاں منانے کا نادانستہ جُرم تو نہ کرتے رہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات تو تمام مورخین اور سیرت نگاروں میں متفق علیہ ہے کہ آپ ﷺ کی ولادتِ با سعادت کا دن پیر ہے اور اصحابِ تاریخ و سِیَر پر ہی بس نہیں، خود نبی اکرم ﷺ کی ایک صحیح حدیث مسلم شریف میں موجود ہے۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے پیر کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((ذٰلِكَ يَوْمٌ وُلِدْتُّ فِيهِ اَوْ اُنْزِلَ عَلَيَّ فِيْهِ))[1]

''یہ وہ دن ہے جس میں مَیں پیدا ہوا یا اسی دن یا مجھ پر وحی نازل کی گئی۔''

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٨١٤ـ ٨٥ عن أبي قتاده)

ایک متکلم فیہ سند والی روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"نبی اکرم ﷺ پیر کے دن پیدا ہوئے اور پیر کے دن نبوت کا اعلان کیا اور پیر کے دن ہی وفات پائی اور پیر کے دن ہی نبی اکرم ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کے لیے روانہ ہوئے اور پیر کے دن ہی مدینہ منورہ پہنچے اور پیر کے دن ہی حجرِ اسود کو اٹھایا۔"[1]

رہا معاملہ تاریخِ ولادت کا، تو اس کے بارے میں خود آپ ﷺ سے تو کوئی روایت نہیں ملتی۔ البتہ سیرت ابنِ اسحاق کی ایک روایت سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے، جس سال ہاتھی والے ابرہہ اور اس کے لشکر نے بیت اللہ شریف پر حملہ کیا اور غضبِ الٰہی کا شکار ہوئے تھے۔ وہ روایت یوں ہے:

《عَنْ قَيْسِ بْنِ مِخْرَمٍ... قَالَ: وُلِدْتُ أَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَامَ الْفِيْلِ فَنَحْنُ لِدَانُ وُلِدْنَا مَوْلِداً وَاحِداً》[2]

"حضرت قیس بن مخرم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی سال عام الفیل میں پیدا ہوئے۔"

امام سہیلی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

"ہاتھی ماہِ محرم میں مکہ آیا تھا اور آپ ﷺ اس واقعہ کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے تھے۔"

امام سہیلی رحمہ اللہ اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کے بقول جمہور اہلِ علم کا مسلک یہی ہے۔[3]

مفسرِ شہیر اور مورخِ کبیر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ "البداية و النهاية" میں لکھا ہے کہ جمہور اہلِ علم کا مسلک یہ ہے کہ آپ ﷺ ماہِ ربیع الاوّل میں پیدا ہوئے، لیکن یہ کہ آپ ﷺ اس ماہ کے اوّل، آخر، وسط یا کس تاریخ کو پیدا ہوئے؟ اس کے بارے میں مورخین اور سیرت نگاروں نے کثرت سے اقوال نقل کیے ہیں، کسی نے دو ربیع الاوّل کہا ہے، کسی نے آٹھ، کسی نے دس، کسی نے بارہ، کسی نے سترہ اور کسی نے اٹھارہ اور بعض نے بائیس ربیع الاوّل کہا ہے۔ ان سب میں راجح قول دو ہیں: ایک بارہ ربیع الاوّل کا اور دوسرا آٹھ ربیع الاوّل کا۔

---

[1] الفتح الرباني (٢٠/ ١٨٩)

[2] سيرة ابن إسحاق وسنده جيّد، كذا قاله البناء في الفتح الربّاني (٢٠/ ١٩٠)

[3] الفتح الربّاني للبناء (٢٠/ ١٩٠)

جبکہ ماضی قریب کے دو عظیم سیرت نگاروں میں سے علامہ قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی کتاب ''رحمت للعالمین'' میں اور علامہ شبلی نے ''سیرت النبی ﷺ'' میں ۹/ ربیع الاوّل بمطابق ۲۰/ اپریل ۵۷۱ء کو ازروئے تحقیقِ جدید صحیح ترین تاریخِ ولادت قرار دیا ہے۔[1]

اسی تاریخ کو محمد طلعت عرب نے تاریخ دول العرب میں صحیح قرار دیا ہے۔[2]

عام الفیل ماہِ ربیع الاوّل میں یوم الاثنین کی صحت کے پیشِ نظر اور فرزندِ رسول ﷺ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے یومِ وفات پر سورج گرہن لگنے کے حساب کو مدِنظر رکھا جائے تو آپ ﷺ کی ولادت کی صحیح تاریخ ۹/ ربیع الاوّل ہی آتی ہے، جبکہ شمسی عیسوی تقویم کے حساب سے آپ ﷺ کی ولادت کا وقت ۲۰/ اپریل ۵۷۱ء بروز پیر کی صبح بنتا ہے۔[3]

① صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ (آنحضرت ﷺ کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گرہن لگا تھا اور یہ ۱۰/ ہجری تھا اور اس وقت آپ ﷺ کی عمر کا تریسٹھواں (۶۳) سال تھا۔

② ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰/ ہجری کا گرہن ۷/ جنوری ۶۳۲ء کو آٹھ بج کر تیس منٹ پر لگا تھا۔

۞ اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری تریسٹھ برس پیچھے ہٹیں تو آپ ﷺ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے، جس میں ازروے قواعدِ ہیئت ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ جو ۱۲/ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

③ تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاوّل کا مہینہ اور دو شنبہ یعنی پیر کا دن تھا اور تاریخ آٹھ سے لے کر بارہ تک میں منحصر ہے۔

④ ربیع الاوّل مذکور کی ان تاریخوں میں دو شنبہ کا دن صرف نویں تاریخ کو پڑتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر تاریخِ ولادت قطعاً ۲۰/ اپریل ۵۷۱ء تھی اور ربیع الاوّل کی نو تاریخ۔ بارہ ربیع الاوّل کی روایت مشہور تو ہے مگر وہ حساب سے صحیح ثابت نہیں ہوتی۔[4]

---

[1] شبلي (١/ ١٧١) قاضي (١/ ٤٠)

[2] بحواله قاضي (١/ ٤٠، حاشيه و ٢/ ٣٦٧)

[3] حدائق الأنوار (١/ ٢٩ طبع قطر) عن التقويم العربي (ص: ٣٦ تا ٣٩)

[4] بحواله سيرة النبي ﷺ (١/ ١٧١، ١٧٢، طبع قرآن محل، كراچی)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی پیدائش ۱۲/ ربیع الاوّل کو نہیں، بلکہ صحیح تاریخ ۹/ ربیع الاوّل ہے۔ ہاں آپ ﷺ کی وفات ضرور ۱۲/ ربیع الاوّل کو ہوئی تھی، جیسا کہ معروف کتبِ تاریخ و سِیَر سے معلوم ہوتا ہے، جس کی مفصّل تحقیق کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف ہمیں اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ ہمارے بھائی لوگ جس تاریخ کو خوشیاں مناتے ہیں، وہ نبی کریم ﷺ کا یومِ پیدائش نہیں، بلکہ یومِ وفات ہے اور چند سال پہلے بلکہ آج تک بارہ وفات کے نام سے مشہور ہے۔ تو پھر وفاتِ سرورِ کائنات ﷺ پر خوشیاں...؟

ایں چہ بوالعجبی است؟

اللہ تعالیٰ اس پہلو پر توجہ دینے اور سوچنے کی توفیق بخشے۔ آمین

مروجہ عید میلاد النبی ﷺ کی شرعی حیثیت... کتاب و سنت کی روشنی میں:

پورے عالم کے مسلمانوں اور بالخصوص اسلامیانِ برصغیر کا ایک طبقہ اس بات کا عادی ہو چکا ہے کہ بارہ ربیع الاوّل کو عید میلاد النبی ﷺ کے نام سے جشن منائے اور جلوس نکالے، اَکل و شرب کی دعوتیں کرے، بھنگڑے ڈالے اور قوالیاں سُنے. جبکہ دوسرا طبقہ اس جشن کو شرعاً ناجائز قرار دیتا ہے۔

تنازعات کو ہوا نہ دو:

اس مختلف فیہ مسئلے اور ایسے ہی دیگر اختلافی مسائل کے سلسلے میں قرآنِ پاک نے ہمیں کئی بہترین اصول دیے ہیں، جن میں سے پہلا اصول ہے:

- تنازعات کو اوّل تو سرے سے ہوا ہی نہ دی جائے، تاکہ اُمت کی اجتماعی قوت میں کمزوری نہ پیدا ہو، جیسا کہ سورۃ الانفال (آیت: ۴۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾

”اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی، صبر سے کام لو، یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اختلاف کا حل:

① اگر کبھی کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس چیز کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عدالت میں لے جاؤ اور وہاں سے جو فیصلہ صادر ہو، اسے قبول کرلو، جیسا کہ سورۃ النساء (آیت: ۵۹) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾

''پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں تنازع ہوجائے تو اُسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔''

② جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ فیصلہ کردیں تو اسے بلا چوں و چرا قبول کر لینا ہی ایمان کی سلامتی کا ضامن ہے۔جیسا کہ سورۃ النساء (آیت: ۶۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾

''(اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کی قسم! وہ مومن نہ ہوں گے جب تک اپنے جھگڑوں کا فیصلہ تجھ سے نہ کروائیں اور پھر تیرے فیصلے سے ان کے دِلوں میں کچھ اُداسی نہ ہو، بلکہ (خوشی خوشی) مان کر منظور کر لیں۔''

③ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے کے خلاف دل میں ذرّہ بھر بھی تنگی اور ناپسندیدگی کی جائے تو یہ ایمان کے منافی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

《لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ》[1]

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس میرے لائے ہوئے طریقے (دین) کے تابع نہ ہو۔''

④ جب اللہ اور رسول ﷺ کوئی فیصلہ کر دیں تو پھر کسی کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی مرضی سے کوئی اور راہ

[1] مشکاۃ المصابیح (۱/ ۳۶)

اپنائے، بلکہ اُس فیصلے کو قبول کرنا ہی ہوگا، چنانچہ سورت احزاب (آیت: ۳۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾

''اور کسی مَرد یا عورت کے لیے یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کسی بات کا حکم کر دیں تو پھر ان کو اس بات میں کوئی اختیار رہے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا فرمان نہ مانے (اور دوسروں کی رائے پر چلے) تو وہ کھلا گمراہ ہو چکا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کسی آیت یا حدیث کے مقابلے میں کسی مجتہد کی رائے پر عمل نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جونہی کوئی آیت یا حدیث ملے، اُسے سر آنکھوں پر رکھیں اور مجتہد کی رائے صد احترام کے باوجود ترک کر دیں، کیونکہ اسی میں ایمان کی سلامتی اور گمراہی سے بچاؤ ہے۔

غور کریں:

- اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ اصول ''اپنے تنازعات کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیردو۔'' کے پیشِ نظر جب اس جشنِ میلاد جیسے اختلافی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے کتابِ الٰہی کو کھولیں گے تو اس کے تیس پاروں یا ایک سو چودہ سورتوں کو اوّل تا آخر پڑھ جائیں، آپ کو کوئی ایک بھی ایسی آیت نہیں ملے گی جس سے مروّجہ جشن منانا ثابت ہو، لہٰذا عدالتِ الٰہی کا فیصلہ میلاد منانے والوں کے حق میں نہ ہوا اور جس کام کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا، اسے سرانجام دے کر اجر وثواب کی توقع رکھنا بے کار ہے۔
- جب ہم ارشادِ الٰہی کے مطابق دوسرے ثالث یا عدالتِ مصطفیٰ ﷺ کا رُخ کرتے ہیں تو آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سیرتِ عطرہ کا مطالعہ یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ آپ ﷺ نے خود اپنی ولادت کے دن جشن منایا اور نہ اس بات کا کسی کو حُکم فرمایا ہے۔ یہ بات بھی نہیں کہ آپ ﷺ نے شاید غربت و افلاس کی وجہ سے ایسا نہ کیا ہو، بلکہ اگر آپ ﷺ کی مکی زندگی کو محدود معنوں میں قدرے تنگدستی کی زندگی بھی سمجھ لیا جائے تو ہجرتِ مدینہ کے بعد دس سال کے دَوران میں آپ ﷺ دولتِ اسلامیہ کے بانی و حاکم ہوگئے تھے۔ عرب وعجم اور ممالکِ مشرق ومغرب کے تمام خزانے آپ ﷺ کے قدموں میں ڈھیر ہوگئے تھے۔

مگر اس فارغ البالی کے باوجود بھی آپ ﷺ نے تادمِ آخر کسی سال اس قسم کی عید اور جشن نہیں منایا تھا۔ لہٰذا جب خود صاحبِ میلاد نے ایسا نہیں کیا اور نہ کرنے کا حکم دیا، تو ایسے کام کو سرانجام دینا کس طرح نیکی وثواب ہوسکتا ہے؟ اگر اس کام میں نیکی و ثواب ہوتا یا کوئی بھی دینی یا دنیوی فائدہ ہوتا تو آپ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ضرور اس کا حکم دے دیتے۔ بہر حال موقع ہونے اور کوئی امرِ مانع بھی نہ ہونے کے باوجود آپ ﷺ کا خود جشن منانا نہ اس کا حکم دینا، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ کوئی کارِخیر نہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اَربعہ رحمہم اللہ کی نظر میں:

کئی حدیثوں سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے کتاب و سُنّت کے بعد خلفاے راشدین اور عام صحابہ کے طریقے کو بھی معتبر اور ذریعہ نجات قرار دیا ہے، لہٰذا جب ہم خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو کئی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے ایک اشارہ ابرو پر اپنا مال و جان قربان کرنے کے لیے بیتاب رہتے تھے، آپ ﷺ کو دل و جان سے چاہتے تھے، آپ ﷺ کے احکام و ارشادات پر عمل پیرا ہونا اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے، بلکہ آپ ﷺ کی سنت پر مَر مٹتے تھے۔ لیکن جب ہم اس مروّجہ عید میلاد کو تلاش کرتے ہیں تو ان کی زندگیوں میں اس کا کہیں سراغ تک نہیں ملتا۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں، حضرت عثمان ذوالنّورین رضی اللہ عنہ کے عہد میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں اور نہ ایک لاکھ چالیس ہزار سے بھی زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے قول وعمل سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

اب یا تو ہمیں اس جشن کو ترک کردینا چاہیے یا پھر ہمیں اس بدگمانی کا کھل کر اظہار کر دینا چاہیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نعوذ باللہ نبی اکرم ﷺ سے محبت نہ تھی یا کم از کم اتنی نہ تھی جتنی آج کے جشن منانے والوں کو ہے۔ بخاری و مسلم شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي۔ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ)) [1]

''تمام زمانوں سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر ان لوگوں کا جو اس کے بعد والے

[1] متفق عليه، مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٥) بتحقيق الألباني.

ہیں اور پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد والے ہیں۔“

یہاں آپ ﷺ نے قیامت تک آنے والے لوگوں میں سے اپنے اور اپنے صحابہ، پھر تابعین اور اس کے بعد تبع تابعین کے تین زمانوں کو قرونِ خیر قرار دیا ہے اور اس میلاد النبی کے بارے میں صحابہ و تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی سے کچھ منقول نہیں کہ ان تینوں صدیوں میں کسی نے یہ عیدِ ثالث منائی ہو۔

نیز معروف فقہی مذاہب کے ائمہ مجتہدین حضرت امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی اجتہادی مساعی اور کتبِ فقہ کا مطالعہ کریں، آپ کو کسی بھی امام صاحب کے یہاں اس عید کا ذکر ملے گا اور نہ دیگر فقہا و محدثین میں سے کسی نے اس کا حکم دیا ہے۔

تو پھر بہنو! جو چیزیں تینوں قرون مشود لہا بالخیر بلکہ اسلام کے پہلے چھ سَو پچیّس (۶۲۵) برس تک موجود نہ تھی، اُسے جائز و ثواب قرار دینا شریعت سازی اور سینہ زوری کے سوا کچھ نہیں۔

قائلینِ عید میلاد النبی ﷺ کے دلائل اور اُن کا جائزہ:

ہم نے عید میلاد النبی ﷺ کی شرعی حیثیت کے بارے میں ذکر کر دیا ہے کہ اس کا عہدِ رسالت وخلافت اور دورِ صحابہ و تابعین سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، بلکہ ساتویں صدی ہجری (۶۲۵ھ) میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے بہنوئی اور موصل کے قریبی شہر اَربل کے گورنر ملک مظفر ابو سعید کوکبوری نے اسے رواج دیا۔ وہ محفلِ میلاد میں بھانڈ، میراثی، راگ و رنگ اور ناچنے والوں کو جمع کرتا اور راگ سنتا اور گانا باجا سن کر خود بھی ناچا کرتا تھا۔[1]

”الإبداع في مضار الابتداع“ میں لکھا ہے:

”عیسائیوں کے کرسمس کی دیکھا دیکھی مصری فاطمیوں نے جشنِ میلاد کو رواج دیا تھا۔“[2]

قرونِ اُولیٰ میں اس کا ثبوت نہ ہونے اور ساتویں صدی میں آ کر شروع ہونے کی وجہ سے اہلِ علم نے اسے ”بدعت“ قرار دیا ہے۔ اس میلاد کے جواز کا فتویٰ سب سے پہلے مَلک مظفر کے عہد کے ایک مولوی شیخ ابو الخطاب ابن دحیہ نے ایک رسالے ”التنوير في مولد البشير النذير“

---

[1] البداية والنهاية (٧/ ١٣/ ١٣٦ تا ١٣٧)

[2] كلمة الحق في الاحتفال بمولد سيد الخلق للشيخ عبدالله آل محمود (ص: ٥٠)

میں دیا، جس کی تالیف پر اسے ملک مظفر نے ایک ہزار دینار انعام دیا تھا۔[1]

اس مولوی ''ابن دحیہ'' کو کبار علمائے حدیث نے کذاب، ناقابلِ اعتبار، غیر صحیح النسب، بے تکی اور فضول باتیں کرنے والا قرار دیا ہے۔ جس کی تفصیلات ''البداية والنهاية'' (۷/ ۱۳/ ۱۳۷) اور ''لسان الميزان'' (۴/ ۲۹۶، ۲۹۷) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ سورت کہف (آیت: ۱۰۵) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ پس اس لیے ان کے سارے اعمال (کفر کی وجہ سے) ضائع ہوگئے۔ قیامت کے روز ہم انھیں کوئی وزن نہ دیں گے۔''

بہر حال لوگوں کی باتیں ہمارے لیے دین نہیں، ہمارا دین وہ ہے جو آپ ﷺ کی بعثتِ مبارکہ سے لے کر آپ ﷺ کی وفات (۱۲/ ربیع الاول ۱۱ھ) تک سے ہمیں ملتا ہے، وہی ہمارا دین ہے اور ہماری ہدایت کے لیے کافی ہے اور ہم پر فرض ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں، آپ ﷺ کی اطاعت اور پیروی کریں، آپ ﷺ سے محبت کریں اور آپ ﷺ کا ادب کریں۔

لیکن... اے ہوش و گوش رکھنے والو! ذرا غور کرو:

وہ ایمان جو آپ ﷺ کی اطاعت نہ سکھائے کس کام کا؟

وہ محبت جو آپ ﷺ کی سنتِ مطہرہ پر چلنا نہ سکھائے کس کام کی؟

وہ ادب جو آپ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا نہ سکھائے کس کام کا؟

وہ پیار اور محبت جو آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے کا سلیقہ نہ سکھائے وہ جذبہ کس کام کا؟

آپ ﷺ کی عزت اور ناموس پر مر مٹنے کا جذبہ جو آپ ﷺ کی اتباع نہ سکھائے کس کام کا؟

گویا آپ ﷺ کے تمام حقوق ادا کرنا اور آپ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہی محبت ہے۔ جو لوگ حیلوں بہانوں سے جانتے بوجھتے آپ ﷺ کے فرامین اور فیصلوں کو پس پشت ڈالیں یا

---

[1] البداية والنهاية (۷/ ۱۳/ ۱۳۷) الإنصاف (۳۴/ ۳۵)

آپ ﷺ کی سنتِ مطہرہ سے انحراف کریں، ایسے لوگوں سے متعلق سورۃ النساء (آیت: ۶۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ ''تمھارے رب کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے۔''

مومن تو اپنے نبی کریم ﷺ کے وجود سے ہر وقت خوش رہتا ہے، لہٰذا اس کے لیے سال میں ایک مرتبہ اظہارِ خوشی کا موقع (میلاد) ایجاد کرنا، کسی طرح بھی لائق نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں نبی اکرم ﷺ کی سنتوں کے ساتھ پیار کرنے والوں میں سے شمار فرما لے اور ہمیں صحیح قرآن وسنت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ

مراجعِ درس

1. پیغمبرِ رحمت ﷺ۔ تالیف: فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر سعید بن علی بن وہف قحطانی
2. جشنِ میلاد... یومِ وفات پر...؟ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

مصادر و مراجع

① القرآن الکریم۔

② تفسیر احسن البیان۔ حافظ صلاح الدین یوسف۔

③ بدعت۔ تعریف، اقسام واحکام، تالیف: الشیخ صالح الفوزان، ترجمہ: مولانا اسرار الحق عبیداللہ۔

④ پیغمبرِ رحمت ﷺ۔ ڈاکٹر سعید بن علی بن وہف قحطانی، ترجمہ: شیخ الحدیث حافظ محمد امین صاحب۔

⑤ رہبر و راہنما۔ تالیف: مولانا محمد عبد الجبار۔

⑥ جشنِ میلاد... یومِ وفات پر...؟ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑦ بدعات اور ان کا تعارف۔ مصنف: علامہ سعید بن عزیز یوسف زئی، نظرِ ثانی: ابو عدنان محمد منیر قمر حفظہ اللہ

⑧ سیرت امام الانبیاء ﷺ، تالیف۔ الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑨ مکار دشمن؛ سلسلۂ معجزاتِ نبویہ۔ تالیف: جناب نعیم احمد بلوچ۔ دارالسلام۔

⑩ قبولیتِ عمل کی شرائط۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑪ فضائلِ رحمت العالمین ﷺ۔ تالیف: مولانا محمد اقبال کیلانی۔

⑫ مختصر السیرۃ النبویۃ. تالیف: مولانا عبد الخالق خلیق۔

گلدستہ دروسِ خواتین

4

نماز و روزہ

تالیف
محترمہ ام عدنان قمر حفظہا اللہ

تنقیح و مراجعہ
فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ - ڈینگہ

ام القریٰ پبلی کیشنز
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

فون: 0333-8110896. 0321-6466422

احکامِ غسل و وضو

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ﴾

''اللہ تعالیٰ بہت زیادہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

دینِ اسلام کا سب سے پہلا سبق طہارت ہے۔ جب کوئی غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے اسے غسل کر کے طہارت حاصل کرنی پڑتی ہے اور اس کے بعد وہ کلمہ شہادت کا اقرار کر کے مسلمان کہلاتا ہے۔

اسلام کے سب سے اہم اور بنیادی رکن، نماز کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جسم کی طہارت، لباس کی طہارت اور جگہ کی طہارت بنیادی شرائط مقرر فرمائی ہیں۔ طہارت اور پاکیزگی کی حالت میں ہر مسلمان اپنے جسم اور روح کی کیفیت کو عام حالت سے ممتاز اور ارفع سمجھنے لگتا ہے۔ اگر کہیں پانی میسر نہ ہو تو مٹی سے تیمّم کا حکم دے کر نفسیاتی طور پر طہارت اور نظافت کے اس احساس کو برقرار رکھا گیا ہے جو اللہ کے حضور حاضری دینے کے لیے ضروری ہے، جس کے لیے ہمیں اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ غسل و وضو اور تیمّم کے احکام دے کر ہماری زندگی تنگ نہیں کرنا چاہتا بلکہ ''وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک و صاف کر دے اور اپنی نعمت تم پر مکمل کر دے تاکہ تم شکر گزار بنو۔''

طہارت کی فضیلت:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ''طہارت نصف ایمان ہے۔'' طہارت کا حاصل کرنا ''وضو'' کہلاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ مدینہ منورہ کے قریب بستی قبا کے لوگ نماز کے لیے طہارت کا بہت زیادہ اہتمام کیا کرتے تھے، جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ان کی یوں تعریف فرمائی ہے:

﴿ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ [التوبة: ١٠٨]

''اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو خوب پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔''

امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ایسی قدیم مساجد میں نماز پڑھنا مستحب ہے جو اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کی غرض سے تعمیر کی گئی ہوں، نیز صالحین کی جماعت اور ایسے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنا مستحب ہے جو مکمل وضو کرنے اور طہارت و پاکیزگی کا صحیح صحیح اہتمام کرنے والے ہوں۔

مسنون و مستحب غسل:

غسلِ واجب کی چار اقسام (جنابت، حیض، نفاس اور جماع سے غسل) کے علاوہ بعض اقسامِ غسل مسنون و مستحب ہیں۔ مثلاً جمعہ کے دن ہر عاقل وبالغ مسلمان کے لیے غسل کی نبی کریم ﷺ نے بڑی تاکید فرمائی۔ بعض احادیث میں اسے ضروری اور بعض میں اسے اچھا فعل قرار دیا گیا ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار شرح منتقیٰ الأخبار'' میں ہر قسم کی احادیث نقل کرنے کے بعد غسلِ جمعہ کے مستحب ہونے کا حکم اخذ کیا ہے۔ بعض احادیث کی رو سے عیدین کے غسل کے بھی مستحب اور کارِ ثواب ہونے کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح میت کو غسل دینے کے بعد، مشرک کو دفن کرنے کے بعد، غشی یا بے ہوشی کے بعد، احرام باندھتے وقت، دخولِ مکہ سے قبل اور وقوفِ عرفہ سے پہلے غسل کرنا بھی احادیث سے ثابت ہے۔ مگر یہ سب اقسام فرض یا واجب نہیں بلکہ مسنون و مستحب اور کارِ ثواب ہونے کا درجہ رکھتی ہیں۔[1]

البتہ ان تمام اقسام فرض و واجب اور مستحب و مسنون کے لیے غسل کا طریقہ تقریباً ایک جیسا ہی ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ غسلِ جنابت کے لیے عورت کا اپنے سر کی چٹیا (مینڈیاں وغیرہ) کھولنا ضروری نہیں جبکہ حیض و نفاس کے لیے غسل کرتے وقت بالوں کا کھولنا اور خوب مل کر دھونا ضروری ہے۔

مسنون طریقہ غسل:

اب رہا غسل کا مسنون طریقہ تو اس کی عموماً دو شکلیں پائی جاتی ہیں:

[1] المنتقی مع النیل (١/ ٢٣١) الفتح الرباني (٢/ ١٤٤ تا ١٤٧)

ایک غسلِ عادت اور دوسرا غسلِ عبادت۔

غسلِ عادت تو یہ ہے کہ کوئی شخص محض اپنے جسم کا میل کچیل اور پسینہ زائل کرنے، صفائی وستھرائی کی خاطر یا گرمی کی شدت کم کرنے کی غرض سے نہائے اور غسل کے مسنون طریقے سے قطع نظر اپنی مرضی سے بدن پر پانی بہالے اور صابن وغیرہ سے غسل کر لے، اسے آپ ''غسلِ عادت'' کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس سے صفائی وستھرائی اور ٹھنڈک تو حاصل ہو جائے گی، مگر وہ اجر وثواب اور فضیلت حاصل نہیں ہوگی، جو مسنون طریقے سے غسل کرنے پر حاصل ہوتی ہے۔

اس لیے مسنون طریقے کو ''غسلِ عبادت'' بھی کہا جاتا ہے اور ان دونوں میں باہم کوئی خاص فرق بھی نہیں کیونکہ پہلے سے بھی صفائی وستھرائی اور ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے اور دوسرے سے بھی۔ پہلے میں بھی سرد یا گرم پانی اور صابن وشیمپو استعمال ہوتا ہے اور دوسرے میں بھی، مگر پہلا عادت اور دوسرا عبادت کیوں ہے؟ اس فرق کی وجہ صرف اتنی ہے کہ جب بھی کوئی شخص غسل کرنے لگے تو اسے ہر شکل میں مسنون طریقے کو اختیار کرنا چاہیے اور اس تصور کے آجانے سے جہاں آپ طبی و دنیاوی فوائد سے بہرہ ور ہوں گے، وہیں اس کے دینی وروحانی ثمرات بھی سمیٹیں گے اور اتباعِ سنت کا اجر وثواب بھی پائیں گے۔

لہٰذا آیئے دیکھیں کہ نبی کریم ﷺ کا مسنون طریقۂ غسل کیا تھا؟

صحیح بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''نبی اکرم ﷺ جب غسلِ جنابت فرماتے تو پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھو لیتے۔ پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر مقامِ استنجا کو دھوتے۔ پھر اُسی طرح وضو فرماتے جس طرح نماز کے لیے وضو کیا جاتا ہے۔ پھر پانی لیتے اور بالوں کی جڑوں میں انگلیاں ڈال کر وہاں پانی پہنچاتے۔ جب آپ ﷺ محسوس فرما لیتے کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ گیا ہے تو پانی کے تین چلو بھر کر اپنے سر پر ڈالتے۔ اس کے بعد باقی سارے جسم پر پانی بہاتے تھے اور اس کے بعد اپنے دونوں پاؤں دھوتے تھے۔''[1]

ایک حدیث میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میری خالہ اُم المومنین

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٨) صحيح سنن أبي داود (٢٢٢)

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ غسل بتاتے ہوئے فرمایا:

''میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسلِ جنابت کے لیے پانی بھر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دو یا تین مرتبہ اپنے ہاتھوں کو دھویا۔ پھر اپنا دھلا ہوا ہاتھ پانی کے اس برتن میں ڈالا اور دائیں ہاتھ سے پانی لے کر اپنے مقام استنجا پر ڈالا اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے دھویا۔ پھر اپنا بایاں ہاتھ زمین پر مارا اور اسے مٹی کے ساتھ خوب رگڑ رگڑ کر ملا۔ پھر نماز کے لیے وضو کرنے جیسا وضو کیا۔ پھر تین دفعہ چلو بھر کر سر پر پانی ڈالا۔ پھر اپنے سارے جسم کو دھویا، پھر اس جگہ سے ہٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔''[1]

اس حدیث میں آگے یہ الفاظ بھی ہیں:

''پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تولیہ دیا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا۔''

صحیح بخاری و صحیح مسلم ہی کی ایک حدیث میں ہے:

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی (اپنے دونوں ہاتھوں سے) جھاڑا۔''

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پانی کا جھاڑنا ثابت ہے تو پھر تولیے سے بدن کو صاف کر لینا بھی جائز ہے۔[2]

ان مذکورہ دو احادیث (جو حضرت عائشہ و ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں) کے مجموعی مفاد سے غسلِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مسنون طریقہ سامنے آتا ہے، ظاہر ہے کہ غسل کا سب سے پاکیزہ طریقہ اور باسلیقہ انداز یہی ہوسکتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کی جگہ سے ہٹ کر آخر میں پاؤں دھوئے، اس کی وجہ یہ ہوگی کہ غسل کی وہ جگہ پختہ نہ ہوگی اور وہاں پانی رکتا اور جمع ہوتا ہوگا، اس طرح کیے گئے غسل کے بعد دوبارہ وضو کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اسی غسل والے وضو سے نماز وغیرہ پڑھی جاسکتی ہے، بشرطیکہ دورانِ غسل وضو ٹوٹنے کی صورت پیش نہ آئے، کیونکہ سننِ اربعہ اور مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غسل کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢٤٩) شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٣/ ٢٣١)

[2] شرح صحيح مسلم مع النووي (٢/ ٣/ ٢٣١ـ ٢٣٢) تولیے کے استعمال کے بارے میں تفصیل کے لیے ''سبل السلام'' کا مراجعہ کریں۔

عورتوں کا غسل وحیض کے لیے چوٹیاں کھولنا:

عورت کے لیے غسلِ جنابت کے وقت سر کے بالوں کو کھولنا ضروری نہیں، البتہ حیض و نفاس کے غسل کے لیے چوٹی کو کھولنا ضروری ہے اور غسلِ حیض و نفاس کے لیے پانی میں بیری کے پتے ڈالنا بھی بخاری و مسلم اور مسند احمد میں ثابت ہے۔[1] آدابِ غسل میں سے یہ بھی ہے کہ پردے میں غسل کرے، کیونکہ سنن ابو داود و نسائی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''اللہ تعالیٰ بہت حیا اور پردے والا ہے اور حیا و پردے کو پسند کرتا ہے، پس تم سے جب کوئی شخص غسل کرے تو اسے چاہیے کہ پردے میں غسل کرے۔''[2]

وضو سے قبل چند امور

حدثِ اصغر:

حدث اصغر کے اسباب: بول وبراز، نیند، خروجِ ہوا، خروجِ منی و ودی اور خونِ استحاضہ وغیرہ ہیں، اس حدث کا ازالہ صرف استنجا اور وضو کر لینے ہی سے ہو جاتا ہے۔ جبکہ نیند اور خروجِ ہوا کے بعد استنجا کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، محض وضو کر لینا ہی کافی ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے ثابت شدہ صحیح احادیث میں وضو کا مسنون طریقہ بتایا گیا ہے جس کی تفصیل میں جانے سے پہلے چند امور کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

1- ہاتھ دھونا:

اگر کوئی شخص سو کر نہیں اٹھا بلکہ حالتِ بیداری ہی میں ہے تو وہ پانی کے برتن سے بلا توقف جب چاہے یا جب ضرورت ہو وضو کر لے، لیکن اگر کوئی سو کر اٹھا ہو اور کسی ٹب یا برتن سے وضو کرنا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس برتن میں اس وقت تک ہاتھ نہ ڈالے جب تک پہلے کسی چیز سے پانی نکال کر اپنے ہاتھوں کو نہ دھو لے، کیونکہ بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو وہ اپنا ہاتھ پانی کے برتن میں نہ ڈالے،

---

[1] الفتح الرباني (٢/ ١٦٧)

[2] صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٨٧) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٣)

یہاں تک کہ پہلے اسے دھو نہ لے، کیونکہ کیا معلوم کہ نیند کے عالم میں اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری ہے؟''[1]

ہوسکتا ہے کہ سوتے میں ہاتھ بدن کے پوشیدہ اعضا کو لگ کر ناپاک ہوگیا ہو اور اگر اسی حالت میں پانی کے برتن میں ہاتھ ڈال دیا تو وہ پانی بھی متاثر ہوگا۔ اندازہ فرمائیں کہ طہارت و پاکیزگی کی کتنی عمدہ تعلیم دی جارہی ہے۔

2- ناک جھاڑنا:

اسی طرح نیند سے بیدار ہونے والے شخص کے لیے ایک اور ہدایت بھی مذکور ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہوتو اسے چاہیے کہ اپنی ناک کو تین مرتبہ اچھی طرح جھاڑ لے، کیونکہ شیطان اس کی ناک کے بانسے پر رات گزارتا ہے۔''[2]

سونے والے کی ناک کے بانسے پر شیطان کے رات گزارنے کی کیا کیفیت ہوسکتی ہے؟ اس کی اصل حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور ہمارا کام اسرار و رموز کو جاننا نہیں بلکہ صادق و مصدوق نبی اکرم ﷺ کے ارشادات پر ایمان لانا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ عبادت میں کاہلی وسستی پیدا ہوجاتی ہے جس سے شیطان خوش ہوتا ہے، تو گویا وہ رات بھر وہیں رہا ہے۔ لہٰذا نیند سے بیدار ہوکر طبِ نبوی ﷺ کا یہ نسخہ استعمال کریں۔ اس طرح واقعی شیطان کا عمل دخل ختم ہوجاتا ہے۔

وضو کا مسنون طریقہ

نماز کے لیے وضو چونکہ بنیادی حیثیت رکھنے والا عمل ہے، بلکہ یوں کہیں کہ وضو نماز کی چابی ہے اور نماز جنت کی چابی ہے۔ قرآنِ کریم میں فرضیتِ وضو کا ذکر سورت مائدہ (آیت: ٦) میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٦٢)

[2] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٢٩٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٢٧)

''مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھو لیا کرو)۔''

آیت کے اس حصے میں وضو کے وجوب و فرضیت کے علاوہ طریقہ وضو کے اصول بھی ذکر کر دیے گئے ہیں جس کی تفصیل نبی اکرم ﷺ کے ارشادات و عمل میں موجود ہے۔ قرآن کی طرح ہی سنتِ رسول ﷺ کی رو سے بھی وضو کی فرضیت ثابت ہے اور اس کے بارے میں کئی ایک احادیث ہیں جن میں سے ایک صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص کا وضو ٹوٹ جائے (یا سرے سے وضو ہی نہ ہو) تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا، جب تک کہ وہ وضو نہ کر لے۔''[1]

فضیلتِ وضو:

نعیم بن عبد اللہ مجمر کہتے ہیں، میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو وضو کرتے دیکھا تو انھوں نے اچھی طرح پورا وضو کیا۔ پھر کہا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا۔'' پھر فرمایا:

''کامل وضو کرنے کی وجہ سے قیامت کے دن تمھارے چہرے اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے، پس تم میں سے جو شخص اپنی یہ روشنی بڑھانے کی طاقت رکھتا ہے، تو وہ ضرور ایسا کرے۔''[2]

حضرت ابو حازم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے موجود تھا جبکہ وہ وضو کر رہے تھے اور وہ ہاتھ دھوتے وقت اپنا ہاتھ بغل تک لے جاتے تھے۔ میں نے کہا: ابو ہریرہ! یہ کیسا وضو ہے؟ تو انھوں نے کہا: اے ابن فروخ! تم یہاں ہو، اگر مجھے تمھاری موجودگی کا علم ہوتا تو میں ایسا وضو نہ کرتا۔ میں نے اپنے خلیل ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''[جنت میں] مومن کا زیور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو پہنچے گا۔''

زر بن حبیش سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٠٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٦)

سوال کیا گیا کہ آپ ﷺ اپنی امت کے ان لوگوں کو قیامت کے دن کیسے پہچانیں گے جن کو آپ نے دیکھا ہی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''وضو کی وجہ سے ان کی پیشانیاں اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے۔''[1]

اس حدیث میں طہارت اور وضو کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے دن اس وجہ سے امتِ محمدیہ کے افراد کے چہرے اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ بعد میں آنے والی اپنی امت کو اس علامت ونشانی کی وجہ سے پہچانیں گے۔

حدیث میں نبیِ رحمت ﷺ کے حوضِ کوثر کا بیان ہے جس سے آپ ﷺ قیامت کے دن اپنی امت کے متبعین اور کتاب وسنت پر عمل کرنے والوں کو پانی پلائیں گے اور جس خوش نصیب کو وہاں سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نصیب ہو جائے گا، پچاس ہزار سال کے برابر دن میں بھی اس کو دوبارہ پیاس نہیں لگے گی، اگرچہ لذت وسرور کے لیے وہ بار بار پیے گا، لیکن اہلِ بدعت اور رسول اللہ ﷺ کے نافرمان حوضِ کوثر سے محروم رہیں گے۔[2]

اس حدیث میں وضو اور نماز کو صحیح آداب وشرائط کے ساتھ ادا کرنے کا بیان ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر ادا شدہ نماز والے کے گذشتہ تمام صغیرہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، البتہ کبیرہ گناہ صرف توبہ یا اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت وعنایت سے معاف ہوں گے۔

وضو کی فضیلت کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے متعدد ارشادات ثابت ہیں جن میں سے ایک ''صحیح مسلم'' میں ہے، حضرت ابو امامہ باہلی، حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا:

''مجھے وضو کے بارے میں بتائیے!'' تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص جب وضو کرنے لگتا ہے اور پھر کلی کرتا ہے، ناک میں پانی چڑھاتا ہے اور ناک جھاڑ کر صاف کرتا ہے تو اس کے منہ اور ناک کے تمام گناہ اس پانی کے ساتھ ہی بہہ جاتے ہیں، جس کے ساتھ منہ اور ناک کو صاف کیا ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اپنا منہ دھوتا ہے جیسا کہ اللہ کا حکم ہے تو اس کی ڈاڑھی کے اطراف سے اس کے چہرے کی تمام

[1] صحيح مسلم، كتاب الطهاره، رقم الحديث (٢٤٩)

[2] صحيح مسلم، كتاب الطهاره، رقم الحديث (٢٢٨)

خطائیں بھی پانی سے دھل جاتی ہیں، یعنی جو گناہ اس کی آنکھوں کی وجہ سے ہوئے تھے۔ پھر جب وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوتا ہے، تو ان دونوں ہاتھوں کے گناہ اس کی انگلیوں کے پوروں کے راستے نکل جاتے ہیں اور پھر جب وہ اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کی تمام خطائیں اس کے بالوں کے راستے پانی کے ساتھ ہی مٹ جاتی ہیں اور پھر جب وہ حکمِ الٰہی کے مطابق دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھوتا ہے تو اس کے پاؤں کی تمام خطائیں پاؤں کی انگلیوں کے راستے پانی کے ساتھ ہی بہہ جاتی ہیں۔''[1]

وضو کی محافظت کی فضیلت:

حسان بن عطیہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ انھیں ابو کبشہ سلولی رحمہ اللہ نے بیان کیا اور انھوں نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے سُنا، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سیدھے راستے پر رہو، میانہ روی اختیار کرو، [نیک] اعمال کرتے رہو اور اچھے اعمال اختیار کرو اور جان لو کہ تمھارے اعمال میں سے سب سے بہترین عمل نماز ہے اور وضو کی محافظت صرف مومن ہی کرتا ہے۔''[2]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

① عبادت اور دوسری نیکی و بھلائی کے کاموں میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو وہ عمل پسند ہے جو ہمیشہ کیا جائے۔

② عقیدہ توحید ورسالت کے بعد بہترین عمل نماز ہے۔

③ نماز کی طرح وضو کی محافظت بھی ایمان کی دلیل ہے۔

محافظت سے مراد سنت کے مطابق وضو کرنا اور ہمیشہ حالتِ وضو میں رہنے کی کوشش کرنا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''جو مسلمان اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرتا ہے جس کے دوران توجہ الی اللہ اور قلبی یک سوئی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے لیے جنت واجب کر دیتا ہے۔''[3]

---

[1] صحيح مسلم بحواله شرح الفتح الرباني (١/ ٢٠١)

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٨٢)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨۔ ١١٩)

ایسے ہی بعض دیگر احادیث میں ایک ایک اعضا کے وضو کے پانی کے ساتھ گناہوں سے پاک ہونے کا ذکر پایا جاتا ہے جس سے وضو کی فضیلت و برکت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مسواک کی فضیلت:

مسنون طریقہ وضو کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ سب سے پہلے مسواک کی جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہر وضو کے ساتھ مسواک کی ترغیب دلائی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''مسواک منہ کی پاکیزگی اور اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔''[1]

نیز حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''نبی کریم ﷺ رات جب نماز تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو خوب رگڑ کر مسواک فرماتے تھے۔''[2]

معلوم ہوتا ہے کہ دن کو سو کر اٹھنے پر اگرچہ نہ ہو، رات کے سونے کے بعد جب وضو کریں تو پہلے مسواک کرلیں اور مجموعی طور پر ہر نماز سے قبل وضو کے ساتھ مسواک کرنے کی نبی اکرم ﷺ نے سخت تاکید فرمائی ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''اگر میں اپنی امت کے لیے باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو حکم دے دیتا کہ نمازِ عشا تاخیر سے ادا کریں اور ہر نماز سے قبل مسواک کیا کریں۔''[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے مسواک لانے کا حکم دیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''بندہ جب مسواک کرتا ہے، پھر وضو کر کے نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو فرشتے اس کے پیچھے اس کی قراءت سُننے کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں، پھر اس سے قریب سے قریب تر ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ اپنے منہ کو اس کے منہ پر رکھ دیتے ہیں، پھر اس کے منہ سے قرآن سے جو کچھ بھی نکلتا ہے وہ فرشتے کے پیٹ میں داخل ہوتا ہے،

---

[1] صحيح الترغيب، رقم الحديث (١٩٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٤٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٨٧)

اس لیے تم اپنے مونہوں کو قرآن پڑھنے کے لیے پاک وصاف کرلو۔''[1]

یاد رہے کہ یہ تمام فضائل وبرکات صرف اُسی وقت حاصل ہوں گی جب وضو نبی اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے مسنون طریقے سے کیا جائے اور اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ مسواک کی لمبائی مقرر کرنا سنت سے ثابت نہیں۔

نیت:

سب سے پہلے نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ دیگر عبادات کی طرح وضو کے لیے بھی نیت شرط ہے، کیونکہ بخاری ومسلم اور سننِ اربعہ بلکہ تمام معتبر کتبِ حدیث میں خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''تمام اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے، ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔''[2]

اس حدیث کی عظمت ورفعت:

یہ حدیث بخاری میں سب سے پہلی حدیث ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی احادیث میں جامع ومانع اور کثیر الفائدہ ہونے کے اعتبار سے اس حدیث کا مقابلہ دوسری کوئی حدیث نہیں کرسکتی۔ بہر حال امام ابن قدامہ رحمہ اللہ ''المغني'' میں لکھتے ہیں:

''وضو بھی ایک عبادت ہے اور کوئی عبادت نیت کے بغیر نہیں ہوتی کیونکہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کا تقرب، اس کی اطاعت اور اس کے فرمان کی بجا آوری ہوتا ہے اور یہ سب بغیر نیت کے حاصل نہیں ہوسکتا۔''[3]

﴿إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ﴾ والی یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نیک اعمال میں نیت شرط ہے۔[4]

نیت کے الفاظ کی شرعی حیثیت:

یہاں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ وضو کی نیت تو واجب یا شرط ہے، مگر اس کے لیے یہ درست نہیں کہ کوئی شخص اس نیت کے الفاظ بھی ادا کرے اور اس پریشانی میں مبتلا ہوجائے کہ نیت کے

---

[1] صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢١٠)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٩)

[3] المغني (١/ ١١٣، ١١٤)

[4] نيل الأوطار مع المنتقىٰ (١/ ١/ ١٣٣)

الفاظ کیا ہیں اور انھیں کیسے ادا کرنا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کسی سے بھی نیت کے کوئی بھی الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ شارح صحیح مسلم امام نووی رحمہ اللہ اور دیگر علما کا کہنا ہے کہ نیت دل کا فعل ہے نہ کہ زبان کا یعنی صرف دل کے ارادے ہی سے نیت ہو جاتی ہے۔

نیت کی کیفیت:

دل سے وضو کی نیت کریں، نیت کے مروجہ الفاظ زبان سے نہ کہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ وضو کرتے وقت اور نماز پڑھتے وقت زبان سے نیت کے الفاظ ادا نہیں فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے، لہٰذا مذکورہ اعمال میں زبان سے نیت کا اظہار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ یہ سنت سے ثابت ہے۔

مسنون طریقہ وضو:

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''انھوں نے وضو کرتے وقت پہلے اپنے دونوں ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی بہایا (یعنی اپنے دونوں ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا) پھر انھوں نے تین مرتبہ کلی کی اور تین مرتبہ ہی ناک کو جھاڑا، پھر تین مرتبہ اپنا منہ دھویا، پھر تین مرتبہ کہنی تک اپنا دایاں ہاتھ دھویا، پھر تین مرتبہ کہنی تک اپنا بایاں ہاتھ، پھر سر کا مسح کیا۔''[1]

''پھر انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ نے اسی طرح وضو کیا اور فرمایا: جو شخص میرے اس وضو کی طرح وضو کرے اور پھر دو رکعتیں ایسے خشوع وخضوع سے پڑھے جن کے دوران میں وہ اپنے آپ سے باتیں نہ کرے (یعنی آر پار کی سوچوں میں نہ کھو جائے) تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔''

تمام اعضاے وضو کے دھونے کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہی تین تین بار کے الفاظ بھی وارد ہیں، مگر سر کے مسح کے ساتھ تین بار کا ذکر نہیں بلکہ صحیحین میں اس حدیث کے جتنے بھی طُرق ہیں، ان میں سے کسی میں بھی مسح کی تعداد مذکور نہیں ہے، لہٰذا سر کا مسح صرف ایک مرتبہ ہی کر لینا کافی ہے اور یہی جمہور علماے امت کا مسلک ہے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٥٩)

[2] المرعاة (١/ ٢٧١)

وضو سے قبل بِسْمِ اللّٰہ پڑھنا ضروری ہے:

① سب سے پہلے آپ کہیں: ”بِسْمِ اللّٰہ“ ”شروع کرتی ہوں (کرتا ہوں) اللہ کے نام سے۔“

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے وضو سے پہلے ”بِسْمِ اللّٰہ“ نہ پڑھی اس کا وضو نہیں ہوا۔“[1]

② پھر دونوں ہاتھوں کو تین مرتبہ دھوئیں۔

③ پھر تین مرتبہ پانی سے کلی کریں اور تین مرتبہ پانی سے ناک صاف کریں۔

④ پھر تین مرتبہ چہرہ دھوئیں۔ چہرے کی حدودِ اربعہ دائیں کان سے بائیں کان تک اور پیشانی کے بالوں کی جگہ سے لے کر ڈاڑھی یعنی تھوڑی کے نیچے تک ہیں۔

⑤ پھر انگلیوں کے پوروں سے لیکر کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کو تین مرتبہ باری باری دھوئیں، پہلے دایاں اور پھر بایاں۔

⑥ پھر ایک مرتبہ سر کا مسح کریں اور وہ یوں کہ دونوں ہاتھوں کو گیلا کریں اور انھیں سر کے شروع سے لیکر آخر (گردن) تک لے جائیں اور پھر شروع تک واپسی لے آئیں۔ کچھ لوگ سر کے چوتھائی حصہ میں مسح کرتے ہیں جو سنت سے ثابت نہیں۔ اسی طرح الٹے ہاتھوں سے گردن کا مسح کرنا بھی سنت سے ثابت نہیں۔ سر کا مسح ہی کافی ہے۔

⑦ پھر دونوں کانوں کا ایک مرتبہ مسح کریں، شہادت کی دونوں انگلیوں کو کانوں کے سوراخوں میں ڈالیں اور دونوں انگوٹھوں کو کانوں کی پشت پر پھیریں۔

⑧ پھر تین مرتبہ دونوں پاؤں دھوئیں، پہلے دایاں اور پھر بایاں، انگلیوں کے پوروں سے لیکر ٹخنوں تک۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا چاہیے اور یہ مسنون بھی ہے۔ اعضائے وضو کو ایک بار یا دو بار یا تین بار دھونا جائز ہے۔ اس سے زائد دھونا اسراف اور گناہ ہے۔

مسند احمد، نسائی اور ابن ماجہ کی حدیث میں ہے:

”جس نے اس سے زیادہ مرتبہ دھویا اُس نے بُرا کیا، زیادتی کی اور ظلم کیا۔“[2]

---

[1] سنن الترمذي (١/ ٢٣، مطبوعه كراچی)

[2] مشكاة المصابيح (ص: ٤٧)

تکمیلِ وضو پر دعا:

جب وضو مسنون طریقے کے مطابق مکمل کرلیں تو پھر کلمہ شہادت پڑھیں، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص تم میں سے اچھی طرح سے وضو کرلے اور پھر یہ کہے:

«أَشْهَدُ أَنَّ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ»

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے وہ جس سے چاہے داخل ہو جائے۔''[1]

ترمذی شریف میں اختتامِ وضو کی دعا میں کلمہ شہادت کے علاوہ یہ الفاظ بھی ہیں:

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَ اجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ»

کلمہ شہادت کے بعد یہ دعا بھی کہہ لینی چاہیے، کیونکہ یہ بھی صحیح اور ثابت ہے۔ تاہم اس کے وضو کی دعا یا نماز کی ادعیہ میں سے ہونے میں قدرے اختلاف بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر قسم کی طہارت و پاکیزگی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ طیب اور طاہر لوگوں کا ساتھ نصیب فرمائے اور اللہ کریم ہمیں اپنے دینِ اسلام پر ثابت قدم رکھے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر احسن البیان — فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
2. طہارت و نماز۔ — فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
3. احکامِ غسل و وضو۔ — فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. صحیح فضائلِ اعمال۔ — تالیف: علامہ علی بن محمد مغربی۔ ترجمہ: حافظ عبد الغفار مدنی
5. صحیح فضائلِ اعمال۔ — مولانا محمد طیب محمد خطاب بھواروی

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١١٨، ١٢٠)

وضو کے متعلق کچھ وضاحتیں

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ [المائدة: ٦]

''مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھو لیا کرو)۔''

① انگوٹھی اور چوڑیوں کا ہلانا:

وضو کے لیے جب ہاتھ دھونے لگیں تو ایک چیز یہ بھی پیشِ نظر رکھیں کہ اگر کسی کے ہاتھ میں انگوٹھی ہو یا کسی عورت نے کنگن یا چوڑیاں پہن رکھی ہوں تو انھیں ہلا لینا چاہیے تاکہ کہیں ان کے تنگ ہونے کی وجہ سے نیچے کی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

''امام ابنِ سیرین رحمہ اللہ جب وضو کرتے تو اپنی انگوٹھی کو حرکت دیتے (ہلاتے) تھے۔''[1]

کیونکہ اعضائے وضو سے ناخن برابر جگہ بھی خشک رہ جائے تو وضو نہیں ہوتا۔ اگر وضو ہی نہ ہوا تو نماز کیا ہوگی؟

② ناخن پالش کا حکم:

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناخن پالش کا حکم بھی ذکر کر دیا جائے، کیونکہ عورتیں عموماً نیل پالش استعمال کرتی ہیں جو ان کے لیے جائز بھی ہے مگر اس کے لیے صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ اگر اس کے لگائے ہوئے کسی نماز کا وقت ہو جائے تو اسے اتار کر وضو کریں۔

---

[1] فتح الباري (١/ ٢٦٧)

اسی طرح غسلِ حیض ونفاس یا غسلِ جنابت واجب ہوتو بھی پہلے اسے اتار لیں اور پھر غسل کریں۔ وضو اور غسلِ واجب کے وقت یہ احتیاط کیوں ضروری ہے اور اسے اتارنا کیوں لازمی ہے؟ کیونکہ ناخن جسم کے ان حصوں میں سے ہے جنھیں غسلِ واجب یا وضو کرتے وقت دھونا ضروری ہے اور پھر اعضاے وضو پر کسی واقعی ضرورت کے بغیر کوئی ایسی چیز لگا لینا جو پانی کو جسم تک پہنچنے سے روکے رکھے، ایسی چیز کی موجودگی میں وضو درست نہیں ہوگا۔ اس لیے وضو کرتے وقت ضروری ہے کہ اس کو کھرچ دیا جائے، تاکہ ناخنوں کی تہہ تک پانی پہنچ سکے۔

③ عمامہ یا پگڑی پر مسح:

سر کے مسح کے مسائل میں سے یہ امر قابلِ توجّہ ہے کہ اگر کسی نے سر پر پگڑی یا عمامہ باندھ رکھا ہو تو اس وقت مسح کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس سلسلے میں صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیشانی اور دستارِ مبارک اور موزوں پر مسح کیا۔''[1]

اس طرح معلوم ہوا کہ سر پر پگڑی ہو تو اسے پورا اُتارنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے تھوڑا سا اٹھا کر اس طرح مسح کرلیں کہ پیشانی اور سر کے کچھ حصے پر مسح ہو جائے اور پھر پگڑی کے اوپر سے گدی تک سر کے مسح کو مکمل کرلیں۔ البتہ اس میں شرط یہ ہے کہ عمامہ اتارنے میں مشقّت ہو تو اس پر کفایت کی جاسکتی ہے۔[2]

④ عورتوں کے دوپٹے کا حکم:

خواتین کی چادر ہو یا دوپٹہ وہ انھوں نے سر پر باندھا ہوا تو ہوتا نہیں لہٰذا اس کا اتارنا آسان ہوتا ہے۔ انھیں اسے اُتار کر سر پر ہی مسح کرنا چاہیے، البتہ بعض خواتین کا جو یہ خیال ہے کہ وضو کرتے وقت سر کے بال ننگے نہیں ہونے چاہییں، ان کا یہ خیال درست نہیں، کیونکہ سر کے بالوں کے ننگے ہوتے ہوئے وضو کرنا تو کجا غسل سے قبل سارے جسم کے ننگے ہوتے ہوئے کیا ہوا وضو بھی صحیح ہوتا

[1] صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۱۷۳، ۱۷٤)

[2] فتح الباري (۱/ ۳۰۸، ۳۰۹)

ہے اور دورانِ غسل اگر کوئی دوسرا ناقضِ وضو سرزد نہ ہو تو اسی وضو سے نماز ادا کی جاسکتی ہے، دوبارہ وضو کرنا ضروری نہیں ہوتا، جیسا کہ سننِ اربعہ اور مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غسل کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔''

⑤ مصنوعی دانتوں کا حکم:

اگر کسی کے اصلی دانت کسی بیماری کی وجہ سے یا اپنی طبعی مدت کو پہنچنے کی وجہ سے نہ رہے ہوں اور مصنوعی دانت لگوا رکھے ہوں تو اس صورت میں غسل و وضو کے کیا احکام و مسائل ہیں؟

اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ مصنوعی دانت دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مستقل طور پر لگا دیے جاتے ہیں اور انھیں آسانی سے نکالا نہیں جاسکتا اور دوسرے وہ جو بنائے ہی اس طرح جاتے ہیں کہ حسبِ ضرورت ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلی صورت میں تو یہ مصنوعی دانت بھی اصل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا حکم بھی اصلی دانتوں کا ہوگا اور جنھیں جب چاہیں نکال کر رکھ لیا جاتا ہے تو اس صورت میں ان دانتوں کے نیچے تک پانی پہنچانا مسنون وضو اور غسل میں فرض ہوگا، کیونکہ غسل اسی وقت درست ہوگا، جب اس کے نیچے کی جگہ تک پانی پہنچ جائے۔ یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہوتا کہ زبان کے معمولی دباؤ سے انھیں ڈھیلا کر لینے سے اصل جسم تک پانی پہنچ جائے گا اور اس طرح آپ کا وضو اور غسل درست ہوجائے گا۔ ان شاء اللہ

⑥ پلاسٹر پر مسح:

اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کسی کے ہاتھ یا پاؤں وغیرہ پر پلاسٹر لگا ہوا ہو، تو غسل یا وضو کے لیے اس صورت میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں بھی شریعتِ اسلامیہ کے مصادر میں ہدایات موجود ہیں کہ اس پلاسٹر پر صرف مسح کرلیا جائے، یعنی اس کے اُوپر صرف گیلا ہاتھ پھیر دیا جائے۔ اُسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''میرا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا تو میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا (کہ میں کیا کروں)؟''

اس روایت میں وہ فرماتے ہیں:

«فَأَمَرَنِي أَنْ أَمْسَحَ عَلَى الْجَبَائِرِ»[1]

''مجھے نبی اکرم ﷺ نے حکم فرمایا کہ میں پٹیوں پر مسح کر لیا کروں۔''

⑦ پلاسٹر یا پٹی پر مسح کے نواقض:

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ فقہائے مذاہبِ اربعہ نے کہ پٹی یا پلاسٹر پر کیے ہوئے مسح کی مدت کب ختم ہوگی؟ اس سلسلے میں دو حالتیں ذکر کی ہیں:

ناقضِ اوّل:

پہلی یہ ہے کہ مسح کے بعد جب تک وضوٹوٹنے کے اسباب میں سے کسی کا وقوع نہ ہو، اس وقت تک مسح کی مدت بحال رہے گی اور جونہی وضوٹوٹ گیا، مسح کی مدت بھی ختم ہوگئی، نئے وضو کے ساتھ ازسرِنو مسح کرنا ضروری ہوگا۔

دوسری یہ کہ پلاسٹر، پٹی یا جبیرہ کو جونہی کھولا گیا، اس مسح کی مدت ختم ہو جائے گی اور وضو ٹوٹ جائے گا، چاہے وضوٹوٹنے کا دوسرا کوئی بھی سبب نہ بنا ہو۔[2]

⑧ موزوں پر مسح:

موسمِ سرما میں سردی سے بچنے کے لیے یا کسی بھی دوسری غرض سے جس شخص نے چمڑے کے موزے پہن رکھے ہوں اور پہنتے بھی وضو وطہارت کی حالت میں ہوں، تو اسے اجازت ہے کہ انھیں اتار کر پاؤں دھونے کے بجائے ان موزوں کے اُوپر ہی گیلا ہاتھ پھیر کر مسح کر لے، کیونکہ یہ مسح نبی اکرم ﷺ سے صحیح احادیث میں ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے وضو کیا اور پاؤں کے موزوں پر مسح کیا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کرتے ہیں؟ تو اُنھوں نے فرمایا:

''ہاں، میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے پیشاب کرنے کے بعد وضو فرمایا اور اپنے موزوں پر مسح کیا۔''[3]

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٥٧)

[2] البدائع و الصنائع (١/ ١٤) فتح القدير شرح هداية (١/ ١١٠)

[3] الفتح الرباني (٤/ ٥٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٠)

⑨ جرابوں پر مسح اور احادیثِ رسول ﷺ:

چمڑے کے موزوں کی طرح ہی اون، فوم، کاٹن یا نائیلون کی جرابوں پر مسح کرنا بھی جائز ہے، جس کا ثبوت سنن ابو داود، ترمذی اور ابنِ ماجہ میں صحیح سند سے مروی حدیث میں موجود ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نبی اکرم ﷺ نے وضو کیا اور اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔''[1]

⑩ مسح کی شرط:

موزوں یا جرابوں پر مسح صرف اُس صورت میں جائز ہے کہ جب انھیں باوضو ہونے کی حالت میں پہنا گیا ہو، کیونکہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران میں مَیں نبی اکرم ﷺ کی معیت میں تھا۔ آپ ﷺ وضو فرمانے لگے تو میں برتن سے پانی ڈال رہا تھا۔ آپ ﷺ نے جب چہرہ اقدس اور بازؤں کو دھولیا اور سرِ اقدس کا مسح کر لیا تو میں جھکا کہ آپ ﷺ کے موزے اتاروں، لیکن آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''انھیں رہنے دو، کیونکہ میں نے طہارت کی حالت میں پہنے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے ان پر مسح کر لیا۔''[2]

⑪ مقامِ مسح:

موزوں یا جرابوں پر مسح بظاہر تو پاؤں کی نچلی جانب چاہیے تھا مگر مسنون یہ ہے کہ پاؤں کے تلوؤں کے بجائے ان کے اوپر والے حصے پر مسح کر لیا جائے، کیونکہ سنن ابو داود و دارقطنی اور مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اُنھوں نے فرمایا:

''اگر دین کا تعلق و بنیاد عقل وقیاس پر ہوتی تو موزوں کے نیچے مسح کرنا ان کے اُوپر مسح کرنے سے اولیٰ تھا، لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ موزوں کے اُوپر مسح کیا کرتے تھے۔''

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٣٢٧)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٣٠٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٧٠)

⑫ توقیتِ مسح:

اب رہی یہ بات کہ جب وضو کر کے موزے یا جرابیں پہن لی جائیں تو کتنے عرصے کے لیے ان پر مسح کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں دس سے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ مقیم کے لیے ایک دن رات یعنی چوبیس ۲۴ گھنٹے اور مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں یعنی بہتّر گھنٹے تک ان موزوں یا جرابوں پر مسح کر لینے کی گنجایش ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن نسائی اور ابن ماجہ میں شریح بن ہانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور موزوں پر مسح کی مدت کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے کہا کہ تم ابنِ ابی طالب یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلے جاؤ اور ان سے جا کر پوچھو، کیونکہ وہ سفر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اس بات کو مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے مسح کی مدت کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے بتایا:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (موزوں یا جرابوں پر) مسح کی مدت مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں اور مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات مقرر کی ہے۔“[1]

تیمّم

قارئینِ کرام! یہاں تک تو مسنون غسل و طہارت اور وضو کرنے کے ضروری احکام و مسائل تھے جن کا تعلق پانی سے ہوتا ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی ایسے مقام پر ہوں جہاں پانی ہی میسر نہیں، جس سے غسل یا وضو کیا جاسکے یا اتنا نہیں جو پینے جیسی اہم انسانی ضرورت سے بچ کر وضو کے کام لایا جائے اور کبھی یوں بھی ہوسکتا ہے کہ ہم سفر میں نہیں، پانی بھی موجود ہے مگر کسی بیماری کی وجہ سے غسل و وضو کرنا جان لیوا اور سخت مضر ہوتا ہے۔ سفر و حضر میں کبھی ان حالات کا پیش آجانا کوئی بعید از امکان نہیں تو ایسے میں شریعتِ اسلامیہ کے پاس اس کا کیا حل ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کسی خاص ملک وقوم اور کسی محدود وقت و زمانے کے لیے نہیں کہ ان مسائل کے حل کا دائرہ محدود ہو، بلکہ دینِ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ یہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۳/ ۱۷۶)

ہے اور اس کی تعلیمات میں ہر زمانے، ہر قوم اور ہر ملک کے باشندوں کو پیش آنے والے ہر قسم کے حالات کا حل اور اس کی راہنمائی کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے اور یہی چیز شریعتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا اعجاز ہے جو اسے دوسری تمام سابقہ شرائع سے ممتاز کرتی ہے۔

اگر کبھی کوئی شخص ایسے حالات سے دوچار ہوجائے کہ پانی نہ ہو یا پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو یا پھر اس کا استعمال مضر ہو تو ایسے حالات میں بھی نماز معاف نہیں کی گئی، کیونکہ یہ تو دین کا ستون ہے۔ البتہ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے مٹی کو پانی کے قائم مقام قرار دیا ہے اور پھر اس کا ایک خاص انداز اور مسنون طریقہ بھی ہے۔ اس اندازِ طہارت کو ''تیمّم'' کہا جاتا ہے۔ تیمّم کا اجمالی طریقہ یہ ہے کہ حصولِ طہارت کی نیت سے دونوں ہاتھوں کو زمین یا کسی چیز پر پڑے ہوئے گرد وغبار پر ماریں۔ پھر دونوں ہاتھوں میں پھونک مار کر انھیں پہلے منہ پر اور پھر دونوں ہاتھوں کو باہم ایک دوسرے پر پھیر لیں۔ اس طرح صرف ایک ہی بار کر لینے سے تیمّم ہو جاتا ہے۔ کہنیوں اور پاؤں وغیرہ پر ہاتھ پھیرنا اور سر یا کانوں کا مسح کرنا بھی ضروری نہیں، کیونکہ یہ اندازِ طہارت ایک ''علامت'' ہے۔ اعضائے وضو کا استیعاب اس میں مقصود ہی نہیں ہے۔

بعض مخصوص حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت اور شفقت کرتے ہوئے غسل و وضو کا علامتی قائم مقام جس تیمّم کو قرار دیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مشروعیت میں پائی جانے والی حکمتیں اختصار سے ذکر کردی جائیں۔ چنانچہ اگر بلا غسل، بلا وضو اور بلا تیمّم ہی نماز وغیرہ کی اجازت دے دی جاتی تو اس کا ایک نقصان تو یہ ہوتا کہ ان اتفاقات سے طبائع ترکِ طہارت کی عادی ہو جاتیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوتا کہ غسل و وضو کی پابندی سے اللہ تعالیٰ کے دربار کی حاضری کا جو اہتمام محسوس ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اس حاضری کی عظمت وتقدس کا جو تصور ذہن پر چھایا رہتا ہے، وہ مجروح ہوتا۔ اسی لیے حکمتِ الٰہی نے مجبوری کی ایسی حالت میں تیمّم کو غسل و وضو کا قائم مقام بنادیا ہے۔ اب مجبوری کی حالت میں غسل یا وضو کے بجائے آدمی نماز وغیرہ کے لیے تیمّم کا اہتمام کرے گا تو اس کی عادت اور ذہن پر کوئی غلط اثر نہیں پڑے گا۔

غسل و وضو میں تو پانی استعمال ہوتا ہے جب کہ تیمّم مٹی سے ہوتا ہے۔ اس کی ایک حکمت تو بعض اہلِ علم نے یہ بیان کی ہے کہ پوری زمین کے دو ہی حصے ہیں: خشکی اور تری، اور ان دونوں

میں سے ایک بڑے حصے کی سطح پانی ہے اور دوسرے حصے کی مٹی، اس لیے پانی اور مٹی میں ایک مناسبت ہے۔ نیز انسان کی ابتدائی تخلیق بھی پانی اور مٹی ہی سے ہوئی ہے اور مٹی ہی ایک ایسی چیز ہے جسے انسان سمندر کے سوا ہر جگہ پا سکتا ہے اور مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر پھیرنے میں تذلل وانکساری اور خاکساری کی بھی ایک خاص شان ہے اور چونکہ انسان کا آخری ٹھکانا بھی مٹی اور خاک ہی ہے۔ مر کر اسے خاک ہی سے جا ملنا ہے۔ اس لیے تیمّم میں موت اور قبر کی یاد بھی پائی جاتی ہے۔ تیمّم کی مشروعیت میں یہ حکمتیں اور اسرار ورموز محسوس کیے جاسکتے ہیں۔[1]

تیمّم اور قرآنِ کریم:

یہ تیمّم قرآن وسنت اور اجماعِ امت تینوں کی رو سے جائز اور ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا طریقہ سورت مائدہ (آیت: ۶) میں بیان فرمایا ہے، اس آیت میں پہلے وضو کے اصول واحکام ہیں اور پھر اسباب وطریقہ تیمّم کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوۡا وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَ اَيۡدِيۡكُمۡ مِّنۡهُ مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّلٰـكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَ لِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴾

’’اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو اور اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلا میں سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمھیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اُس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (تیمّم) کر لو، اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تا کہ تم شکر کرو۔‘‘

تیمّم اور احادیثِ رسول ﷺ:

حدیث شریف میں بھی ان امور کا تذکرہ آیا ہے، چنانچہ صحیح مسلم، مسند احمد اور بیہقی میں

[1] معارف الحديث مولانا منظور أحمد نعماني (٣/ ٩٥۔ ٩٦)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہمیں تین اشیا کے ساتھ دوسری امتوں کے لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے:

① ہماری صفوں کو فرشتوں کی صفیں قرار دیا گیا ہے۔

② ہمارے لیے تمام روے زمین مسجد بنا دی گئی ہے۔

③ جب ہم پانی نہ پائیں تو اس زمین کی مٹی ہمارے لیے طہارت کا ذریعہ بنادی گئی ہے۔''[1]

حیض وجنابت اور تیمّم:

یہ بات تو معروف ہے کہ نماز وغیرہ کے لیے وضو کرنا ہوگا، مگر پانی نہ ملنے یا پانی تو ہو مگر کسی عذر کی بنا پر پانی استعمال نہ کرسکتا ہو تو وہ شخص تیمّم کر کے نماز ادا کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین کرلیں کہ اگر کسی پر جماع و احتلام یا حیض ونفاس کی وجہ سے غسل واجب ہو اور اس کے پاس پانی نہ ہو یا پانی تو ہو مگر بیماری یا شدید سردی کی وجہ سے غسل نہ کرسکتا ہو تو ایسے شخص کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ تیمّم کر کے نماز ادا کر لے اور اس کا یہ تیمّم، غسل اور وضو دونوں سے کفایت کر جائے گا۔ امام مالک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔[2]

اس کا ثبوت کئی احادیث میں موجود ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عمران رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''ہم ایک سفر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو الگ تھلگ بیٹھے دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مخاطب ہوکر فرمایا: اے فلاں! تمھیں نماز ادا کرنے سے کس چیز نے روکا ہے؟ اس نے جواب دیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں جنابت میں مبتلا ہوں گیا ہوں، لیکن غسل کے لیے پانی نہیں ہے۔ یہ سن کر نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارے پاس مٹی ہے [اس سے تیمّم کرلو] یہی تمھارے لیے کافی ہے۔''[3]

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٤) إرواء الغليل (١/ ٣١٦)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٣٨٩)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٤٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ١٨٩ تا ١٩٢)

اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نماز کسی حال میں بھی معاف نہیں ہے۔

سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲۲) میں ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴾

''کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر قسم کی طہارت و پاکیزگی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور طیب اور طاہر لوگوں کا ساتھ نصیب فرمائے۔ اللہ کریم ہمیں اپنے دینِ اسلام پر ثابت قدم رکھے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
2. طہارت و نماز۔ فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
3. احکامِ غسل و وضو۔ فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ علی بن محمد مغربی۔ ترجمہ: حافظ عبدالغفار مدنی
5. صحیح فضائلِ اعمال۔ مولانا محمد طیب محمد خطاب بھاروی

فرض نمازوں کی فضیلت اور لباس کے احکام

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ العنکبوت (آیت: ۴۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾

''(اے نبی!) یہ کتاب جو تمھاری طرف وحی کی گئی ہے اس کو پڑھا کرو اور نماز کے پابند رہو کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے جانتا ہے۔''

قصرِ اسلام کی عمارت پانچ ستونوں پر قائم ہے جن میں سے ایمان باللہ و ایمان بالرسول یا شہادتین کے بعد نماز کو دینِ اسلام کا اہم رکن قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا رکن ہے جس میں بندہ اپنے رب سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے، اس سے سرگوشی کرتا ہے، اسے یاد کرتا اور اسے پکارتا ہے، اس کی کتاب قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔ یعنی بندے کا اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بھی یہی نماز ہے۔ نماز وہ عبادت ہے جو اسے ادا کرے اور اس کا حق پورا کر دے تو وہ اس کو فحش اور منکر چیزوں سے ضرور روک دے گی، اس کی سعادت وسلامتی کا باعث، نجات کا ذریعہ اور اس کے دل و عمل کی اصلاح کا سبب بن جائے گی۔ بندے کے تمام اعمال میں سب سے افضل عمل بھی نماز ہی ہے، جیسا کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم دین پر قائم رہو، اگرچہ تم اس کا احاطہ نہیں کر سکتے اور یہ جان لو کہ تمھارے اعمال میں سے افضل عمل نماز ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ! نماز کو اس کے مقرر وقت میں پڑھنے کی تاکید کرتے ہوئے سورۃ النساء (آیت: ۱۰۳)

[1] حديث صحيح. سنن ابن ماجه (۱/ ۱۰) صحيح ابن حبان و الحاكم (۱/ ۱۳۰)

میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴾

''نماز کو درستی سے ادا کرو، کیونکہ نماز مسلمانوں پر ہے بندھے وقتوں پر۔''

سورۃ المنافقون (آیت: ۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾

''مسلمانو! ایسا نہ ہو تمھارے مال اور اولاد تمھیں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل بنا دیں اور جو لوگ ایسا کریں گے (اللہ کو بھول جائیں گے) وہ نقصان اٹھائیں گے۔''

یعنی مال اور اولاد کی محبت تم پر اتنی غالب نہ آجائے کہ تم اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے احکام وفرائض سے غافل ہو جاؤ اور اللہ کی قائم حدوں کی پروا نہ کرو اور جو ایسا کریں گے بڑے ہی خسارا اٹھانے والے ہیں۔ احکام و فرائض کی پابندی اور حلال و حرام کے درمیان تمیز کرنا اہل ایمان کا کردار ہے۔ قرآنِ کریم سے قلبِ سلیم کے ساتھ ہدایت حاصل کرنے والے خوش نصیب لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے جو نشانیاں بتائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔

سورۃ البقرہ (آیت: ۳) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴾

''فلاح پانے والے وہ ہیں: جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں عطا فرمایا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں، جن کا ادراک عقل وحواس سے ممکن نہیں۔ جیسے ذاتِ باری تعالیٰ، وحی الٰہی، جنت، دوزخ، ملائکہ، عذابِ قبر اور حشرِ اجساد وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بتلائی ہوئی ماورائے عقل و احساس باتوں پر یقین رکھنا، جزوِ ایمان ہے اور ان کا انکار کفر و ضلالت ہے۔ ﴿وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ سے مراد پابندی سے اور سنتِ نبویہ ﷺ کے مطابق نماز کا اہتمام کرنا ہے۔

﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ سے مراد صدقاتِ واجبہ اور نافلہ دونوں ہیں۔ اہلِ ایمان حسبِ استطاعت

خرچ کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ اسی سورت (آیت: ۵) میں فرمایا ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

''یہی لوگ اپنے پروردگار کی راہ پر ہیں اور یہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔''

جو لوگ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، ان کے لیے سورۃ المعارج (آیت: ۳۴، ۳۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ﴾

''اور جو اپنی نماز کی خبر رکھتے (پابندی کرتے) ہیں۔ یہی لوگ باغہائے بہشت میں عزت و اکرام سے ہوں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں کامیاب لوگوں کی جو نشانی بتائی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔ تیسویں پارے کی سورۃ الاعلیٰ (آیت: ۱۴، ۱۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾

''یقیناً فلاح پا گیا جو پاک ہوا اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے نماز کو نمازیوں کے لیے ذریعہ نجات و فلاح قرار دیا ہے۔ یعنی کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا اور خود کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد میں مشغول کر لیا۔ ذکر کی بہترین صورت نماز کو باقاعدگی اور صحیح طریقے سے ادا کرنا ہے۔ یہی بات ایک دوسرے انداز سے اللہ تعالیٰ نے سورت مومنون کی پہلی دو آیتوں میں بیان فرمائی ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾

''یقیناً ایمان والوں نے فلاح حاصل کرلی جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پاک کرلیا اور اللہ کے احکام کی فرماں برداری کی، نماز کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی طلب کرنے کے لیے ٹھیک وقت پر مسنون طریقے سے قائم کیے رکھا تو اس نے نجات اور فلاح پالی۔ نیز سورت مومنون (آیت: ۹) میں فرمایا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾

''اور جو اپنی نمازوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔''

اسی سورت (آیت: ١١) میں فرمایا ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

’’یہی وہ لوگ ہیں جو جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔‘‘

سورۃ النور (آیت: ٣٧) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّكٰوةِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾

’’ایسے لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر اور نماز پڑھنے اور زکات دینے سے غافل نہیں کرتی اور وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور آنکھیں (گھبراہٹ کے سبب) الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔‘‘

سورت طٰہٰ (آیت: ١٣٢) میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے:

﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَیْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی﴾

’’اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو اور خود اس پر قائم رہو، ہم تم سے روزی کے طلبگار نہیں بلکہ تمھیں ہم روزی دیتے ہیں اور یہ بات یاد رکھیے (نیک) انجام (اہلِ) تقویٰ کا ہے۔‘‘

سورت سجدہ (آیت ١٦، ١٧) میں اللہ تعالیٰ نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر نمازیں پڑھنے اور قیام کرنے والوں کو آنکھوں کی ٹھنڈک کی بشارت دی اور فرمایا ہے:

﴿ تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾

’’ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو (مال) ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی

متنفس نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے؟ یہ اُن اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔‘‘

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی کئی دیگر مقامات پر نماز پڑھنے والوں کو جہنم سے نجات، دنیوی و اخروی کامیابی و فلاح اور نعیمِ جنت کی خوشخبریاں دی ہیں اور ایک مقام پر نماز کو مصائب و مشکلات میں حصولِ مدد وقوت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ نماز دکھ، تکلیف اور رنج کے وقت مومن کا سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ (آیت: ۴۵) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴾

’’اور (رنج و تکلیف میں) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو اور بیشک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر (گراں نہیں) جو عجز و انکساری کرنے والے ہیں۔‘‘

نماز کی پابندی عام لوگوں کے لیے گراں ہے لیکن خشوع وخضوع کرنے والوں کے لیے یہ آسان بلکہ اطمینان اور راحت کا باعث ہے، ان لوگوں کے لیے جو قیامت پر پورا یقین رکھتے ہیں، گویا قیامت پر یقین اعمالِ خیر کو آسان کر دیتا ہے اور آخرت سے بےفکری انسان کو بےعمل بلکہ بد عمل بنا دیتی اور جنت سے دور کر دیتی ہے۔ اسی مفہوم کی سورۃ البقرہ (آیت: ۱۵۳) بھی ہے جہاں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

’’اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔‘‘

صبر اور نماز ہر اللہ والے کے دو بڑے ہتھیار ہیں۔ نماز کے ذریعے ایک مومن کا رابطہ وتعلق اللہ تعالیٰ سے استوار ہوتا ہے، جس سے اسے اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت حاصل ہوتی ہے اور صبر کے ذریعے کردار کی پختگی اور دین میں استقامت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز کا راستہ بتایا ہے۔ اس طرح بندے کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوجائے گا جو تمام قدرتوں کا مالک اور مصائب کو دور کرنے پر قادر بھی ہے۔

ویسے بھی مصیبت میں دوست ہی یاد آتے ہیں۔ جن سے اپنے دکھ بیان کریں اور اپنے دل

کا بوجھ ہلکا کر کے سکون حاصل کریں اور مومن کا سب سے محبوب ترین دوست اللہ تعالیٰ ہی ہے، جو اس کے ہر مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کوئی مشکل کام پیش آتا تو اللہ کے حضور کھڑے ہوجاتے اور نماز ادا فرماتے۔''[1]

سورۃ النور (آیت: ۵۶) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾

''اور نماز پڑھتے رہو اور زکات دیتے رہو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔''

صبر کرنے اور نماز پڑھنے والوں کے متعلق سورۃ الرعد (آیت: ۲۲ تا ۲۴) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾

''اور جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (مصائب پر) صبر کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور جو (مال) ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں اور نیکی سے بُرائی کو دُور کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے عاقبت کا گھر ہے۔ (یعنی) ہمیشہ رہنے کے باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور اُن کے باپ دادا اور بیویوں اور اولاد میں سے جو نیکوکار ہوں گے وہ بھی (جنت میں جائیں گے) اور فرشتے (جنت کے) ہر ایک دروازے سے اُن کے پاس آئیں گے اور (کہیں گے:) تم پر رحمت ہو (یہ) تمھاری ثابت قدمی کا بدلا ہے اور عاقبت کا گھر خوب (گھر) ہے۔''

سورۃ الفرقان (آیت: ۲۴) میں انھیں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ٢٤٥) صحيح الجامع (٢/ ٢١٥١٤)

﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴾

''اس دن اہلِ جنت کا ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقامِ استراحت بھی ہوگا۔''

نماز کی اہمیت وفضیلت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم میں اتنا کسی دوسری عبادت کا ذکر نہیں آیا جتنا نماز اور جہاد کا ہے۔ نماز قائم کرنے کے بارے میں جابجا حکم ہے۔ الغرض قرآنِ کریم کے آغاز ہی میں متقی لوگوں کے اوصافِ حمیدہ بیان کرتے ہوئے ایک وصف یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ [البقرۃ: ۳]

فرض نمازوں کی اہمیت نبی اکرم ﷺ کی احادیث کے حوالے سے:

نبی اکرم ﷺ کی کثیر احادیث و ارشاداتِ گرامی میں بھی نمازِ پنجگانہ اور نمازِ جمعہ کی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے:

① سب سے پہلی حدیث تو وہ ہے جس میں نماز کو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایمان کے بعد سب سے پہلا اور اہم ترین رکن قرار دیا گیا ہے۔

② اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا۔

③ نماز کا وقت ہوتا تو آپ ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ کے ساتھ اذان دینے کا حکم فرماتے:
((اَقِمِ الصَّلٰوةَ يَا بِلَالُ! اَرِحْنَا بِهَا)) [1] ''اے بلال! ہمیں نماز سے راحت پہنچاؤ۔''

④ نماز کو رسول اللہ ﷺ نے جنت میں جانے کی ضمانت بھی قرار دیا۔ حضرت ربیعہ بن کعب الاسلمی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے اور نبی کریم ﷺ کے لیے وضو کا پانی اور دوسری چیزیں لایا کرتے، ایک مرتبہ آپ ﷺ نے خوش ہوکر فرمایا: ''ربیعہ مانگو! کیا مانگتے ہو؟''
ربیعہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں۔''
آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر کثرتِ سجود سے میری مدد کرو۔'' [2]
یعنی تمھارے نامہ اعمال میں کثرتِ نماز میرے لیے سفارش کرنا آسان بنا دے گی۔

⑤ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ

---

[1] سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في صلوٰة العتمة، رقم الحديث (٤٩٨٦) مسند أحمد (١٢٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٩)

سے دریافت کیا: «أَيُّ الْأَعْمَالِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ؟» ''اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل کونسا ہے؟''

نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

«اَلصَّلٰوةُ فِيْ أَوَّلِ وَقْتِهَا» [1] ''نماز کو اس کے اول وقت پر ادا کرنا۔''

⑥ سنن ابن ماجہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ رسول ﷺ ہے:

''جب کوئی شخص نماز میں داخل ہوتا ہے [یعنی نماز شروع کرتا ہے] تو اللہ تعالیٰ اپنے وجہِ کریم کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور اس وقت تک نظر نہیں ہٹاتا جب تک وہ نماز سے فارغ نہ ہوجائے یا حادث [بے وضو] نہ ہوجائے۔'' [2]

بندہ جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے، تب سے لے کر نماز کے بعد ذکر و اذکار تک اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم اپنے بندے پر ہوتی ہے، بلکہ جب تک وہ وضو کی حالت میں رہتا ہے۔ مگر یہ کرم اور فضلِ الٰہی اس نمازی کے لیے ہے جس کی نماز نمازِ نبوی ﷺ ہو۔ یعنی نبی کریم ﷺ کے طریقے کے مطابق اور خشوع و خضوع کے ساتھ ہو۔

⑦ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیثِ قدسی میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب بھی وہ مجھے یاد کرے اور جب بھی میرے ذکر سے اس کے ہونٹ ہلیں۔'' [3]

⑧ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی نماز ادا کرتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے، پس وہ اپنی دائیں طرف نہ تھوکے بلکہ اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوکے۔'' [4]

⑨ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٢٧)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٢٣)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٩٢) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٢٢٨٥)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٦١٦)

کونسا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نماز۔ اس نے کہا: پھر کونسا عمل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نماز۔ اس نے پھر کہا: پھر کونسا عمل؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نماز، آپ ﷺ نے ایسا تین مرتبہ فرمایا۔ اس نے کہا: پھر کونسا عمل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔''[1]

آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ فرض نمازوں کی کتنی فضیلت ہے اور ہم ہیں کہ ان کی پروا ہی نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نمازوں کی پابندی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

⑩ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دو بھائی تھے، ان میں سے ایک کی وفات دوسرے سے چالیس دن پہلے ہوئی، رسول اللہ ﷺ کے پاس لوگوں نے ان میں سے پہلے کی فضیلت بیان کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا دوسرا شخص مسلمان نہیں تھا؟''

لوگوں نے کہا: ''کیوں نہیں، وہ مسلمان تھا اور ٹھیک ٹھاک مسلمان تھا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں کیا معلوم کہ اس کی نماز نے اس کو کہاں پہنچادیا؟''[2]

نماز گناہوں کا کفارہ ہے:

⑪ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''پانچوں نمازیں ایسی ہیں کہ ایک نماز سے دوسری نماز کے درمیان سرزد ہونے والے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح جمعہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے درمیان سرزد ہونے والے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، جب تک کہ آدمی گناہِ کبیرہ نہ کرے۔''[3]

⑫ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو اور امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہے تو تم آمین کہو۔ اس وقت آسمان پر فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔ بس جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی تو اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

---

[1] صحيح البخاري (٥٠٤) صحيح مسلم (٨٥) مسند أحمد (٢/ ١٧٢) صحيح ابن حبان (٣/ ١١١)

[2] مسند أحمد (١/ ١٧٧) سنن النسائي (١/ ٢٣٠)

[3] صحيح مسلم (١/ ٢٠٧)

⑬ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''نماز کی مثال ایسے ہی ہے جیسے تم میں سے کسی کے دروازے پر میٹھے پانی کی نہر بہتی ہو اور وہ اس میں روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرتا ہے، بھلا بتاؤ کہ اس کے بدن پر کوئی میل کچیل باقی رہ جائے گی؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: ''اس پر میل نامی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''یہی مثال ان پانچ نمازوں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان نمازوں کے ذریعے بندے کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''[1]

⑭ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ! مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوگیا ہے جس پر حد واجب ہے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر حد قائم کیجیے۔'' اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا اور اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، جب وہ نماز پڑھ چکا تو اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ! مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوگیا ہے جس پر حد واجب ہے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر حد قائم کیجیے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟'' اس نے کہا: ''ہاں۔''

تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمھیں معاف کر دیا ہے۔''[2]

یہاں حد سے مراد تعزیر ہے، یعنی وہ گناہ جس پر تعزیر واجب ہوتی ہے، مثلاً بوس و کنار وغیرہ نہ کہ وہ گناہ جس پر واقعی حد واجب ہے، مثلاً زنا، شراب اور چوری وغیرہ کیونکہ حد واجب ہونے کی صورت میں نماز کفارہ نہیں بن سکتی، جیسا کہ دوسری حدیثوں میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

⑮ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے ایک عورت کا بوسہ لیا، پھر وہ آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے خبر دی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورت ہود (آیت: ۱۱۴) نازل فرمادی اور فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٨) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٧٠)

[2] صحيح البخاري (١٢/ ١٣٣) صحيح مسلم (٤/ ٢١١٧)

﴿ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾

''اور دن کے دونوں سروں (صبح اور شام) اور رات کی چند (پہلی) ساعات میں نماز پڑھا کرو کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دُور کر دیتی ہیں، یہ ان کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں۔''

اس آدمی نے کہا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا یہ حکم میرے لیے خاص ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ میری ساری امت کے لیے ہے۔''[1]

لہٰذا آج بھی کسی سے رات کے اندھیرے یا دن کے اجالے میں کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اس طرح نماز کے ساتھ اپنے اللہ سے توبہ کرے، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

⑯ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

''پانچ کام ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص انھیں ایمان کے ساتھ کرے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ وہ پانچ کام کیا ہیں؟

① جس نے پانچوں نمازوں کی حفاظت کی، ان کے لیے اچھی طرح وضو کیا اور رکوع وسجدہ برابر کیا۔

② ان کے وقت کی پابندی کرنے والا۔

③ رضائے الٰہی کے لیے رمضان المبارک کے روزے رکھنے والا۔

④ اللہ کے لیے حج کرے۔ اگر وہ وہاں تک جانے پر قادر ہے۔

⑤ اگر اللہ تعالیٰ نے اُسے مال و دولت سے نوازا ہے تو وہ خوش دلی سے زکات ادا کرتا ہے۔''[2]

⑰ اسی طرح ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر میں اس بات کی گواہی دوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور پانچوں نمازیں پڑھوں، زکات دوں، رمضان کے روزے رکھوں اور اس کی راتوں میں قیام کروں تو میں کن لوگوں میں سے ہوں گا؟ تو اس کو آپ ﷺ نے فرمایا: ''صدیقین اور شہدا میں سے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١١٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٩)

[3] مختصر الترغيب (ص: ٢٦) صحيح الترغيب للألباني (ص: ٣٥٨)

⑱ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:
''میں نے تمھاری امت پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، میں نے اس بات کا عہد کیا ہے کہ جو شخص ان نمازوں کی حفاظت ان کے وقت پر کرے گا اس کو میں جنت میں داخل کروں گا اور جو ان کی حفاظت نہیں کرے گا اس کے لیے میرے پاس کوئی عہد نہیں ہے۔''[1]

⑲ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور ان سے کہنے لگے: ''کیا تم جانتے ہو کہ تمھارا رب کیا کہتا ہے؟''
لوگوں نے کہا: ''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں۔''
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا تین مرتبہ کہا۔ پھر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ مجھے میری عزت اور جلال کی قسم جو بھی شخص ان نمازوں کو ان کے وقت پر پڑھے گا، اس کو میں جنت میں داخل کروں گا اور جو شخص ان کے وقت کے علاوہ میں پڑھے گا تو اس پر میں چاہوں تو رحم کروں یا عذاب دوں (یعنی ان سے میرا کوئی وعدہ نہیں)۔''[2]

⑫ صحیح بخاری اور مسلم کی حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا:
''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں کہ اگر میں اُسے کروں تو جنت میں جاؤں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نمازیں پڑھو، زکات ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔''
اس نے کہا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں اس سے کم یا زیادہ نہیں کروں گا۔''
تو اسی وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص کسی جنتی آدمی کو دیکھنا چاہے تو وہ اس آدمی کو دیکھ لے۔''[3]

---
[1] سنن أبي داود (۱/ ۱۱۷)
[2] صحيح. المعجم الكبير (۱۰/ ۲۸۱)
[3] صحيح البخاري (۳/ ۳۷۱) صحيح مسلم (۱/ ٤٤)

ترکِ نماز کا انجام:

یہ تو وہ لوگ تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ''خوش نصیب'' کے لقب سے نوازا ہے مگر نماز میں غفلت، کاہلی اور سُستی سے کام لینے کو اللہ کریم نے منافقین کی نشانی بتایا ہے۔

سورۃ النساء (آیت: ۱۴۲) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾

''اور جب یہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو نہ چاہتے ہوئے لوگوں کو دکھانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور وہ اللہ کو بس تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں۔''

منافقین کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ ہوئے تو نماز پڑھ لی، ورنہ نماز پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، یعنی صرف نمود و نمایش اور ریاکاری کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ سورت ماعون (آیت: ۴، ۵) میں اللہ تعالیٰ نے اُن نمازیوں کے لیے ہلاکت اور تباہی بتائی ہے جو نماز کے معاملے میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے قوم کی تباہی و ہلاکت کا اصل سبب ترکِ نماز ہی بتایا ہے اور فرمایا:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾

''تو ایسے نمازیوں کے لیے بربادی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔''

یعنی یا تو نماز پڑھتے ہی نہیں یا نماز کو اس کے مسنون وقت میں نہیں پڑھتے، جب جی چاہتا ہے پڑھ لیتے ہیں یا دیر سے پڑھ لینے کو معمول بنالیتے ہیں یا خشوع و خضوع کے ساتھ نہیں پڑھتے اور نماز کے وقت کو ٹالتے رہتے ہیں، جب وہ بالکل ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگے مار لیتے ہیں اور بہت کم اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے منافقین کی نمازوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا ہوا سورج کو دیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوجاتا ہے، (یعنی غروب ہونے لگتا ہے) تو کھڑے ہوکر [مرغ کی طرح] چار ٹھونگے مار لیتا ہے، اس میں اللہ کا ذکر بہت ہی کم کرتا ہے۔''[1]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۶۲۲)

صحیح بخاری اور شرح السنہ میں زید بن وہب رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کسی کو نماز پڑھتے دیکھا جو رکوع و سجود پورے نہیں کر رہا تھا۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو انھوں نے اسے بلایا اور فرمایا: تم نے نماز نہیں پڑھی۔ میرا خیال ہے یہ بھی کہا کہ اگر تم اسی طرح مر گئے تو اُس فطرت پر تمھاری موت نہیں ہوگی جس پر اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا ہے۔''

مسند احمد و طیالسی، مصنف ابن ابی شیبہ اور الاحکام للاشبیلی (عبدالحق) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس بات سے منع فرمایا کہ میں نماز میں مرغ کی طرح ٹھونگے ماروں اور لومڑی کی طرح اِدھر اُدھر جھانکوں اور بندر کی طرح (ایڑیوں پر) بیٹھوں۔''

نماز میں ان کوتاہیوں کے مرتکب وہی لوگ ہوتے ہیں جو آخرت کی جزا اور حساب وکتاب پر یقین نہیں رکھتے۔ قیامت کے روز جہنمیوں کا ایک گروہ جہنم میں جانے کا سبب یہ بیان کرے گا کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ سورۃ المدثر (آیت: ۴۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴾ ''وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔''

نمازِ نبوی اور ہمارا طرزِ عمل:

نماز بذاتِ خود جتنی اہم ہے، اس کے ادا کرنے کے طریقے کی اہمیت بھی اسی قدر بڑھ جاتی ہے۔ نماز کے بارے میں بس یہی حکم نہیں کہ اسے ادا کرو بلکہ حکم یہ ہے کہ اس طرح ادا کرو جس طرح مجھے ادا کرتے دیکھتے ہو۔[1]

سورۃ النساء (آیت: ۸۰) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴾

''جو شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو بیشک اُس نے اللہ کی فرمانبرداری کی اور جو نافرمانی کرے تو اے پیغمبر! تمھیں ہم نے اُن کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١)

اس حکمِ الٰہی کی تعمیل صرف اطاعتِ رسول ﷺ کی صورت ہی میں ممکن ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ کے خلافِ عمل لایا گیا کوئی نیک کام قابلِ قبول نہیں، اسی طرح نماز بھی آپ ﷺ کے بتائے ہوئے اور سکھلائے ہوئے طریقے کے خلاف پڑھی جائے تو قبول نہیں ہوتی۔ نماز پر ہی بس نہیں بلکہ خلافِ پیغمبر چلنے والا کوئی بھی شخص کبھی منزلِ مقصود اور گوہرِ مطلوب کو نہیں پا سکتا، مگر اس کے برعکس ہماری نمازوں کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ہم نے کبھی یہ زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ ہمارے رسول ﷺ نے اس کا کیا طریقہ بتایا ہے، تاکہ ہم وہ سیکھیں اور اسی طریقے سے پڑھیں اور نبی اکرم ﷺ کے نماز سے متعلقہ ارشادات کا خود مطالعہ کر کے اپنی نمازوں کا ان سے موازنہ کریں۔ بلکہ ہمارا سارے کا سارا انحصار اپنے ماں باپ اور پھوپھی دادی کی نمازوں کی نقل اتارنے میں ہوتا ہے۔ جس طرح وہ نماز پڑھتے ہیں یا انھیں پڑھتے ہوئے دیکھا، ویسے ہی ہم بھی مشین کے سے انداز کے ساتھ چند حرکات و سکنات اور کچھ قراءت و تلاوت اور ذکر و دُعا کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اقامت الصلوٰۃ یا ادائے نماز کا حق ادا کر دیا ہے۔ آپ خود ہی بتائیں کہ اس نماز کو کیا نام دیا جائے؟ نمازِ نبوی ﷺ یا نمازِ آبائی؟

اب آپ ہی بتائیں کہ مسلمانوں کی نماز کیا واقعی ایسی ہوتی ہے؟ ساری نماز ہی بے چین ہوتی ہے، رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ ہی نہیں بلکہ ہم نے تو نبی رحمت ﷺ کی پوری نماز کا حسین سراپا ہی بگاڑ کر رکھا ہوا ہے۔ ایسے ہی دلخراش مناظر کو دیکھ دیکھ کر علامہ اقبال بے ساختہ کہہ اٹھے تھے:

تیری نماز بے سرور، تیرا امام بے حضور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

لٰہذا ہمیں چاہیے کہ جب ہم نماز ادا کریں تو وہ سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ہو اور نماز کے وقت رکوع اور سجود کا خیال رکھیں کیونکہ جو شخص رکوع اور سجود اطمینان کے ساتھ نہیں کرتا، اس کی کوئی نماز نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میرے خلیل ﷺ نے مجھے اس بات سے منع فرمایا کہ میں نماز میں مرغ کی طرح ٹھونگے ماروں۔''[1]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٢٢)

مستدرک حاکم میں حضرت عبدالرحمٰن بن شبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوے کی طرح ٹھونگے مارنے سے منع فرمایا ہے۔''

ایسے نمازی کو نماز کا بدترین چور کہا گیا ہے، جو نماز کی چوری کرتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! نماز کی چوری کیسی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نماز کا رکوع و سجود پوری طرح ادا نہ کرنا نماز کی چوری ہے۔''[1]

لہٰذا رکوع و سجود خوب اطمینان سے ادا کرنے چاہییں۔

نماز کے لیے لباس اور عام طہارت کا حکم:

سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴾

''اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

سورۃ المدثر (آیت: ۴) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ ''اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔''

① لہٰذا نماز کے لیے سب سے پہلا عمل طہارت کا ہونا واجب ہے۔ یعنی غسل یا وضو سے طہارت حاصل کریں۔

② جسم اور کپڑے پاک صاف ہوں۔

③ نیت خالص ہو۔ چونکہ ہر قسم کی عبادت کے لیے نیت کا ہونا ضروری ہے اور طہارت بھی ایک عبادت ہے لہٰذا اس کے لیے بھی نیت کا ہونا ضروری ہے، مگر یہ واضح رہے کہ نیت کا تعلق دل سے ہے۔ یعنی غسل و وضو اور نماز فرض ہو یا نفل ارادہ یعنی نیت دل ہی میں کرے اور زبان سے الفاظ ادا کرنے والے بسم اللہ کے ہوں اور یہ ہی صحیح اور افضل عمل ہے۔

پھر صحیح سنت کے مطابق وضو کے اعضا کو دھویا جائے۔ ایک سے لے کر تین بار تک دھونا جائز ہے اس سے زیادہ دھونا گناہ ہے اور ایک بار سر کا مسح کریں، ساتھ ہی کانوں کا مسح بھی ضروری ہے۔ اس طرح وضو مکمل کرنے کے بعد جس نے یہ کہا:

---

[1] مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٩١)

«أَشْهَدُ أَنَّ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ»

پھر اس کے بعد وضو کی دعا کی ہو تو ایسے مومن مسلمان کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں جہاں سے چاہے گا وہ جنت میں داخل ہوسکتا ہے۔[1]

یہ کتنا بڑا انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی ان انعام یافتہ لوگوں میں شمار فرمالے۔ آمین

یاد رہے کہ وضو کے اعضا میں سے کوئی جگہ خشک نہیں رہنی چاہیے، اگر ناخن جتنی جگہ بھی خشک رہ گئی تو اس کا وضو مکمل نہیں ہوگا۔ اگر وضو نہیں تو نماز بھی نہیں ہوگی اور نماز کے لیے وضو کا مسنون طریقہ یہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''جس نے میرے وضو کی طرح وضو کیا، پھر دو رکعتیں نماز ادا کی اور اس نے اپنے آپ سے (دل ہی دل میں) کوئی گفتگو نہ کی، ایک روایت میں ہے کہ اس میں کوئی بھول نہ کی ہو، تو اس کے گذشتہ تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔''[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک روز نمازِ فجر کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

''اے بلال! اسلام لانے کے بعد تمھارا وہ کونسا (نفلی) عمل ہے جس پر تمھیں اللہ سے بخشش کی بہت زیادہ امید ہے۔ کیونکہ میں نے جنت میں اپنے آگے آگے تمھارے چلنے کی آواز سنی ہے؟''

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

''یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اتنا زیادہ امید افزا عمل تو کوئی نہیں کیا، ہاں ایک کام میں ضرور کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ دن اور رات کے وقت میں جب بھی وضو کرتا ہوں تو جتنی اللہ تعالیٰ کو منظور ہو میں نماز پڑھ لیتا ہوں۔''[3]

وضو کرنے کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو کی نماز ادا کرنا مسنون ہے، کیونکہ مذکورہ حدیث کی رو سے تحیۃ الوضو جنت میں لے جانے والا عمل ہے۔

[1] صحيح البخاري، صحيح مسلم، سنن الترمذي (٢/ ٢٥) مشكاة المصابيح (٣/ ٤٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٥٨)

نماز میں مردوں کے لیے کپڑے کا حکم:

نماز کے لیے طہارت اور وضو کی طرح ستر کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ نماز کا آغاز کرنے سے قبل ''ستر پوشی'' بھی واجب ہے۔ نماز کے شایانِ شان لباس پہنا ہو، جو مقاماتِ ستر کی دونوں اقسام یعنی مغلظ و مخفف دونوں کا ساتر ہو اور موٹا بھی۔ تنگ و چست نہ ہو کہ اعضائے جسم کی چغلی کھائے، ایسا لباس اُس دربارِ عالیہ کی حاضری کے لائق نہیں ہوسکتا۔ البتہ مرد کے لیے صرف ایک کپڑے میں بھی نماز پڑھنی جائز ہے، بشرطیکہ کندھے سے لے کر ران تک مردوں کے جسم کو ڈھانپے ہوئے ہو، کیونکہ ناف سے لے کر ران تک شرمگاہ ہے جس کا پردہ کرنا ضروری ہے۔[1]

اس کے علاوہ اگر کسی نے شلوار، پاجامہ یا تہبند باندھا ہوا ہے تو وہ ٹخنوں سے نیچے نہیں ہونا چاہیے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تہبند کا وہ حصہ جو ٹخنوں سے نیچے ہوگا، جہنم میں جائے گا۔''[2]

نماز میں عورت کے لیے ضروری کپڑوں کا حکم:

سر پر چادر یا موٹا دوپٹا لیے بغیر عورت کی نماز نہیں ہوتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بالغ عورت کی نماز چادر (یا موٹے دوپٹا) کے بغیر نہیں ہوتی۔''[3]

دورانِ نماز عورت کا سارا جسم ہی ستر ہے سوائے چہرہ اور ہاتھوں کے، اس کے علاوہ سر سے لے کر پاؤں تک سارے اعضا ڈھکے رہنے چاہییں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا عورت تہبند کے بغیر صرف لمبے کرتے اور دوپٹے میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

《إِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغاً يُغَطِّي ظُهُور قَدَمَيْهَا》[4]

---

[1] مشكاة المصابيح (ص: ٢٦٩)

[2] مختصر صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٨٤)

[3] صحيح سنن أبي داود للألباني، رقم الحديث (٥٩٧)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٤٥) مشكاة المصابيح (ص: ٧٣)

''ہاں، بشرطیکہ کرتا اتنا لمبا ہو کہ اس سے پاؤں ڈھک جائیں اور موٹا بھی ہو۔''

عورت اگر گھر سے باہر کسی ایسی جگہ پر ہے جہاں مرد اور عورتیں یعنی ملے جلے لوگ ہیں تو پھر نماز کے وقت بھی اپنا چہرہ اور ہاتھوں کو ڈھکے رکھے۔ باقی نماز میں مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں، نماز پڑھنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔ اگر فرق ہے تو وہ یہ ہے کہ عورت کا مسجد میں نماز ادا کرنے کے بجائے گھر میں نماز کا ادا کرنا زیادہ افضل ہے اور یہ حجاب و ستر کی غرض سے ہے۔ تاہم حجاب کے نام پر عورت کا سمٹ کر اور زمین سے چمٹ کر سجدہ کرنا بے اصل اور خلافِ سنّت ہے۔

جانماز کی طہارت کا حکم:

سورۃ الحج (آیت: ۲۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾

''طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں (اور) سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔''

نماز میں جس طرح ستر یا پردہ ضروری ہے اسی طرح نماز پڑھنے کے لیے پاک صاف جگہ کا ہونا بھی ضروری ہے، جہاں نماز پڑھی جائے۔ جا نماز کی طہارت و پاکیزگی کثیر اہلِ علم کے نزدیک نماز کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے اور بعض کے نزدیک یہ سنت ہے، جب کہ جمہور اہلِ علم کا مسلک ان دونوں کے مابین ہے۔ ان کے نزدیک یہ واجب ہے نہ کہ شرط یا سُنّت۔

علامہ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ والیِ ریاست بھوپال نے ''الروضة الندية'' میں لکھا ہے:

''نماز کے لیے بدن، کپڑے اور جگہ کا پاک ہونا جمہُور کے نزدیک واجب ہے۔ بہت سے اہلِ علم نے اسے صحتِ نماز کے لیے شرط قرار دیا ہے اور بعض نے اسے سنت کہا ہے۔''

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
3. نماز میں عدمِ پابندی کا انجام اور تارکِ نماز کا حکم۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ ابوعبداللہ علی بن محمد مغربی رحمہ اللہ، ترجمہ: حافظ عبدالغفار مدنی
5. نماز کا بیان۔ تالیف: مولانا محمد اقبال کیلانی
6. بے نماز کا شرعی حکم۔ تالیف: الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ
7. نمازِ باجماعت کی اہمیت وفضیلت۔ تالیف: الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ ابن باز رحمہ اللہ

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

مسنون طریقہ نماز

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ الاحزاب (آیت: ۲۱) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾

''(مسلمانو) تم کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی پیروی کرنا تھی جو لوگوں کے لیے اچھی ہے جو اللہ تعالیٰ اور پچھلے دن (قیامت) سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بہت یاد کرتے ہیں۔''

نیز نبی رحمت ﷺ کا بھی ارشاد ہے:

« صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ »[1]

''اسی طرح نماز پڑھو، جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔''

چونکہ ہر قسم کی عبادت کے لیے نیت کا ہونا ضروری ہے اور نماز فرض ہو یا نفل عبادت ہے اس لیے اس کی نیت دل ہی میں کرے اور زبان سے الفاظ ادا کرنے والے بسم اللہ کے ہوں اور یہ ہی صحیح اور افضل عمل ہے۔

تکبیرہ اولیٰ (تحریمہ) کے وقت رفع یدین:

جب آپ کسی نماز کے لیے کھڑے ہوں تو سب سے پہلے آپ قبلہ رو کھڑے ہو جائیں اور اپنی نظروں کو سجدے والی جگہ پر رکھیں، پھر رفع یدین کرتے ہوئے یعنی دونوں ہاتھوں کو کندھوں یا کانوں تک اٹھاتے ہوئے تکبیرِ تحریمہ یعنی ''اَللّٰہُ اَکبَرُ'' کہیں، جسے رفع الیدین کرنا کہا جاتا ہے۔ یہ پہلی مرتبہ والا رفع الیدین متفق علیہ ہے اور تمام معروف مذاہب میں سے کسی کا بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اس رفع الیدین کا ذکر بھی کثرت سے احادیث میں آیا ہے۔ مثلاً: حضرت ابوحمید

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١)

الساعدی رضی اللہ عنہ والی معروف حدیث میں وہ دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین بیٹھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیفیت وطریقہ بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث کے الفاظ ہیں:

«رَاَیْتُهٗ اِذَا كَبَّرَ جَعَلَ یَدَیْهِ حَذْوَ مَنْكِبَیْهِ»[1]

''میں نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تکبیر (تحریمہ) کہی تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر تک اٹھایا۔''

مَرد و زن کے رفع یدین میں عدمِ فرق:

احادیثِ شریفہ میں وارد ان حدود (کندھوں تک یا کانوں تک) میں یہ کہیں بھی ذکر نہیں آیا کہ ان میں سے کسی مقام کو مردوں کے لیے خاص کر دیا جائے اور کسی کو عورتوں کے ساتھ مخصوص مان لیں، بلکہ مَرد و زن اس معاملے میں بھی برابر ہیں کہ مَرد اُن (کندھوں تک یا کانوں تک) میں سے جس حد تک چاہیں رفع یدین کریں اور عورتیں بھی جس حد کو چاہیں اختیار کر لیں، کسی کے لیے کسی حد کی کوئی تخصیص حدیث شریف میں ہرگز وارد نہیں ہوئی۔

رفع یدین کے وقت ہاتھوں اور ہتھیلیوں کی کیفیت:

اب آیئے یہ بھی دیکھ لیں کہ رفع یدین کے وقت ہاتھوں اور ہتھیلیوں کی کیفیت کیا ہونی چاہیے؟

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ رفع یدین کرتے وقت اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر رکھنا چاہیے کہ انگلیاں کھلی ہوں اور مٹھی کی طرح بند نہ رکھی جائیں، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«ثَلَاثٌ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَعْمَلُ بِهِنَّ قَدْ تَرَكَهُنَّ النَّاسُ، كَانَ یَرْفَعُ یَدَیْهِ مَدًّا اِذَا دَخَلَ فِی الصَّلٰوةِ»[2]

''تین کام ایسے ہیں جنھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے اور لوگ انھیں چھوڑ بیٹھے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو کھول کر رفع یدین کرتے تھے۔''

لہٰذا تکبیرِ تحریمہ اور رفع یدین کا وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کا اختیار کردہ ہے۔

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٠٥) سنن أبي داود (٢/ ٤٢٧)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٣٥٢)

قیام میں ہاتھ باندھنا:

جب رفع یدین کے ساتھ تکبیرِ تحریمہ یعنی ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' سے فارغ ہو جائیں تو اب ہاتھوں کو کہاں رکھنا چاہیے اور انھیں کہاں باندھنا ہے؟

دایاں ہاتھ اوپر اور بایاں نیچے:

یہ نہیں ہے کہ جو ہاتھ چاہیں اوپر رکھ لیں اور جو چاہیں نیچے باندھ لیں، بلکہ ہاتھ باندھنے کی مسنون کیفیت یہ ہے کہ دایاں ہاتھ بائیں کے اوپر ہو، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس حالت میں (نماز پڑھتے) دیکھا کہ میرا بایاں ہاتھ دائیں کے اوپر رکھا ہوا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھوں کو کھینچ کر (یعنی چھڑا کر) دائیں کو بائیں کے اوپر رکھ دیا۔''[1]

اس حدیث سے ان لوگوں کو بھی اپنی اصلاح کر لینی چاہیے جو لاعلمی میں آج تک نماز کے لیے قیام کے وقت جب ہاتھ باندھتے ہیں تو دایاں ہاتھ نیچے اور بایاں اوپر رکھتے ہیں۔

ہاتھ باندھنے کی حکمتیں:

ہاتھوں کو نیچے نہ لٹکانے بلکہ باندھ کر نماز میں کھڑے ہونے کی اہلِ علم نے بعض حکمتیں بھی بیان کی ہیں:

① پہلی حکمت تو یہ ہے کہ یوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا ایک حقیر و خاکسار سائل یا سوالی کی صورت ہوتی ہے اور بندہ چونکہ اس کائنات کے خالق و مالک اور اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے کھڑا ہوتا ہے لہٰذا عجز و انکساری کے لائق ہاتھ باندھ کر یوں کھڑے ہونا ہی ہے۔

② بعض اہلِ علم نے تو ایک بڑی لطیف بات کہی ہے کہ نیت کا مقام دل ہے اور یہ ایک معروف بات ہے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کی حفاظت کرتا ہے تو اس پر اپنے ہاتھ رکھ لیتا ہے اور یوں ہاتھ باندھنے میں نماز سے حاصل ہونے والے نورِ ایمان کی حفاظت ہے۔ لہٰذا دل اور سینے پر

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٤٤) صحيح سنن النسائي (١/ ١٩٣) رقم الحديث (٨٥٥) سنن ابن ماجه (٨١١)

ہاتھ باندھنا ہی اولیٰ ہے۔[1]

دائیں ہاتھ کو اس انداز سے بائیں ہاتھ پر رکھیں کہ دائیں ہاتھ کا کچھ حصہ بائیں ہاتھ کی پشت پر آئے اور کچھ حصہ ہاتھ اور کلائی کے درمیان والے گٹے پر آئے اور (کچھ حصہ) بائیں بازو کی کلائی پر بھی ہو جائے۔ موطا امام مالک اور صحیح بخاری میں وارد حدیث کی رو سے نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اسی کا حکم فرمایا تھا۔[2]

دُعاے استفتاح یا ثنا کا حکم

جب نمازی قیام کی حالت میں رفع یدین اور تکبیرِ تحریمہ سے فارغ ہو جائے تو دعاے استفتاح یا ثنا پڑھی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اچھی طرح سے نماز نہ پڑھنے والے صحابی کو اس کی بھی تعلیم فرمائی تھی۔ چنانچہ سنن ابو داود اور مستدرک حاکم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

”لوگوں میں سے کسی کی نماز پوری نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ تکبیر ”اَللّٰہُ اَکْبَرُ“ نہ کہے اور اللہ عزوجل کی حمد و ثنا بیان نہ کرے اور قرآن میں سے جو میسر ہو نہ پڑھے۔“

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ تکبیرِ تحریمہ کے بعد ان الفاظ سے ثنا کیا کرتے تھے:

«سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ»[3]

”اے اللہ! تو اپنی حمد کے ساتھ پاک ہے، تیرا نام بہت برکت والا ہے اور تیری عظمت بھی بہت بلند ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں ہے۔“

یہی ثنا اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔[4]

یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیں کہ تکبیرِ تحریمہ کے بعد والی دعا و ثنا سے پہلے ”بسم اللّٰہ“ پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا جب تکبیر کہیں تو سیدھے ثنا ہی شروع کر دیں۔

---

[1] فتح الباري (٢/ ٢٢٤) نيل الأوطار (١، ٢/ ١٨٧) مرعاة المفاتيح (٢/ ٣٠٠)

[2] بحواله صفة الصلوة للألباني (ص: ٤٣)

[3] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١١١) الإرواء (٢/ ٤٨، ٤٩) فقه السنة (١/ ١٤٧)

[4] صحيح سنن أبي داوٗد (١/ ١٤٨) صحيح سنن الترمذي (١/ ٧٨) صحيح ابن ماجه (١/ ١٣٥)

”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ“ پڑھنا:

« سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ » یا کسی بھی دوسری ثنا و دُعا کے بعد اور سورت فاتحہ شروع کرنے سے پہلے ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ“ پڑھنا چاہیے، کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ [النحل: ۹۸]

”جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو (یعنی ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ“ پڑھ لیا کرو)۔“

تعوذ کس کس رکعت میں؟

اب رہی یہ بات کہ تعوذ یا استعاذہ صرف پہلی رکعت کے شروع میں تکبیر و ثنا کے بعد ہے یا دوسری ہر رکعت کے شروع میں بھی ہے؟ اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہو جاتے تو بغیر کسی سکتے کے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے قراءت شروع کر دیتے تھے۔“[1]

بعد والی یعنی تیسری اور چوتھی رکعتوں کا حکم بھی دوسری رکعت والا ہی ہے، تو گویا تعوذ صرف پہلی رکعت کے ساتھ ہی خاص ہے۔[2]

تسمیہ (بسم اللہ) پڑھنا:

تکبیرِ تحریمہ، ثنا یا دعاے استفتاح اور تعوذ کے بعد تسمیہ ہے۔ یعنی ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ“ پڑھی جاتی ہے جو ہر رکعت میں سورت فاتحہ (اور بعد والی کسی سورت) سے پہلے پڑھی جائے گی، چاہے فرض ہوں یا سنتیں اور چاہے وتر ہوں یا نوافل اور ہر نماز کی ہر رکعت میں سورت فاتحہ سے پہلے اور پھر دوسری کوئی سورت پڑھنے سے پہلے ”بِسْمِ اللّٰهِ...“ کا پڑھنا مشروع و مسنون ہے۔ اکثر اہلِ علم کا یہی مسلک ہے۔

سورۃ الفاتحہ:

دعاے استفتاح ”سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ...“ یا ”اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ...“ ، ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ...“

---

[1] صحیح مسلم (۳/ ۵/ ۹٦) صحیح سنن ابن ماجه (٦٦٤) نسائي بحواله المنتقى مع النيل (۱/ ۲/ ۲۷۰)

[2] المنتقىٰ مع النيل (۱/ ۲/ ۲۷۰، ۲۷۱)

اور "بِسمِ اللّٰہِ..." کے بعد نماز میں بحالتِ قیام سورت فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ جو یہ ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۝ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ﴾ [الفاتحة]

"اصل تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے جو سارے جہاں کا پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان رحم والا ہے۔ انصاف کے دن کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی (عبادت) بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔ ان کا راستہ جن پر تو نے کرم کیا نہ کہ ان کا جن پر غصے ہوا اور نہ ان کا جو بہک گئے۔"

فرضیتِ فاتحہ:

نماز کی ہر رکعت میں امام اور منفرد (اکیلے نمازی) کے لیے اس سورت فاتحہ کا پڑھنا تمام ائمہ وفقہا اور محدثینِ کرام کے نزدیک بلا اختلاف فرض ہے اور اس سلسلے میں فرض ونفل اور بلند آواز یا پست آواز والی قراءت سے پڑھی جانے والی نمازوں میں کوئی فرق بھی نہیں ہے۔ صحیح مسلم اور موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورت فاتحہ نہ پڑھی اس کی وہ نماز ناقص ہے... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی کہ وہ ناقص و نامکمل ہے۔"[1]

اسی حدیث میں آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور نماز کی اس تقسیم کی وضاحت میں "نماز" سورت فاتحہ کو قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے اس سورت کا نام "الصلوٰۃ" بھی ہے۔ یہ حدیث نماز میں سورت فاتحہ کی فرضیت کی دلیل ہے اور مقتدی کو بھی چاہیے کہ وہ بھی بلا آواز سورۃ الفاتحہ پڑھ لے، اس کے بہت سارے دلائل مفصل کتب میں مذکور ہیں۔[2]

---

[1] موطأ الإمام مالك مع شرح الزرقاني (١/ ١٧٥۔ ١٧٧) مشكاة المصابيح (١/ ٢٦٢) و ابن كثير (١/ ٩ بيروت)

[2] دیکھیں: تحقیق الکلام علامہ مبارکپوری، توضیح الکلام مولانا ارشاد الحق اثری، سورۃ الفاتحہ مولانا محمد منیر قمر۔

آمین:

سورت فاتحہ کی قراءت کے مکمل ہونے پر بالاتفاق ''آمین'' کہی جاتی ہے۔

آمین کا معنی، فضلیت و اہمیت اور امرِ نبوی ﷺ:

آمین دراصل ایک دعا ہے جس کا معنی ہے:

''اَللّٰھُمَّ اسْتَجِبْ'' ''اے اللہ! میری دعا قبول فرما۔''

امام و مقتدی اور منفرد، حتیٰ کہ عام تلاوت کرنے والے، سب کا سورت فاتحہ مکمل کرنے کے بعد آمین کہنا صحیح احادیث میں وارد ہوا ہے اور اس میں ائمہ مذاہب کے مابین کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((إِذَا اَمَّنَ الْإِمَامُ فَاَمِّنُوْا......الخ)) ''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔''

اس حدیث کے آخر میں اس کے ایک راوی امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ آمِيْن))[1]

''نبی اکرم ﷺ بھی آمین کہا کرتے تھے۔''

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہے تو تم آمین کہو، جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے سے مل گیا، اس کے پہلے تمام گناہ بخشے گئے۔''[2]

① آمین کہنے کا صحیح وقت کون سا ہے؟ جب امام ﴿وَلَا الضَّآلِّيْن﴾ کہے تو امام و مقتدی سب بیک وقت آمین کہیں۔

② عورتوں کے لیے آمین بالجہر کے سلسلے میں کیا حکم ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے:

ا۔ اگر صرف عورتیں ہی ہوں اور انھیں کوئی عورت ہی جماعت کروا رہی ہو تو نبی اکرم ﷺ کی مطلق احادیث کی رو سے وہ سب بھی امام کے ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہنے کے بعد امام کے ساتھ ہی بلند آواز سے آمین کہنے پر مامور ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٦٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١٢٨، ١٢٩)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٢٦٦) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٢٩) سنن أبي داود (٢/ ٢٠٩) صحيح سنن النسائي (١/١، ٢٠)

ب۔ اگر وہ جمعہ وغیرہ پڑھ رہی ہیں اور وہاں دوسرے مرد بھی ہیں تو پھر خواتین کو صرف اتنی آواز سے آمین کہنی چاہیے کہ ان کی آواز مردوں تک نہ پہنچے۔

بہرحال کوئی نماز میں ہو یا عام حالت میں‘ منفرد ہو یا امام و مقتدی، تلاوت کر رہا ہو یا سن رہا ہو، اختتامِ فاتحہ پر سب کو آمین کہہ کر اس دعا میں شامل ہو جانا چاہیے۔ واللّٰہُ وَلِيُّ التَّوفِيق.

سکتہ:

سورت فاتحہ کے بعد بسم اللہ پڑھ کر قرآنِ کریم کی کوئی بڑی یا چھوٹی سورت یا کسی سورت کا کوئی حصہ پڑھیں۔ جب قراءتِ فاتحہ سے فارغ ہو جائیں تو ایک چھوٹا سا سکتہ کریں، یعنی چند لمحوں کے لیے خاموش کھڑے رہیں۔ جس کا پتا سنن ابو داود اور مستدرک حاکم (۷۹۰) میں وارد بعض احادیث سے چلتا ہے۔[1]

حالتِ رکوع:

رکوع جانے سے پہلے اور رکوع سے اٹھنے کے بعد تکبیر تحریمہ کی طرح دونوں ہاتھ کندھوں تک اُٹھانا مسنون ہے، اسے رفع یدین کہتے ہیں۔ لہٰذا دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے ہوئے اللہ اکبر کہیں اور پھر رکوع چلے جائیں۔ رکوع میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر اور دبا کر گھٹنوں پر رکھنی چاہئیں۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں اپنی انگلیاں کھلی رکھتے اور سجدے میں اپنی انگلیاں ملا کر رکھتے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کرتے تو اپنے ہاتھوں سے گھٹنے مضبوط پکڑ لیتے۔[2]

رکوع و سجود میں تسبیحات و اَذکار میں چاہے کتنا وقت لگائیں، کارِ ثواب ہے، البتہ ان مواقع پر قرآنِ کریم کی تلاوت کرنا منع ہے، نماز چاہے فرض ہو یا نفل، کیونکہ صحیح مسلم و ابی عوانہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

> ”خبردار! مجھے رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے سے روکا گیا ہے، البتہ رکوع میں اپنے پروردگار کی عظمت بیان کرو اور سجدوں میں دعائیں مانگو، سجدے میں کی گئی دعا قبولیت

---

[1] مستدرك الحاكم (ص: ۷۹۰) وصححه هو و الذهبي و الألباني في الصلٰوة (ص: ۷۲)

[2] صحيح البخاري (۱/ ۳۴۳)

کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔"[1]

نبی اکرم ﷺ رات کی نماز میں کتنا لمبا قیام اور کتنا طویل قومہ کیا کرتے تھے؟ ہم سے اگر اتنا نہ ہو پائے تو کم از کم یہ تو ہو کہ رکوع سے اٹھ کر پوری طرح سے اطمینان کے ساتھ کھڑے ہوں اور جو ذکر یاد ہو وہ کریں، کیونکہ اکثر ائمہ و فقہا اور اہلِ علم کے نزدیک رکوع کے بعد قومے میں سیدھے کھڑے ہونا اور چاہے کوئی بھی دعا یا ذکر یاد نہ ہو تب بھی چند لمحات کے لیے سیدھے کھڑے رہنا واجب ہے اور اس بات کی تائید متعدد صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ بڑا لمبا قومہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

"جب آپ ﷺ رکوع سے سر اٹھاتے تو اتنا لمبا قومہ فرماتے کہ ہم سمجھتے شاید آپ سجدے میں جانا بھول ہی گئے ہیں۔"[2]

قومے میں اطمینان سے کھڑے ہو کر ذکر کرنا نبی اکرم ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا عملِ مبارک ہے اور جب نبی اکرم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ سامنے ہو پھر بھی اپنی مرضی سے جلدی جلدی "ٹکریں" مارنے والی ادا انتہائی تعجب خیز ہے۔

بعض لوگ باجماعت نماز پڑھتے ہوئے امام کے رکوع سے قومے کے لیے اٹھنے سے پہلے ہی سر اٹھا لیتے ہیں اور کھڑے ہو جاتے ہیں، جبکہ امام ابھی سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوا ہوتا، بلکہ وہ اس کے رکوع سے اٹھنے کا اشارہ پاتے ہی جھٹ سے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ کی بے آواز لاٹھی سے ڈرنا چاہیے، کیونکہ امام سے پہلے اپنا سر اٹھانے یا رکھنے پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ صحیح بخاری و مسلم اور شرح السنہ بغوی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات سے نہیں ڈرتا جبکہ وہ امام سے پہلے (رکوع و سجدے سے) سر اٹھا لیتا ہے کہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کہیں اس کے سر کو گدھے کا سر نہ بنا دے یا اس کی صورت کو مسخ کر کے اسے گدھے کی صورت نہ دے دے۔"[3]

بہر حال نماز کے طریقے کے ساتھ ساتھ جو دعائیں نبی مکرم ﷺ سے ثابت ہیں، انھیں بھی

[1] صحيح مسلم (١/ ١٥١)

[2] صحيح البخاري (١/ ٣٤٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٢٧)

آپ اچھی طرح یاد کریں۔ رکوع کی مختلف دعائیں رسول ﷺ سے ثابت ہیں، مگر یہاں ہم صرف دو دعاؤں کا ذکر کررہے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو پڑھیں اور کم از کم تین بار ضرور پڑھیں:

① «سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ»

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سے یہ سورت ﴿إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ نازل ہوئی ہے، رسولِ کریم ﷺ نے کوئی نماز ایسی نہیں پڑھی جس میں آپ ﷺ کثرت سے یہ دعا نہ کرتے ہوں:

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ»

لہٰذا ہمیں بھی اپنی نمازوں کے رکوع و سجود میں یہ دعائیں کثرت کے ساتھ پڑھنی چاہییں۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا:

''جب آدمی نماز ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے سارے گناہ اس کے کندھوں پر رکھ دیے جاتے ہیں، وہ جب بھی رکوع و سجود کرتا ہے تو اس کے گناہ گر جاتے ہیں۔''[1]

اگر کوئی جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے تو کوع کے بعد جب امام ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہے، تو آپ کہیں: ''اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا...'' یا صرف ''رَبَّنَا وَ لَكَ الْحَمْدُ'' اور اگر آپ اکیلے گھر میں یا کسی بھی جگہ نماز پڑھتے ہیں تو بھی یہ الفاظ رکوع کے بعد ضرور پڑھیں، ان کے پڑھنے کی بڑی فضیلت ہے۔ حضرت رفاعہ بن رافع زرقی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک دن نبی مکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا تو: ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہا، آپ ﷺ کے پیچھے ایک آدمی نے کہا:

«رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ، حَمْداً كَثِيْراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيْهِ»

''اے ہمارے پروردگار! تیرے ہی لیے ساری تعریفیں ہیں، بہت زیادہ، پاکیزہ اور بابرکت۔''

جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''یہ کلمات کس نے کہے ہیں؟''

اس صحابی نے کہا: میں نے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے تیس [۳۰] سے زیادہ فرشتوں کو ان کلمات کو لکھنے میں ایک دوسرے سے سبقت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧٠)

کرتے ہوئے دیکھا۔“[1]

اللہ اکبر! کتنا بڑا ثواب ہے...! ہمیں اس ثواب کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سات اعضا پر سجدہ:

سجدے کے سلسلے میں پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ سجدہ سات اعضا پر ہونا چاہیے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”مجھے حکم ہوا ہے کہ میں سات ہڈیوں (اعضا) پر سجدہ کروں۔ پیشانی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اپنی ناک کی طرف بھی اشارہ فرمایا، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے، دونوں پاؤں کی انگلیاں اور مجھے اس کا حکم ملا ہے کہ ہم اپنے کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹیں۔“[2]

نیز فرمایا:

”پھر جب تم سجدہ کرو تو اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ زمین پر خوب ٹکا کر رکھو۔ یہاں تک کہ تمھارے جسم کی تمام ہڈیاں اپنی اپنی جگہ پر پہنچ کر خوب ٹھہر جائیں۔“[3]

ہاتھوں کو رکھنے کی جگہ:

کتبِ حدیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ نمازی سجدے کے دوران میں اپنے دونوں ہاتھوں کو یا تو اپنے کانوں کے پاس (برابر) رکھے یا پھر اپنے کندھوں کے برابر (پاس)۔

کلائیاں یا بازو پہلوؤں سے الگ رکھنا:

اب یہ بات بھی بیان کر دیں کہ بعض نمازیوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بوقتِ سجدہ اپنی کلائیوں اور بازوؤں کو اپنے گھٹنوں کے ساتھ لگائے ہوئے اور پسلیوں سے جوڑے ہوئے ہوتے ہیں جو صحیح نہیں ہے، بلکہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ سجدے میں نمازی بازوؤں کو پہلوؤں سے ہٹا کر رکھے۔

صحیح مسلم، سنن ابو داود و ابن ماجہ اور شرح السنہ میں اُمّ المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

”نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو بازوؤں کو پہلوؤں سے الگ رکھتے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی پیچھے سے دیکھی جا سکتی تھی۔“

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٦)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٩٧) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٧)

[3] مسند أحمد (٤/ ٣٤٠) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٢٤)

بوڑھوں اور کمزوروں کے لیے رخصت:

سجدے کی مسنون کیفیت کے سلسلے میں جو احادیث ذکر کی جاچکی ہیں، ان کی رو سے بوقتِ سجدہ نمازی کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ تو اپنی کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھے، نہ پہلوؤں سے جوڑ کر رکھے اور نہ بازوؤں کو زمین پر بچھائے، بلکہ زمین سے اٹھا کر پہلوؤں اور گھٹنوں سے الگ رکھے۔ ظاہر ہے کہ تندرست و نوجوان مرد و زن اس کیفیت کو بہ آسانی اختیار کر سکتے ہیں، البتہ انتہائی بوڑھے اور بیمار و کمزور شخص کے لیے یہ انداز مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں ایسی صورت میں کہنیوں کو گھٹنوں پر لگانے کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے بحالتِ سجدہ کہنیاں پہلوؤں سے ہٹا کر اور اٹھا کر رکھنے میں مشقت کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”گھٹنوں (پر ٹیک لگا کر اُن) سے تعاون حاصل کر لو۔“[1]

فضائلِ سجدہ:

سجدے سے تعلق رکھنے والے امور میں سے ایک بات سجدے کا مقام و مرتبہ، عز و شرف اور فضیلت و اہمیت ہے۔

① نہایت درجہ قربِ الٰہی:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”بندہ اپنے رب کے قریب تر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو، لہٰذا سجدے میں کثرت سے دعائیں کیا کرو۔“[2]

② سجدے میں جنت ملنا اور شیطان کا رونا:

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

”جب بنی آدم آیتِ سجدہ پڑھے اور سجدہ کرے تو شیطان الگ ہو کر روتا اور کہتا ہے: میں برباد ہو گیا، ابنِ آدم کو سجدے کا حکم ملا تو اس نے سجدہ کر لیا اور جنت پائی، مجھے

---

[1] سنن أبي داود مع العون (٢/ ١٦٩) سنن البيهقي (٢/ ١١٧) مستدرك الحاكم (١/ ٢٢٩)

[2] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٢٠٠) سنن البيهقي (٢/ ١١٠) شرح السنة (٣/ ١٥١) صحيح ابن حبان (٥/ ٢٥٥)

سجدے کا حکم ہوا اور میں نے انکار کیا، جس سے میرا ٹھکانا جہنم ہو گیا ہے۔'' [1]

سجدہ ادا نہ کرنے کے نتیجے میں شیطانِ لعین راندۂ درگاہ ہوا تھا جبکہ اس کو ادا کرنا بندۂ مومن کے لیے باعثِ نجات و ذریعہ جنت ہے۔ خصوصاً اگر وہ حکمِ الٰہی اور حکمِ نبوی ﷺ کے بموجب کم از کم نمازِ پنجگانہ ہی میں سجدہ کر کے اس حکم سے عہدہ برآ ہو اور اگر کوئی شخص پنجگانہ فرائض ہی کا تارک ہے تو پھر وہ بھی سجدے کا نافرمان ہے اور اسے اپنا ٹھکانا معلوم ہونا چاہیے۔

③ رفاقتِ مصطفیٰ ﷺ:

سجدہ جہاں انسان کے لیے ذریعہ نجات و باعثِ جنت ہے، وہیں سجدے کی وجہ سے قیامت کے روز رفاقتِ مصطفیٰ ﷺ کی ضمانت بھی ہے، جیسا کہ حدیث گزری ہے۔

④ بلندیِ درجات:

صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے جنت میں لے جانے والا کوئی عمل پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''کثرت سے سجدے کو اختیار کر لو۔ تم جب بھی سجدہ کرو گے تو اللہ تمھارے ہر سجدے کے عوض تمھارا ایک درجہ بلند کرے گا اور ایک گناہ مٹائے گا۔'' [2]

⑤ نورِ جبیں:

اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہونے والی جبینِ نیاز قیامت کے دن خوب منور و روشن ہوگی، بلکہ وہ مومن کی پہچان بن جائے گی۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''جب اللہ اہلِ جہنم میں سے کسی پر رحمت کی نظر کرتا ہے تو فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اللہ کی عبادت کرنے والوں کو جہنم سے نکال لاؤ۔ وہ انھیں نکال دیتے ہیں۔ انھیں وہ سجدوں کے نشانات کی وجہ سے پہچانتے ہیں اور اللہ نے آگ پر حرام کر رکھا ہے کہ وہ سجدوں کے نشانات کو بھسم کرے۔ لہٰذا اہلِ جہنم میں سے عبادت گزار جہنم سے نکال دیے جائیں گے۔ پورے انسان کو آگ کھا جائے گی سوائے سجدوں کے نشانات کے۔'' [3]

---

[1] صحیح مسلم (۱/ ۲/ ٦٩) سنن البیهقي (۲/ ۲۱۲)

[2] صحیح مسلم (۲/ ٤/ ۲۰۵)

[3] صحیح البخاري (۲/ ۲۹۳) صفة الصلٰوة (ص: ۸۸)

سجود کے اَذکار وتسبیحات:

سجدے میں کم از کم تین مرتبہ ''سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡاَعۡلٰی''کہیں یا پھر یہ دعا پڑھیں:

《 سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمۡدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡ لِيۡ 》

یہ تسبیحات طاق یعنی تین، پانچ، سات، نو (۹) مرتبہ پڑھنے میں زیادہ اجر ہے۔

سجدے میں کمر سیدھی کرنا:

سنن ابنِ ماجہ، صحیح ابنِ خزیمہ اور ابنِ حبان میں حضرت علی بن شیبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمانو! اُس کی کوئی نماز نہیں جو رکوع یا سجدوں میں اپنی کمر کو صحیح طرح سے سیدھا نہ کرے۔''[1]

دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا:

جب نمازی (پہلے) سجدے کے اذکار وتسبیحات سے فارغ ہو جائے تو اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے سے اپنا سر اٹھائے اور پورے اطمینان سے بیٹھ جائے۔ اسے ''جلسہ بین السجدتین'' کہا جاتا ہے۔

دو سجدوں کے درمیان زیادہ وقفہ نہ بھی ہو تو کم از کم اتنا تو ضرور ہونا چاہیے جس میں جسم کے تمام جوڑ ایک مرتبہ اپنی اپنی جگہ پر رُک جائیں اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت متعدد مسنون دعاؤں میں سے کوئی ایک دُعا کی جا سکے۔

سجدوں کے درمیان دُعائیں:

ان دعاؤں میں سے ایک سنن ابو داود، ترمذی، ابنِ ماجہ، بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو سجدوں کے درمیان یہ دعا کیا کرتے تھے:

《 اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡ لِيۡ وَارۡحَمۡنِيۡ وَاهۡدِنِيۡ وَعَافِنِيۡ وَارۡزُقۡنِيۡ 》

''اے اللہ! میری مغفرت فرما، مجھ پر رحم کر، مجھے ہدایت و عافیت دے اور مجھے رزق سے نواز۔''

دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کو ''جلسہ'' کہتے ہیں۔ دوسرے سجدے کے بعد بھی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحیح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٧١) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٠٠) صحيح ابن حبان (٥/ ٢١٧)

تھوڑی دیر سیدھے بیٹھتے جسے ''جلسۂ استراحت'' کہا جاتا ہے اور پھر قیام کے لیے کھڑے ہوتے۔[1]

اسی طرح آپ اپنی دوسری رکعت کو مکمل کریں۔ اگر نمازی دو رکعت والی نماز پڑھ رہا ہے تو پھر تشہد کے لیے بیٹھ جائے۔ پہلے تشہد میں دایاں پاؤں کھڑا رکھنا اور بائیں پاؤں پر بیٹھنا مسنون ہے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب التحیات میں بیٹھتے تو دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھتے اور اپنے انگوٹھے کو اپنی درمیانی انگلی پر رکھ کر حلقہ بنا کر شہادت کی انگلی اوپر اٹھاتے۔[2]

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''انگشتِ شہادت اٹھانا شیطان کو تلوار یا نیزہ مارنے سے زیادہ سخت ہے۔''[3]

احادیث میں انگشتِ شہادت کلمہ شہادت کے وقت اٹھانے کی کوئی صراحت نہیں، لہٰذا آغازِ تشہد سے لے کر آخر تشہد تک مسلسل اٹھائی جائے۔

تشہد کی مسنون دعا:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو کہو:

«اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ، اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ»[4]

''(میری ساری) قولی، بدنی اور مالی عبادات صرف اللہ کے لیے خاص ہیں۔ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر اللہ کی رحمت، سلامتی اور برکتیں نازل ہوں، اور ہم پر اور اللہ کے (دوسرے) نیک بندوں پر بھی سلامتی ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٣٥٥)

[2] صحيح مسلم، مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (ص: ٩٠٨)

[3] مسند أحمد (٣/ ١١٩) مشكاة المصابيح (٩١٧)

[4] صحيح البخاري (١/ ٣٥٨)

درود شریف:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى (اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى) آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى (اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى) آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ»[1]

''اے اللہ! ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر درود بھیج اور آپ (ﷺ) کی آل پر بھی، جس طرح کہ تو نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی آل پر درود بھیجا، یقیناً تو تمام تعریفوں والا اور صاحبِ مجد و ثنا ہے۔ اے اللہ! ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر اور آپ ﷺ کی آل پر برکتیں نازل فرما، جس طرح تو نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی آل پر برکتیں نازل کیں، یقیناً تو صاحبِ حمد و مجد ہے۔''

نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

''جب کوئی نماز پڑھے تو اللہ کی حمد و ثنا سے آغاز کرے، پھر اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ پر درود بھیجے، اس کے بعد جو چاہے مانگے۔''[2]

التحیات، درود شریف اور دعاؤں سے فارغ ہونے کے بعد ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہہ کر نماز ختم کرنا مسنون ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''طہارت نماز کی کنجی ہے۔ نماز کا آغاز تکبیر اور اختتام سلام کہنا ہے۔''[3]

نبی کریم ﷺ کے طریقے سے نماز پڑھنے کے لیے ہمیں کسی بھی مسلک کو سامنے نہیں رکھنا چاہیے، کیونکہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے ہمیں ہر قسم کی نماز کو عمل میں لا کر ہمیں طریقہ بتا دیا ہے، وہ نماز چاہے عام فرض ہو یا نمازِ جمعہ ہو یا تہجد کی نماز ہو یا پھر عید کی نماز ہو یا سنت و نوافل ہوں، نماز سفر کی ہو یا بیماری کی حالت میں پڑھی جانے والی ہو، نبی کریم ﷺ نے ہر قسم کی نماز ادا کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دکھلائی اور اسی کا حکم بھی فرمایا، جیسا کہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

---

[1] صحيح البخاري (٦/ ٤٠٨) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ١٢٦)

[2] سنن الترمذي (٢/ ٢٠٧)

[3] سنن الترمذي (١/ ١٥)

«صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ»[1]

''تم بعینہٖ اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

اس ارشادِ گرامی سے معلوم ہوا کہ ہماری نماز کی قولی وفعلی حالت ہو بہ ہو نبی اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے نمونے کے مطابق ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ کے طریقے سے ہماری نمازیں جتنی زیادہ ملتی ہوں گی دربارِ الٰہی میں شرفِ قبولیت بھی اتنا ہی زیادہ ملے گا اور پھر عمل کرنے کے لیے ہمارے پیشِ نظر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا وہ مسلک ہے جس میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا جو رکوع و سجود ٹھیک سے ادا نہیں کر رہا تھا، جب وہ آدمی نماز سے فارغ ہوا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے بلا کر کہا:

''تم نے نماز صحیح نہیں پڑھی اور اگر اسی طرح پڑھتے پڑھتے مر گئے تو طریقۂ اسلام کے خلاف مرو گے۔''

ایک دوسرے صحابی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کو نمازِ عید سے پہلے نفل پڑھتے دیکھا تو اسے منع کیا۔ وہ شخص کہنے لگا: اللہ تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پر عذاب نہیں کرے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تجھے سنت کی مخالفت کرنے پر ضرور عذاب دے گا۔''

اتباعِ سنت کے معاملے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہی سوچ ہمارا مسلک ہے۔ سنتِ رسول ﷺ سے محبت کا یہی جذبہ ہمارا مذہب ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سنتوں کی کتنی قدر و قیمت اور اہمیت تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے اس فرمانِ مبارک سے آگاہ ہے:

«مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ»[2]

''جس شخص نے میری سنت اختیار کرنے سے گریز کیا وہ مجھ سے نہیں۔''

تو میرا خیال ہے کہ کوئی مسلمان اس فرمان کو پڑھ کر یا سن کر کسی بھی سنت کو معمولی اور غیر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١)

[2] صحيح البخاري، كتاب النكاح، صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب استحباب النكاح، سنن الترمذي، كتاب الصوم، باب ما جاء في الرخصة في ترك صوم عاشوراء.

اہم سمجھ کر نظر انداز کرنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ سنتِ رسول ﷺ سے محبت کرنے اور اتباعِ سنت کی فکر و سوچ عام کرنے کا جذبہ ہر مسلمان کے دل میں ہونا چاہیے، کیونکہ سنت کے بغیر ہمارا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ بندے کے اعمال کا دار و مدار اس کی نیت پر ہے، اگر نیت میں صرف رضائے الٰہی ہے اور طریقہ پیغمبر ﷺ کا ہے تو اجر و ثواب کی امید رکھے، ورنہ نہیں۔ کیونکہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی۔''

تشہد کی دعائیں:

آخری تشہد کے بعد سلام سے پہلے بہت ساری دعائیں ہیں جن میں بندہ اپنے اللہ تعالیٰ سے قبر کے عذاب، جہنم کے عذاب، زندگی و موت کے فتنے، مسیح دجال کے فتنے کے شر اور قرض سے اللہ کی ہر قسم کی پناہ پکڑتا ہے۔ جن میں سے ایک یہ ہے:

«اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ»

''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں جہنم کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے اور موت و حیات کے فتنے سے اور مسیح دجال کے فتنے کے شر سے۔''

نماز کے بعد مسنون دُعائیں:

فرض نماز ادا کرنے کے بعد اذکار کی بہت فضیلت ہے، لہٰذا انھیں بھی کوشش کر کے پڑھنا چاہیے۔ نمازی سلام کے بعد ''اللہ اکبر'' کہے، پھر تین مرتبہ ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ'' کہے، پھر یہ مسنون دعائیں پڑھنے پر بہت اجر اور ثواب ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''ہر نماز کے بعد [۳۳] مرتبہ سبحان اللہ، [۳۳] مرتبہ الحمد للہ اور [۳۴] مرتبہ اللہ اکبر پڑھا کرو، اس کا بہت اجر و ثواب ہے، اللہ تعالیٰ اس بندے کے گناہ معاف کردے گا، خواہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔''[1]

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دو دفعہ فرمایا: ''معاذ! اللہ کی قسم! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' پھر فرمایا: ''میں تمھیں وصیت کرتا ہوں

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٩٧)

کہ ہر نماز کے بعد یہ دُعا ترک نہ کرنا اسے ضرور پڑھنا۔'' اس دُعا کے الفاظ یہ ہیں:

«اَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلَىٰ ذِكْرِكَ وَ شُكْرِكَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِكَ» [1]

''اے اللہ! تو اپنا ذکر کرنے اور اپنا شکر ادا کرنے اور اچھے انداز سے اپنی عبادت ادا کرنے میں میری مدد فرما۔''

ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھ کر ان کے پاس سے گزرے تو اس وقت وہ اپنی نماز پڑھنے کی جگہ پر بیٹھی اللہ کا ذکر کر رہی تھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کے وقت واپس تشریف لائے اور وہ وہیں پر بیٹھی ملیں تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تیرے بعد میں نے چار کلمات تین مرتبہ کہے ہیں، تم نے صبح سے اب تک جو کچھ پڑھا ہے، اگر اس کے ساتھ ان کلمات کا وزن کیا جائے تو اِن کا وزن بڑھ جائے گا اور وہ کلمات یہ ہیں:

«سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَ رِضَا نَفْسِهٖ وَ زِنَةَ عَرْشِهٖ وَ مِدَادَ كَلِمَاتِهٖ»

''اللہ پاک ہے اور اپنی تعریف کے ساتھ اپنی مخلوق کی گنتی کے برابر اور اپنے نفس کی رضا کے برابر اور اپنے عرش کے وزن کے برابر اور اپنے کلمات کی سیاہی کے برابر۔''

سنن ابن ماجہ کی ایک حدیث (۲/ ۳۳۱) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص صبح کے وقت ایک سو (۱۰۰) مرتبہ کہے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ»

اس کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک گردن آزاد کرنے کا ثواب ملے گا اور اس کے دس گناہ معاف کیے جائیں گے اور اس کے دس درجے بلند کیے جائیں گے اور وہ شام تک شیطان سے حفاظت میں رہے گا اور اگر شام کو یہ کلمات کہے تو صبح تک یہی فضیلت حاصل رہے گی۔

اس طرح درود شریف پڑھنے کا بھی بہت اجر و ثواب ہے، نمازِ فجر اور مغرب کے بعد کم از کم دس بار ضرور پڑھیے۔ اسی طرح آیت الکرسی پڑھنے کا بھی بہت اجر و ثواب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''فرض نماز کے بعد جو کوئی اسے پڑھتا ہے، اس کے اور جنت کے درمیان صرف اس کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٩٠)

موت کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔‘‘[1]

سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھنے کا بھی بہت اجر ہے۔ حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

’’جس نے یہ دو آیتیں رات کے وقت پڑھیں تو اُس کے لیے یہ کافی ہو جائیں گی۔‘‘[2]

اسی طرح قرآنِ کریم کی آخری دو سورتوں [سورۃ الفلق اور سورۃ الناس] کی بھی بڑی فضیلت ہے، انھیں بھی پڑھنا چاہیے۔ ان سورتوں سے اپنے آپ کو صبح و شام اور رات سوتے وقت دم کرتے رہنا چاہیے، خاص طور پر جادو ٹونا اور نظرِ بد کے مریض کو ان سورتوں کے ساتھ اہتمام سے دم کرنا چاہیے، بفضل اللہ شفا ہو گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

’’صبح اور شام کے وقت تین مرتبہ معوذتین پڑھو، یہ ہر مصیبت اور تکلیف سے بچنے کے لیے کافی ہوں گی۔‘‘[3]

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ہمیں صحیح سنت کے مطابق نماز پڑھنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ
3. نماز میں عدمِ پابندی کا انجام اور تارکِ نماز کا حکم۔ تالیف: ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ ابو عبد اللہ علی بن محمد مغربی رحمہ اللہ، ترجمہ: حافظ عبد الغفار مدنی
5. نماز کا بیان۔ تالیف: مولانا محمد اقبال کیلانی
6. بے نماز کا شرعی حکم۔ تالیف: الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ
7. نمازِ باجماعت کی اہمیت و فضیلت۔ تالیف: الشیخ عبد العزیز بن عبد اللہ ابن باز رحمہ اللہ۔

ترجمہ: ابو عبد الرحمٰن شبیر بن نور

---

[1] صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٤٦٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٠٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٦١) صحيح البخاري مترجم (١/ ٨١ مطبوعه كراچی)

نماز باجماعت اور دیگر مسائل

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ البقرۃ (آیت:۴۳) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾

''نماز پڑھا کرو اور زکات دیا کرو اور (اللہ تعالیٰ کے آگے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔''

نماز باجماعت:

نماز کو باجماعت ادا کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ مذکورہ آیتِ مبارکہ نمازِ باجماعت ادا کرنے کے لیے نص صریح یعنی واضح حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر محض نماز ادا کرلینا ہی کافی ہوتا تو آیتِ مبارکہ کے آخر میں:

﴿وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ''اور (اللہ تعالیٰ کے آگے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔''

کہنے کی قطعاً ضرورت نہ ہوتی، کیونکہ نماز پڑھنے کا حکم تو آیت کے ابتدائی حصے ہی میں آچکا تھا، مگر مسئلہ جماعت کی اہمیت کا ہے، جیسا کہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں اور کافروں کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل جنگ کے لیے تیار کھڑی ہوں اور ایک لمحے کی بھی غفلت مسلمانوں کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہو، تو ایسے نازک وقت میں بھی باجماعت نماز ادا کرنے کا حکم ہے۔

سورۃ النساء (آیت:۱۰۲) میں اللہ عز وجل اپنے نبی مکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

﴿وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً﴾

''اور (اے پیغمبر!) جب تم (مجاہدین کے) لشکر میں ہو اور ان کو نماز پڑھانے لگو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمھارے ساتھ مسلح ہو کر کھڑی رہے، جب وہ سجدہ کر چکیں تو پرے ہو جائیں پھر دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی (ان کی جگہ) آئے اور ہوشیار اور مسلح ہو کر تمھارے ساتھ نماز ادا کرے۔ کافر اس گھات میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ تو تم پر یک بارگی حملہ کر دیں۔''

قرآنِ کریم کی اس آیت سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حالتِ جنگ بلکہ عین دورانِ جنگ میں بھی نمازِ باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب آپ خود اندازہ کریں کہ حالتِ امن وسکون میں کیا حکم ہونا چاہیے؟

نمازِ باجماعت کی اگر کسی کو معافی مل سکتی تھی تو وہ دشمن کے سامنے صف آرا ان لوگوں کو مل سکتی تھی جنھیں دشمن کے حملے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا، کیونکہ میدانِ جہاد ترکِ جماعت کا سب سے زیادہ، مناسب اور اہم موقع ہے، اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے کسی شرعی مجبوری کے بغیر ترکِ جماعت کی رخصت نہیں دی۔ نمازِ باجماعت ترک کرنے والوں کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴾ [القلم: ٤٢، ٤٣]

''جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائے گا اور کفار سجدے کے لیے بلائے جائیں گے تو سجدہ نہ کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ان پر ذلت چھا رہی ہو گی حالانکہ پہلے (اس وقت) سجدے کے لیے بلائے جاتے تھے جب کہ وہ صحیح وسالم تھے۔''

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا جس طرح کہ اس کی شان کے لائق ہے، تو اس وقت ہر مومن مرد اور عورت اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے البتہ وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جو دکھلاوے اور شہرت کے لیے سجدے کیا کرتے تھے، وہ اس وقت سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن ان کی ریڑھ کی ہڈی کے منکے تختے کی طرح ایک ہڈی

بن جائیں گے جس کی وجہ سے ان کے لیے [سجدے میں] جھکنا ناممکن ہوجائے گا۔‘‘[1]

قیامت کے دن مجرم سر جھکائیں نہایت ذلت و رسوائی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے کیونکہ دُنیا میں تکبر و سرکشی کی وجہ سے ان کی گردنیں اکڑی ہوئی تھیں، صحت اور سلامتی کی حالت میں جب انھیں عبادت کے لیے بلایا جاتا تھا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے سے انکار کردیتے تھے، اس لیے ان کی کمر تختہ بن جائے گی۔ ان کے لیے یہ ممکن ہی نہ ہوگا کہ وہاں عبادت گزار ہونے کا جھوٹا مظاہرہ کرسکیں، اس لیے وہ سجدہ کرنا چاہیں گے تو چت گر پڑیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن انھیں یہ سزا دینا ہے، اس لیے وہ ان کے اور ان کے سجدے کے درمیان حائل ہوگیا، اس لیے کہ جب انھیں دنیا میں سجدے کے لیے بلایا گیا تھا تو انھوں نے موذن کی پکار کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس سے یہ واضح ہوگیا کہ منادی کا جواب مسجد میں نمازِ با جماعت ادا کرنا ہے۔

موذن کی پکار کی اہمیت کا اندازہ اللہ کے ولیوں کے طرزِ عمل سے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عامر بن عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بسترِ مرگ پر تھے، زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ ان کے گھر والے ان کے پاس بیٹھے رو رہے تھے اور وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے کہ ان کے کانوں میں مغرب کی اذان کی آواز پڑی، ان کی سانس ان کے حلق میں پھنس رہی تھی، نزع کا عالم شدید تھا، تکلیف حد سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اذان کے بعد اپنے آس پاس موجود لوگوں سے کہا کہ میرا ہاتھ پکڑو، لوگوں نے کہا کہ کہاں جائیں گے؟ کہا: مسجد...! لوگوں نے کہا کہ آپ اس حال میں مسجد جائیں گے؟ انھوں نے جواباً کہا: ’’سُبُحَانَ اللہ‘‘ میں نماز کے لیے موذن کی اذان سنوں اور لبیک نہ کہوں؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم لوگ میرا ہاتھ پکڑو، دو آدمی انھیں مسجد لائے، ایک ہی رکعت امام کے ساتھ ادا کی پھر سجدے ہی میں ان کی روح پرواز کرگئی اور وہ سجدے کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ سبحان اللہ... کیا قسمت ہے؟![2]

جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی اہمیت کا اندازہ اُس حدیث سے بھی ہوتا ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

’’ایک نابینا آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ میری راہنمائی کرنے والا کوئی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩١٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٩)

نہیں ہے جو مجھے مسجد تک لے آیا کرے۔ کیا مجھے گھر میں نماز ادا کرنے کی اجازت ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمھیں اذان سُنائی دیتی ہے؟'' اس نے کہا: جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے اسے حکم دیا: ''تب نماز باجماعت میں ضرور پہنچا کرو۔''[1]

ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ وَ لَمْ يَأْتِ فَلَا صَلٰوةَ لَهٗ اِلَّا مِنْ عُذْرٍ))[2]

''جس آدمی نے اذان سنی اور اس کے باوجود نماز کے لیے نہیں پہنچا، اس کی نماز قابلِ قبول نہیں، الا یہ کہ اس کے پاس عذر ہو۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ عذر سے کیا مراد ہے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جان یا مال کا خطرہ یا بیماری۔''

قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا سب سے اہم فرض ہے، جو کسی بھی صورت میں نہیں چھوڑا جاسکتا۔ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے ثواب کے متعلق حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

''باجماعت نماز ادا کرنے میں تنہا نماز ادا کرنے کے مقابلے میں ستائیس درجے زیادہ اجر وثواب ہے۔''[3]

نماز باجماعت ادا کرنے کا اجر وثواب بہت زیادہ ہے، لیکن افسوس کہ مسلمانوں کی اکثریت محض سُستی اور کوتاہی کی وجہ سے نماز باجماعت کا اہتمام نہیں کرتی جو کھلم کھلا گناہ ہے اور اس کا انجام بھی بہت خطرناک ہے۔ اتنے اہم حکمِ شریعت پر کسی مسلمان کو سُستی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں نمازِ باجماعت کا حکم دیا ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اس کی مزید وضاحت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کثرت سے نماز کا تذکرہ قرآنِ کریم میں فرمایا ہے، اس کے فضائل بیان کیے ہیں، اسے باجماعت اور پابندی سے ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ بھی بتادیا ہے کہ اس معاملے میں سُستی اور کوتاہی کا مظاہرہ کرنا منافقین کی نشانی ہے۔

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٣)

[2] سنن ابن ماجه (٧٩٣) المستدرك للحاكم (٨٩٤)

[3] صحيح مسلم (١/ ١٩٩)

رسولِ کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں حالتِ علالت میں بھی نبی مکرم ﷺ کو جس چیز کی سب سے زیادہ فکر تھی، وہ نماز تھی۔ وفاتِ اقدس سے چند لمحے پہلے آپ ﷺ نے امت کو جو آخری وصیت فرمائی، وہ یہ تھی:

''مسلمانو! نماز اور اپنے غلاموں کا ہمیشہ خیال رکھنا۔''

نبی مکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ سے نماز کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ہمیں بھی پوری زندگی اپنے پیارے نبی کریم ﷺ کی اس وصیت کو مانتے ہوئے اپنی نمازوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے، بالخصوص زندگی کے آخری ایام میں اللہ تعالیٰ کی حمدوتسبیح اور استغفار کا کثرت سے اہتمام کریں۔ رکوع میں کثرت کے ساتھ اپنے رب کی عظمت کو بیان کریں اور سجدے میں دعائیں مانگیں، سجدے میں کی گئی دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔[1]

نمازِ عشا، نمازِ عصر اور نمازِ فجر کی فضیلت:

1. حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

''منافقین پر فجر اور عشا کی نماز سے زیادہ بھاری کوئی نماز نہیں اور اگر وہ ان کی فضیلت جان لیں تو وہ ان میں ضرور حاضر ہوں، خواہ ان کو گھٹنوں کے بل گھسٹ کر ہی کیوں نہ آنا پڑے۔''[2]

2. سورۃ البقرہ (آیت: ۲۳۸) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾

''(مسلمانو!) سب نمازیں خصوصاً درمیانی نماز (نمازِ عصر) پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو اور اللہ کے آگے ادب سے کھڑے رہا کرو۔''

3. نمازِ فجر اور نمازِ عصر باجماعت پڑھنے کی فضیلت صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں بھی آئی ہے۔ حضرت قیس بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نبی مکرم ﷺ کے پاس موجود تھے کہ آپ ﷺ نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر فرمایا:

''تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے تم اس چاند کو دیکھ رہے ہو اور اس

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٥)

وقت دیکھنے میں تمھیں کوئی بھیڑ محسوس نہیں ہوگی، پس اگر استطاعت رکھتے ہو کہ تم سے دو نمازیں طلوعِ شمس و غروبِ شمس سے قبل [فجر و عصر] فوت نہ ہوں تو ایسا ضرور کرو۔''

پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے سورت طٰہ کی (آیت: ۱۳) کی تلاوت فرمائی جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى﴾

''اور میں نے تم کو انتخاب کر لیا ہے تمھیں جو حکم دیا جائے اُسے سنو۔''[1]

خاص کر ان دو نمازوں کا ذکر اور ان کی اہمیت و تاکید کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں اکثر سستی ہوجاتی ہے۔ نمازِ فجر نیند اور نمازِ عصر کاروباری مصروفیات کی وجہ سے رہ جاتی ہے یا کم از کم لیٹ ہوجاتی ہیں، اس لیے ان کی خاص تلقین کی گئی ہے۔ ورنہ نمازیں پوری پانچ ہی فرض ہیں جیسا کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

۴ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں رات اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے بعد باری باری آتے ہیں اور فجر و عصر کی نماز وہ میں جمع ہوجاتے ہیں، پھر رات گزارنے والے فرشتے اوپر چڑھتے ہیں، پس [اللہ تعالیٰ] ان سے سوال کرتا ہے۔''

مسلم شریف کی روایت میں ہے:

''ان کا رب ان سے پوچھتا ہے، حالانکہ وہ ان کے بارے میں زیادہ جانتا ہے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کیسے چھوڑا؟ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ ہم نے ان کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس گئے تو بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔''[2]

۵ ان نمازوں کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ نبیِ رحمت ﷺ نے فرمایا:

''نمازِ فجر و عصر کی پابندی کرنے والا جہنم میں ہرگز داخل نہیں ہوگا۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٤، ٥٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٣) سنن الترمذي، كتاب صفة الجنة، رقم الحديث (٢٥٥١)

[2] صحيح البخاري، كتاب المواقيت، رقم الحديث (٥٥٥) صحيح مسلم، كتاب المساجد (٤٣٢)

[3] صحيح مسلم (١/ ٤٤٠)

نمازِ باجماعت اور تیمّم:

نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''پوری زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور پاک کرنے والی (ذریعہ تیمّم وطہارت) بنادی گئی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی نماز کا وقت آجائے وہاں پر ہی نماز ادا کرلینی چاہیے۔''[1]

خواہ گھر میں ہو، آفس میں ہو یا دکان میں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نماز باجماعت مسجد میں پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ یہ فہم صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث امتِ محمدیہ ﷺ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے چونکہ پچھلی امتوں کے لیے نماز کی جگہ صرف عبادت خانے اور گرجے وغیرہ ہی تھے، اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ اعزاز عطا فرمایا اور اسے بہت سی خصوصیتیں عطا فرمائیں جو گزشتہ امتوں کو نہیں ملی تھیں، البتہ مسلمانوں کی نماز کا وقت جب آئے تو زمین پر کسی جگہ نماز پڑھ لے، ساری جگہیں پاک ہیں۔

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت عمران رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''ہم ایک سفر میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، جب آپ ﷺ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے ایک آدمی کو الگ تھلگ بیٹھے دیکھا جس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔ نبی مکرم ﷺ نے اس سے مخاطب ہوکر فرمایا: اے فلاں! تمھیں لوگوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرنے سے کس چیز نے روکا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں جنابت میں مبتلا ہوگیا ہوں لیکن (غسل کے لیے) پانی نہیں ہے۔ یہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تمھارے پاس مٹی ہے (اس سے تیمّم کرلو) یہی تمھارے لیے کافی ہے۔''[2]

سورۃ المائدہ (آیت: ٦) میں بھی فرمانِ الٰہی ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَ أَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَ إِنْ كُنْتُمْ

---

[1] صحيح البخاري (١/ ١٢٦) صحيح مسلم (١/ ٣٧٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٤٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ١٨٩ تا ١٩٢)

جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

”مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھو لیا کرو) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو اور اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء سے ہو کر آیا ہو یا تم نے عورتوں کو مس کیا ہو اور تمھیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اُس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (یعنی تیمّم) کر لو، اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔“

قرآنِ کریم کی آیت اور مذکورہ احادیث سے پتا چلتا ہے کہ نماز کسی حال میں بھی معاف نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو پکا نمازی بنائے۔ ایک حدیث قدسی میں فرمانِ الٰہی ہے:

”سب سے زیادہ اہم چیز جس سے میرا بندہ میرا تقرب حاصل کرتا ہے وہ فرائض ہیں جو میں نے اس پر فرض کیے، میرا بندہ [فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ] نوافل سے بھی میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔“[1] اللہ اکبر!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو شخص صبح یا شام مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مہمانی تیار کرتا ہے۔ جب بھی وہ صبح یا شام کو جائے۔“[2]

باجماعت نماز ادا کرنے کی فضیلت بہت ساری احادیث سے ثابت ہے اور بالخصوص مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرنا اور پھر مسجدیں تو بنائی ہی اسی لیے جاتی ہیں کہ وہاں کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اسی کے نام کی بڑائی بیان ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٠٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥)

﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [التوبة: ١٨]

''اللہ کی مسجدوں کی رونق اور آبادی تو ان کے حصے میں ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں۔''

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی، کچھ لوگ چلے گئے اور کچھ بیٹھے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی جلدی آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سانس پھولا ہوا تھا اور جلدی کی وجہ سے کپڑا گھٹنوں سے اٹھا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''خوش ہو جاؤ! تمھارے رب نے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھولا ہے، اللہ تمھاری وجہ سے فرشتوں پر فخر کرتے ہوئے فرماتا ہے:
میرے بندوں کی طرف دیکھو، ایک فریضہ ادا کر چکے ہیں اور دوسرے کا انتظار کر رہے ہیں۔''[1]

تارکِ جماعت کے لیے وعید:

بروقت اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا بہت اجر و ثواب ہے، اس کے برعکس جماعت کے ساتھ نماز نہ ادا کرنے والوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعید فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

''میں نے پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ نماز کا حکم دوں اور جب اذان ہوجائے تو کسی کو حکم دوں کہ وہ میری جگہ لوگوں کو نماز پڑھائے اور میں ایسے لوگوں کی طرف جاؤں جو نمازِ باجماعت میں شریک نہیں ہوئے اور میرے ہمراہ ایسے ساتھی ہوں جن کے پاس لکڑیوں کا گٹھا ہو اور میں جماعت میں نہ پہنچنے والوں کے گھروں کو ان کے سمیت جلادوں لیکن مجھے ایسا کرنے سے اس بات نے روکا ہوا ہے کہ گھروں میں عورتیں اور بچے ہیں۔''[2]

چنانچہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ باجماعت نماز کا اہتمام کرے اور کوشش کر کے نماز کے لیے پہنچے اور اپنی اولاد کو، اپنے قریبی رشتے داروں کو، اپنے پڑوسیوں اور تمام مسلمان بھائیوں کو اس ضمن میں بار بار تاکید کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اسی شکل میں ہوسکتی

[1] صحيح سنن ابن ماجه للألباني، رقم الحديث (٦٦٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥١)

ہے کہ ہم پانچ وقت کی نمازوں کو باجماعت ادا کریں اور اس طرح ایک مسلمان منافقوں کی مشابہت سے بھی دور ہوسکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی جن بری اور قابلِ نفرت عادتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک عادت نماز کے بارے میں سُستی کا مظاہرہ بھی ہے۔

عورت کی جماعت کا حکم:

رہا معاملہ عورت کی جماعت کا تو اس مسئلے کے دو پہلو ہیں:

① پہلا یہ کہ آیا کوئی عورت کسی شکل میں مردوں کی امامت کرا سکتی ہے؟

اس سلسلے میں جمہور علماے امت کا مسلک یہ ہے کہ عورت کا مردوں کی امامت کرانا ناجائز ہے، ان کا استدلال ابن ماجہ کی اس روایت سے ہے:

《لَا تَؤُمَّنَّ امْرَأَةٌ رَجُلًا》[1] ''کوئی عورت کسی مرد کی امامت ہرگز نہ کرائے۔''

عورت چونکہ مردوں کے لیے اذان ہی نہیں کہہ سکتی تو وہ ان کی امامت بھی نہیں کراسکتی۔

② اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ عورت صرف عورتوں کو جماعت کرا سکتی ہے یا نہیں؟

تو اس بات کا جواب متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ نبی مکرم ﷺ کے حکم اور اذن سے یہ جائز ہے، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ وہ مردوں کی طرح بحیثیت امام آگے بڑھ کر الگ کھڑی نہیں ہوگی۔ بلکہ صف کے اندر ہی وسط میں رہے گی، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو سنن دارقطنی و بیہقی، مسند احمد اور مصنف عبدالرزاق میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ہے:

《اِنَّهَا أَمَّتْهُنَّ، فَقَامَتْ بَيْنَهُنَّ فِيْ صَلٰوةٍ مَكْتُوْبَةٍ》[2]

''انھوں نے عورتوں کو فرض نماز کی امامت کرائی اور وہ ان کے درمیان کھڑی ہوئیں۔''

دوسری حدیث امام شافعی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے، جس میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں صراحت موجود ہے:

《اِنَّهَا أَمَّتْهُنَّ، فَقَامَتْ وَسَطاً》[3]

''انھوں نے عورتوں کی امامت کروائی اور ان کے وسط میں کھڑی ہوئیں۔''

---

[1] نيل الأوطار (٢/ ٣/ ١٦٣)

[2] عون المعبود (٢/ ٣٠١) الفتح الرباني (٥/ ٢٣٥)

[3] عون المعبود (٢/ ٣٠١)

ان احادیث سے پتا چلتا ہے کہ عورت عورتوں کی جماعت کروا سکتی ہے، لیکن نبی مکرم ﷺ کی بتائی ہوئی شرط کے مطابق صف کے وسط میں کھڑے ہوکر، لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ اس حدیث پر عمل کریں، گھر کے اندر اگر ایک سے زیادہ عورتیں ہوں تو جماعت کا اہتمام کیا کریں، کیونکہ اکیلے نماز پڑھنے سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے۔

عورت کے لیے مسجد میں نماز پڑھنے کے بجائے گھر میں نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے، پھر بھی اگر مسجد میں جا کر نماز پڑھنا چاہتی ہیں تو پڑھ سکتی ہیں لیکن اس کے لیے پردے اور طہارت کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ ہماری کچھ بہنوں نے نماز تو نہیں پڑھنی ہوتی، یعنی حیض کی حالت میں ہوتی ہیں، پھر بھی بیت اللہ اور عام مسجدوں میں داخل ہوجاتی ہیں جب کہ اس حالت میں حرم تو کیا عام مسجد میں داخل ہونا بھی منع ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں جنبی اور حائضہ عورت کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔''[1]

اس حدیث سے پتا چلتا ہے کہ حیض کی حالت میں عورت مسجد میں داخل نہیں ہوسکتی۔ جب عام مسجد میں داخل ہونا منع ہے تو پھر حرم مکی، بیت اللہ یا مسجد نبوی میں عورت کیسے جاسکتی ہے؟ جبکہ بیت اللہ تو اللہ کا ایک خاص گھر ہے، اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض ہم نماز کی پابندی کی بات کر رہے تھے کہ ہمیں ہر حال میں نماز پڑھنی ہے، کسی بھی حال میں معاف نہیں۔ جماعت کے ساتھ ہر مسلمان کو پانچوں وقت نماز کی پابندی کرنی چاہیے۔ اپنے بچوں کو بھی سات سال کی عمر ہی میں نماز پڑھنے کا حکم دیا کریں اور جب یہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر ان سے سختی کی جائے اور یہ ہر ماں باپ کا فرض ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ نماز کی پابندی کرے اور جماعت کے ساتھ نمازوں کو ادا کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ نماز ہی مسلمانوں اور کافروں میں فرق کرنے والی چیز ہے۔

مسلمان بہنو اور بھائیو! نماز چاہے عورت چھوڑے یا مرد دونوں کے لیے نبی مکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے:

---

[1] سنن أبي داود مترجم (١/ ١١٨)

''ہمارے اور کافروں کے درمیان اصل فرق نماز کا ہے، پس جس نے نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔''[1]

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا ذکر شروع کیا تو فرمایا:

''جس نے اس کی پابندی کی اس کے لیے قیامت کے دن یہ نورِ صراط، دلیلِ خیر اور ذریعہ نجات بن جائے گی اور جس نے اس کی پابندی نہ کی تو اس کے لیے یہ نور ہوگی، نہ برہان اور نہ ذریعہ نجات ہی، اور قیامت کے دن اس کا حشر قارون، فرعون، ہامان اور اُبی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔''[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سب سے پہلے جس عمل کا حساب ہوگا، وہ نماز ہے۔ اگر یہ صحیح ہوئی تو سارے اعمال ہی صحیح ہوں گے اور اگر یہ خراب ہوئی تو سارے اعمال ہی خراب نکلیں گے۔''[3]

لہٰذا مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز کا خیال رکھے نماز کے وقت اپنی تمام تر مشغولیات ترک کرے اور نماز کے وقت سونے کے ساتھ ساتھ ہر اس چیز کو چھوڑ دے جو نماز سے اس کو دور رکھتی ہے۔

بعض لوگوں کے لیے یہ امر بڑا مشکل ہوسکتا ہے، لیکن انسان جب خود کوشش اور نفس سے مجاہدہ کرتا ہے تو سب کام ساز گار ہوجاتے ہیں، جسے وہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اور اس کا نفس اس معاملے میں اس کا غلام بن جاتا اور اس کا ایسا تابع و فرمانبردار ہوجاتا ہے کہ خیر کی راہ میں وہ اس کا معاون بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ نفس کو اس نے خیر کا عادی بنادیا ہے۔ چنانچہ نماز کا جب وقت ہوتا ہے تو آپ کا دل شاد ہوجاتا ہے، یعنی نماز کا وقت ہونے پر نفس خوش ہوجاتا ہے اور پوری راحت و سرور کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور یہی حال باقی سب اعمال میں رہتا ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠٩) سنن ابن ماجه، برقم (١٠٦٨)

[2] مختصر صحيح مسلم للألباني (٣٠٤) صحيح ابن حبان (١٤٦٧) مسند أحمد (٦٥٤٠)

[3] نيل الأوطار مع المنتقى (١/ ١/ ٢٩٥)

لیکن اس کے برعکس جب آپ اس میں غفلت برتتے ہیں، اس کو اہمیت نہیں دیتے، دوست واحباب کے ساتھ گپ شپ کرنے یا نمازِ فجر وعصر کے وقت سونے میں نفسِ امارہ کی پیروی کرتے ہیں تو ایسے میں شیطان آپ سے ضرور کھلواڑ کرے گا۔ آپ پر اور آپ کے دل پر خواہشِ نفس عزیز ہوگی، اللہ کے پاس جو کچھ نعمتیں ہیں ان سے رغبت کم ہوجائے گی اور نماز بارِگراں ومشکل بن جائے گی۔ کیونکہ دل تو خواہشِ نفس اور شیطان کی پیروی کرکے کمزور ہوچکا ہے اور شیطان نے بندے پر ہر اچھائی کے کام کو بوجھل بنا دیا اور اس کے حق میں نقصان دہ تعلیل وتاویل کو مزین کر دیا ہے۔ جیسے یہ کہنا: اللہ معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے، اللہ درگزر کرنے اور مہربانی کرنے والا ہے۔ وہ اس کو اپنے باطل کی دلیل بناتا ہے اور وہ سورۃ الحجر (آیت ۴۹، ۵۰) میں اللہ تعالیٰ کے اُس فرمان کو بھول جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴾

''(اے پیغمبر!) میرے بندوں کو بتا دو کہ میں بڑا بخشنے والا (اور) مہربان ہوں اور یہ کہ میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے۔''

اسی طرح ہر مسلمان کو قرآنِ کریم کی سورۃ النور (آیت: ۵۶) پر غور کرنا چاہیے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾

''اور نماز پڑھتے رہو اور زکات دیتے رہو اور پیغمبرِ الٰہی کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔''

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ''تارک الصلوٰۃ'' (ص: ۱۹۸) میں لکھا ہے:

''جو تارکِ نماز ہیں، ان پر یہ امور مرتب ہوتے ہیں:

① اس کا شمار زمرہ کفار میں ہوگا۔
② نماز اور دیگر ارکانِ اسلام کی پابند مسلمان عورت سے اس کی شادی جائز نہیں۔
③ اس کے کافر یا کم ازکم فاسق ہونے کی وجہ سے اس کی گواہی قابلِ قبول نہ ہوگی۔

④ اگر توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے۔

⑤ اس کے مرنے پر اسے غسل نہ دیا جائے، نہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔

⑥ اسے اس کے مسلمان رشتہ داروں کی وراثت سے حصہ نہیں دیا جائے گا اور نہ اس کے مرنے پر اس کی وراثت تقسیم ہوگی، بلکہ اس کا سارا مال بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا۔''[1]

ہمیں چاہیے کہ نمازوں کی پابندی کریں اور ہر نماز کو اس کے اصل وقت پر ادا کریں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء (آیت:۱۰۲) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾

''اور جب تو ان میں موجود ہو، پس ان کے لیے نماز کھڑی کرے تو لازم ہے کہ ان میں سے ایک جماعت تیرے ساتھ کھڑی ہو اور وہ اپنے ہتھیار پکڑے رکھیں، پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسری جماعت آئے جنھوں نے نماز نہیں پڑھی، پس تیرے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار پکڑے رکھیں۔ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا چاہتے ہیں کاش کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامانوں سے غفلت کرو تو وہ تم پر ایک ہی بار حملہ کر دیں۔ اورتم پر کوئی گناہ نہیں اگر تمھیں بارش کی وجہ سے کچھ تکلیف ہو، یا تم بیمار ہو کہ اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دو اور اپنے بچاؤ کا سامان پکڑے رکھو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

[1] مختصراً از تطهير المجتمعات (ص: ۸۷، ۸۹)

اس قسم کے نمازی کے متعلق سورۃ المنافقون (آیت: ۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴾

''مومنو! تمھارا مال اور اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے اور جو ایسا کرے گا تو وہ لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔''

علمائے تفسیر کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس آیت میں ذکرِ الٰہی سے مراد پانچ نمازیں ہیں۔ جو آدمی کاروباری مصروفیات یا بچوں کے کھیل کود میں نمازوں کو بے وقت کر کے پڑھتا ہے، قیامت کے دن وہ خسارہ پانے والا ہوگا۔[1]

ایسے نمازیوں کے بارے میں قرآنِ کریم کے تیسویں پارے کی سورۃ الماعون کی (آیت: ۴، ۵) میں اللہ تعالیٰ نے بڑی سخت وعید سُنائی ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ﴾

''تو ایسے نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے۔ جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔''

اس آیت میں جس ویل وہلاکت کا ذکر آیا ہے اس ویل کی تشریح کرتے ہوئے امام طبری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جہنم کی ایک وادی کا نام ویل ہے، جو جہنمیوں کے پیپ سے بہتی ہے، یعنی اس قسم کے نمازیوں کے لیے ویل وجہنم ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ کے غضب اور دردناک سزا سے بچنے کے لیے ہمیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنی چاہیے، اسی میں ہماری دنیا اور آخرت کی خیر ہے۔ جس انسان کے پاس معمولی سوجھ بوجھ اور بصیرت ہو اسے معلوم ہے کہ نماز میں کس قدر فائدے ہیں اور کس قدر بھلائیاں اس میں پوشیدہ ہیں۔ نماز ایک ایسا عمل ہے جو کسی بھی حال میں معاف نہیں ہے، چاہے حالتِ امن ہو یا حالتِ خوف، گرمی ہو یا سردی، تندرستی ہو یا بیماری حتیٰ کہ جہاد وقتال کے موقع پر عین میدانِ جنگ میں بھی یہ فرض معاف نہیں ہوتا۔ البتہ موقع کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے آسانی ضرور فرما دی ہے، مثلاً:

---

[1] الزواجر للهيتمي (١/ ١٣٣)

[2] مختصر الطبري (ص: ٧٠٤)

بیماری میں پورا اجر:

کوئی سفر میں ہے یا کوئی بیمار ہے، ایسا مریض جس میں واقعتاً کھڑے ہونے کی ہمت ہی نہ ہو، اس کے بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے سے اس کے اجر و ثواب میں فرق نہیں آتا، جیسا کہ صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب اللہ کا کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر پر نکلتا ہے تو اس کے لیے ویسا ہی اجر لکھا جاتا ہے جیسا کہ اس کے مقیم و تندرست ہونے کے ایام میں (اس کے عمل پر) لکھا جاتا تھا۔''[1]

اسی طرح مسند احمد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب اللہ اپنے کسی مسلمان بندے کو کسی جسمانی بیماری میں مبتلا کرتا ہے تو (فرشتے کو) کہتا ہے: اس کے نامہ اعمال میں اتنی ہی نیکیاں (مسلسل) لکھتے رہو جتنی یہ (ایامِ صحت میں) کیا کرتا تھا۔ پھر اگر اسے اللہ شفا بخش دے تو اس کے گناہوں کو دھو کر اسے پاک کر دیتا ہے اور اگر اس کی روح قبض کر لے تو اس کی مغفرت فرما دیتا ہے اور اس پر بارانِ رحمت نازل فرماتا ہے۔''

مسافر کی نماز:

اسی طرح مسافر کو بھی نماز کا حکم ہے۔ دینِ اسلام آسان دین ہے۔ وہ بندے کو اتنا ہی مکلّف کرتا ہے جتنے کی وہ طاقت رکھتا ہے اور ایسے احکامات کی تعمیل کا وہ حکم نہیں دیتا جن کے کرنے کی اس میں طاقت نہیں۔ سفر کے دوران میں چونکہ مشقت اور دشواری سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں دو چیزوں کی رخصت دی ہے:

① نماز میں قصر کرنا:

نماز میں قصر اس طرح کی جائے گی کہ چار رکعت والی نمازوں کی دو رکعتیں پڑھیں، البتہ دو یا تین رکعت والی نماز میں قصر نہیں ہے۔ لہٰذا فجر اور مغرب کی نمازیں پوری پڑھی جائیں گی۔ تاہم مغرب کی سنتیں نہیں پڑھی جائیں گی۔ نماز میں قصر کی مشروعیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے نیک بندوں کے لیے ایک آسانی اور رخصت ہے اور اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس کی عطا کی ہوئی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٧٤)

رخصت پر عمل کیا جائے، جس طرح وہ چاہتا ہے کہ اس کے فرائض کو ادا کیا جائے۔

قصر کی یہ رخصت کسی مخصوص دشواری کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ سفر خواہ موٹر کار سے ہو یا ہوائی جہاز سے یا ریل گاڑی سے یا پھر کسی جانور پر ہو یا پیدل چل کر ہو، ان تمام ذرائع کے استعمال کو سفر کہا جاتا ہے، لہٰذا ان تمام صورتوں میں نماز قصر کی جائے گی۔

② جمع بین الصلاتین:

مسافر کے لیے جائز ہے کہ وہ دو نمازوں کو ایک وقت میں باہم جمع کر کے پڑھ لے، چنانچہ ظہر اور عصر کے درمیان اور اسی طرح مغرب اور عشا کے درمیان جمع کر کے دو نمازیں ایک ہی وقت میں پڑھی جائیں گی۔ ایک بات واضح رہے کہ جمع بین الصلوٰتین پر عمل صرف ظہر اور عصر کے درمیان اور مغرب اور عشاء کے درمیان ہی کیا جا سکتا ہے، چنانچہ فجر اور ظہر یا عصر اور مغرب یا عشا اور فجر میں جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر وقت صحیح سنت کے مطابق پانچوں نمازیں پڑھنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین ثم آمین

فرض نمازوں کے علاوہ سنتِ موکدہ کی فضیلت:

یہ تو تھی فرض نماز کی فضیلت قرآن و حدیث کے حوالے سے، اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”جو مسلمان ہر روز اللہ کی فرض کردہ نماز کے علاوہ بارہ رکعت سُنت نماز بھی پڑھے گا تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ جنت میں ایک گھر بنائے گا۔“[1]

اسی طرح عصر کی نماز سے پہلے چار سنت نماز پڑھنے کی بہت فضیلت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اللہ کی رحمت اس بندے پر ہو جو عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے۔“[2]

سفر کی حالت میں فجر کی سنتوں اور وتر کے علاوہ باقی نمازوں کی سنتوں کو چھوڑ دینا سنت ہے۔

حفص بن عاصم بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مکے کے راستے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا۔ انھوں نے ہمیں نمازِ ظہر کی دو رکعات پڑھائیں۔ پھر ہم آپ کے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۲۸)

[2] صحیح الترغیب، رقم الحدیث (۵۸۸)

ساتھ وہاں چلے گئے جہاں ہم نے پڑاؤ ڈالا تھا، آپ بھی بیٹھ گئے اور ہم بھی، اسی دوران میں ان کی نظر اس جگہ کی طرف گئی جہاں انھوں نے نماز پڑھائی تھی۔ دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ ابھی تک کھڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے پوچھا: یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا: یہ نفلی نماز پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا: اگر مجھے نفلی نماز پڑھنی ہوتی تو میں ظہر کی نماز پوری پڑھتا (یعنی قصر نہ کرتا) پھر فرمایا:

اے میرے بھتیجے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعات سے زیادہ نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح قبض کرلی۔ پھر میں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی سفر کیا، لیکن انھوں نے بھی دو رکعات سے زیادہ نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ ان کی روحیں اللہ تعالیٰ نے قبض کرلیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾

”تم کو پیغمبرِ الٰہی کی پیروی (کرنی) بہتر ہے (یعنی) اُس شخص کو جسے اللہ (سے ملنے) اور روزِ قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ اللہ کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔“[1]

جہاں تک سنتِ فجر اور نمازِ وتر کا تعلق ہے تو انھیں سفر و حضر دونوں حالتوں میں نہیں چھوڑنا چاہیے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سنتِ فجر کے متعلق بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔[2]

نمازِ وتر کی فضیلت:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کو مستقل ایک نماز قرار دیا ہے اور اس نماز کی بہت زیادہ فضیلت اور اہمیت بیان فرمائی ہے۔ اس نماز کو عشا کے ساتھ جوڑ دینے کا سبب دراصل یہ ہے کہ اس نماز کا وقت نمازِ عشا کے بعد سے شروع ہوکر طلوعِ فجر تک رہتا ہے۔ بہر حال اس نماز کی بہت فضیلت و اہمیت

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١١٠١، ١١٠٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٨٩) و اللفظ لمسلم.

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١١٥٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٢٤)

ہے۔ نبی مکرم ﷺ نمازِ وتر میں قرآنِ کریم کی سورتوں میں سے ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَىٰ﴾ اور ﴿قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھتے تھے۔ جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ کہتے:

«سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ رَبُّ الْمَلَآئِكَةِ وَ الرُّوْحِ»

''پاک ہے بادشاہ، بہت ہی پاکیزگی والا، فرشتوں اور روح کا رب۔''

تیسری مرتبہ یہ کلمات بلند آواز سے کہتے اور آواز لمبی کرتے۔[1]

نبی رحمت ﷺ پانچ فرض نمازوں کے علاوہ نمازِ تہجد، نمازِ اشراق، نمازِ چاشت، تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد کا بھی اہتمام فرمایا کرتے۔ آپ ﷺ کی نمازِ تہجد کے قیام کے بارے میں معروف حدیث ہے کہ آپ ﷺ رات کو اتنا طویل قیام فرمایا کرتے تھے کہ آپ ﷺ کے قدمِ مبارک سوج جاتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ حَتّٰى تَفَطَّرَ قَدَمَاهُ»

''نبی اکرم ﷺ رات کو اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپ ﷺ کے قدمِ مبارک (سوجن سے) پھٹ جاتے تھے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی:

«لِمَ تَصْنَعُ هٰذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ»

''اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اگلے پچھلے تمام گناہ بخش دیے ہیں؟''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَفَلَا اُحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا؟»[2]

''تو کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ بننا پسند نہ کروں؟''

پھر خاص خاص مواقع پر اپنے رب کے حضور توبہ و استغفار کے لیے نماز ہی کو ذریعہ بناتے۔ جب کبھی کوئی پریشانی یا تکلیف آتی تو مسجد تشریف لے جاتے اور نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد

[1] سنن النسائي (٣/ ٢٤٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٠)

طلب فرماتے، جیسا کہ سورۃ البقرہ (آیت: ۴۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴾

’’اور (رنج و تکلیف میں) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو اور بیشک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر (گراں نہیں) جو عجز و انکساری کرنے والے ہیں۔‘‘

سورۃ الزمر (آیت: ۱۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

’’جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بیشمار ثواب ملے گا۔‘‘

اسی طرح جب سفر سے واپسی ہوتی تو پہلے آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے جاتے۔ نماز ادا کرنے کے بعد پھر آپ ﷺ اپنے گھر تشریف لاتے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی رحمت سے اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو لوگ مستقل نماز چھوڑے بیٹھے ہیں یا سستی کا شکار ہیں۔ ان سب بہن بھائیوں سے میری درخواست ہے کہ آج ہی اپنے رب رحمٰن سے توبہ کرلیں اور اپنی باقی کی عمر میں نمازوں کی پابندی اور نیک عمل کرکے اپنے رب کو راضی کرلیں کیونکہ کسی کو کیا خبر کہ اس کی عمر کی شام کب اور کہاں ہوجائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے نماز پڑھنے سے پہلے ہی ہماری نماز پڑھ دی جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نمازوں کی بہت فکر رہتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخموں سے بری طرح گھائل اور موت و حیات کی کشمکش میں بھی نماز کی فکر میں تھے۔ انھوں نے پوچھا: کیا میں نے نماز مکمل کی تھی؟ لوگوں نے بتایا کہ نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارگاہ الٰہی میں عرض کرنے لگے: اے اللہ مجھے نماز مکمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ زندگی کے آخری لمحات میں انھوں نے اپنی حکومت کے بارے میں پوچھا نہ بیوی کے بارے میں، نہ بچوں کے بارے میں اور نہ وراثت کے بارے میں، انھیں فکر تھی تو اس بات کی کہ وہ اللہ کے حضور پیش ہونے سے قبل فجر کی نماز ادا کرلیں۔ اللہ اکبر...!

آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں صحت اور مہلت بھی دی ہوئی ہے تو کیوں نہ ہم اس وقت کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے رب کی نافرمانیوں سے بچنے کی کوشش کریں، کیونکہ اللہ اپنے نافرمانوں سے غافل نہیں ہے۔ اگر اس نے دنیا میں کسی کو مہلت دی ہے تو قیامت کے دن وہ مواخذہ الٰہی سے نہیں بچ سکے گا اور کافروں، نافرمانوں کے لیے وہ دن اتنا ہولناک ہوگا کہ ان کی

آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اور یہ ظالم اس دن کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑے وقت کی ہی مہلت دے تاکہ ہم تیرا فرمان مان لیں اور تیرے پیغمبروں کی اطاعت میں لگ جائیں۔ لیکن وہاں کچھ فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس دن جو کسی نے کیا ہوگا، اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ مرد و عورت کے درمیان کچھ فرق نہیں کیا جائے گا۔

① عبادت میں اخلاص للہ:

ہر قسم کی عبادت کرنے سے پہلے ایک بات ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی عبادت اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک اس میں دو شرطوں کا لحاظ نہ رکھا جائے:

① ہماری ہر قسم کی عبادت صرف حصولِ رضائے الٰہی کے لیے ہو، اس میں کسی قسم کا دکھاوا ہو نہ اس عبادت کا مقصود کسی اور کو خوش کرنا ہو۔

② اتباعِ رسول ﷺ۔ اتباعِ رسول ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ہر عبادت نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق ہو۔ سنتِ رسول ﷺ کے سامنے ہمارے مال و اولاد حتیٰ کہ ہماری جان بھی کوئی قیمت نہیں رکھتی، یہی نبی مکرم ﷺ کے ساتھ پیار کا اظہار اور سنت پر عمل کی شرط بھی ہے۔

اگر ان دونوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی فوت ہوگئی تو ہماری ساری کی ساری عبادات رائیگاں ہو جائیں گی، جیسا کہ سورۃ البینہ (آیت: ۵) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾

''اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔''

نبی رحمت ﷺ کا بھی ارشاد ہے:

((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ))[1]

''اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔''

پھر راہِ حق کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہم اپنی وسعت و حیثیت کے مطابق جد و جہد کرتے رہیں اور جس کے لیے اللہ تعالیٰ آسانی فرما دے، اس کے لیے وہاں پہنچنا دشوار نہیں ہے، جبکہ ہماری راہنمائی کے لیے نبی کریم ﷺ کی یہ ہدایت بھی موجود ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١)

''میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، اگر تم انھیں مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے، ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب اور دوسری میری سنت ہے۔''[1]

اس لیے آپ اس بات کا خاص اہتمام کریں کہ آپ کی عبادت و اطاعت اللہ کی شریعت، اس کے رسول ﷺ کی سنت اور سلفِ صالحین کے طریقے کے موافق ہو۔ غرض نماز، روزہ، حج اور دیگر عبادات میں ان شرطوں کا خاص خیال رکھنے کی کوشش کیجیے۔

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَ اغْفِرْلَنَا وَ ارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کرنا۔ اے ہمارے پروردگار! جیسے اگلے لوگوں پر تو نے بھاری بوجھ ڈالا تھا ویسا ہم پر مت ڈال۔ مالک ہمارے! جس بوجھ کے اٹھانے کی ہم کو طاقت نہیں وہ ہم سے مت اٹھوا اور ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہمارے عیبوں کو ڈھانپ دے (اور آخر میں ہم کو رسوا نہ کر دینا) اور ہم پر رحم فرما (کہ دوبارہ گناہ میں نہ پڑیں) تو ہی ہمارا مولا (حامی و مددگار اور آقا) ہے تو ہماری مدد کر کافروں کے مقابل میں۔''

﴿ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ [الإبراهيم: ٤٠، ٤١]

''اے میرے پالنے والے! مجھ کو نماز کا پابند رکھ اور میری اولاد سے بھی، اے ہمارے رب ہماری دعا قبول فرما۔ اے اللہ! حساب (وکتاب) کے دن مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش اور مومنوں کی مغفرت فرما۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سنت کے مطابق وضو کرنے اور بروقت و مسنون طریقے سے باجماعت نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں ہر اس کام کی توفیق بخشے جس میں اس کی رضا شامل ہو اور جو ہماری دنیا و آخرت کی اصلاح کا ذریعہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفس کی شرارت اور

[1] مستدرك الحاكم، صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٩٣٧) الصحيحة، رقم الحديث (١٧٦١)

بُرے اعمال کی نحوست سے محفوظ فرمائے۔ کافروں اور منافقوں کی مشابہت سے دور رکھے اور ہمیں انبیا وصدیقین اور شہدا و صالحین کا ساتھ نصیب فرمائے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَ ارْحَمْنِيْ اَللّٰھُمَّ آمِيْن.

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ
3. نماز میں عدمِ پابندی کا انجام اور تارکِ نماز کا حکم۔ تالیف: ابو عدنان الشیخ محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ ابوعبداللہ علی بن محمد مغربی رحمہ اللہ، ترجمہ: حافظ عبدالغفار مدنی
5. نماز کا بیان۔ تالیف: مولانا محمد اقبال کیلانی
6. بے نماز کا شرعی حکم۔ تالیف: الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ
7. نمازِ باجماعت کی اہمیت وفضیلت۔ تالیف: الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ ابن باز رحمہ اللہ
ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

ذکر و دعا کی فضیلت

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

① سورۃ البقرۃ (آیت: ۱۵۲) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ ﴾

''تم میرا ذکر کرو میں تمھیں یاد کیا کروں گا اور میرا شکر ادا کرو۔''

ذکر کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جابجا دعا مانگنے اور ذکر کرنے کا حکم فرمایا ہے، جیسا کہ ایک مقام کا تذکرہ ہوگیا ہے۔

② نیز سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۱) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴾

''اے اہلِ ایمان! اللہ کا بہت ذکر کیا کرو۔''

③ اسی طرح سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۵) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

''اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں، کچھ شک نہیں کہ ان کے لیے اللہ نے بخشش اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

④ سورت آل عمران (آیت: ۱۹۱) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾

''(عقلمند وہ ہیں) جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔''

⑤ سورت سجدہ (آیت: ۱۵، ۱۶) میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾

''اور وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے، ان کی پشتیں راتوں کو بھی چارپائی سے الگ رہتی ہیں۔ وہ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے وہ خرچ کرتے ہیں۔''

اللہ کے بندے عبادت اور انقیاد کا راستہ اختیار کرتے ہیں، جاہلوں اور کافروں کی طرح تکبر نہیں کرتے، کیونکہ اللہ کی عبادت سے تکبر کرنا جہنم جانے کا سبب ہے۔ مومن ہر وقت اپنے اللہ کے سامنے عاجزی، ذلت و مسکینی اور خشوع و خضوع کا اظہار کرتے ہیں۔ راتوں کو اٹھ کر نوافل (تہجد) پڑھتے، توبہ و استغفار، تسبیح وتحمید، دعا اور الحاح و زاری کرتے ہیں، یعنی اس کی رحمت اور فضل و کرم کی امید بھی رکھتے ہیں اور اس کے عتاب و غضب اور مواخذہ و عذاب سے ڈرتے بھی ہیں۔ محض امید ہی امید نہیں رکھتے کہ عمل سے بے پروا ہو جائیں (جیسے بے عمل بلکہ بدعمل لوگوں کا شیوہ ہے) اور نہ عذاب کا اتنا خوف طاری کر لیتے ہیں کہ اللہ کی رحمت ہی سے مایوس ہو جائیں، کیونکہ یہ مایوسی بھی کفر و ضلالت ہے، اس لیے اہلِ ایمان اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں۔

دعا و پکار کیا ہیں؟

میری مسلمان بہنو (اور بھائیو)! دعا و پکار دراصل التجائیں ہیں جو انسان اپنے رب کے حضور پیش کرتا ہے۔ مشکل ترین اوقات میں بے اختیار اس کی زبان سے ''یا اللہ'' ''یا رحیم'' نکلتا ہے۔ اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ اس کو پکاریں، وہ ان کی دعاؤں کو قبول کرے گا۔

⑥ سورۃ المومن (آیت: ۶۰) میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

''اور تمھارے رب نے کہا ہے: تم مجھے پکارو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا۔''

⑦ سورۃ الاعراف کی (آیت: ۲۰۵) میں اللہ عزوجل کا فرمان کچھ اس طرح ہے:

﴿ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾

”اور اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف سے، پست آواز سے صبح و شام یاد کرتے رہو اور (دیکھنا) غافل نہ ہونا۔“

قرآنِ کریم کی اس آیت سے واضح ہوگیا کہ بلند آواز سے دعا کرنے کی نسبت آہستہ دعا کرنے میں زیادہ عاجزی و انکساری ہوتی ہے اور پھر ریاکاری و دکھلاوے کا بھی خطرہ و خدشہ نہیں ہوتا، جس کے آجانے سے اجر و ثواب نہ صرف کم ہوجاتا بلکہ عمل کا کوئی وزن ہی نہیں رہتا، یعنی ثواب ختم ہوگیا۔

اس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ایک فرمانِ عالی شان صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابی داود میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، کچھ آدمی بلند آواز سے تکبیریں کہہ رہے تھے، رسول اللہ ﷺ نے انھیں فرمایا:

”لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو، تم کسی بہرے غائب کو تو نہیں پکارتے، تم سننے والے دیکھنے والے کو پکارتے ہو اور وہ ہر وقت تمھارے ساتھ ہے اور جس کو تم پکار رہے ہو وہ تو تمھاری سواری کی گردن سے بھی تمھارے زیادہ قریب ہے۔“

⑧ سورۃ البقرۃ (آیت: ۱۸۶) میں اس طرح فرمایا ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾

”اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں کہہ دیجیے کہ میں ان کے قریب ہوں۔“

اور آگے فرمایا:

﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾

”جب کوئی دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔“

اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں مفسرینِ کرام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”جب کوئی شخص مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار یا دعا کو صرف سنتا ہی نہیں بلکہ شرفِ قبولیت بھی بخشتا ہوں۔“

لہٰذا لوگوں کا یہ کہنا اور سمجھ لینا ٹھیک نہیں کہ اللہ ہم گنہگاروں کی دعا کب سنتا اور قبول کرتا

ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآنِ کریم کی اس آیت پر غور کرنا چاہیے جس میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کی سنتا ہے، ویسے ہی ہم گنہگاروں کی بھی سنتا ہے اور اسے شرفِ قبولیت بخشتا ہے، لہٰذا دعا صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی چاہیے، وہی ہماری التجائیں سنتا ہے اور ہماری مصیبتوں کو ٹالتا بھی ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم کسی وسیلے کے بغیر براہِ راست اپنے رب سے مانگیں جو ہمارا خالق و مالک ہے اور وہ ہی ہماری امیدوں کا مرکز ہے، جیسا کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

''جس چیز کو اللہ تعالیٰ عطا کرے، اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جس چیز کو وہ روک لے، اس کو کوئی دینے والا نہیں۔''[1]

دعا کی اہمیت یہی کیا کم ہے کہ قرآنِ کریم کی ان آیات کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے ایک صحیح حدیث میں اسے ''عبادت'' قرار دیا ہے۔[2] اس کو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ قدر چیز بتایا ہے۔[3]

بارانِ رحمت کے نزول میں رکاوٹ:

قرآنِ کریم کی سابقہ آیت اور حدیثِ رسول ﷺ سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ بلند آواز کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو سنتا ہے، یعنی اپنے دل میں اپنے رب کو یاد کرنا زیادہ افضل ہے۔ جیسا کہ اس بات کا پتا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے ایک شخص کے واقعہ سے بھی چلتا ہے، واقعہ کچھ اس طرح ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل سخت قحط سالی میں مبتلا ہو گئے۔ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جمع ہو گئے اور انھوں نے عرض کی: اے اللہ کی ہم کلامی کا شرف پانے والے کلیم اللہ! اپنے رب سے ہمارے لیے دعا مانگیں کہ وہ بارش برسا کر ہمیں پانی سے نوازے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک صحرا کی طرف نکل گئے۔ اُس وقت وہاں ان کی تعداد ستر ہزار یا اس سے بھی زیادہ تھی... وہ سب اللہ کے حضور اکٹھے ہو گئے اور دعائیں مانگنے لگے، جبکہ وہ پراگندہ بال وفقیرانہ حال تھے، بھوکے اور پیاسے بھی تھے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے بھی یوں دعا مانگنا شروع کیا: یا الٰہی! ہمیں بارش عطا فرما۔ ہم پر اپنی رحمتیں نازل کر اور شیر خوار بچوں، بے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٤٤)

[2] سنن أبي داود، سنن الترمذي، رياض الصالحين (١٤٧٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٥) مستدرك الحاكم، مسند أحمد، الأدب المفرد للبخاري، صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٩٢)

زبان جانوروں اورخمیدہ کمر بوڑھوں کی بدولت ہم پر رحم فرما۔

آسمان سے پانی کی بوند تک نہ گری، بلکہ الٹی قحط سالی بڑھی اور سورج کی تمازت و حرارت میں شدّت آ گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا مانگی کہ اے اللہ! ہمیں بارانِ رحمت سے نواز۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: تمھیں بارشوں سے کیوں نوازوں جبکہ تمھارے مابین ایک شخص وہ ہے جو چالیس برس سے گناہوں میں مبتلا مجھے کھلا چیلنج کر رہا ہے۔ لوگوں میں اعلان کریں کہ وہ شخص تمھارے مابین سے باہر نکل جائے کیونکہ اسی کے سبب میں نے تم سے بارشیں روک رکھی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں اعلان کرتے ہوئے فرمایا: اے نافرمان شخص! جو چالیس سالوں سے اللہ کی معصیت و نافرمانی کر کے اسے چیلنج کر رہا ہے... ہمارے مابین سے اٹھ کر نکل جاؤ... صرف تیری وجہ سے ہم سب سے بارشیں روک دی گئی ہیں... اس نافرمان بندے نے اپنے دائیں بائیں دیکھا مگر کسی کو اس اجتماع سے باہر جاتے نہ پایا... اب اسے یقین ہو گیا کہ خود وہی مطلوب ہے۔

اس نے اپنے دل میں کہا: اگر ان تمام لوگوں میں سے اٹھ کر باہر نکل جاؤں تو پورے بنی اسرائیل کی نظر میں ذلیل ورسوا ہو جاؤں گا اور اگر میں شرم کے مارے بیٹھا رہا تو میری وجہ سے یہ سب لوگ بارشوں سے محروم رہیں گے ... یہ سوچ کر وہ بہت ہی دل شکستہ ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ... اس نے اپنے افعال پر ندامت کی وجہ سے اپنا سر منہ اپنے کپڑوں (گریبان) میں چھپا لیا اور اللہ کے حضور یوں عرض گزار ہوا: یا الٰہی! اے میرے آقا و مولیٰ! میں نے چالیس سال تک تیری نافرمانی کی... اس کے باوجود تو نے میری پردہ پوشی کی اور مجھے مہلت دیے رکھی ... اب میں سرِ تسلیم خم کیے تیرا مطیع وفرمانبردار بن کر تیرے دربار میں حاضر ہو گیا ہوں، میری اس حاضری کو قبول فرما...

اب اس نے اپنے خالق و مالک کے سامنے گریہ و زاری کرنا شروع کر دی ...وہ ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ بادلوں کا ایک سفید ٹکڑا اٹھا، آسمان کے وسط میں بلند ہوا اور اس نے یوں زور دار بارش برسانا شروع کر دی جیسے مشکیزوں کے منہ کھل گئے ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر تعجب میں مبتلا ہوگئے اور اپنے رب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: اے اللہ! تو نے ہمیں بارش عطا فرما دی ہے جبکہ ہمارے مابین سے کوئی بھی آدمی اٹھ کر باہر نہیں گیا... اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے اسی شخص کے اشک ہائے ندامت کی بدولت آپ کو

بارش عطا کی ہے، جس کی نافرمانیوں کے سبب ہم نے بارش روک رکھی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: یاالٰہی! وہ مطیع وفرمانبردار بندہ مجھے بھی دکھلا دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے اپنے اس بندے کو اس وقت بھی ذلیل و رسوا نہیں کیا تھا جبکہ وہ میری نافرمانیاں کیا کرتا تھا، کیا میں اسے لوگوں کے سامنے اب رسوا کردوں، جبکہ وہ میرا مطیع وفرمانبردار بن کر میرے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکا ہے؟[1]

سبحان اللہ! اس واقع سے آپ خوب اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے لیے کتنا رحیم اور کریم ہے، نیز اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ نیچی آواز سے اپنے رب کو یاد کرنے کے بجائے اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور آواز کے بغیر صبح و شام اپنے رب کو یاد کرنا زیادہ بہتر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بندے کے اس یقین کے مطابق ہوں جو وہ میری بابت رکھتا ہے اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اپنے دل میں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، تو میں اسے یاد کرتا ہوں اپنے دل میں اور اگر وہ مجھے یاد کرے کسی محفل میں تو میں اسے یاد کرتا ہوں ایسی محفل میں جو ان کی محفل سے زیادہ بہتر ہے۔''[2]

کیونکہ ہماری محفل بہت اچھی بھی ہوگی تو اس کے گناہگار بندے ہی ہوں گے، مگر اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نوری فرشتوں کی محفل میں یاد کریں گے۔ اللہ اکبر.

ذکرِ الٰہی کی فضیلت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو راستوں میں پھرتے رہتے ہیں اور اللہ کو یاد کرنے والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔ پھر جہاں وہ کچھ ایسے لوگوں کو پالیتے ہیں جو اللہ کا ذکر کررہے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں کہ آؤ ہمارا مطلب حاصل ہوگیا۔ پھر وہ پہلے آسمان تک اپنے پروں سے اُن پر امنڈتے رہتے ہیں۔

پھر اپنے رب کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان کا رب ان سے پوچھتا ہے کہ میرے بندے کیا

---

[1] ''مچھلی کے پیٹ میں'' تالیف: ڈاکٹر محمد بن عبد الرحمٰن العریفی، ترجمہ: الشیخ ابو عدنان محمد منیر قمر۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٤٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥)

کہتے تھے؟ حالانکہ وہ اپنے بندوں کے متعلق خوب جانتا ہے۔ وہ جواب دیتے ہیں: وہ تیری تسبیح پڑھتے تھے، تیری کبریائی بیان کرتے تھے، تیری حمد کرتے تھے اور تیری بڑائی کرتے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: کیا انھوں نے مجھے دیکھا ہے؟ وہ جواب دیتے ہیں: نہیں، واللہ! انھوں نے تجھے نہیں دیکھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: پھر اس وقت ان کا کیا حال ہوتا اگر وہ مجھے دیکھے ہوئے ہوتے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اگر وہ تیرا دیدار کر لیتے تو تیری عبادت اور بھی بہت زیادہ کرتے، تیری بڑائی اور تسبیح سب سے زیادہ کرتے۔

پھر اللہ تعالیٰ دریافت کرتا ہے کہ وہ مجھ سے کیا مانگتے ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ جنت مانگتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ دریافت کرتا ہے: کیا انھوں نے جنت دیکھی ہے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں: نہیں، واللہ! اے ہمارے رب! انھوں نے جنت نہیں دیکھی۔ اللہ تعالیٰ دریافت کرتا ہے: ان کا اس وقت کیا عالم ہوتا اگر انھوں نے جنت کو دیکھا ہوتا؟ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اگر انھوں نے جنت دیکھی ہوتی تو وہ اس کے اور بھی زیادہ خواہشمند ہوتے، سب سے بڑھ کر اس کے طلبگار اور آرزومند ہوتے۔

پھر اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ وہ لوگ کس چیز سے پناہ مانگتے ہیں؟ فرشتے جواب دیتے ہیں: دوزخ سے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے: کیا انھوں نے جہنم کو دیکھا ہے؟ وہ جواب دیتے ہیں: نہیں، واللہ! انھوں نے جہنم کو نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اگر انھوں نے اسے دیکھا ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ اگر انھوں نے اسے دیکھا ہوتا تو اس سے بچنے میں وہ سب سے آگے ہوتے اور سب سے زیادہ اس سے خوف کھاتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمھیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی۔

نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس پر ان میں سے ایک فرشتے نے کہا کہ ان میں فلاں بھی تھا جو ان ''ذاکرین'' میں سے نہیں تھا، بلکہ وہ کسی ضرورت سے آ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ یہ ''ذاکرین'' وہ لوگ ہیں جن کی مجلس میں بیٹھنے والا بھی نامراد نہیں رہتا۔''[1]

اہلِ ذکر کو (جو مسنون اذکار کے ساتھ اپنی مجالس کو آباد رکھتے ہیں) فرشتے اپنے پروں کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨٩)

ساتھ گھیر لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ذکرِ الٰہی کی مجالس کی اتنی فضیلت ہے کہ جو شخص گزرتے گزرتے کسی ذاتی کام کی وجہ ہی سے ان کے ساتھ بیٹھ جائے وہ بھی بخشا جاتا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اپنی محفل میں بیٹھتے ہیں تو اپنے رب کو بھول جاتے ہیں، دنیا داری کی باتوں میں لگے رہتے ہیں اور لوگوں کو خوش کرنے کے لیے جھوٹ سچ کا بھی خیال نہیں کرتے۔

زبان کی حفاظت کا حکم:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

''بندہ ایک بات زبان سے نکالتا ہے اور اس کے متعلق سوچتا نہیں (کہ کتنے کفر اور بے ادبی کی بات ہے) جس کی وجہ سے وہ جہنم کے گڑھے میں اتنی دور گر پڑتا ہے جتنا مشرق سے مغرب دور ہے۔''[1]

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بہتر مسلمان کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔''[2]

اسی طرح حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: نجات کیسے ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمھارا گھر تمھارے لیے کافی ہو اور تم اپنی خطاؤں پر رویا کرو۔''[3]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مومن کو صرف خیر کی بات کرنی چاہیے، ورنہ خاموش رہنا چاہیے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس نے خاموشی اختیار کی، وہ نجات پا گیا۔[4]

کفارہ مجلس:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے اور کثرت سے باتیں کرے اور اٹھنے سے پہلے یہ دعا پڑھ لے

---

[1] صحيح البخاري، باب حفظ اللسان، رقم الحديث (٦٤٧٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٢)

[3] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٦١)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٠١) صحيح الجامع الصغير، رقم الحديث (٦٣٦٧)

تو اللہ تعالیٰ اس کی وہ تمام خطائیں معاف کردیتا ہے جو انجانے میں اُس سے سرزد ہوگئیں:
«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَ أَتُوْبُ اِلَيْكَ» [1]

''اے اللہ! تو اپنی تعریفوں کے ساتھ پاک ہے، میں شہادت دیتا / دیتی ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، تجھ سے مغفرت طلب کرتا / کرتی ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا / ہوتی ہوں اور توبہ کرتا / کرتی ہوں۔''

دوسری حدیث میں ہے:

''اگر کسی نیک مجلس میں ہوگا تو یہ دعا بھی اس کے تابع ہو جائیگی اور اگر کسی مخلوط مجلس میں ہوگا تو یہ دعا اس کا کفارہ بن جائے گی۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''کوئی قوم جب کسی ایسی مجلس سے اٹھے جس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کا سرے سے ذکر ہی نہ کیا ہو تو وہ گویا گدھے کی مردار لاش سے اٹھے ہیں اور وہ مجلس ان کے لیے باعثِ حسرت ہے۔'' [3]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کم ہی کسی مجلس سے یہ پڑھے بغیر اٹھتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعَاصِيْكَ وَ مِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهٖ جَنَّتَكَ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا مَصَائِبَ الدُّنْيَا، اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّاتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّا يَرْحَمُنَا» [4]

''اے اللہ! ہم میں اپنی خشیت تقسیم کر دے جو ہمارے اور ہمارے گناہوں کے درمیان

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٤٤)

[2] سنن النسائي (ص: ٢٧٣) مسند أحمد (٧/ ٧٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٠)

[4] سنن الترمذي (٣٥٠٢) صحيح الجامع (١٢٦٨)

حائل ہوجائے، اپنی اطاعت جو ہمیں جنت میں پہنچادے اور یقین جو ہم پر مصائبِ دنیا کو ہلکا کر دے، اے اللہ! تو جب تک زندہ رکھے ہمیں ہمارے کانوں آنکھوں اور قوّت سے فائدہ پہنچا اور اسے ہم سے وارث بنا۔ جو ہم پر ظلم کرے، اس کا بدلہ دے اور جو ہم سے عداوت کرے، اس کے خلاف ہماری مدد فرما، ہماری مصیبت کو ہمارے دینی امور میں حارج نہ کردینا اور دنیا کو ہمارے لیے سب سے زیادہ غم اور انتہائے علم نہ بنا اور ہم پر ایسا کوئی شخص مسلّط نہ فرما جو ہم پر رحم نہ کرے۔"

دعا و فریاد کی اہمیت اسلام میں کس قدر ہے؟ اس بات کا اندازہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ کی نظر میں دعا سے زیادہ کوئی چیز بھی قابلِ قدر نہیں ہے۔"[1]

باقی کوئی بھی عمل ایسا نہیں، اب آپ خود ہی اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ عمل کتنا افضل ہے۔ دعا انسان کی اپنی ضرورت تو ہے ہی لیکن اس کے علاوہ یہ ایک عبادت بھی ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةَ»[2] "دعا خود ایک عبادت ہے۔"

حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے کہ "دعا کرنا افضل عبادت ہے۔"

دعا نہ کرنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے:

بخاری اور ابوداود میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ لَمْ يَدْعُ اللّٰهَ غَضِبَ عَلَيهِ»[3]

"جو اللہ سے دعا نہیں کرتا، اس سے وہ ناراض ہوتا ہے۔"

جبکہ انسان کا معاملہ اس کے برعکس ہے، جب کوئی اس سے مانگتا ہے، تو یہ غضب ناک ہوجاتا ہے۔ کبھی جھڑک بھی دیتے ہیں کہ اس کا توروزانہ کا کام ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس وقت ناراض

---

[1] صحيح الجامع الصغير (١/ ٢٥١) رقم الحديث (١١٢٢)

[2] صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٤٠٧)

[3] الأدب المفرد (ص: ٢٢٩) طبع دار البشائر الإسلامية بيروت.

ہوتا ہے جب اس سے التجا و دعا نہ کی جائے، اس کے سامنے دستِ سوال نہ پھیلایا جائے۔ ایک حدیث میں ہے:

''انسان کے سامنے اپنی ضرورت کے لیے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔اس سے مانگو جس کے فضل و کرم کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ اگر بندہ اپنے رب سے مانگنا چھوڑ دے تو وہ ناراض ہوجاتا ہے۔''[1]

غرض یہ کہ دعا کا نہ کرنا بھی بندگی سے گریز اور استکبار و سرکشی کی علامت ہے، ویسے بھی دعا اللہ ہی سے مانگنی چاہیے کیونکہ انسان کا اپنے جیسے انسانوں ہی سے دعا مانگنا اپنی فطرت سے بغاوت ہے، بے بس انسان دوسرے کی بے بسی کا علاج کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے جب بھی دعا کریں تو اللہ ہی سے کریں، وہی سب کی سننے والا ہے۔

کوئی بھی دعا مانگیں تو کم از کم تین بار کہیں، جیسے کوئی آدمی اللہ تعالیٰ سے رزق مانگتا ہے، صرف ایک بار ہی کہہ کر نہ چھوڑ دے، بار بار کہیے یا پھر کم از کم تین مرتبہ تو ضرور کہیے:

«اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِی» ''اے اللہ مجھے رزق عطا فرما، اے اللہ مجھے بخش دے۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کوئی دعا کرتے تو اسے تین مرتبہ دہراتے۔ جنت اور مغفرت کی طلب کریں تو بھی اِسی طریقے سے کریں۔

خوش حالی میں، مصیبت کے وقت اور مجبوری و تنگدستی میں، ہر حال میں بندے کو اللہ کے ساتھ تعلق قائم رکھنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس آدمی کی دعاؤں کی زیادہ قدر ہوتی ہے جو آسایش کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کو نہیں بھولتا، کیونکہ نمک حلال و وفا دار وہی غلام ہوتا ہے جو کسی بھی حال میں اپنے آقا و مالک کو نہیں بھولتا۔

مصیبت یا خوشحالی کے زمانے میں، ہر حال میں اُسی سے کثرت کے ساتھ دعا کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ آپ ایسی ذات سے سوال کر رہے ہیں جس کے خزانے ختم نہیں ہوسکتے اور نہ عطا کرتے ہوئے وہ کبھی تھکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین بندہ وہی ہے جو سوال کرتے کبھی نہ تھکے۔ اللہ تعالیٰ اس بندے کو بہت پسند کرتا ہے جو اس کا فضل طلب کرتا ہے۔

---

[1] حوالہ سابقہ.

صدیقۂ کائنات رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بھی تم میں سے کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے سوال کرے تو اُسے چاہیے کہ بڑی بڑی چیزوں کا سوال کرے کیونکہ وہ اپنے رب کریم سے سوال کرتا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صبح وشام کے معمولات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر مرحلے پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے دعا مانگی۔ ان دعاؤں میں یا تو آپ نے صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے دنیا و آخرت کی بھلائیاں طلب کیں، یا نقصان دہ امور سے اس کی پناہ مانگی، یا اس کی تسبیح وتعریف کی اور اس کا شکر ادا کیا اور پھر اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اپنے رب سے تعلق پیدا کرنے کا حکم دیا اور انھیں کثرت سے دعائیں مانگنے کی تلقین فرمائی۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ جب بھی اپنی کسی ضرورت و حاجت کے لیے دعا کرے تو اپنے خالق و مالک کے سامنے التجا کرے اور مسنون الفاظ سے دعا کرے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہیں، من گھڑت مناجات اور موضوع اور اوراد وظائف سے بچیں۔

ہر انسان کو روز مرہ زندگی میں پیش آنے والی جتنی بھی ضروریات و حاجات ہیں، جب ان کے متعلق زبانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلی ہوئی بے شمار دعائیں موجود ہیں اور صحیح احادیث سے ثابت ہیں تو پھر اِدھر اُدھر کی دعائیں پڑھنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ہر دعا قبول کرتا ہے، لیکن جس میں کسی کی حق تلفی یا قطع تعلقی ہوتی ہو ایسی دعائیں بارگاہِ الٰہی میں قبولیت سے ہمکنار نہیں ہوتیں۔ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

”بندے کی دعا اگر گناہ یا قطع رحمی پر مشتمل نہ ہو تو وہ دعا قبول کی جاتی ہے۔“[1]

کیونکہ مومن کی زبان سے نکلی ہوئی دعا کبھی بیکار نہیں جاتی۔

”یا تو اُس کی دعا کو اسی وقت قبول کرلیا جاتا ہے یا پھر اُس کی آخرت کے لیے اسے ذخیرہ کرلیا جاتا ہے یا پھر اُس پر آنے والی مصیبت کو اُس سے دور کردیا جاتا ہے۔“

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ان تین باتوں میں سے ایک ضرور پوری کردی جاتی ہے۔[2]

اگر آپ مسلسل اللہ سے دعا وفریاد کر رہے ہیں لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا اور دعا جلدی قبول نہیں ہو رہی تو بے صبری اور بے قراری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعا کو ترک نہ کریں بلکہ دعا کو

---

[1] مسند أحمد، مشكاة المصابيح (٢/ ٦٩٧)

[2] حواله سابقه.

مسلسل جاری رکھیں، یوں سمجھیں کہ جب تک کھانا اچھی طرح پک کر تیار نہ ہوجائے ماں اپنے بچے کو کھانا نہیں دیتی کیونکہ وہ ماں ہے اور وہ جانتی ہے کون سا وقت بچے کو کھانا دینے کے لیے مناسب و بہتر ہے اور کون سا نہیں۔ لیکن بچہ اپنی نادانی کی وجہ سے روتا اور ضد کرتا ہے کیونکہ وہ دیر کی مصلحت کو نہیں سمجھتا، ایسے ہی انسان بہت سی دعاؤں کو اپنے لیے بہتر و مفید سمجھ کر مانگتا ہے لیکن ہوسکتا ہے اُس کے لیے وہ نفع آور نہ ہوں بلکہ اس کے لیے وہ سب نقصان کی چیزیں ہوں کیونکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ اس کی دعا قبول کیوں نہیں کی گئی؟ اِسی وجہ سے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعاؤں کو ترک نہیں کرنا چاہیے، صبر سے کام لیں، بے صبری کا دامن چھوڑ دیں اور جو بھی دعا کریں آخر میں آمین ضرور کہیں، کیونکہ نبی اکرم ﷺ آمین کہا کرتے تھے۔[1]

اگر کسی شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا ہو اور اب وہ توبہ کرنا چاہتا ہے، تو وہ سب سے پہلے اچھی طرح وضو کرے، پھر کھڑا ہوکر دو رکعت نماز پڑھے، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کردیتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ سے حسنِ ظن رکھنا چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرما رہے تھے:

« يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ وَلَا أُبَالِي، يَا ابْنَ آدَمَ! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ، ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ، يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً »[1]

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابن آدم! جب تم نے مجھے پکارا اور اچھی امیدیں وابستہ رکھیں تو تیرے اعمال خواہ کیسے ہی ہوں، میں تجھے معاف کردوں گا اور مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہوگی، تیرے گناہ آسمانوں کے کناروں تک پہنچ جائیں تو بھی میں تجھے معاف کردوں گا، اگر تم نے میرے ساتھ کچھ بھی شرک نہ کیا ہوگا۔“

[1] صحيح الترمذي، رقم الحديث (٢٨٠٥)

لیکن شرط یہ ہے کہ توبہ خالص ہو اور خالص توبہ یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کر رہا ہے، پہلے فوراً اسے ترک کرے، اس پر سخت ندامت کا اظہار کرے اور آیندہ اُسے نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے۔ اگر اس گناہ کا تعلق کسی بندے کے حقوق سے ہے تو بندے ہی اسے معاف کریں گے۔ اگر یہ صدقِ دل سے اللہ اور اس کے بندے سے معافی مانگے گا تو اللہ تعالیٰ تو غفور رحیم ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے جو اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا کر چکا، تو اپنی کتاب (لوحِ محفوظ) میں جو اس کے پاس عرش پر موجود ہے، اس نے لکھا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔''[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ نے رحمت کے سو حصے بنائے اور اپنے پاس ان میں سے ننانوے حصے رکھے اور ایک حصہ زمین پر اتارا ہے، اسی کی وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچے کو اپنے سم نہیں لگنے دیتی کہ کہیں اس سے بچے کو تکلیف نہ پہنچے۔[3]

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے۔ قیدیوں میں ایک عورت تھی جس کی چھاتی دودھ سے بھری ہوئی تھی اور وہ دوڑ رہی تھی۔ اتنے میں ایک بچہ اس کو قیدیوں میں ملا۔ اس نے جھٹ اپنے سینے سے لگایا اور اس کو دودھ پلانے لگی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ یہ عورت اپنے اس بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟ ہم نے عرض کی: نہیں، جب تک اس کو قدرت ہوگی یہ اپنے بچے کو آگ میں نہیں پھینک سکتی۔ تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! اللہ تو اپنے بندوں کے لیے اس ماں کے اپنے بچے کے لیے شفقت و رحم دل ہونے سے بھی زیادہ مہربان ہے۔''[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٠٦)

[2] صحيح البخاري، باب التوبة، رقم الحديث (٦٣٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٤٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤١٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٥)

جامع دعا کرنا:

جب بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں جامع قسم کی دعا مانگا کریں، یعنی جن کے الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں اور ان الفاظ میں دین و دنیا کی بھلائیاں آ جائیں، جیسا کہ ابو داود میں اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جامع دعاؤں کو پسند فرماتے تھے اور اُن کے سوا باقی کو چھوڑ دیتے تھے۔''[1]

لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ ہم بھی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعائیں کیا کریں، جو جامع قسم کی ہوں۔ جیسا کہ ایک دعا یہ ہے، جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص یقین کی حالت میں شام کے وقت یہ دعا پڑھے اور اسی رات فوت ہو جائے تو وہ جنت میں جائے گا اور اسی طرح (حالتِ یقین میں) جو شخص صبح کے وقت یہ دعا پڑھ لے اور اسی دن فوت ہو جائے تو وہ بھی جنت میں جائے گا۔'' دعا کے الفاظ یہ ہیں:

«اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰی عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ»[2]

''اے اللہ! تو ہی میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، تو نے مجھے پیدا فرمایا اور میں تیرا بندہ / بندی ہوں اور میں اپنی طاقت کے مطابق تیرے عہد اور وعدے پر ممکنہ حد تک قائم ہوں، میں تجھ سے اس چیز کے شر سے پناہ مانگتا / مانگتی ہوں جس کا میں نے ارتکاب کیا، میں تیری بارگاہ میں تیرے انعامات کا اقرار کرتا / کرتی ہوں اور میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا / کرتی ہوں، تو مجھے معاف کر دے۔ امر واقعی یہ ہے کہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو معاف نہیں کر سکتا۔''

اس دعا کو سید الاستغفار کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں توبہ کے تمام ممکنہ معانی شامل ہیں:

''وَ اَنَا عَلٰی عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ''

---

[1] جامع الأصول (٤/ ١٦٣) وقال المحقق: إسناده حسن.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٠٦)

’’اے اللہ! میں تجھ سے کیے گئے اس عہد و وعدے پر قائم ہوں۔‘‘ جو عالم ارواح میں تو نے مجھ سے لیا تھا۔ میں قیامِ حشر پر یقین رکھتا ہوں اور تیری ملاقات اور جزا و سزا کے وعدے پر میرا مکمل ایمان واعتقاد ہے۔ اس میں اپنے قصور اور عجز کا اعتراف ہے، یعنی میں تیری عبادت کا حق تو ادا نہیں کرسکتا لیکن میں اپنی ہمت واستطاعت کے مطابق تجھے راضی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس دعا میں پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اقرار اور پھر اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اور اس کے بعد گناہوں کی معافی کی درخواست ہے۔ اس طرح یہ دعا بہت جامع بن جاتی ہے۔

اسی طرح ایک دعا یہ ہے جو صبح وشام ایک بار پڑھنی چاہیے:

«اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَ الْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَ الْعَافِيَةَ فِیْ دِيْنِیْ وَ دُنْيَا یَ وَ اَهْلِیْ وَمَالِیْ، اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَ اٰمِنْ رَوْعَاتِیْ، اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَيْنِ يَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ يَّمِيْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِن فَوْقِیْ واَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ»[1]

’’اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں معافی اور عافیت کا سوال کرتا / کرتی ہوں۔ اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین، اپنی دنیا اور اپنے اہل ومال میں معافی اور عافیت کا سوال کرتا / کرتی ہوں۔ اے اللہ! میرے عیبوں پر پردہ ڈال دے اور میری گھبراہٹوں میں امن دے۔ اے اللہ! تو میری حفاظت فرما میرے سامنے سے، میرے پیچھے سے، میری دائیں طرف سے، میری بائیں طرف سے اور میرے اوپر سے اور میں تیری عظمت کے ساتھ اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ ناگہاں اپنے نیچے سے ہلاک کیا/ کی جاؤں۔‘‘

یہ بڑی جامع دعا ہے جس میں انسان اپنے رب کی حفاظت طلب کرتا ہے اور اپنے امن و امان، اپنے عیوب کی پردہ داری، نیز اہل وعیال کے لیے سلامتی اور عافیت کا سوال کرتا ہے۔

لہٰذا ہمیں اس قسم کی دعاؤں اور اللہ کے ذکر سے اپنی زبانوں کو ہر وقت تر رکھنا چاہیے، کیونکہ زبان کی افضل، مصروفیت وہ ہے جو نہ صرف نامہ اعمال کو بھر دینے والی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کا قرب

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٧٤) وسنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٧١)

حاصل کرنے والی ہو۔ قرآنِ پاک میں تقریباً ۱۹ آیات میں اللہ کا ذکر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جو اس کی اہمیت پر دلالت کرتی ہیں جن میں سے ۸ آیات ہم اس موضوع کے شروع میں ذکر کر چکے ہیں۔ جبکہ ثبوت کے لیے تو قرآنِ کریم کی ایک آیت ہی کافی ہے، بس عمل کی ضرورت ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [الجمعة: ١٠]

''پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بہت بہت یاد کرتے رہو تاکہ نجات پاؤ۔''

اس طرح کی کتنی ہی آیات ہیں جن میں اللہ کے ذکر کی ترغیب اور تاکید کی گئی ہے اور نبی کریم ﷺ کی متعدد احادیثِ مبارکہ میں بھی اللہ کے ذکر کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: یا رسول اللہ ﷺ! بندوں میں کون (کون سا عمل کرنے والا) سب سے افضل ہے اور قیامت میں کس کو اللہ کے ہاں زیادہ بلند درجہ ملنے والا ہے؟ اس کے جواب میں نبیِ رحمت ﷺ نے فرمایا:

''جو زیادہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے ہوں گے۔''[1]

حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! ثواب کے کام بہت ہیں اور یہ میری طاقت سے باہر ہے کہ میں ان سب کو بجا لاؤں، لہٰذا آپ مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجیے، جس کو میں مضبوطی سے تھام لوں اور اس پر کاربند ہو جاؤں (اور بس وہی میرے لیے کافی ہوجائے)، اس کے ساتھ یہ بھی عرض ہے کہ جو کچھ آپ بتائیں وہ بہت زیادہ بھی نہ ہو کیونکہ خطرہ ہے کہ میں اس کو یاد بھی نہ رکھ سکوں، آپ ﷺ نے فرمایا:

''(بس اس کا اہتمام کرو اور اس کی عادت ڈالو کہ) تمھاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔''[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں مکہ مکرمہ کی طرف

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧٦) یہ حدیث ضعیف ہے۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٤٦)

تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں حمدان نامی پہاڑ سے گزر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ پہاڑ حمدان ہے، مفرّ دون سبقت لے گئے۔'' عرض کی گئی: مفردون کون لوگ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کا زیادہ ذکر کرنے والے بندے اور بندیاں۔''[1]

ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہنے والی زبان کتنی مبارک زبان ہے اور مبارک کیوں نہ ہو؟ وہ ذکرِ الٰہی کی وجہ سے دوسری تمام آلایشوں سے پاک رہتی ہے اور اس شخص کے دائیں ہاتھ کا فرشتہ مسلسل اس کی نیکیاں لکھنے میں مصروف رہتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہونگے جو قیامت کے دن مفردون میں شامل ہونگے جو سب سے سبقت لے جائیں گے۔

احادیث میں بے شمار کلمات کا ذکر ہے، جنھیں ہم عملاً اپنا کر ان تمام خوشخبریوں کے مصداق بن سکتے ہیں۔ مثلاً اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، لباس پہنتے اور دیگر کام کرتے ہوئے ان تمام اوقات کے مسنون اذکار اور دعائیں یاد کیجیے اور انھیں ان کے اوقات میں پڑھیں۔

پانچ وقت کی نماز کو بھی ذکر کہا گیا ہے۔ نماز میں زیادہ سے زیادہ قرآنِ پاک کی تلاوت کی جائے۔ نماز کے بعد مسنون اذکار کریں کیونکہ ان کی بہت فضیلت آئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے لا الٰہ الا اللہ کو ''افضل الذکر'' قرار دیا ہے۔[2]

اسی طرح کتبِ حدیث میں مختلف کلمات کی بہت فضیلت آئی ہے جن میں درود شریف کی کثرت بھی شامل ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کلمہ یا تمام کلمات منتخب کر لیے جائیں اور اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ان کا ذکر کرتے رہیں، تو جنت کے حقدار بن سکتے ہیں اور اس دوہرے فائدے کو بھی حاصل کر سکتے ہیں جو زبان کی حفاظت اور اس کے درست استعمال پر مشتمل ہے۔

اسی طرح کسی بیمار کی تیمار داری کے وقت اس کو امید دلانا اور اس کے لیے مسنون دعا کرنا بھی باعث اجر وثواب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جب بھی کوئی آدمی اپنے مسلمان بھائی کی بیمار پرسی کے لیے جائے تو سب سے پہلے اُس کے لیے یہ دعا کرے:

---

[1] صحيح مسلم (٤/ ٢٦٧٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩١٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٠)

«لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ»[1]

''کوئی حرج نہیں، یہ بیماری پاک کرنے والی ہے اگر اللہ نے چاہا۔''

پھر جب تک وہ بیٹھا رہے رحمتِ الٰہی اُسے ڈھانپے رہتی ہے۔ جب تک وہاں بیٹھا رہے گا جنت کے میووں میں رہتا ہے اور اگر صبح کا وقت ہو تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں اور اگر شام کا وقت ہے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔[2]

ایک دوسرے کے حق میں غائبانہ دعا کی فضیلت:

انسان کو صرف اپنے لیے ہی دعا نہیں کرتے رہنا چاہیے بلکہ اپنے دوست و احباب اور خویش و اقارب کے حق میں بھی پر خلوص دعائیں کرنی چاہییں۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

''مسلمان کی اپنے مسلمان بھائی کے حق میں غائبانہ دعا قبول ہوتی ہے۔ اس کے سر پر ایک فرشتہ مقرر ہے۔ جب بھی وہ اپنے بھائی کے لیے دعائے خیر کرتا ہے، تو اس پر مقررہ فرشتہ کہتا ہے: [آمین] (اے اللہ! اس کی دعا قبول فرما لے) اور تجھے بھی اُس کی مثل اللہ دے۔''[3]

سورت مریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک صالح بندے (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی دعا کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُلَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا﴾ [مريم: ٤٧]

''انھوں نے سلام علیک کہا (اور کہا کہ) میں آپ کے لیے اپنے رب سے بخشش مانگوں گا، بیشک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے۔''

کسی سے اچھی گفتگو کرنا، دکھ اور رنج کے وقت دلاسا دینا، صبر کی تلقین کرنا، اللہ کی رحمت و نصرت یاد دلانا، یہ سب زبان کے وہ استعمالات ہیں جن کی تاکید کی گئی ہے۔ دُنیا اور آخرت کی بھلائی اور آگ کے عذاب سے بچنے کی دعا کرنے کی بڑی فضیلت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ١١٨)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ١٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٨٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٣)

کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اکثر یہ دُعا ہوا کرتی تھی:

《اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ》[1]

''اے اللہ! ہمیں دُنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔''

ہمیں اللہ سے عجز اور سُستی وغیرہ ہر قسم کے فتنوں اور آزمایشوں سے پناہ مانگنی چاہیے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ نبیِ رحمت ﷺ کہا کرتے تھے:

《اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَ الْجُبْنِ وَ الْبُخْلِ وَ الْهَرَمِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَ الْمَمَاتِ》[2]

''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا/ مانگتی ہوں، عاجزی سے، سُستی سے، بزدلی اور بہت زیادہ بڑھاپے سے اور میں تیری پناہ مانگتا / مانگتی ہوں عذابِ قبر سے اور میں تیری پناہ مانگتا / مانگتی ہوں زندگی اور موت کی آزمایشوں سے۔''

جنت کی نعمتوں کا تذکرہ:

جنت کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمیں زبان کے متعلق دو باتوں کا علم اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے:

﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴾ [النبأ: ٣٥]

''وہاں نہ بیہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹ (خرافات)۔''

یعنی کوئی بیہودہ بات نہیں کریں گے اور نہ ایک دوسرے سے جھوٹ بولیں گے، یہ جنتی لوگ ہیں:

﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [یونس: ١٠]

''(جب وہ) اُن میں (اُن کی نعمتوں کو دیکھیں گے تو بے ساختہ) کہیں گے: سبحان اللہ! اور آپس میں اُن کی دعا السلام علیکم ہو گی اور اُن کا آخری قول یہ (ہو گا) کہ اللہ رب العالمین کی حمد (اور اُس کا شکر) ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٩)

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آتا ہے:

''اہلِ جنت کی زبانوں پر تسبیح وتحمید کا اس طرح الہام ہوگا، جس طرح سانس کا الہام کیا جاتا ہے۔''

یعنی جس طرح بے اختیار سانس کی آمد و رفت رہتی ہے، اسی طرح اہلِ جنت کی زبانوں پر کسی اہتمام کے بغیر حمد و تسبیحِ الٰہی کے ترانے جاری رہیں گے۔ ایک دوسرے کو سلام کریں گے، نیز فرشتے بھی انھیں سلام عرض کریں گے۔

اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رکھنا چاہیے، کیونکہ ذکرِ الٰہی روح کی غذا اور دل کی دوا بھی ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں: ﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد: ۲۸] کہہ کر واضح فرمادیا کہ ''ذکرِ الٰہی ہی اطمینانِ قلبی کا ذریعہ ہے۔''

ذکر کی طرف راہنمائی کرنے والی بے شمار کتابیں موجود ہیں، انہی میں سے کسی صحیح کتاب کا انتخاب کریں جس میں جعلی اذکار اور من گھڑت و موضوع وظائف نہ ہوں۔ بہت سی دعائیں ہیں جو چھوٹی بھی ہیں اور آسان بھی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم انھیں یاد کریں۔

دعاؤں والی کتابوں میں سے ''پیارے رسول کی پیاری دعائیں'' مولانا عطاء اللہ حنیف، ''حصن المسلم'' شیخ سعید القحطانی، ''آدابِ الدعا و الدوا'' شیخ عبد الخالق، ''اذکار و ادعیہ'' ڈاکٹر محمد لقمان سلفی اور ''ذکرِ الٰہی (دعائیں)'' از محمد منیر قمر دیکھی جاسکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی زبان کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اہلِ جنت میں سے بنا لے، آمین۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دست بستہ سوال کرتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں میں داخل فرما لے جن کی آخری دعا یہ ہو:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ اِلَيْكَ.

مراجعِ درس

1. تفسیر احسن البیان۔ حافظ صلاح الدین یوسف، ترجمہ: مولانا محمد جونا گڑھی
2. جواهر الإيمان شرح اللؤلؤ والمرجان. حافظ عمران ایوب لاہوری
3. حصن المسلم. تالیف: ڈاکٹر سعید بن علی قحطانی، ترجمہ: مولانا عبد السلام محمد
4. ذکرِ الٰہی۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
5. مچھلی کے پیٹ میں۔ تالیف ڈاکٹر محمد بن عبد الرحمٰن العریفی۔
ترجمہ: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

فرضیت وفضائلِ رمضان و روزہ

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ البقرہ (آیت: ۱۸۳،۱۸۴) میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

”اے ایمان والو! تم پر [رمضان المبارک کے] روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو یا سفر میں ہو (اور روزہ نہ رکھے) تو دوسرے دنوں میں وہ گنتی پوری کر لے اور جن کو روزے کی طاقت ہی نہیں ہے تو وہ ہر روزے کے بدل ایک محتاج کو کھانا دیں، پھر جو کوئی نفلی طور پر زیادہ نیکی کرے تو اس کے لیے اور اچھا ہے اور اگر تم سمجھو تو روزہ رکھنا تمھارے حق میں بہتر ہے۔“

① ماہِ صیام:

رمضان المبارک کا یہ مہینا اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتوں اور برکتوں کا مہینا ہے۔ یہ مقدس مہینا نزولِ قرآن اور صبر کرنے اور فراخیِ رزق کا مہینا ہے اور ایک دوسرے سے خیر خواہی کا مہینا ہے، جنت میں داخل ہونے اور جہنم سے آزادی حاصل کرنے کا مہینا ہے، کیونکہ ماہِ صیام ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ذکر وفکر، تسبیح وتہلیل، تلاوت ونوافل اور صدقات وخیرات گویا ہر قسم کی عبادات کا عالمی موسمِ بہار ہے، جس سے دنیا کا ہر مسلمان اپنے اپنے ایمان اور تقوے کے مطابق حصہ پا کر دل

کوسکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک مہیا کرتا ہے۔ عبادت کے اس عالمی موسمِ بہار کا اگر کسی نے ٹھیک ٹھیک نظارہ کرنا ہے تو وہ اس ماہِ مقدس کے بابرکت لیل و نہار میں عز و شرف والے گھر بیت اللہ شریف میں جاکر دیکھے جہاں دن کے اوقات میں ذکر وفکر، تلاوتِ قرآن کی مجالس، احکام و مسائل کے حلقے، طواف کرنے والوں کا ہجوم اور رات کے اوقات میں قیام اللیل کے روح افزا اور ایمان پرور مناظر کس طرح گناہگار سے گناہگار انسان کے دل میں بھی شوقِ عبادت پیدا کردیتے ہیں۔ مسجد الحرام کے تمام برآمدے اور اس کے اوپر کی چھتیں تمام جگہیں کھچا کھچ بھری ہوئی ہوتی ہیں، کہیں بھی تِل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی۔

نیم شب کے پُرسکون اور خاموش لمحے:

اگر کسی نے یہ منظر دیکھنا ہے: سامنے سیاہ ریشمی غلاف میں ڈھکی ہوئی بیت اللہ کی بلند و بالا عمارت، اُوپر کھلا آسمان اور آسمان پر اللہ رب العالمین کے جلوہ فرما ہونے کا تصور، انوار و تجلیات کے اس ماحول میں امامِ کعبہ قرآن کریم کی تلاوت فرماتے ہیں، اس وقت جب ان کی پرسوز اور پر درد آواز گونجتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے فضا کو چیرتی ہوئی سیدھی عرشِ الٰہی پر دستک دے رہی ہے۔

ماہِ رمضان کا مہینا اسی طرح ذکر و عبادت اور صبر کے ساتھ گزرتا ہے، پھر ختمِ قرآن کے موقع پر خصوصی دعائیں کی جاتی ہیں، امامِ حرم اللہ تعالیٰ کے حضور ہاتھ پھیلا کر خشوع و خضوع کے ساتھ جب دعا کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سارا حرم آہوں اور سسکیوں میں ڈوب جاتا ہے اور ان کی آواز رُک رُک کر سنائی دیتی ہے، جب وہ کہتے ہیں:

"اَللّٰھُمَّ لَا تَرُدَّنَا خَائِبِیْنَ" "اے ہمارے پروردگار! ہمیں ناکام و نامراد واپس نہ لوٹانا۔"

پھر اسی عالم میں اپنے لیے، تمام مسلمانوں کے لیے اور اسلام کی سربلندی کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں، زندہ اور فوت شدہ تمام مسلمانوں کی مغفرت اور بخشش کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کاش یہ انمول گھڑیاں اور مبارک لمحات طویل تر ہوجائیں۔ کون جانے یہ گھڑیاں کس خوش نصیب کو دوبارہ میسر آئیں...!

اس وقت دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ کریم رحمٰن و رحیم اپنے عاجز، محتاج اور درماندہ بندوں کو بڑی محبت و شفقت اور کرم کی نظروں سے دیکھتا ہے اور خالق اپنی مخلوق کے پھیلائے ہوئے دامن

اور اٹھائے ہوئے ہاتھوں کو کبھی خالی واپس نہیں لوٹائے گا۔ عبادت کا یہ ذوق وشوق اور ایمان و ایقان سے معمور کیفیتیں، عبادت کے اس موسمِ بہار کا تعلق خاص رمضان مبارک کے مہینے کے ساتھ ہے۔

ماہ رمضان المبارک کی ہر سال آمد بھی رب کائنات کا ایک احسان عظیم ہے، کیونکہ دید وشنید کی باتیں اور آموختہ سبق کو بھول جانا انسانی فطرت کا خاصا ہے جیسا کہ معروف ہے:

''انسان خطا و بھول سے مرکب ہے۔''

لہٰذا گاہے بہ گاہے اسے یاد دہانی کی ضرورت رہتی ہے، کیونکہ سال کے گیارہ مہینوں میں مسلمان کی عملی قوتوں میں آہستہ آہستہ ضعف و کمزوری در آتی ہے، تو اتنے میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور عنایتوں کا مہینا ''رمضان مبارک'' پھر آجاتا ہے، جو روزے داراں کے لیے اخلاقی وروحانی تربیت گاہ کا کام کرتا ہے، ان کی علمی کمزوریوں اور عملی کوتاہیوں کا ازالہ کرتا ہے اور انھیں پھر سے نئے جوش و جذبے کے ساتھ اطاعت کے میدانِ عمل میں لا کھڑا کرتا ہے۔

② روزہ اسلام کے بنیادی فرائض میں سے ایک فرض ہے:

عبادت کے اس سارے اہتمام کی غرض اور مقصد کیا ہے؟ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی سورۃ البقرہ (آیت: ۱۸۳) میں خود اس کی وضاحت فرمادی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! تم پر [رمضان المبارک کے] روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔''

اس آیت میں اللہ رب العزت فرما رہے ہیں کہ جس طرح تم پر روزے کو فرض قرار دیا ہے، اسی طرح پہلے لوگوں پر بھی اسے فرض قرار دیا تھا، چنانچہ وہ لوگ ہمارے لیے ایک نمونہ ہیں، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ پہلے لوگوں کی نسبت زیادہ کامل طریقے سے اسے سرانجام دیں۔

''**الصیام**'' [روزہ] مصدر ہے، جس کے شرعی معنی ہیں:

''صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور بیوی سے ہم بستری کرنے سے صرف اللہ کی عبادت کی نیت سے اور اُسی کی رضا کے لیے رُکے رہنا۔''

یہ عبادت چونکہ نفس کی طہارت اور تزکیے کے لیے بہت اہم ہے، اس لیے اسے تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کیا گیا تھا، اس کا سب سے بڑا مقصد تقویٰ کا حصول ہے، کیوں کہ تقویٰ انسان کے اخلاق و کردار کے سنوارنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور روزہ ہی ایک ایسا عمل ہے، جس میں تقویٰ پرہیز گار بدن کے لیے تزکیہ اور شیطان کے راستوں کو تنگ کردینے کا اہتمام بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتابِ مبین کو عمل کرنے کے لیے اچھی طرح سمجھ کر پڑھیے کیونکہ اس کتاب قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ تقویٰ کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ نیز نفس کی تربیت کا ایک مکمل ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ نفسِ امارہ کو نفسِ مطمئنہ کے درجے تک کیسے پہنچایا جاتا ہے، اس مقصد کے لیے مسنون زندگی کا ایک مکمل نقشہ نبیِ رحمت ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے عبادت کا جو نقشہ اور طریق پیش کیا، یعنی آپ ﷺ نے جن عبادات کو فرضیت کے درجے میں پیش کیا، ان کا ایک طریقہ بھی سکھایا ہے اور سب سے پہلے خود اس پر عمل کرکے دکھایا۔ شرعی زندگی میں اس طریقِ عبادت سے انحراف یا اس میں تبدیلی کا کوئی تصور یا گنجایش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر مسلمان کی عبادت کی قبولیت کی بنیاد اس عمل کو مسنون طریقے سے ادا کرنے پر ہے۔

جہاں تک روزے کی مخصوص عبادت کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں نبیِ رحمت ﷺ نے عامۃ المسلمین کو تو صرف رمضان المبارک کے مہینے کے روزوں کا پابند بنایا، مگر آپ ﷺ خود ان فرض روزوں کے علاوہ کثرت سے نفلی روزے بھی رکھتے تھے، جیسے ہر ہفتے میں سوموار اور جمعرات اور پھر آپ ﷺ رمضان کے علاوہ ہر قمری مہینے کی ۱۳۔۱۴۔ ۱۵۔ کی تاریخوں کو روزے رکھا کرتے تھے۔ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے بھی رکھتے، رمضان المبارک سے پہلے شعبان کے زیادہ دن روزوں کی کیفیت میں رہتے۔ روزوں کے سلسلے میں آپ ﷺ کی اس رغبت اور اہتمام سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ عبادت کس درجہ مرغوب اور محبوب تھی۔

قرآنِ مجید میں روزے کی فرضیت اور اس کے مختصر احکام بیان کیے گئے ہیں، مگر اس عبادت کا مکمل نقشہ احادیث کی کتابوں میں پوری جامعیت کے ساتھ موجود ہے۔ جہاں تک اس عبادت کے فضائل و برکات کا تعلق ہے تو اس پر درجنوں صحیح احادیث پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہمارے نزدیک تو

نبی اکرم ﷺ کا وہ فرمان ہی کافی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ’’جس شخص نے رمضان المبارک کے روزے ایمان و احتساب کے ساتھ رکھے، اس کے سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔‘‘ یہ ہمارے لیے ایک عظیم خوشخبری اور بشارت ہے، جس سے محرومی کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔

یہاں ایک بات پر خصوصی توجہ رہنی چاہیے کہ اتنے بڑے انعام کا صرف وہ ہی حقدار ہوگا، جس نے روزوں کو ایمان کے ساتھ اور مسنون طریق سے رکھا اور شرائط کو پورا کیا ہوگا۔ اللہ کے ان احکام پر عمل کرنے کے نتیجے میں بندہ مومن اپنے رب کی خوشنودی کا حق دار بن سکتا ہے۔

③ روزے کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے ماہِ رمضان المبارک کو بہت سے خصائص و فضائل کی وجہ سے دوسرے مہینوں کے مقابلے میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

① رمضان المبارک کے روزے رکھنا اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک رکن ہے۔

② اس ماہِ مبارک میں قرآن مجید کا نزول ہوا۔

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ [البقرۃ: ۱۸۵]

’’(روزوں کا مہینا) رمضان کا مہینا (ہے) جس میں قرآن نازل ہوا۔‘‘

جس کا ایک مطلب تو بعض علما اور مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ سب سے پہلی وحی جو غارِ حرا میں بصورتِ ﴿اِقْرَاْ﴾ جبرائیلِ امین علیہ السلام لے کر آئے، وہ رمضان مبارک کا واقعہ ہے۔

③ اس ماہ میں لیلۃ القدر ہے، جس کے بارے میں سورۃ القدر (آیت: ۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ﴾ ’’شبِ قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔‘‘

اس کے عشرہ اخیر کی طاق راتوں میں ایک قدر کی رات (شب قدر) ہوتی ہے، جس میں اللہ کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ ہزار مہینے 83 سال 4 مہینے بنتے ہیں، عام طور پر ایک انسان کو اتنی عمر بھی نہیں ملتی۔ یہ امتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اسے اتنی فضیلت والی رات عطا کی جس میں مسلمان سال میں ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے ۸۳ سال کی عبادت سے بھی زیادہ اجر و ثواب حاصل کرسکتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’انھوں نے بعض معتمد علما سے یہ بات سنی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ سے پہلے

لوگوں کی عمریں دکھلائی گئیں۔ تو آپ ﷺ کو ایسا محسوس ہوا کہ آپ ﷺ کی امت کی عمریں ان سے کم ہیں اور اس وجہ سے وہ ان لوگوں سے عمل میں پیچھے رہ جائیں گے جن کو لمبی عمریں دی گئیں، تو اللہ تعالیٰ نے [اس کا ازالہ اس طرح فرما دیا کہ] امتِ محمدیہ کے لیے لیلۃ القدر عطا فرما دی جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''[1]

④ رمضانِ مبارک شروع ہوتے ہی جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔[2]

قیامت کے دن روزے داروں کو اللہ تعالیٰ کے مہمانانِ خصوصی ہونے کا شرف واعزاز حاصل ہوگا اور جس مخصوص دروازے سے یہ ضیوف الرحمٰن یا مہمانانِ الٰہی جنت میں داخل ہوں گے، وہاں سے کسی دوسرے کا گزر ممکن نہیں ہوگا۔ صحیحین میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک کا نام باب ''الرّیان'' ہے، جس سے صرف روزے دار ہی داخل ہوسکیں گے۔''[3]

مقامِ صدیق رضی اللہ عنہ:

نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے مختلف اعمال پر مختلف دروازوں سے بلائے جانے کا ذکر سن کر آپ ﷺ کے خلیفہ بلافصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! (بندہ جنت میں داخل تو ایک دروازے ہی سے ہوگا لیکن) ''کیا کوئی ایسا (خوش نصیب وسعادت مند) بھی ہوگا جسے جنت کے سبھی دروازوں سے بلایا جائے گا؟''

نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

''نَعَمْ'' ہاں، (کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے اور) مجھے امید ہے کہ تم انھی میں سے ہوگے۔''[4]

سبحان اللہ! عظمتِ صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے دیگر بے شمار فضائل ومناقب کے علاوہ یہی مقام

[1] موطأ الإمام مالك، كتاب الاعتكاف، باب ما جاء في ليلة القدر (١/ ٣٢١) طبع مصر.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٩٩، ١٨٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧٩)

[3] مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (١/ ٦١٠)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (٤/ ٩٦) رياض الصالحين (ص: ٤٧٩) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٢٦١)

ومرتبہ کیا کم ہے کہ صحیحین میں مذکوراس ارشادِ رسالت مآب ﷺ کی رو سے ان کے استقبال کے لیے باب الرّیان تو کیا جنت کے آٹھوں دروازے ہی کھول دیے جائیں گے...!

⑤ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا تھا:

''رمضان مبارک میں عمرہ کرنے کا ثواب حج کے برابر ملتا ہے۔''[1]

⑥ فرشتے جب تک روزے دار روزہ افطار نہیں کرلیتے، ان کے حق میں رحمت و مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔

روزے دار کے منہ کی بو:

⑦ روزے دار کے منہ کی بو اللہ کے ہاں کستوری کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ اور خوشگوار ہوتی ہے۔

نبیِ رحمت ﷺ فرماتے ہیں:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! روزے دار کے منہ کی بدلی ہوئی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔''[2]

صحیح بخاری ومسلم، سنن ابوداود وترمذی اورنسائی میں نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کو کستوری کی خوشبو سے بھی زیادہ محبوب ہے۔''[3]

بتائیے! اس سے بڑھ کر اور اعزاز کیا ہوگا کہ وہ ناگوارسی ہوا بلکہ بدبو (جو معدے کے خالی رہنے اور منہ بند ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے) جو خود روزے دار کو بھی پسند نہیں ہوتی، اسے اللہ رب العزت اِس شرف سے نواز دیتا ہے کہ کستوری بھی اس کے سامنے کیا چیز ہے؟ یہ اس ہوا کا کوئی کمال نہیں بلکہ اس ہوا کی پسندیدگی تو دراصل اس بندے کی ادا کی پسندیدگی کی وجہ سے ہے کہ وہ میرے حکم کی تعمیل میں اپنے معدے اور پیٹ کو خالی رکھے ہوئے ہے، دراصل یہی تعمیلِ ارشاد بندے کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٥٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٠٤)

[3] رياض الصالحين (ص: ٤٧٨) صحيح الجامع (٢/ ٤/ ١١٩)

⑧ اگر روزے داروں نے صحیح معنوں میں روزے رکھ کر ان کے تقاضوں کو پورا کیا ہو تو رمضان کی آخری رات میں ان کی مغفرت کردی جاتی ہے۔

⑨ سرکش شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے۔[1]

رمضان کا استقبال:

اس مہینے کے اور بھی بہت فضائل و برکات ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے اللہ کے نیک بندے اس کا استقبال اس طرح کرتے ہیں کہ غفلت کے پردے چاک کردیتے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ و استغفار کے ساتھ یہ عزم [اللہ سے وعدہ] کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک مرتبہ پھر اس ماہِ مبارک کی سعادتوں سے نوازا ہے تو کیوں نہ ہم اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس کی فضیلت حاصل کریں اور اپنے اوقات کو اللہ کی عبادت کرنے اور اعمالِ صالحہ بجا لانے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں سمیٹنے میں صرف کریں۔

ماہِ رمضان کے بابرکت ہونے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس کے دنوں، گھنٹوں یا منٹوں میں کوئی ایسی برکت شامل ہے جو لوگوں کو خود بہ خود حاصل ہوجاتی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے ایسے مواقع پیدا کردیتے ہیں جن کی بدولت بندے بے حساب برکات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس مہینے میں ایک مسلمان جتنی زیادہ عبادت کرے گا اس کے لیے اتنی زیادہ روحانی ترقی کا وسیلہ بنے گی، کیونکہ اس مہینے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

> ''اس مہینے میں انسان جو بھی نیک عمل کرتا ہے، اس کا اجر اسے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے۔''[2]

④ رمضان کے روزے کب فرض ہوئے تھے؟

یاد رہے کہ رمضان المبارک کے روزے ۲ھ ماہ شعبان کی دو تاریخ بروز پیر کو فرض کیے گئے تھے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٠٠) و صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٩٤)

[3] نيل الأوطار (٢/ ٤/ ١٨٦) فقه السنة (١/ ٤٣٣)

روزے کا بے حساب اجر:

حدیث شریف کی روشنی میں رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت و فضائل اور بعض مسائل سے متعلقہ قرآنی آیات کی طرح ہمارے نبیِ رحمت ﷺ کی احادیث میں بھی رمضان المبارک کے روزے فرض قرار دیے گئے ہیں اور نہ صرف یہ کہ فرض قرار دیے گئے ہیں، بلکہ انھیں اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن کا درجہ دیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: ① اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ ② نماز قائم کرنا۔ ③ زکات ادا کرنا۔ ④ رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔ ⑤ اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ شریف کا حج کرنا۔''[1]

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

جبریلِ امین علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہا: ''جس کی زندگی میں رمضان مبارک کا مہینا آیا اور وہ اپنے اللہ سے بخشش و معافی حاصل نہ کر سکا تو اس کے لیے ہلاکت ہے اور میں نے کہا: آمین۔ پھر جناب جبریل علیہ السلام نے کہا: اس آدمی کے لیے بھی ہلاکت ہے جس کے سامنے آپ ﷺ کا ذکر کیا جائے اور وہ آپ ﷺ پر درود نہ بھیجے۔ میں نے آمین کہا اور پھر فرمایا: جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اس نے ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہیں کی اس کے لیے بھی ہلاکت ہے اور میں نے کہا: آمین۔''[2]

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس بابرکت مہینے کی خاص برکتوں اور رحمتوں سے نوازے۔ آمین

① روزے رکھنے سے ایک مومن کی ایمانی قوت میں اضافہ اور اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت کا نقش اس کے دل میں مزید گہرا ہو جاتا ہے اور وہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں راحت اور اطمینان محسوس کرتا ہے اور نافرمانی میں اس کی گرفت سے ڈرتا ہے۔

② اس کے عقیدۂ آخرت میں تازگی اور پختگی آجاتی ہے اور وہ روزے میں اپنی تمام لذتیں قربان

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦)

[2] صحيح ابن حبان (٢/ ١٤٠)

کر دیتا ہے، یعنی ہر قسم کی خواہشات کو ترک کرتا ہے، ایسا وہ اس یقین کی بنیاد پر کرتا ہے کہ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں اس سے زیادہ لذتوں والی چیزیں عطا فرمائے گا۔

⑤ اخلاص للہ کا منفرد مظہر:

تمام عبادات میں سے روزہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے سوا اسلام کے تمام ارکان کا کسی نہ کسی حد تک ظاہر سے بھی ایک تعلق ہے، جیسے نماز ہی کو لے لیجیے کہ یہ پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔سورت بقرہ (آیت:۴۳) میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ''اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

جب اس حکم کے تحت کوئی شخص با جماعت نماز ادا کرے گا تو پوری جماعت اسے مسجد میں آتے جاتے اور نماز ادا کرتے دیکھے گی۔حج ادا کرنے پر سیکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں حجاج کا جم غفیر اسے مناسکِ حج وعمرہ ادا کرتے دیکھتا ہے اور زکات ہے تو وہ بھی کم از کم دینے اور لینے والے دو آدمیوں کے مابین ہوگی مگر روزہ وہ منفرد عبادت ہے کہ ایک وقت اس کا تعلق ظاہر سے بالکل ہی ٹوٹ جاتا ہے اور صرف عابد و معبود کا باہمی معاملہ ہی رہ جاتا ہے۔مثلاً والدین، بہن، بھائیوں اور بیوی بچوں یا دوست احباب کے ساتھ مل کر سحری کھائی، مگر جب وہ باتھ روم، کچن یا کسی بھی مقام پر تنہا ہے تو بنی نوعِ انسان تو کیا تمام مخلوقات میں سے کوئی پرندہ تک بھی اُسے نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ایسے میں جب باہر شدّت کی دھوپ اور گرمی ہو تو انسان کا نفسِ امّارہ اسے یہ طفل تسلیاں دیتا ہے کہ اس تنہائی میں اگر تم ٹھنڈے پانی سے شاد کام ہو لو، تو کون دیکھ رہا ہے؟ اور کس کا ڈر ہے عین اُسی وقت روزے دار کا ذاتِ الٰہی پر غیر متزلزل ایمان آڑے آتا ہے، اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے اور اُسے جھنجھوڑ کر بتاتا ہے کہ اس تنہائی میں پانی پینے میں بھی اُس ذات کا ڈر ہے جو شہ رگ سے بھی قریب تر ہے اور میرا روزہ اُسی کے لیے ہے، کیونکہ سورت قٓ (آیت:۱۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾

''ہم تو اپنے بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

⑥ غیر متزلزل ایمان اور اس کی جزا:

روزہ بندے کے اندر صبر و ثبات کی خوبیاں پیدا کرتا ہے جو اسے دین پر قائم رکھتی ہیں اور

اللہ تعالیٰ کے حکم سے انحراف نہیں کرنے دیتیں۔ یکسوئی و تنہائی کے لمحات میں اگر اسے فکرِ آخرت اور خوفِ الٰہی نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے لطیف و خبیر اور علیم و رقیب ہونے پر اس کا مضبوط و محکم ایمان نہ ہو تو وہ کبھی روزے کی تکمیل نہ کر پائے۔ یہ دولتِ ایمان ہی کا کرشمہ ہے کہ آتش بار گرمی میں بھی وہ روزے دار کو ٹھنڈے پانی سے لطف اندوز نہیں ہونے دیتا اور ایک گھونٹ بھی گلے سے نیچے نہیں اتارنے دیتا۔ یہ امتیازی اور انفرادی حیثیت تمام عبادات میں سے صرف روزے ہی کو حاصل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جس نے رمضان کے روزے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے خاص میرے لیے رکھے تو میں ہی ان کی جزا دوں گا۔ روزے دار اپنی ساری خواہشات اور کھانا پینا صرف میری خاطر چھوڑتا ہے۔ ایسے روزے دار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں، ایک خوشی وہ جب روزہ دار روزہ افطار کرتے وقت راحت اور خوشی محسوس کرتا ہے اور دوسری خوشی اسے اپنے رب سے ملاقات کے وقت ہوگی۔''[1]

اندازہ فرمائیں! روزے کی اس امتیازی و انفرادی حیثیت و مقام میں دوسرا کوئی عمل اس کا مقابلہ کر پائے گا؟ ہرگز نہیں اور اس کا مستحق کون ہوگا؟ صرف وہ روزے دار جس نے صحیح معنوں میں روزے کے تقاضے کو پورا کیا ہو گا۔ جیسے جھوٹ، غیبت، بد گوئی، گالی گلوچ، دھوکا، فریب دینا اور اسی قسم کی تمام بے ہودگیوں اور بدعملیوں سے جو اجتناب کرے گا۔ لہٰذا جب آپ روزے سے ہوں تو کسی قسم کی فحش گوئی اور بیہودہ باتیں نہ کرے، اگر کوئی آپ کو بُرا بھلا کہے یا لڑنے کی کوشش کرے تو آپ اسے کہیں کہ میں روزے سے ہوں۔[2]

⑦ روزے کے تقاضے:

''روزے کی حالت میں جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو کوئی حاجت نہیں کہ یہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑے (اور اس کے بھوکا پیاسا مرنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں)۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٠٣)

[3] رياض الصالحين (ص: ٤٧٥) صحيح الجامع (٢/ ٤/ ١٩٩)

اس ارشادِ گرامی میں یہ بتا دیا ہے کہ روزے کی حالت میں جھوٹ نہ بولنا بھی قبولیتِ روزہ کی ایک شرط ہے اور اگر کوئی شخص روزہ بھی رکھے اور جھوٹ بھی بولتا جائے تو ایسے روزے دار کو اس کے روزے کا ثواب نہیں ہوگا، وہ خواہ مخواہ ہی بھوک پیاس برداشت کر رہا ہے۔

معلوم ہوا کہ روزہ صرف اسی چیز کا نام نہیں کہ طلوعِ صبح صادق سے لیکر غروبِ آفتاب تک کھانے پینے سے منہ بند کرلیا جائے، بلکہ روزے کے کچھ اور بھی تقاضے ہیں جو اس کی قبولیتِ کے لیے ضروری ہیں بلکہ یوں کہہ لیں کہ صرف منہ، پیٹ اور شرمگاہ ہی کا روزہ نہیں بلکہ تمام اعضائے جسم کا روزہ ہونا چاہیے۔

غیبت اور چغلی کھانے سے قطعی پرہیز کرے۔ دل و دماغ کو آوارگی و بدخیالی سے روکے اور تصوّرات کی دنیا میں خوابوں کے محل تیار کرنے اور جسمانی و ذہنی عیاشی سے باز رہے۔ راہ چلتی عورتوں کی تاک جھانک کرنے سے بچے اور اپنے کانوں کو ناجائز باتوں، گانوں اور موسیقی سے محفوظ رکھے۔ کیونکہ یہ تمام برائیاں جہاں معاشرتی ناسور کی حیثیت رکھتی ہیں، وہیں یہ سب امور آدابِ روزہ کے بھی خلاف ہیں۔

جو شخص مہینا بھر ثواب و جنت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچاتا رہے گا تو وہ اپنے نفس پر اتنا قابو پانے میں کامیاب ہوجاتا ہے کہ اُس کی خواہشاتِ نفس بے لگام نہیں ہونے پاتیں اور وہ اللہ کے حکم سے اپنے آپ کو رضائے الٰہی کا پابند بنا لیتا ہے۔

⑧ ابلیس اور جہنّم کے سامنے ڈھال:

جس طرح ڈھال کے ذریعے انسان دشمن کے وار سے اپنا بچاؤ کرتا ہے، اسی طرح روزے دار روزے کی ڈھال سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچے گا اور یہی روزہ اس کو جہنم سے بچاؤ کے لیے ڈھال ثابت ہوگا۔ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و ترمذی اور نسائی شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”روزہ ڈھال ہے۔ اللہ کا بندہ اس کے ذریعے نارِ جہنم سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔“[1]

معلوم ہوا کہ اس دنیا کی عملی زندگی میں تو روزہ مسلمانوں کو اپنے ازلی دشمن ابلیسِ لعین سے

[1] صحيح الجامع (٢/ ٤/ ١١٤) رقم الحديث (٣٨٦٧)

بچاؤ کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے اور گناہوں سے بچاتا ہے جبکہ اُخروی زندگی میں روزہ آگ کے سامنے ڈھال کا کام دے گا اور روزے دار کو جہنم سے بچائے گا۔

⑨ روزہ؛ نفس کی سرکشی کا زور توڑنے میں معاون ہے:

عام طور پر دو چیزیں گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا باعث بنتی ہیں:

① نفس کی بڑھتی ہوئی خواہش اور اس کی سرکشی۔

② شیطان کا وجود اور اس کا مکر وفریب۔

رمضان المبارک میں سرکش شیطان کو جکڑ دیا جاتا ہے جس سے یقیناً نیکی کے رجحان میں اضافہ اور اللہ کا خوف دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ خیر کے اس اضافے اور نیکی کے ماحول سے انسان اگر پورا فائدہ اٹھائے تو اس سے یقیناً اس کے مزاج اور کردار کا فساد دور ہوسکتا ہے

روزہ نفس کی بڑھتی ہوئی سرکشی کو بھی لگام دیتا ہے اور اس کی حیوانی خواہشوں کو بھی بے قابو نہیں ہونے دیتا۔ اسی لیے نبی رحمت ﷺ نے نوجوانوں کو بطورِ خاص خطاب فرمایا تھا، کیونکہ نوجوانی میں نفس زیادہ زور آور ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

> ''نوجوانو کی جماعت! تم میں سے جو شادی کی استطاعت رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ شادی کرلے، کیوں کہ یہ [شادی] نگاہوں کو پست رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوتی ہے اور جو اس کی طاقت نہیں رکھتا، تو وہ روزے رکھے، کیونکہ یہ روزہ اس کی نفسانی خواہشوں کا زور توڑے رکھے گا۔''[1]

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے روزے کو ایک نفع بخش عمل قرار دیا ہے۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

> ''میں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! مجھے ایسا کام بتلائیں جو مجھے نفع دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: روزے رکھا کرو، اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔''[2]

گویا روزہ بندے کے اندر وہ تقویٰ پیدا کر دیتا ہے جو روزے کا اصل مقصد ہے۔ اگر انسان

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٠)

[2] سنن النسائي، باب فضل الصيام، رقم الحديث (٢٢٢٣)

اس ایک ماہ کے مشن کو اپنے احساس وشعور کا حصہ بنالے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کا یہ خوف قدم قدم پر اس کے دامن گیر رہ سکتا ہے اور اسے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز رکھ سکتا ہے۔ جب وہ اللہ کے حکم پر اللہ تعالیٰ کے ڈر سے جائز اور حلال کاموں سے بھی وقتی طور پر رکا رہتا ہے تو جن چیزوں اور کاموں کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے حرام اور ناجائز قرار دیا ہے، ایک مومن اور ایک متقی ان کا ارتکاب کس طرح کرسکتا ہے؟

ایک مومن کے اندر جب یہ تقویٰ اور ڈر پیدا ہو جاتا ہے تو ایک طرح سے اس کی ٹریننگ یا تربیّت بھی ہوجائے گی، جو سال بھر برائیوں سے بچنے کے لیے اس کے کام آئے گی اور اتنے میں پھر یہ ماہِ مبارک آجائے گا۔جس نے اللہ کی رضا کے لیے ایسا کیا، سمجھو اس نے اس مہینے کی رحمتوں اور برکتوں میں سے اپنا حصہ پالیا اور اللہ کی رحمت ومغفرت کا حقدار بن گیا، جنت میں داخلے اور جہنم سے آزادی کا مستحق ہوگیا۔

⑫ ماہِ رمضان ... ماہِ قرآن:

ماہِ رمضان المبارک کے فضائل وبرکات کا تذکرہ اس وقت تک نامکمل رہتا ہے جب تک ان میں اس بات کا ذکر نہ آجائے کہ اس ماہِ مبارک ہی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس میں قرآنِ کریم نازل ہوا، گویا یہ ماہِ رمضان، ماہِ قرآن بھی ہے کہ اسی ماہ کی ایک برکت وعزت اور قدر والی رات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دستورِ حیات،قرآنِ کریم کو لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا میں واقع بیت العزت تک نازل فرمایا اور پھر وہاں سے تئیس (۲۳) سال کے دوران میں تھوڑا تھوڑا کرکے حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت نبی اکرم ﷺ پر نازل کیا جاتا رہا۔چنانچہ سورت دخان (آیت: ۳، تا ۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ﴾

’’ہم نے اس کتاب (قرآنِ کریم) کو ایک بڑی ہی خیر وبرکت والی رات میں نازل کیا اور ہم لوگوں کو متنبہ کرتے ہیں اور اُسی رات میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔‘‘

قرآنِ کریم کا نزول رمضانِ کریم میں ہوا، اس لیے قرآنِ کریم کا رمضان المبارک کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ماہِ مبارک میں نبی اکرم ﷺ حضرت جبرائیلِ امین علیہ السلام کے ساتھ قرآنِ کریم کا دور فرمایا کرتے تھے اور صحابہ و تابعین بھی اس ماہ میں کثرت سے قرآنِ کریم کی تلاوت کا اہتمام کرتے تھے۔ لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ اس ماہِ مقدس میں زیادہ سے زیادہ قرآنِ کریم کی تلاوت کیا کریں، کیونکہ کثرتِ تلاوت بھی مستحب ہے، توجہ اور اہتمام کے ساتھ ساتھ سمجھ کر پڑھیں، کیونکہ قرآنِ کریم کو پڑھتے اور سنتے وقت ایک مسلمان پر خوف اور رقت کی کیفیت بھی طاری ہونی چاہیے، یعنی اللہ کے ڈر اور خوف سے دلوں کو نرم ہونا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب پڑھنے اور سننے والے دونوں ہی الفاظ کے معانی سے بھی واقف ہوں۔

قرآن کو محض تاریخ و قصص کی کتاب نہ سمجھا جائے بلکہ اسے کتابِ ہدایت سمجھ کر اس طرح پڑھا جائے کہ جہاں اللہ کی رحمت و مغفرت اور اس کی بشارتوں اور نعمتوں کا بیان ہے، وہاں اللہ سے ان کا سوال کیا جائے اور جہاں عذاب و وعید کا تذکرہ ہو، وہاں ان سے اللہ کی پناہ مانگی جائے۔

ہمارے اسلاف اس طرح غور و تدبر سے قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے تھے کہ ان پر بعض دفعہ ایسی کیفیت اور رقت طاری ہوتی کہ بار بار وہ ان آیتوں کی تلاوت کرتے اور خوب بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑاتے اور اگر سننے والے بھی غور و تدبر سے سنیں تو ان پر بھی یہی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

جب آپ مکے میں جاتے ہیں تو نماز کے وقت آپ نے اندازہ کیا ہوگا جب ائمہ حرم خصوصاً فضیلۃ الشیخ عبد الرحمٰن السدیس حفظہ اللہ اور فضیلۃ الشیخ سعود الشریم حفظہ اللہ وغیرہ قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو سارا حرم آہوں اور سسکیوں میں ڈوب جاتا ہے اور امامِ حرم کے خشوع و خضوع سے پُر آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز رُک رُک کر سنائی دیتی ہے، یہ کیفیت تبھی ہوتی ہے جب ہم قرآن پاک کے ترجمے سے واقف ہوں گے۔

نبی اکرم ﷺ اس طرح غور و تدبر سے قرآن پڑھتے اور اس سے اثر پذیر اتنا ہوتے کہ جن سورتوں میں قیامت کی ہولناکیوں کا بیان ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ انھوں نے مجھے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا کردیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

''مجھے ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔''[1]

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩٧)

اللہ کے خوف سے ڈرنا اور رونا اللہ کو بہت محبوب ہے۔ایک حدیث میں نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

''سات آدمیوں کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائے گا:

① جس کی آنکھوں سے تنہائی میں اللہ کے ذکر اور اس کی عظمت و ہیبت کے تصور سے آنسو جاری ہو جائیں۔

② عدل و انصاف کرنے والا حاکم۔

③ جوانی کی عمر میں عبادت کرنے والا۔

④ جس کا دل ہر وقت مسجد سے جڑا ہوا ہو۔

⑤ صدقہ خالص اللہ کی رضا کے لیے کرنے والا۔

⑥ اللہ کے لیے کسی سے محبت کرنے والا۔

⑦ خوبصورت اور حسب ونسب والی عورت جس نوجوان کو برائی کی دعوت دے تو وہ اللہ سے ڈرتا ہوا کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔''[1]

بہر حال اپنے دل میں اللہ کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت غور و تدبّر سے کی جائے، اس کے معانی و مطالب کو سمجھا جائے اور اللہ کی عظمت و جلالت کو قلب و ذہن میں مستحضر کیا جائے۔

⑬ روزہ قیامت کے دن روزے دار کا سفارشی ہوگا:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندے کے لیے سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا: اے میرے رب! میں نے تیرے اس بندے کو کھانے پینے اور اپنی خواہشات (پوری کرنے) سے روکے رکھا، لہٰذا اس کے بارے میں میری سفارش قبول فرما۔ اسی طرح قرآنِ پاک بھی کہے گا: ''اے میرے رب! میں نے اس بندے کو رات (قیام کے لیے) سونے سے روکے رکھا، لہٰذا اس کے لیے میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔''[2]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٠، ٦٤٧٩)

[2] مسند أحمد، صحيح الجامع (٢/ ٧٢٠) رقم الحديث (٣٨٨٢)

⑭ روزے کی اہمیت اور تارک کے لیے وعید:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے بلا عذر یا بلا مرض رمضان کا ایک روزہ بھی ترک کیا، ساری عمر کے روزے بھی اس کا کفارہ نہیں بن سکتے۔''[1]

روزے کا ایک تربیتی پہلو:

آج ہمارے معاشرے میں نیکی مغلوب اور بدی غالب ہے، شر خوب پھل پھول رہا ہے اور خیر سکڑتا اور سمٹتا جا رہا ہے، حالانکہ ہم سالہا سال سے رمضان المبارک کے روزے رکھتے چلے آ رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود نیکی کا عمومی ماحول بن رہا ہے نہ ہمارے اندر کوئی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک رسم کے طور پر روزہ رکھ لیتے ہیں اور اس کی روح کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک محدود وقت کے دوران میں ہم صرف کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں، لیکن محرماتِ ابدیہ سے اجتناب ضروری نہیں سمجھتے۔ گویا تقوے کی اصل حقیقت سے ہم محروم ہی رہتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ روزے سے ہماری ایمانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے نہ ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف راسخ ہوتا ہے، جبکہ برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایمان مستحکم، آخرت پر یقین مضبوط اور دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو۔ جب ایسا ہو جاتا ہے تو پھر انسان نہ صرف یہ کہ خود برائی کا ارتکاب نہیں کرتا، بلکہ برائی کو ہوتے ہوئے دیکھنا بھی اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ ایمان و تقویٰ اسی جذبے اور شعور کا نام ہے۔

اس لحاظ سے رمضان المبارک کا مہینا بہت ہی فضیلت کا حامل ہے کہ اس کی غرض و غایت ہی گناہوں سے بچنے کی تربیت کرنا ہے۔ جو شخص گناہوں سے رکنا اور بچنا چاہتا ہو تو رحمتوں اور برکتوں کے اس مقدس مہینے میں تھوڑی سی کوشش اور ارادے ہی سے اس کی طبیعت نیکی کی طرف راغب اور گناہوں سے بچنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

جس نے مہینے بھر دن کے اوقات میں ترکِ طعام کے ساتھ رات کے اوقات میں قیام کر کے اپنے

---

[1] ضعيف. سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٧)

رب سے گناہ اور برائی سے توبہ کر کے نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تو اس نے صحیح معنوں میں روزے کے اغراض و مقاصد حاصل کر لیے اور اس ماہِ مقدس کی برکتوں سے اپنا حصہ پالیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں رمضان المبارک کے مہینے کے روزے رکھنے کی توفیق سے نوازے، اس مہینے کی رحمتیں اور برکتیں نصیب فرمائے اور ہماری نمازیں، روزے، تلاوتِ قرآن اور صدقہ و خیرات ہر قسم کی عبادات خاص اس کی رضا کے لیے ہوں اور اطاعتِ رسول ﷺ کے مطابق ہوں۔ اگر عمل میں کسی اور کی اطاعت ہوگی تو پھر ہر قسم کے اعمال برباد ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو نرم کردے، حق کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ظلم وزیادتی سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

بارگاہِ الٰہی میں دعا ہے کہ مجھے اور آپ سب کو نیکی کرنے کے ساتھ ساتھ برائی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور خلوصِ نیت کے ساتھ اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ رسول ﷺ میں ہمیں رمضان المبارک کے روزے اور ہر قسم کی عبادت کی توفیق سے نوازے اور ہمیں اس ماہ مبارک کی سعادتوں سے بہرہ ور ہونے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین اور ہمیں انبیا و صدقین، شہدا و صالحین اور نیک لوگوں کا ساتھ نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ
3. رمضان المبارک؛ فضائل و برکات۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان قمر حفظہ اللہ
4. کتاب رمضان المبارک۔ تالیف: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ
5. کتاب الصیام۔ تالیف: مولانا محمد اقبال کیلانی حفظہ اللہ

نمازِ تراویح

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ البقرہ (آیت: ۱۸۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

’’رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن اترا، راہ بتلاتا ہے لوگوں کو اور اس میں کھلی دلیلیں ہیں ہدایت کی اورحق کو ناحق سے پہچاننے کی، پھر جو کوئی تم میں سے یہ مہینا پائے (صحیح اور مقیم ہو، مسافر نہ ہو) وہ اس میں روزے رکھے اور جو بیمار یا مسافر ہو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے، اللہ تم پر آسانی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا (اسی لیے مریض اور مسافر کو افطار کی اجازت دی) اور یہ چاہتا ہے کہ تم رمضان کی گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی کرو اس احسان پر کہ تم کو سیدھے راستے پر چلایا اور تاکہ تم اس کا شکر کرو۔‘‘

جب ماہِ رمضان المبارک کا چاند شہادت یا خبر کی بنا پر ثابت ہوجائے تو وہ رات ماہِ رمضان کی پہلی رات شمار ہوتی ہے اور اگر مناسب وقت پر چاند نظر آجائے یا اس کے نظر آجانے کی اطلاع مل جائے تو اُسی رات نمازِ عشا کے بعد نمازِ تراویح کا آغاز ہوجاتا ہے۔

① نمازِ تراویح کی فضیلت:

رمضان المبارک کی راتوں کا [قیام اللیل] اس قدر باعثِ اجر وثواب ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس نے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے خالص اُس کی رضا جوئی کے لیے رمضان المبارک کی راتوں کو قیام کیا، اس کے سابقہ تمام گناہ بخش دیے گئے۔''[1]

② نمازِ تراویح کا حکم:

قیامِ رمضان یا نمازِ تراویح کا ادا کرنا فرض نہیں بلکہ سنّت ہے اور اس سلسلے میں ائمہ وفقہائے مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے۔ لہٰذا وہ حضرات جو جھٹ سے فتویٰ داغ دیتے ہیں کہ جس نے تراویح نہ پڑھی اس کا کوئی روزہ نہیں، انھیں اپنے اس قول کی اصلاح کرلینا چاہیے۔ البتہ ماہِ رمضان المبارک کے شب و روز انتہائی برکت وفضیلت والے ہیں، لہٰذا اس ماہ میں صدقہ و خیرات، تلاوتِ قرآنِ کریم اور نوافل جس قدر بھی ممکن ہوں کم ہیں۔ لیکن جو آدمی کسی عذر کی وجہ سے نمازِ تراویح ادا نہیں کرسکا، وہ صبح اپنا روزہ رکھ سکتا ہے اور اس کے روزے میں کسی قسم کا کوئی فرق یا نقص نہیں آتا۔

اس کی دلیل:

نمازِ تراویح کی ترغیب دلانے کے لیے اتنی سخت فتویٰ بازی کے بجائے مسنون طریقہ اختیار کرنے ہی میں خیر و برکت ہے اور وہ مسنون طریقہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں مذکور ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو رمضان کی راتوں میں قیام کرنے [نمازِ تراویح پڑھنے] کی ترغیب دلایا کرتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں عزیمت [وجوباً پابندی] کا حکم نہیں دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ''جس نے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اسی کی رضا وخوشنودی کے حصول کی خاطر رمضان کی راتوں کو قیام کیا، اس کے سابقہ تمام گناہ بخش دیے گئے۔''[2]

ایک اور حدیث میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''رمضان کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور قیام کا طریقہ میں نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے، لہٰذا جس نے ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٤/ ٢٥٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٤/ ٣٩، ٤٠)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٤/ ٢٥٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ٤٠)

اور راتوں کو قیام کیا، وہ اس طرح گناہوں سے پاک ہوگیا، جیسے آج ہی پیدا ہوا ہے۔''[1]

نبی کریم ﷺ نے خود ایک رمضان میں تین دن قیام اللیل یعنی نمازِ تراویح باجماعت ادا فرمائی۔ آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی نہایت ذوق و شوق کے ساتھ تین دن یہ نماز پڑھی۔ چوتھے دن بھی صحابہ رضی اللہ عنہم قیام کے لیے آپ ﷺ کے منتظر رہے، لیکن آپ ﷺ حجرے سے باہر تشریف نہیں لائے اور اس کی وجہ آپ ﷺ نے یہ بیان فرمائی کہ ''مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوگیا کہ کہیں رمضان المبارک میں یہ قیام اللیل تم پر فرض نہ کردیا جائے۔'' اس لیے اس کے بعد یہ قیام اللیل بطورِ نفلی نماز کے انفرادی طور پر ہوتا رہا۔ نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہی معمول رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت تمیم داری اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ وہ رمضان المبارک میں اس قیام اللیل کا باجماعت اہتمام کریں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر دوبارہ اس سنت کا احیا عمل میں آیا، جسے رسول اللہ ﷺ نے خواہش کے باوجود فرض ہوجانے کے خوف سے چھوڑ دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ قیام اللیل فرض نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک سنت نماز کی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ عہدِ رسالت و عہدِ صحابہ میں اسے قیام اللیل کہا جاتا تھا، یعنی تہجد کی نماز، جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نمازِ تہجد کا وقت عشا کی نماز کے بعد سے لے کر رات کے آخری پہر یا طلوعِ فجر تک ہے، اس کے دوران میں کسی بھی وقت اسے پڑھا جاسکتا ہے۔

③ رکعاتِ تراویح کی تعداد:

نمازِ تراویح کی رکعتیں کتنی ہیں؟ اس سلسلے میں موجودہ عمل تو آپ کے سامنے ہے کہ کوئی آٹھ (8) تراویح اور تین (3) وتر، کُل گیارہ (11) رکعتیں پڑھتا ہے، کوئی دس (10) تراویح اور تین (3) وتر، کُل تیرہ (13) رکعتیں پڑھتا ہے اور کوئی بیس تراویح (20) اور تین (3) وتر، کُل تئیس (23) رکعتیں پڑھتا ہے۔ اس سلسلے میں جو احادیث ملتی ہیں، ان میں سے پہلی حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و ترمذی میں ہے جس میں حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں:

''انھوں نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: ماہِ رمضان (کی راتوں) میں نبی مکرم ﷺ

[1] ضعیف الجامع الصغیر، رقم الحدیث (۳۴۱۲)

کی نماز کیسی ہوتی تھی؟ انھوں نے جواب دیا: آپ ﷺ رمضان یا غیر رمضان (کسی بھی دوسرے مہینے) میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔‘‘[1]

یہ گیارہ رکعتیں تین وتروں سمیت ہیں اور اِن میں تراویح کی تعداد صرف آٹھ (8) رکعتیں ہے۔ صحیحین و غیرہ کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی مکرم ﷺ کے قیام اللیل، قیامِ رمضان، صلوٰۃ اللیل، تہجد یا تراویح کی تعداد آٹھ (8) رکعتیں اور تین (3) وتر، کل گیارہ (11) رکعتیں تھی۔

④ نمازِ تراویح، قیامِ رمضان، قیام اللیل، صلوٰۃ اللیل اور تہجد:

یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یہ تو نبی مکرم ﷺ کی نمازِ تہجد یا قیامُ اللیل کی رکعتیں تھیں نہ کہ نمازِ تراویح کی۔ جبکہ مذکورہ پانچوں نام ایک ہی نماز کے ہیں۔ سال کے گیارے مہینوں میں جو نماز دوسرے تین ناموں سے پڑھی جاتی ہے، اسے ہی ماہِ رمضان میں تراویح یا قیامِ رمضان کے نام سے ادا کیا جاتا ہے اور جن تین راتوں میں نبی مکرم ﷺ نے نمازِ تراویح کی جماعت کروائی تھی، اُن راتوں میں تہجد کے نام سے الگ سے نبی مکرم ﷺ کا قیام اللیل ادا کرنا ہرگز ثابت نہیں ہے، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیان کے مطابق آپ ﷺ کے تراویح کی جماعت سے فارغ ہونے کے بعد اتنا وقت ہی نہیں بچا تھا کہ کوئی دوسری متعدد رکعتوں والی نماز پڑھی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری اور دیگر محدثینِ کرام نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی قیام اللیل یا تہجد کی گیارہ رکعتوں والی نماز پر مشتمل حدیث کو کتاب التراویح میں ذکر کیا ہے۔

دلائل:

نمازِ تراویح ہی کے تہجد ہونے، نبی مکرم ﷺ کے ماہِ رمضان میں تہجد کی جگہ صرف تراویح ہی پڑھنے اور تہجد کے نام سے دوسری کوئی نماز نہ پڑھنے کے کئی دلائل ہیں۔ اس کی ایک واضح دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’’ہم نے نبی مکرم ﷺ کے ساتھ ماہِ رمضان کے روزے رکھے۔ آپ ﷺ نے ہمیں تیئسویں (23) روزے تک قیام نہیں کروایا اور اس رات جب قیام کروایا تو اتنی لمبی قراءت فرمائی کہ پہلی رات کا ایک تہائی حصہ اور دوسری رات کا آدھا حصہ قیام ہی میں

[1] صحیح البخاري مع الفتح (۳/ ۳۳) کتاب التهجّد، باب قیام النبي ﷺ باللیل في رمضان وغیره.

گزر گیا ... تیسری رات جب آپ ﷺ نے قیام کی جماعت کروائی تو اتنی لمبی تلاوت فرمائی، حتیٰ کہ ہم ڈر گئے کہ آج کہیں ہم ''فلاح'' ہی سے نہ رہ جائیں، میں نے عرض کی کہ ''فلاح'' سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: سحری کا کھانا۔''[1]

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان راتوں میں جس نماز کی جماعت نبی مکرم ﷺ نے کروائی تھی وہ تراویح ہی تھی، ایسے ہی ان احادیثِ صحیحہ کی بعض روایات میں ﴿ صَلوٰةُ اللَّيْلِ ﴾ اور ﴿قِيَامُ هَذَا الشَّهْرِ ﴾ بھی کہا گیا ہے۔ تو گویا تراویح ہی رمضان میں صلوٰۃ اللیل اور تہجد بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سنت کے مطابق قیام اللیل اور فرض نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے، کیونکہ بے نماز کا روزہ مقبول نہیں۔

آج مسلمانوں میں نماز جیسے اہم فریضے سے غفلت عام ہے، حالانکہ یہ ایسا فریضہ ہے جس سے کفر و اسلام کے درمیان فرق و امتیاز ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

''وہ عہد جو ہمارے [مسلمانوں] اور کافروں کے درمیان ہے، نماز ہے، جس نے نماز کو ترک کر دیا، اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔''[2]

گویا نماز دین کا وہ ستون ہے جس پر دینِ اسلام کی عمارت استوار ہوئی ہے، لیکن مسلمان اتنی شدید غفلت میں مبتلا ہیں کہ بہت سے لوگ روزہ رکھنے کے باوجود نماز نہیں پڑھتے۔ یاد رکھیے! اس طرح روزہ رکھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں، جب بے نماز پر کفر تک کا حکم لگایا گیا ہے، تو کفر کے ساتھ روزہ رکھنے کا کیا مطلب؟ کافر کا تو کوئی عمل مقبول ہی نہیں، پھر بے نمازی کا روزہ کیوں قبول ہوگا؟

⑤ اعمال کے اجر وثواب کا دار و مدار نیت پر ہے:

صحیح بخاری شریف جیسی بلند پایہ کتاب میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔''[3]

روزہ بھی چونکہ ایک دینی فریضہ ہے، لہٰذا اس کے لیے بھی نیت ضروری ہے۔ چنانچہ سنن ابو داود، ترمذی اور نسائی میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٨٧)

[2] مسند أحمد (٥/ ٣٤٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٢١)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٩)

”جس شخص نے فجر سے پہلے روزے کی نیّت اور پختہ ارادہ نہ کیا، اس کا کوئی روزہ نہیں۔“[1]

البتہ نفلی روزے کی نیت دن میں کسی بھی وقت کی جاسکتی ہے۔ بعض دیگر احادیث سے رات کے وقت یا قبل از فجر روزے کی نیت کر لینے کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ نیت کیا ہے؟ نیت محض دل کا قصد و ارادہ ہے اور اسے ادا کرنا (تلفظ) ثابت نہیں ہے، خصوصاً نماز و روزہ اور غسل و وضو وغیرہ کی نیت زبان سے کرنا نبی اکرم ﷺ، خلفاے راشدین اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کرام و ائمہ عظام رحمہم اللہ میں سے کسی سے بھی منقول نہیں ہے۔ البتہ حج وعمرہ اور قربانی کے وقت زبان سے یہ کہنا درست ہے، جیسے ایک حدیث میں ہے:

«اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ عَنْ شُبْرُمَةَ»

”اے اللہ! میں شبرمہ کی طرف سے حج کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

ایسے ہی «بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَنِّیْ وَعَنْ فُلَانٍ» والی حدیث ہے:

”اے اللہ! تیرے نام کے ساتھ اور تو سب سے بڑا ہے۔ یہ (قربانی) میری طرف سے اور فلاں کی طرف سے قبول فرما۔“[2]

جن اعمال کے لیے زبانی نیت ثابت ہے، ان کی نیّت تو زبان سے کی جاسکتی ہے، لیکن جن کی ثابت نہیں ان کی نیّت بھی زبان سے کرنا ہرگز صحیح نہیں اور ہمیں یہی چاہیے کہ جہاں آپ ﷺ نے کچھ کیا وہاں ہم بھی اتنا کچھ کریں اور جہاں آپ ﷺ نے کچھ نہیں کیا، وہاں ہمیں بھی کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اتباعِ سنت اور اطاعتِ رسول ﷺ یہی ہے۔

⑥ سحری کرنا سنت اور باعثِ برکت ہے:

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

”ہمارے اور اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) کے روزوں کے درمیان سحری کھانے ہی کا فرق ہے۔“[3]

لہٰذا بعض لوگ جو افطاری سے نصف شب تک کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے ہی رہتے ہیں اور سحری کے وقت کچھ کھائے پیے بغیر ہی سو جاتے ہیں کیونکہ اسوقت ان کے پاس مزید کھانے کی کوئی گنجایش

[1] إرواء الغليل (٤/ ٢٥) وصحّحه، مشكاة المصابيح (١/ ٦٢٠) الفتح الرباني (٩/ ٢٧٥، ٢٧٦)

[2] فتاویٰ علماے حدیث (٦/ ٩٤، ٩٥)

[3] بحواله جات سابقه والفتح (١٠/ ١٧)

ہی نہیں ہوتی ان کا یہ طریقہ کار خلافِ سنت اور روزے کے اجر وثواب میں کمی کا باعث ہے اور ایسا کرنے سے روزے کا ایک مقصد بھی فوت ہوجاتا ہے۔ لہٰذا زیادہ نہیں تو چند لقمے ہی سہی سحری کے وقت کچھ نہ کچھ ضرور کھانا چاہیے، تاکہ سنت پر عمل ہوجائے اور خیر وبرکت حاصل ہو۔ سحری کھانے کی تاکید کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ سنن سعید بن منصور میں مروی ہے:

''سحری کھاؤ، چاہے صرف ایک لقمہ ہی کیوں نہ ہو۔''[1]

مسند ابو یعلی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''سحری کھاؤ، چاہے وہ صرف ایک گھونٹ پانی کی شکل ہی میں کیوں نہ ہو۔''[2]

سحری میں کوئی بھی حلال چیز کھائی جاسکتی ہے، کوئی پابندی نہیں۔ البتہ سنن ابوداود میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''مومن کی بہترین سحری کھجور ہے۔''[3]

ایک حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

''سحری کا کھانا باعثِ برکت ہے، اس لیے اسے نہ چھوڑیں، کیونکہ اللہ عز وجل سحری کرنے والوں پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے رحمت ومغفرت کی دعا کرتے ہیں۔''[4]

⑦ سحری کا وقت:

سحری کھاتے رہنے کا وقت کب تک ہے؟ اس سلسلے میں قرآنِ کریم نے سورت بقرہ (آیت: ۱۸۷) میں یہ اصول بتایا ہے:

﴿وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾

''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ (رات کے) سیاہ دھاگے سے صبح کا سفید دھاگا (سپیدہ فجر) نمودار ہوجائے۔''

---

[1] نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٢٢)

[2] صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٩٤٥) نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٢١) الفتح الرباني (١٠/ ١٥، ١٦)

[3] صحيح سنن أبي داود للألباني (٢/ ٤٤٦) مشكاة المصابيح (١/ ٦٢٢)

[4] مسند أحمد (٣/ ١٢)

صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”حضرت بلال رضی اللہ عنہ رات کے وقت اذان کہتے ہیں، لہٰذا ان کی اذان سن کر کھاتے پیتے رہو، یہاں تک کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان کہہ دیں۔“

معلوم ہوا کہ نماز فجر کی اذان ہونے تک سحری کا وقت رہتا ہے۔ لہٰذا سحری کھاتے وقت اگر اذان ہوجائے تو کھانا پینا فوراً ترک کرنے کے بجائے جلدی جلدی کھالینا چاہیے۔

⑧ باعثِ عبرت:

وہ لوگ جو رات بھر تو محض اس لیے جاگتے رہتے ہیں کہ کہیں سوئے نہ رہ جائیں اور سحری کا وقت ہی نہ گزر جائے اور پھر جونہی دو تین بجے رات کے قریب پہلی اذان کہی جاتی ہے تاکہ لوگ اٹھیں اور سحری وغیرہ پکائیں، وہ اتنے تک کھا پی کر سو بھی چکے ہوتے ہیں۔ ان کا یہ طریقہ کار ہر لحاظ سے غلط اور خلافِ سنت ہے۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ گھنٹوں پہلے سحری سے فارغ ہوجانے کے بجائے مسنون طریقہ اپنائیں۔

اس غیر مسنون طریقے کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ وقت سے کافی پہلے جب سحری کھا کر لیٹتے ہیں تو سستی کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ رتجگے کا اثر بھی ہوتا ہے اور شیطانِ لعین کی تھپکیاں بھی کہ ابھی تو اقامتِ نماز میں کافی وقت ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنکھ لگ گئی، اولاً تو نماز ہی گئی یا پھر کم از کم جماعت کا ہاتھ سے نکل جانا تو یقینی بات ہے جبکہ یہ بہت بڑا خسارہ ہے جو سنت کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اپنے نفس کو رضائے الٰہی اور سنتِ رسول ﷺ کا پابند بنانا چاہیے۔ اگر جنت حاصل کرنی ہے تو اپنے نفس پر اتنا قابو پانے میں کامیاب ہوجائیں کہ آپ کی خواہشاتِ نفس بے لگام نہ ہونے پائیں۔

⑨ افطاری میں جلدی کرنا:

صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی و ابن ماجہ، بیہقی و دارمی اور مسند احمد میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

”لوگ اس وقت تک خیریت سے رہیں گے جب تک (غروبِ آفتاب کے بعد) افطاری

میں جلدی کرتے رہیں گے۔"

غرض اس بات پر پوری امت کے ائمہ اہلِ سنت کا اتفاق ہے کہ روزے کا وقت غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی ختم ہوجاتا ہے، لہٰذا غروبِ شمس کا یقین ہوتے ہی روزہ افطار کرلینا چاہیے۔[1]

⑩ افطاری میں تاخیر پر وعید:

افطاری میں تاخیر کرنے سے حدیث میں منع کیا گیا ہے اور اس فعل کو یہود ونصاریٰ کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سنن ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"دینِ اسلام اس وقت تک غالب رہے گا جب تک لوگ افطاری میں جلدی کرتے رہیں گے، کیونکہ یہود ونصاریٰ اس میں تاخیر کرتے ہیں۔"[2]

ان تمام ارشاداتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ سورج کے غروب ہوتے ہی روزہ افطار کرلینا چاہیے اور تاریکی کے پھیلنے یا اندھیرا چھانے اور ستارے نظر آنے کا انتظار کرنا یہود ونصاریٰ کی عادت ہے اور یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے۔

⑪ افطاری کے لیے مسنون اشیا:

جہاں تک افطاری سے متعلقہ اشیا کا مسئلہ ہے تو روزہ کسی بھی پاک وحلال چیز سے افطار کیا جاسکتا ہے، اس میں کوئی پابندی یا سختی نہیں ہے، البتہ روزہ افطار کرنے کے لیے افضل اشیا کی ترتیب یہ ہے کہ کھجور یا چھوارے سے افطار کریں۔ اگر یہ میسر نہ آسکیں تو پھر پانی سے افطار کرلیں یا اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز کھالیں۔ حضرت سلمان بن عامر ضبی رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"تم میں سے جب کوئی روزہ افطار کرے تو اسے چاہیے کہ کھجور سے افطار کرے، کیونکہ یہ باعثِ برکت ہے اور اگر وہ میسر نہ ہو تو پانی سے افطار کرلے، کیونکہ پانی پاک کر دینے والا ہے۔"[3]

---

[1] الفتح الرباني (١٠/ ٥) نقلًا عن ابن عبدالبر.

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٦٢٢) الفتح الرباني (١٠/ ٦)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٦٢١) الفتح الرباني (١٠/ ٧، ٨)

⑫ افطاری کی دعا:

بسم اللہ پڑھ کر روزہ افطار کریں، تاہم روزہ افطار کرتے وقت کی ایک دعا بھی نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے، چنانچہ سنن ابو داود، بیہقی، ابن ابی شیبہ اور ابن السنّی میں حضرت معاذ بن زہرہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب روزہ افطار فرماتے تو یہ دعا کیا کرتے تھے:

«اَللّٰھُمَ اِنِّیْ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ»[1]

''اے اللہ! میں نے تیری رضا کے لیے روزہ رکھا اور تیرے عطا کردہ رزق ہی سے افطار کیا۔''

لیکن اس کی سند پر کلام کیا گیا ہے۔ جبکہ ایک صحیح ترین سند والی حدیث میں یہ دعا آئی ہے:

«ذَھَبَ الظَّمَأُ وَ ابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَ ثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ»[2]

''پیاس چلی گئی، انتڑیاں بھیگ گئیں اور اللہ نے چاہا تو اجر وثواب ثابت ہو گیا۔''

⑬ وقتِ افطار قبولیتِ دعا کا وقت ہے:

دعا کی قبولیت کے مختلف اوقات میں سے ایک وقت، وقتِ افطار بھی ہے، کیونکہ سنن ابن ماجہ، ابن السنّی اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

''روزے دار کی افطاری کے وقت کی گئی دعا ردّ نہیں کی جاتی۔''[3]

⑭ افطار کرانے کا ثواب:

کسی روزے دار کا روزہ افطار کرانا بہت بڑا کارِثواب ہے، یہاں تک کہ سنن ترمذی، نسائی و ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت زید بن خالد جُہنی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

''جس نے کسی روزے دار کا روزہ افطار کرایا، اسے (افطار کرانے کا) اتنا ہی ثواب ہوگا جتنا خود روزے دار کو ہوگا اور روزے دار کے ثواب میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔''[4]

---

[1] المنتقى (٣/ ٥/ ٢٢٧) مشكاة المصابيح (١/ ٦٢١) الإرواء (٤/ ٣٨)

[2] سنن أبي داود (٢/ ٣٠٦) صحيح الجامع (٢/ ٢٠٩١٤)

[3] إرواء الغليل (٤/ ٤١) الفتح الرباني (١٠/ ١١) نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٢١)

[4] الفتح الرباني (١٠/ ١٠)

اس ثواب کو پانے اور افطار کروانے کا معنیٰ یہ بھی نہیں کہ کسی کو پیٹ بھر کر شام کا کھانا کھلائیں گے، تبھی جا کر افطار کروانے کا ثواب ملے گا۔ نہیں، شکم سیر کروانے پر تو واقعی یہ ثواب ہے اور اگر کسی میں اتنی طاقت واستطاعت نہیں کہ وہ کسی کو ایک وقت کا پورا کھانا کھلا سکے تو وہ ایک لقمہ ہی کھلا دے، کھجور کا ایک دانہ ہی دے دے۔ دودھ کا ایک گھونٹ ہی پلا دے حتیٰ کہ پانی کا چلّو ہی پلا دے، تب بھی (شاید نیک نیت اور کم استطاعت کے اعتبار سے اسے بھی) افطار کروانے کا ثواب مل جائے۔ اس بات کا پتا کئی ایک روایات سے بھی چلتا ہے، لیکن ان کی استنادی حیثیت مخدوش ہے۔[1]

⑮ روزے کی حالت میں مسواک کرنا جائز ہے:

صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب، مسند احمد اور ترمذی شریف میں حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"میں شمار نہیں کرسکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں مسواک کرتے دیکھا ہے۔"[2]

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے: "روزے کی حالت میں خشک یا تر ہر قسم کی مسواک کی جاسکتی ہے۔" جس طرح تلخ (تازہ) مسواک کرنا جائز ہے، ایسے ہی منجن بھی جائز ہے۔[3]

اب رہا ٹوتھ پیسٹ اور برش کا استعمال تو یہ بھی تر اور تلخ مسواک کی طرح ہی ہے، البتہ اس میں ذائقہ بہت زیادہ اور اس کا اثر بڑا تیز ہوتا ہے، اس لیے بلا عذر اس کا استعمال کرنا کچھ مناسب نہیں۔ مفتی عالمِ اسلام شیخ ابن باز رحمہ اللہ کا یہی فتویٰ ہے۔[4]

اگر کوئی پیسٹ برش کر لیتا ہے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا لیکن بہتر یہ ہے کہ دن کو مسواک پر ہی اکتفا کیا جائے، منجن اور پیسٹ کو رات پر ڈال لیا جائے۔

---

[1] بلوغ الأماني شرح الفتح الرباني (١٠/ ١٠) مجمع الزوائد (٢/ ٣/ ١٥٩)

[2] الفتح الرباني (١٠/ ٤٦)

[3] بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (١٠٣/٦)

[4] مجله الدعوة (عدد: ١٠٤١ بابت ٤ رمضان ١٤٠٦ھ، ١٢ مئی ١٩٨٦ء)

روزہ کن کاموں سے نہیں ٹوٹتا

① بھول کر کچھ کھا پی لینا:

اگر روزے کی حالت میں بھول کر کچھ کھا پی لے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، چاہے یہ کھانا پینا کم مقدار میں ہو یا زیادہ میں، کیونکہ بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"جس شخص نے روزے کی حالت میں بھول کر کچھ کھا پی لیا، اُسے اپنا روزہ پورا کرنا چاہیے، کیونکہ اُسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے۔"[1]

سنن دارقطنی میں حسن درجے کی سند کے ساتھ ارشادِ نبوی ﷺ مروی ہے:

"اس پر قضا ہے نہ کفّارہ۔"[2]

② نہانا:

روزے کی حالت میں نہانے یا سر پر پانی ڈالنے سے بھی روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سنن ابو داود، نسائی اور موطا مالک میں حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن کسی صحابی سے روایت بیان کرتے ہیں:

"میں نے نبی مکرم ﷺ کو روزے کی حالت میں گرمی یا پیاس کی وجہ سے سر پر پانی ڈالتے دیکھا ہے۔"[3]

③ جنابت کی حالت میں سحری کرنا:

روزے کی حالت میں نہانے کے جواز کی صحیح دلیل بخاری و مسلم وغیرہ کی اُس حدیث میں بھی ہے جس میں حضرت عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں:

"نبی مکرم ﷺ اپنی کسی زوجہ محترمہ سے جنابت کی حالت میں صبح کرتے، پھر آپ ﷺ نمازِ فجر سے قبل غسل فرماتے اور آپ ﷺ اُس دن کا روزہ مکمل فرماتے۔"[4]

اس حدیث سے جہاں روزے دار کے غسل کا جواز معلوم ہوا، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی

---

[1] رواه الجماعة إلا النسائي، نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٠٦)

[2] إرواء الغليل (٤/ ٨٧) وحسّنهُ الألباني.

[3] الفتح الرباني (١٠/ ٤٦) وصححه الشوكاني في النيل (٢/ ٤/ ٢١٠)

[4] صحيح البخاري و صحيح مسلم، الفتح الرباني (١٠/ ٦٩)

پر غسل واجب ہو اور سحری کا وقت ہو جائے تو وہ غسل کیے بغیر سحری کھا سکتا ہے۔ صرف استنجا و طہارت کرلے اور سحری کھا کر غسل کرلے، تاکہ نمازِ فجر میں شامل ہو سکے۔ اس طرح بھی اُس کے روزے پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ یہ خود بخاری و مسلم میں نبی مکرم ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔

④ احتلام:

علامہ ابن رُشد ''بدایة المجتهد'' میں فرماتے ہیں:

''اس پر اجماع ہے کہ اگر روزے دار کو دن کے وقت سونے میں احتلام یعنی بدخوابی ہو جائے تو اُس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔''[1]

⑤ بوسہ لینا اور بغل گیر ہونا:

صحیح بخاری و مسلم شریف میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''نبی اکرم ﷺ اُن کا بوسہ لیا کرتے تھے، حالانکہ آپ ﷺ روزے سے ہوتے تھے۔''[2]

سنن ابو داود میں ایک روایت ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ سے ایک آدمی نے روزے کی حالت میں (اپنی بیوی سے) بغلگیر ہونے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی، پھر ایک دوسرے شخص نے آ کر یہی سوال کیا تو آپ ﷺ نے اُسے منع کر دیا اور اُس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جس آدمی کو آپ ﷺ نے اجازت دی تھی وہ بوڑھا تھا اور جسے منع فرمایا تھا وہ نوجوان تھا۔ اس روایت کے پیشِ نظر علما نے کہا ہے کہ شہوت پر قابو نہ رکھ سکنے والے جوان آدمی کو روزے کی حالت میں بوس و کنار نہیں کرنا چاہیے اور جو شخص بڑی عمر والا اور اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا ہو، اُسے اجازت ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم میں مروی ہے۔[3]

⑥ سرمہ لگانا:

روزے کی حالت میں سُرمہ لگانا ایسا موضوع ہے جس کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں نبی مکرم ﷺ سے کوئی بھی صحیح حدیث ثابت نہیں (نہ لگانے کے جواز

---

[1] الفتح الرباني (١٠/ ٣٠)

[2] متفق عليه، نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢١٠)

[3] نيل الأوطار (٢/ ٤/ ١٢، ١٣، ٢١٠) تحفة الأحوذي (٣/ ٤٢٥)

میں اور نہ منع کرنے کے بارے میں) لیکن روزہ نہ ہونے کی صورت میں سُرمہ لگانا مستحب ہے، لہٰذا جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ رحمہم اللہ کے نزدیک روزے کی حالت میں سُرمہ لگانے میں کوئی حرج نہیں۔

سید سابق نے فقہ السنہ (۱/ ۴۶۰) میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سمیت متعدد ائمہ سے جواز نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ سُرمہ ہو یا کوئی قطروں والی دوا (آئی ڈراپس) اور اس کا اثر گلے میں محسوس ہو یا نہ ہو بہرحال مباح ہے، کیونکہ آنکھ معدے کو جانے والا راستہ نہیں ہے۔ البتہ قطروں کی شکل میں ناک میں ڈالی جانے والی دوا (نازل ڈراپس) کا استعمال نہ صرف مکروہ ہے بلکہ یہ روزہ توڑ دیتا ہے اور حدیثِ استنشاق (دورانِ وضو ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ کرنے سوائے اس کے جو روزے سے ہو) سے اس قول کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔[1]

⑦ خوشبو لگانا:

بخور وعطور یا پرفیوم وغیرہ خوشبوؤں کا لگانا اور سونگھنا شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جائز قرار دیا ہے۔[2]

⑧ قے آنا:

اگر کسی کو غیر ارادی اور غیر اختیاری طور پر خود بہ خود قے آجائے تو اُس سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور اگر کوئی روزے دار قصد و ارادے سے خود قے کرے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اُس روزے کی قضا لازم آتی ہے، کیونکہ سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''جس شخص کو قے مغلوب کرلے (یعنی خود بخود آجائے اُس کا روزہ نہیں ٹوٹتا اور) اُس کے ذمے کوئی قضا نہیں اور جو شخص اپنے ارادے سے خود قے کرے (اُس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اُسے چاہیے کہ اُس روزے کی قضا کرلے۔''[3]

⑨ ٹیکا لگوانا:

اسی سلسلے میں ایک چیز ٹیکا لگوانا بھی ہے، چونکہ یہ ایک نیا مسئلہ ہے تو شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

---

[1] فقه السنة (١/ ٤٦١)

[2] فتاویٰ ابن تیمیة (٢٥/ ٢٣٣، ٢٥٨) فقه السنة (١/ ٤٦٢)

[3] نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٠٤)

''وہ امور جن سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، ان میں سے ہی تھوڑا سا خون نکلنا یا نکلوانا اور وہ ٹیکا لگوانا ہے جو غذائی نہ ہو، اگرچہ اس کا بھی رات تک موخر کر دینا ہی اَولیٰ اور زیادہ قرینِ احتیاط ہے۔''[1]

وہ امور جن سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے:

اُن میں سے بعض میں صرف قضا اور بعض میں قضا اور کفارہ دونوں واجب ہو جاتے ہیں۔

روزہ مندرجہ ذیل کاموں سے ٹوٹ جاتا ہے:

① جان بوجھ کر کچھ کھاپی لینا۔　② جان بوجھ کر قے کرنا۔

③ مغرب سے پہلے حیض کا شروع ہوجانا۔ ان پر قضا ہے، کفارہ نہیں۔

④ جماع کرنا۔

جو شخص جماع کرلے اس کا بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ پیٹ کی طرح نفس کی خواہشات سے رکے رہنا بھی روزے کا لازمی جزو ہے اور ایسے آدمی پر قضا اور کفارہ دونوں ہی واجب ہیں، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک آدمی نے نبی مکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! میں ہلاک ہوگیا۔'' آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تمھیں کس چیز نے ہلاک کیا؟''

اُس نے بتایا کہ میں رمضان میں (دن کے وقت روزے کی حالت میں) اپنی بیوی سے جماع کربیٹھا ہوں۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم ایک غلام آزاد کرسکتے ہو؟ اُس نے کہا: نہیں، فرمایا: کیا تم مسلسل ساٹھ روزے رکھ سکتے ہو؟ اُس نے جواب دیا: نہیں، فرمایا: کیا تم ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ اُس نے کہا: نہیں، پھر وہ شخص وہیں کچھ دیر بیٹھا رہا، اتنے میں نبی مکرم ﷺ کے پاس ایک بوری آئی جس میں چھوہارے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ چھوہارے صدقہ کردو۔''[2]

نبی اکرم ﷺ نے کفارے کا حکم صرف آدمی کو ہی فرمایا تھا، حالانکہ عورت کی اس کیفیت میں جو پوزیشن ہے وہ بھی آپ ﷺ کو معلوم تھی۔ (اس کے باوجود عورت کو کفارے کا حکم نہیں فرمایا تھا)

---

[1] مقاله ابن باز، مجلّه البلاغ كويت (عدد: ٦٥)

[2] صحيحين وسنن أربعه، نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢١٥)

مسافر اور بیمار کے لیے روزے کا حکم:

قرآنِ کریم کی سورت بقرہ (آیت: ۱۸۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾

''تم میں سے جو بھی اس (ماہِ رمضان) کو پالے وہ اس کے روزے رکھے۔''

اِس فرمانِ الٰہی کے پیشِ نظر پوری امتِ اسلامیہ کے ائمہ و علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رمضان کا روزہ ہر عاقل و بالغ اور مقیم وتندرست مسلمان مردوزن پر فرض ہے، البتہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے یہ رخصت دی ہے کہ وہ رمضان کے کل یا کچھ روزے نہ رکھ سکیں تو بعد میں قضا کرلیں، جیسا کہ سورت بقرہ (آیت: ۱۸۵) میں فرضیت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾

''اور جو شخص بیمار یا مسافر ہو اُسے دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرنی چاہیے۔''

ساتھ ہی فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾

''اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمھارے ساتھ آسانی کا ہے، سختی کا نہیں، وہ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرلو۔''

اس آیت کے الفاظ: ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ اور ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ سے یہ بات واضح فرمادی کہ مرض وسفر کی حالت میں جتنے روزے چھوٹ جائیں، تندرستی اور قیام کی حالت میں ان کی گنتی پوری کرنا ضروری ہے۔

عمر رسیدہ شخص کا روزہ:

اِسی ضمن میں عمر رسیدہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کا ذکر بھی آتا ہے کہ اگر وہ اس قدر بوڑھے اور ضعیف ہوجائیں کہ اُن کے لیے روزہ رکھنا مشکل ہو تو ''بدایة المجتهد'' (۲/ ۱۱۷) میں علامہ ابن رشد کے بقول تمام ائمہ کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ انھیں روزے چھوڑنے کی اجازت

ہے اور امام ابوحنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل اور امام بخاری رحمہم اللہ وغیرہ جمہور ائمہ کے نزدیک وہ روزہ چھوڑنے کی صورت میں بطورِ فدیہ روزانہ ایک مسکین کا کھانا دے دیا کریں۔[1]

اگر کوئی مرد یا عورت یا میاں بیوی بوڑھے بھی ہوں اور فقیر محتاج بھی تو ایسے لوگوں پر نہ روزہ فرض ہے اور نہ فدیہ، کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اللہ تعالیٰ کسی کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''[2]

حمل والی اور دودھ پلانے والی عورت:

حمل یا چھوٹے بچے کو دودھ پلانے والی عورت کو روزہ رکھنے سے اگر اُسے یا بچے کو یا دونوں کو نقصان پہنچے یا اندیشہ ہوتو ایسی عورت بھی رمضان کے کل یا جتنے روزے چھوڑے اُسے اجازت ہے، البتہ بعد میں اتنے روزوں کی قضا کرلے چنانچہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مسافر سے روزہ اور آدھی نماز کم کردی اور حمل والی اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت سے روزہ کم کردیا۔''[3]

اس سے معلوم ہوا کہ مسافر جب مقیم ہوجائے تو اُس پر روزے کی قضا ہے، ایسے ہی حمل یا بچے والی عورت پر بھی قضا ہے کیونکہ ان دونوں کا حکم بھی مسافر والا ہے جس پر قضا واجب ہے۔

حیض ونفاس والی عورت:

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ہم حیض سے ہوتیں تو ہمیں روز کی قضا کا تو حکم دیا جاتا تھا لیکن نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔''[4]

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٥٧٦)

[2] تفسير ابن كثير اُردو (١/ ٢٥٥، ٢٥٦)

[3] نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٣٠)

[4] فقه السنّة (١/ ٤٤٤)

بہرحال قضا روزے آیندہ رمضان سے پہلے کسی بھی وقت ادا کیے جا سکتے ہیں، مسلسل یا الگ الگ کر کے رکھے دونوں طرح درست ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس مقدس مہینے کی برکات سے نوازے اور ہم سب کو صحت وسلامتی کے ساتھ خالص اپنی رضا کے لیے روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ
3. فضائل و مسائلِ رمضان و روزہ۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. نمازِ تراویح۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
5. رمضان المبارک۔ تالیف: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

رمضان المبارک کے بعد ہمارا طرزِ عمل

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ الحجر (آیت: ۹۹) میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرمارہے ہیں:

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾

''اپنے رب کی عبادت کرو، یہاں تک کہ تمھیں موت آجائے۔''

ماہِ رمضان ختم ہوچکا اور جاچکا ہے، اب گیارہ ماہ بعد لوٹ کر آئے گا، بہرحال رمضان تو ختم ہوچکا لیکن رمضان کے بعد ہمارا کیا حال ہونا چاہیے؟ رمضان تو ختم ہوچکا لیکن مومن کا عمل کبھی ختم نہیں ہوتا، کیونکہ رمضان میں بھی رب وہی ہے جو شعبان، شوال، باقی مہینوں اور سالوں میں رب ہے اور ایک مسلمان سے مطلوب یہی ہے کہ وہ ان نیکیوں پر استقامت اختیار کرے، جن نیکیوں کی اس نے ماہ رمضان میں تربیت حاصل کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ أَدْوَمُهَا وَ اِنْ قَلَّ»[1]

''اللہ کے نزدیک سب سے پیارا عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی کی جائے، اگرچہ وہ عمل کم ہی کیوں نہ ہو۔''

صبر کا مہینا ختم ہوچکا۔ صبر متقیوں کا توشہ ہے، جس طرح آپ نے اس مہینے میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کیا، اسی طرح رمضان کے بعد بھی اپنی زبان کو ہر قسم کی بے ہودہ و حرام بات جیسے غیبت، چغلی، فحش کلامی، جھوٹ اور گالی گلوچ سے دور رکھا، آپس میں فساد برپا کرنے والی باتوں سے اپنی زبان کو روک کر رکھیں۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''جہنم میں لوگوں کو ان کی زبان کی شرارتیں ہی اوندھے منہ گرائیں گی۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٨٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦١٥)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا:

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بہتر مسلمان کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: ''وہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔''[1]

تمام اعضا کا بادشاہ دل ہے:

نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

''خبردار! بے شک جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح و سالم ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ خبردار! وہ ٹکڑا دل ہے۔''[2]

ایک حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ کہہ کر واضح فرما دیا کہ ''ذکرِ الٰہی ہی اطمینانِ قلبی کا ذریعہ ہے۔''

ایک مومن کا دل رمضان اور غیر رمضان میں روزے ہی سے رہتا ہے، یوں مومن کا دل ہر قسم کے فاسد مادوں جیسے تباہ کن شرکیات، غلط عقیدے، برے وساوس و خیالات، گندی نیتوں اور خطرناک باتوں سے خالی ہوتا ہے۔

مومن کا دل تکبر سے بھی بچا رہتا ہے، کیونکہ مومن کو تواضع نکھارتا اور حسن اخلاق مکمل کرتا ہے اور تکبر یہ ہے کہ کوئی شخص حق بات نہ مانے اور لوگوں کو حقیر سمجھے اور لوگوں کے سامنے اترا کر چلے۔ اللہ تعالیٰ کسی خود پسند کو پسند نہیں فرماتے۔[3]

مسلم شریف کی ایک حدیثِ قدسی میں ارشادِ الٰہی ہے:

''عظمت و کبریائی میری چادریں ہیں جس نے ان میں سے کوئی بھی مجھ سے چھیننی چاہی میں اسے نارِ جہنم میں جھونک دوگا۔''

اسی طرح ایک مومن اپنے دل کو حسد اور بغض سے بھی بچا کر رکھتا ہے، کیوں کہ یہ مونڈھ دینے والی چیزیں ہیں جو دین کو مونڈ دیتی ہیں۔[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩١٨)

[4] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٣٨)

لہٰذا کسی مومن میں ایمان و حسد دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ بات شاید کسی بھی مسلمان پر مخفی نہ ہو کہ اِسی مرض میں سب سے پہلے شیطانِ لعین مبتلا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مرضِ خطیر سے محفوظ رکھے۔ آمین

یوں ایک مومن کا دل غلط تفکرات سے بلکہ ہر اس چیز سے رک جاتا ہے جو ایمان کے شایان شان نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک مومن کو چاہیے کہ وہ اپنی آنکھوں کو حرام چیزوں کی طرف دیکھنے سے محفوظ کر لے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مومن مردوں کو مخاطب کر کے فرما رہے ہیں:

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾ [النور: ۳۰]

''اے میرے نبی! مسلمان مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہی ان کے لیے پاکیزگی ہے۔''

اسی سورت (آیت: ۳۱) میں اللہ تعالیٰ مومن عورتوں کو مخاطب کر کے فرما رہے ہیں:

﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾

''اور مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت میں فرق نہ آنے دیں۔''

اسی طرح ایک مومن کو چاہیے کہ اپنے کانوں کو ہر قسم کی بے ہودہ اور گندی باتوں کے سننے سے روکے رکھے۔ جو اللہ رب العالمین کے غیظ وغضب کو دعوت دینے والی ہوں۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ جن وانس کو قیامت کے دن جمع کرے گا تو ان کے دلوں، نگاہوں اور کانوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ چنانچہ سورۃ الاسراء (آیت: ۳۶) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴾

''کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک کے بارے میں پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔''

اسی طرح ایک مومن کا ہاتھ کسی قسم کے حرام مال کو پکڑنے یا چھونے کی کوشش نہیں کرتا اور نہ مومن کے ہاتھوں لوگوں پر ظلم و زیادتی ہوتی ہے، نہ وہ مکر و فریب، مار دھاڑ، سودی معاملات، رشوت، چوری اور نہ دھوکا دہی کے ذریعے کسی سے مال و دولت حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا جیسے آپ نے

رمضان کا پورا مہینا اپنے نفس کے ساتھ جہاد کیا ہے، اُسی طرح باقی مہینوں میں بھی اپنے نفس سے جہاد کرنا چاہیے، تاکہ پورا سال آپ کا عمل ایسا ہی ہو جیسے رمضان میں ہوا کرتا ہے۔

ماہِ رمضان ختم تو ہو چکا لیکن روزہ ختم نہیں ہوا، کیونکہ رمضان کے روزے کے علاوہ اور بھی روزے ہیں۔ ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ ان نفلی روزوں سے محروم نہ رہے۔ مثلاً ماہِ شوال کے چھ روزے، یوم عاشوراء ۹، ۱۰ محرم، ۹ ذوالحجہ یوم عرفہ کا روزہ، ہر ماہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ چاند کی تاریخ کا روزہ اور ہر ہفتے پیر اور جمعرات کا روزہ بلکہ ایک دن چھٹی اور ایک دن روزہ صوم داودی ہے۔

قیام اللیل یا تراویح کا مہینا تو گزر چکا ہے لیکن یہ قیام اللیل رمضان تک ہی محصور نہیں ہے، آپ کو چاہیے کہ ہر رات قیام سے بہرہ ور ہوں، جنھوں نے فرض نمازیں ادا کرنے پر محافظت کی بلکہ آگے بڑھ کر نمازِ تراویح اور تہجد کی بھی پابندی کرتے رہے، انھیں چاہیے کہ مستقل اس عمل کو کرتے رہیں، کیونکہ قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے نماز کا حساب کیا جائے گا، اگر نماز درست نکلی تو باقی سارا عمل درست ہوگا اور اگر نماز خراب نکلی تو باقی سارا عمل فاسد ہوگا۔[1]

نیک اعمال کی قبولیت کی نشانی یہ ہے کہ بندہ نیکی کے بعد بھی نیکی کرتا رہے، لہٰذا رمضان کے بعد نیک اعمال کا اہتمام روزے اور قیام اللیل یا تراویح کی قبولیت کی علامت ہے، لہٰذا ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم مضان سے پہلے کی حالت کی طرف پلٹنے سے بچیں، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ﴾ [النحل: ۹۲]

"اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت مضبوط کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کرکے توڑ ڈالا۔"

آپ اپنی نیند اور غفلت سے بیدار ہو جائیے، مختلف طریقوں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہا کریں اور اپنی آخرت کے لیے (زادِ سفر) جمع کر لیجیے، ہر حال اور ہر وقت توبہ و انابت الی اللہ کرتے رہیے، شاید کہ آپ کی لغزشات معاف ہوں اور آپ کی توبہ قبول ہو اور اللہ کی شفقت و رحمت آپ کو نصیب ہو اور اہلِ مغفرت میں آپ کا شمار ہو جائے۔

ماہ رمضان میں توبہ:

جب تک انسان کی زندگی باقی ہے، اس کی دنیوی آرزوئیں ختم نہیں ہوسکتیں، اس کا نفس

[1] السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٥٨)

اسے گناہوں کی لذتوں اور خواہشوں سے نکلنے کی اجازت دے سکتا ہے اور نہ شیطان کے اس بہکاوے سے بچ سکتا ہے کہ عمر کے آخری حصے میں توبہ کرلینا، اس طرح اس کی آرزوئیں کم نہیں ہوسکتیں، چاہے اس کی عمر کتنی ہی لمبی ہو، بلکہ جس قدر انسان بڑا ہوتا ہے اس کے اندر مال اور لمبی عمر کا لالچ بڑھتا ہے، بلکہ آپ اس کی طمع و آرزو کی کوئی حد نہیں پائیں گے۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

''آدم کا بیٹا جس قدر بڑا ہوتا ہے، اس کے ساتھ دو چیزیں اور بڑی ہوتی جاتی ہیں، ایک مال کی محبت اور دوسری لمبی عمر کی خواہش۔''[1]

اللہ عزوجل نے اہلِ ایمان کو، جو تمام مخلوقات میں سب سے بہترین مخلوق ہیں، مخاطب کرکے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ اپنے ایمان، صبر، ہجرت اور جہاد کے بعد توبہ کریں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [النور:۳۱]

''اے مومنو! تم سب کے سب اللہ سے توبہ و استغفار کرو، تاکہ تم کامیاب ہوسکو۔''

آپ کے دل نے توبہ کا صحیح اہتمام کرلیا تو فلاح و کامیابی اور دنیا و آخرت کی سعادت آپ کا مقدر بن جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے میں آپ اپنے اندر ایک عجیب جذبہ محسوس کریں گے۔ اس لیے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے آگے بڑھیں اور اپنے اللہ سے توبہ و استغفار کریں۔ مومنوں کے برعکس ظالموں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات (آیت: ۱۱) میں بیان فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ ''اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم لوگ ہیں۔''

لیکن اہل ایمان اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں، ہر معاملے میں اپنے اللہ سے ڈرتے ہیں اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر نادم ہوکر اپنے رب سے توبہ و استغفار کرتے رہتے ہیں۔

توبہ صرف منکرات و معصیات کرنے پر ہی نہیں ہوا کرتی، بلکہ نوافل کے چھوڑنے اور خیر کے کاموں پر سستی کرنے پر بھی توبہ ہوتی ہے، اسی طرح موکدہ سنتوں کو ادا کرنے میں کوتاہی کرنے سے بھی توبہ ہے اور اپنی غفلت اور قیمتی وقت کو ضائع کرنے پر بھی توبہ کرنی چاہیے۔

میری پیاری بہنو (اور بھائیو!) ویسے تو انسان کی ساری زندگی توبہ کے لیے مفتوح اور کھلی

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٠٥٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٤٧)

ہوئی ہے، لیکن ایک مسلمان جس نے اپنی زندگی کے کئی سال گناہوں میں گزارے ہیں اور گناہ کی حد سے تجاوز کر گیا ہے، ایسے مسلمان کو چاہیے کہ وہ سچے دل سے اپنے گناہوں کو اپنے رب کے سامنے رکھ کر انھیں قبول کرے اور اپنے خالق و مالک سے توبہ کرے اور اپنی توبہ کی قبولیت سے نا امید بھی نہ ہو، کیونکہ مایوسی کفر و ضلالت ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی کریم ذات ہے، وہ کسی سائل کی دعا کو رد نہیں کرتا، اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، آپ کا اپنے ربِ کریم کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے ایک شخص کو اپنی جنت میں داخل کر دیا حالانکہ اس نے اللہ کے لیے ایک سجدہ بھی نہ کیا تھا (کیوں کہ وہ توبہ کرنے کے بعد نماز کے وقت سے پہلے فوت ہوگیا)، آپ کا اس رب کے بارے میں کیا خیال ہے کہ جس نے ایسے شخص کو جنت میں داخل کر دیا جس نے سو آدمیوں کو قتل کیا تھا، آپ کا کیا خیال ہے اس رب کے بارے میں جس نے ایک زانیہ عورت کو محض ایک کتے کو پانی پلانے پر جنت میں داخل کر دیا، جب اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھا کہ یہ لوگ توبہ کرنے اور نادم ہونے میں عاجزی و انکساری اور خوف میں مخلص اور سچے ہیں تو اللہ ارحم الراحمین نے ان سب پر رحم فرما دیا۔ اس یقین پر ہمیں بھی اپنے اللہ رحمٰن سے توبہ کرنی چاہیے۔ توبہ نہ کرنے والے کے متعلق نبی اکرم ﷺ سے بسند صحیح ثابت ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

''اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس نے رمضان کو پایا اور اپنے گناہوں کی مغفرت کا سامان نہیں کیا۔''

ممکن ہے کہ یہ موقع دوبارہ ہمیں نہ ملے۔ یہ ایام ہمارے لیے غنیمت ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے اور اس فرصت سے مستفید ہونے کے لیے جلدی کریں، خالص اور سچی توبہ کا اعلان کریں، تاکہ اللہ تعالیٰ توبہ کی برکت سے ہمارے سارے گناہوں کو معاف فرما دے اور تھوڑی نیکیوں کو کئی گنا کر دے۔

آپ کا رب آپ کو آپ کی نجات و کامیابی کے لیے پکار رہا ہے، آپ اللہ تعالیٰ کی اس پکار پر فوراً لبیک کہیں اور اس بات کا عزم کر کے اپنے رب سے توبہ کریں کہ اب ہم فرائض کی پابندی کریں گے، منکرات و منہیات سے اجتناب کریں گے اور ہمہ وقت استغفار کیا کریں گے تو اللہ کے حکم سے آپ اپنی زندگی میں امید سے بڑھ کر اور تصور سے بالاتر تبدیلی پائیں گے، جس کا خیال بھی آپ

کے وہم و گمان میں پیدا نہیں ہوا ہوگا، کیونکہ توبہ کرنے کی بدولت آپ کا شمار ان کامیاب لوگوں میں ہو جائے گا جن کا ذکر قرآنِ کریم کی سورۃ النحل (آیت: ۹۷) میں اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

''مرد ہو یا عورت جو کوئی ایمان کے ساتھ نیک کام کرے تو ہم (دنیا میں) اس کی زندگی پاک کریں گے اور ان (ایسے لوگوں) کو ہم (قیامت کے دن) ضرور بہتر کاموں کا بدلہ دیں گے۔''

ایک مومن جب عملِ صالح اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے بدلے میں پاکیزہ زندگی عطا فرما دیتا ہے۔ پاک زندگی میں حلال روزی، قناعت، سچی عزت، سکون و اطمینان، دل کی تونگری، اللہ کی محبت اور عبادت کی لذت سبھی چیزیں شامل ہیں۔ یعنی ایمان اور عملِ صالح سے اُخروی زندگی ہی نہیں بلکہ دنیوی زندگی بھی نہایت سکھ اور چین سے گزرے گی جو ایک کافر اور نافرمان کو دنیا بھر کی آسایشوں اور سہولتوں کے باجود میسر نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ سے مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں ہوگا جس نے اس رحمتوں اور برکتوں والے مہینے میں اپنے رب سے سچی توبہ کر کے عمل صالح کے ساتھ اپنی اخروی زندگی کا سامان تیار نہ کر لیا ہو، کیونکہ یہ ایک مومن کا شیوا نہیں کہ اس رحمت اور برکت والے مہینے کو دنیا کمانے میں ضائع کر دے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سچی توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے رب سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سب کے گناہوں کو معاف فرمائے۔ آمین

رمضان کے روزوں کی قضا:

رمضان کے روزوں کی قضا فوراً ضروری نہیں، جس وقت بھی آدمی کو روزوں کی قضا کا وقت ملے روزے رکھ لے۔ روزوں کے کفارے کا بھی یہی حکم ہے۔ روزوں کی قضا میں دیر کرنے کی اجازت اس فرمانِ الٰہی میں ہے:

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ [البقرۃ: ۱۸۵]

''تم میں سے جو کوئی بیمار یا مسافر ہو، وہ دوسرے دنوں میں قضا کر لے۔''

یعنی چھوٹے ہوئے دنوں کا روزہ دوسرے دنوں میں مکمل کر لے اور چھوٹے ہوئے روزوں کی تعداد چاہے مسلسل روزے رکھ کر پوری کرے یا متفرق طور پر روزے رکھ کر پوری کرے، دونوں طرح جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے، انھیں تسلسل جیسی کسی چیز سے مقید نہیں کیا ہے۔[1]

درست بات یہ کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر چاہے تو روزوں کی قضا علاحدہ علاحدہ کرے۔[2]

تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ روزوں کی قضا پہلی فرصت میں اور مسلسل کرنا افضل ہے جس کی تین وجوہات ہیں:

① پہلی یہ کہ قضا بھی ادا کے مشابہ ہوتی ہے اور ادا میں لگاتار روزہ رکھنا پڑتا ہے۔

② دوسری یہ کہ بندہ لگاتار روزہ رکھنے میں ذمہ داری سے بروقت فارغ ہو جاتا ہے، وہ اس طرح کہ اگر ایک دن روزہ رکھے گا اور ایک دن افطا کرے گا تو قضا میں تاخیر ہوگی اور اگر مسلسل و لگاتار روزے رکھے گا تو قضا جلدی ہو جائے گی۔

③ تیسری یہ کہ مسلسل اور لگاتار روزے رکھنا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ انسان نہیں جانتا کہ اسے آیندہ کیا پیش آنے والا ہے، آج وہ تندرست ہے، ممکن ہے کل بیمار ہو جائے، آج وہ زندہ ہے کل فوت ہو جائے۔

فرض روزوں کی قضا سے پہلے نفلی روزے؟

اگر وقت تنگ نہ ہو تو رمضان کے روزوں کی قضا سے پہلے نفلی روزے رکھنا صحیح اور جائز ہے۔ وقت کشادہ ہے لہٰذا نفلی روزے رکھنا جائز ہے، جیسے کوئی فرض نماز سے پہلے نفلی نماز پڑھے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے، کیونکہ اس میں قیاس واضح ہے، لیکن بہتر بھی یہی ہے کہ پہلے قضا کر لے، اگرچہ عشرہ ذی الحجہ، یومِ عرفہ اور یومِ عاشورا گزر جائے، پھر بھی ان ایام میں وہ اپنے روزے رکھے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس طرح قضا اور ان ایام میں روزہ رکھنے کا اجر وثواب پا لے۔ فرض کیجیے اگر وہ قضا

---

[1] فقه السنة (١/ ٤١٦)

[2] إرواء الغليل (٤/ ٩٤ تا ٩٧)

ہی کرے گا تو قضا کرنا نفلی روزے رکھنے سے افضل ہے۔ تاہم ان چھے نفلی روزوں کا وقت صرف ایک ماہ یعنی ماہ شوال ہے اور قضا کا وقت آئندہ رمضان تک پورا سال ہے، لہٰذا پہلے نفلی رکھ لینا جائز ہے، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عمل اس طرح منقول ہوا ہے۔

نفلی روزے اور ممنوع روزے

نفلی روزے اور ان کی نیت وفضیلت:

نفلی روزے کی نیت دن میں کسی وقت بھی کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ کچھ کھایا پیا نہ ہو۔ رمضان المبارک کے فرضی روزوں کے علاوہ بھی سال کے مختلف اوقات میں کچھ روزے ثابت ہیں، لہٰذا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ غیر رمضان کے روزوں کے بارے میں بھی کچھ وضاحت کردی جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''جس نے جہاد کے دوران میں ایک دن کا نفلی روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اسے ستر سال کی مسافت کے برابر جہنم سے دور کردیں گے۔''[1]

شوال کے چھے روزے:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جن نفلی روزوں کا ثبوت ملتا ہے، اُن میں سے ایک تو ماہِ شوال کے چھے روزے ہیں جو عموماً عیدالفطر کے اگلے دن سے شروع کرکے مسلسل یا الگ الگ کرکے پورے ماہِ شوال میں رکھ لینا دونوں طرح ہی جائز ہے، صرف افضلیت میں ائمہ کا معمولی اختلافِ رائے ہے۔[2]

شوال کے ان چھے روزوں کی مشروعیت وثواب کے بارے میں صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے، پھر اس کے بعد شوال کے مہینے میں بھی چھ روزے رکھے تو اُس نے گویا ہمیشہ (سال بھر) کے روزے رکھے۔''[3]

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٣)
2. الفتح الرباني (١٠/ ٢١٧، ٢١٨) نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٣٨)
3. حواله سابقه و مشكاة المصابيح (١/ ٦٣٥)

ان چھے روزوں کے رکھنے سے سال بھر کے روزوں کا ثواب کس طرح بنتا ہے؟ حدیث شریف میں اس کی صراحت بھی مذکور ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''جس نے رمضان کے روزے رکھے، اُسے ایک ماہ کے عوض دس ماہ کے روزوں کا ثواب ہوگا، کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ [الأنعام: ١٦٠]

''جو شخص ایک نیکی کرے اُسے دس گنا ثواب دیا جاتا ہے۔''

''عید الفطر کے بعد چھے دنوں کے روزے۔'' یہ چھے، ساٹھ دنوں یا دو ماہ کے روزے ہوگئے، جبکہ دس ماہ کے روزوں کا ثواب ماہِ رمضان کی وجہ سے مل گیا۔ ''تو اس طرح گویا اس نے پورے سال کے روزے ہی رکھ لیے۔''

ایک بات ذہن میں رہے کہ جس کے ذمے رمضان کے روزوں کی قضا ہو، اس پر یہ حدیث صادق نہیں آتی کہ اس نے رمضان کے روزے رکھے۔[1]

عشرہ ذوالحج اور یومِ عرفہ کے روزے:

ایسے ہی ماہِ ذوالحج کے ابتدائی دس دنوں کے روزوں کا ثبوت بھی کتبِ حدیث میں سے سنن ابو داود، نسائی اور مسند احمد میں مذکور ہے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ سے مروی ہے:

''نبی اکرم ﷺ ذوالحج کے پہلے نو دنوں کے روزے رکھا کرتے تھے۔''[2]

خاص یومِ عرفہ (نو ذوالحج) کے روزے کی تو بہت ہی فضیلت ہے چنانچہ مسلم شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''عرفہ (۹/ ذوالحج) کا روزہ، مجھے اللہ سے امید ہے کہ دو سالوں کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، ایک سابقہ سال اور ایک آیندہ سال۔''[3]

لیکن یاد رہے کہ اس یومِ عرفہ کا روزہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو حج نہ کر رہے ہوں، عرفات میں موجود حاجیوں کو اس دن روزہ رکھنا منع ہے، جس پر تمام ائمہ و فقہا کا اجماع ہے اور

[1] الشرح الممتع (٦/ ٤٤٩) فتاوی إسلامية (٢/ ١٦٦)

[2] الفتح الرباني (١٠/ ١٥٨)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٦٣٥)

حدیث سے ممانعت ثابت ہے۔[1]

لیکن جو لوگ وہاں ڈیوٹی دے رہے ہیں، یعنی حج نہیں کر رہے، اپنے کام کے لیے گئے ہوئے ہیں مثلاً: کوئی ڈاکٹر ہے اور کوئی پولیس والا ہے یا پھر کچھ لوگوں نے وہاں دکانیں لگائی ہیں یعنی کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں عرفات میں موجود ہیں اور حج نہیں کر رہے تو ایسے لوگوں میں سے اگر کوئی یومِ عرفہ کا روزہ رکھنا چاہے تو ان کے لیے منع نہیں، وہ رکھ سکتے ہیں۔

محرم کے روزے اور ان کی فضیلت:

اِسی طرح ماہِ محرم اور خصوصاً یومِ عاشورا اور اُس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا روزہ بھی مسنون ہے، چنانچہ مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''رمضان کے روزوں کے بعد افضل ترین روزے اللہ کے مہینے محرم کے ہیں اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل تہجد کی نماز ہے۔''[2]

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یومِ عاشورا کا روزہ بڑی کوشش سے رکھا کرتے تھے اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیا تھا۔ لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس محرم تو یہود و نصاریٰ کے نزدیک بڑی عظمت کا دن ہے۔ مسلم شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اگر میں آیندہ سال زندہ رہا تو نو محرم کا روزہ ضرور رکھوں گا۔''

مگر آیندہ سال آنے سے پہلے ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہو گئے، یہ دوسرا روزہ اس لیے تھا تاکہ یہودیوں اور نصاریٰ سے مشابہت نہ رہے کیونکہ وہ بھی دس تاریخ کا روزہ رکھا کرتے تھے۔

صرف یومِ عاشورا کے روزے کے بارے میں مسلم، ابوداود اور بیہقی وغیرہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یومِ عاشورا کا روزہ آیندہ پورے ایک سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔''[3]

---

[1] الفتح الرباني (١٠/ ٢٣١ تا ٢٣٧)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٦٣٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٢)

سبب فضیلت:

یوم عاشورا کی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ جب رسولِ اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودی دس محرم کا روزہ رکھتے تھے۔ ان سے وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے کہا: اس روز اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر غلبہ عطا فرمایا تھا تو اس کے شکریے میں حضرت موسی علیہ السلام نے یہ روزہ رکھا تھا، لہٰذا ہم شکرانے کے طور پر اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''یہودیوں کی نسبت ہم موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ حقدار ہیں۔''

چنانچہ آپ ﷺ نے خود اس دن کا روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی اس دن کا روزہ رکھنے کا حکم دیا۔[1]

مگر جب رمضان کے روزے فرض کیے گئے تب آپ ﷺ نے فرمایا:

''اب جو چاہے دس محرم کا روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔''[2]

بہر حال یومِ عاشورا کا روزہ بڑا باعثِ اجر ہے اور اس کے ساتھ ۹ تاریخ کا روزہ بھی ضرور ملا لینا چاہیے۔[3]

نصف شعبان کا روزہ:

رسولِ اکرم ﷺ شعبان کے مہینے میں باقی سب مہینوں سے زیادہ روزے رکھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے رسول ﷺ کو رمضان کے علاوہ کسی مہینے کے پورے روزے رکھتے دیکھا ہے نہ شعبان کے علاوہ کسی دوسرے مہینے میں اتنی کثرت سے روزے رکھتے دیکھا ہے۔[4]

خاص طور پر ۱۵ شعبان کے صیام کی تمام احادیث غیر معتبر ہیں، زیادہ سے زیادہ جو چیز صحیح احادیث سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اس مہینے میں نبی کریم ﷺ کثرت سے روزے رکھتے تھے۔

ایامِ بیض کے روزے:

اسی طرح ہر ماہ کے تین روزے رکھنا بھی سنت و ثواب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٠٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث: ١١٢٥)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٦٣٥) إرواء الغليل (٤/ ١٠٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٦)

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ہر ماہ میں تین دن کے روزے رکھنا زمانہ بھر کے روزے رکھنا ہے۔''[1]

یعنی پوری زندگی کے دوزوں کا ثواب ملے گا اور یہ تین روزے کب رکھے جائیں؟

ترمذی ونسائی میں نبی ﷺ کا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ہر ماہ کے تین روزے رکھنے کا حکم دینا اور (چاند کی) تیرہ، چودہ، پندرہ (۱۳،۱۴،۱۵) تاریخ کے روزوں کی تعیین کرنا ثابت ہے۔[2]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''ماہِ صبر (ماہِ رمضان) کا روزہ اور ہر ماہ میں تین دن کے روزے دل کے کینے کو ختم کر دیتے ہیں۔''[3]

خود نبی اکرم ﷺ ایامِ بیض کے روزے کبھی ترک نہ فرماتے، خواہ سفر میں ہوتے یا گھر میں۔[4]

دورانِ جہاد نفلی روزہ رکھنے کی فضیلت:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے جہاد کے دوران میں ایک دن کا نفلی روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اسے ستر سال کی مسافت کے برابر جہنم سے دور کردیں گے۔''[5]

پیر اور جمعرات کے روزے:

تو سالانہ اور ماہانہ نفلی روزے ہیں جبکہ ہمت والوں کے لیے تو ہر ہفتے میں بھی پیر اور جمعرات دو دن کے روزے مسنون اور کارِ ثواب ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا اِن دو دنوں کا روزہ رکھنا ثابت ہے، چنانچہ سنن ترمذی اور نسائی شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''نبی کریم ﷺ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھا کرتے تھے۔''[6]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٧٩)

[2] مشكاة المصابيح (١/ ٦٣٧)

[3] صحيح الترغيب، رقم الحديث (١٠١٨)

[4] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٣٤٥) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٨٠)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٣)

[6] مشكاة المصابيح (١/ ٦٣٧) وصححه الألباني، إرواء الغليل (٤/ ١٠٢)

ترمذی شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''پیر اور جمعرات کو بندوں کے اعمال اللہ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور مجھے یہ بات محبوب لگتی ہے کہ میرے عمل جب اللہ کے سامنے پیش کیے جائیں تو اُس وقت میں روزے سے ہوں۔''

پیر کے روزے کی فضیلت:

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے جب پیر کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

''اس دن مَیں پیدا ہوا اور اسی دن مجھ پر وحی کا آغاز ہوا تھا۔''[1]

یعنی اس دن قرآنِ کریم کا نزول ہوا۔ لہٰذا جسے توفیق ہو وہ ہر ہفتے میں پیر (سوموار) اور جمعرات کے روزے رکھے۔ یہ مسنون اور کارِ ثواب ہیں۔

صومِ داودی علیہ السلام:

اسی طرح صوم داودی ہیں جن کا بہت اجر و ثواب ہے۔ جسے توفیق ہو وہ ہر دوسرے دن کا روزہ بھی رکھ سکتا ہے، یعنی ایک دن روزہ اور ایک دن افطار۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مخاطب ہو کر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''ہر ماہ تین دن کے روزے رکھو، میں نے عرض کی: مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔ رسول اللہ ﷺ مجھ سے برابر روزے کم کراتے رہے، حتیٰ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن ترک کرو، یہ افضل ترین روزے ہیں۔ میرے بھائی حضرت داود (علیہ السلام) کا یہی طریقہ تھا۔'' یعنی ایک دن روزہ اور ایک دن چھٹی۔[2]

مسلم شریف میں اس سے آگے بڑھنے اور بلا ناغہ ہمیشہ روزہ رکھنے والے کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا صَامَ وَلَا اَفْطَرَ» اَوْ قَالَ «لَمْ يَصُمْ وَلَمْ يُفْطِرْ»[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٢) مشكاة المصابيح (١/ ٦٣٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٩)

[3] مشكاة المصابيح (١/ ٦٣٤)

''ایسے شخص نے روزہ رکھا نہ افطار کیا۔'' یعنی اس کو ثواب نہیں ہوگا۔

یہ سنتِ رسول ﷺ سے تجاوز کرنے کا نتیجہ ہے۔

مطلق نفلی روزے:

مطلق نفلی روزے جو کسی سبب یا خاص وقت کے ساتھ مقید نہ ہوں، کسی چیز کے ساتھ مقید کیے بغیر مطلق نفلی روزے رکھنا جائز ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جاڑے (سرد موسم) میں روزے رکھنا باسہولت فائدہ ہے۔''

ایک اور روایت میں ہے: ''جاڑا (موسم سرما) مومن کے لیے موسمِ بہار ہے، جس کی رات لمبی ہوتی ہے، تو مومن قیام کرتا ہے اور دن چھوٹا ہوتا ہے تو وہ روزہ رکھتا ہے۔''[1]

مطلق نفلی روزے رکھنا آسانی اور سہولت پر مبنی ہے۔

نفلی روزہ توڑنا؟

نفلی روزہ توڑنا جائز ہے۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

''نفلی روزہ رکھنے والے کو اختیار ہے کہ چاہے تو روزہ پورا کرے اور چاہے تو توڑ دے۔''[2]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے کھانا تیار کیا، تو آپ ﷺ صحابہ سمیت میرے یہاں تشریف لائے، جب کھانا رکھ دیا گیا تو کسی آدمی نے کہا: میں تو روزے سے ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا:

''تمھارے بھائی نے تم کو دعوت دی ہے اور تمھارے لیے تکلف کیا ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے اس سے کہا: ''روزہ افطار کرلو اور اگر چاہو تو اس کی جگہ دوسرے دن روزہ رکھ لو۔''[3]

یہ تو تھے مسنون اور کارِ ثواب روزے جو نبی اکرم ﷺ نے خود رکھے اور لوگوں کو رکھنے کا حکم دیا۔

---

[1] السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩٢٢)

[2] مسند أحمد (٦/ ٣٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٥٤)

[3] سنن البيهقي (٤/ ٢٧٩)

ممنوع روزے:

بعض ایام ایسے بھی ہیں جن میں روزہ رکھنا نبی اکرم ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔

①، ② عیدین کے روزے:

عیدین کا روزہ جس کے متعلق صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرماتے ہیں:

''آپ ﷺ نے دو دنوں یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔''[1]

مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ایسے ہی مروی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے مسلم شریف کی شرح میں اس بات پر تمام علما کا اجماع نقل کیا ہے کہ ان دو دنوں کا روزہ رکھنا حرام ہے، چاہے وہ کفارے کا روزہ ہو، یا نذر کا ہو اور چاہے وہ کوئی نفلی روزہ ہی کیوں نہ ہو۔[2]

③، ④، ⑤ ایامِ تشریق کے روزے:

ایسے ہی ایامِ تشریق یعنی عیدالاضحیٰ یا عیدِ قربان کے بعد کے تین دنوں (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحج) کا روزہ رکھنا بھی حرام ہے۔ کیونکہ صحیح مسلم اور مسند احمد میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت کعب بن مالک اور اوس بن حدثان رضی اللہ عنہما کو ایامِ تشریق میں یہ منادی کرنے کے لیے بھیجا:

''مومن کے سوا جنت میں کوئی داخل نہ ہو سکے گا اور ایامِ تشریق یا ایامِ منیٰ کھانے اور پینے کے دن ہیں۔''[3]

البتہ صرف اُن لوگوں کو اِن دنوں کا روزہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے جو حجِ تمتّع کر رہے ہوں اور ان کے پاس قربانی نہ ہو تو وہ ان دنوں کا روزہ رکھ سکتے ہیں۔ سورت بقرہ (آیت: ۱۹۶) میں قربانی نہ پانے والے متمتّع کے لیے ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ﴾

''اگر قربانی میسر نہ ہو تو ایامِ حج میں تین روزے رکھ لے اور سات گھر آ کر۔''

اور قربانی نہ پانے والے حاجی کے سوا باقی سب کے لیے ایامِ تشریق کے روزے رکھنا منع ہے۔

---

[1] متفق علیه، نیل الأوطار (۲/ ٤/ ۲٦١)

[2] نیل الأوطار (۲/ ٤/ ۲٦۲)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱٤۲) مسند أحمد (٥/ ۲۲٤)

⑥ عورت کا شوہر کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ:

عورتوں کے لیے اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت اور رضا مندی کے بغیر نفلی روزہ رکھنا منع ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''کسی عورت کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر (نفلی) روزہ رکھے۔''[1]

سنن ابو داود کی روایت میں ''غَیْرَ رَمَضَانَ'' کے الفاظ بھی ہیں جن سے اس بات کی صراحت بھی ہوجاتی ہے کہ رمضان المبارک کے فرضی روزے رکھنے کے لیے شوہر کی اجازت طلب کرنا ضروری نہیں، کیونکہ وہ فرض ہیں اور اجازت کے لیے صرف نفلی روزے کے لیے مطالبہ کیا گیا ہے۔ عورت کے لیے بغیر اجازت نفلی روزے حرام ہونے پر امام مالک، شافعی، احمد اور جمہور کا اتفاق ہے اور احناف کے نزدیک یہ حرام نہیں، مکروہ ہے۔

یہ تو تھی ان روزوں کی تفصیل جو جمہور اہلِ علم کے نزدیک حرام ہیں، نیز بعض دنوں کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ مثلاً:

⑦ صرف جمعے کا روزہ:

ہفتہ بھر میں سے صرف جمعے کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے، بخاری و مسلم کی متعدد احادیث سے اس کا پتا چلتا ہے، چنانچہ محمد بن عبادہ بن جعفر فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

''کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف جمعے کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: ہاں۔''[2]

بخاری شریف کی ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

''ہفتہ بھر میں سے صرف جمعے کو روزے کے لیے خاص کرنا (بھی ممنوع ہے)۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ساتھ ہی جمعرات یا ہفتے کا روزہ بھی رکھے تو جائز ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم شریف میں اس کی صراحت بھی موجود ہے۔[3]

---

[1] الفتح الرباني (١٠/ ١٦٣) و الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ٥٢٢)

[2] متفق عليه، نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٤٩)

[3] متفق عليه، نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٤٩ تا ٢٥١)

⑧ صرف ہفتے کا روزہ:

ایسے ہی صرف ہفتے کے دن کا روزہ رکھنا بھی امام ابو حنیفہ، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور جمہور اہلِ علم کے نزدیک مکروہ ہے، کیونکہ سنن ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''ہفتے کے دن کا روزہ نہ رکھو سوائے اس کے کہ وہ فرض ہو۔''

اگر اس کے ساتھ ہی جمعے یا اتوار کا روزہ بھی رکھ لیا جائے تو مکروہ نہیں، کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے جو روایت ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اس کے ساتھ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھا کرتے تھے۔[1]

⑨ شک کا روزہ:

ایسے ہی رمضان سے ایک دن پہلے محض اس بنا پر روزہ رکھنا کہ شاید چاند ہوگیا ہو مگر کسی وجہ سے نظر نہیں آ سکا۔ یہ شک کا روزہ بھی منع ہے اور نبی مکرم ﷺ کی نافرمانی ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام روزے داروں کے صیام وقیام کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ سال کے دوران میں مسنون روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور جن دنوں یا جس انداز سے روزے رکھنا حرام اور مکروہ ہے، ان سے ہمیں محفوظ رکھے، کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ [الحجرات: ١]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔''

نیز اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر: ٧]

''جو کچھ رسول دیں، وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں، اس سے رک جاؤ۔''

نبی اقدس ﷺ نے دین کے معاملے میں جو کام ساری حیاتِ طیبہ میں نہیں کیا، وہ کام اپنی مرضی سے کر کے اللہ کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی جسارت نہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو سنت کے مطابق نیک کام کرنے کی توفیق سے نوازے، ہمیں ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھے اور ہمارا خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین ثم آمین

---

[1] البدر المنير بحواله الفتح الرباني (١٠/ ٢٢١)

مراجعِ درس

① تفسیر ابن کثیر۔

② تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

③ فضائل و مسائلِ رمضان و روزہ۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر

④ کتاب الصیام۔ تالیف: مولانا محمد اقبال کیلانی

⑤ استقبالِ رمضان۔ جمع وترتیب: مکتب توعیۃ الجالیات مجمعہ، ترجمہ: محمد طیب خطاب بھواروی

اعتکاف وفطرانہ، عیدین اور لیلۃ القدر

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴾ [سورة القدر]

''شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان ہے رحم والا۔ بے شک ہم نے قرآن کو (لوح محفوظ سے پہلے آسمان پر) شب قدر میں اتار۔ اور اے پیغمبر (ﷺ) تجھ کو کیا معلوم شب قدر کیا چیز ہے (اس کی کیا فضلیت ہے، قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ اس شب میں فرشتے اور جبرائیل اپنے مالک کے حکم سے ہر کام پر اترتے ہیں۔ یہ شب امان ہے صبح نکلنے تک۔''

فضائل و برکات:

فضائل و مسائلِ رمضان وروزہ تو بہت ہیں لیکن اس ماہ کو ایک خاص فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ اس ماہِ رمضان میں ایک وہ مبارک رات بھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کے بیت العزت تک نازل فرمایا تھا، جہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت نبی مکرم ﷺ پر نازل ہوتا رہا اور آپ ﷺ کی تئیس (۲۳) سالہ پیغمبرانہ زندگی میں نزولِ قرآن کا اتمام ہوا اور دینِ اسلام کی تکمیل ہوئی۔[1]

قرآنِ کریم کے اس ماہِ مبارک میں نازل کیے جانے کا ثبوت سورۃ البقرہ (آیت: ۱۸۵) میں مذکور ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] مختصر تفسير ابن كثير للرفاعي (٤/ ٤١٠)

﴿ شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰى وَ الۡفُرۡقَانِ﴾

''رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔''

پورے ماہِ رمضان کی اس وسعت کو خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ الدخان (آیت:۳) میں محدود کر دیا کہ اِس ماہ کی ایک ہی رات میں ہم نے قرآن نازل کیا تھا اور اسے ''مبارک رات'' کے لقب سے نوازتے ہوئے فرمایا:

﴿ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ﴾

''ہم نے اِس (قرآنِ کریم) کو ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہم لوگوں کو متنبّہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔''

ساتھ ہی اگلی آیت (۴ اور ۵) میں فرمادیا:

﴿ فِیۡهَا یُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِیۡمٍ ۞ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا ﴾

''یہ رات وہ ہے جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔''

رمضان المبارک میں آنے والی نزولِ قرآن کی اِس مبارک رات کو تیسویں پارے میں مزید وضاحت سے بیان فرما دیا اور اُسے شبِ قدر یا ''لیلۃ القدر'' کے نام سے نوازتے ہوئے فرمایا:

﴿ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾ ''ہم نے اِس قرآنِ کریم کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔''

پھر اس رات کی عظمت جتلانے کے لیے فرمایا:

﴿ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ﴾ ''(اے میرے نبی !) آپ کیا جانیں کہ وہ شبِ قدر کیا ہے؟''

آگے اُس رات کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ۞ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ فِیۡهَا بِاِذۡنِ

رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ [سورة القدر]

''شبِ قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور روح (الامین جبرائیل) اُس رات میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لیکر اترتے ہیں۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوعِ فجر تک۔''

سنن نسائی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''اس (ماہِ رمضان المبارک) میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی رات بھی رکھی ہے جس کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بھی بہتر ہے۔ جو شخص اس رات کی خیر و برکت سے محروم رہا وہ حرمان نصیب شخص ہے۔''[1]

اب آپ اس لیلۃ القدر کی فضیلت و برکت کا اندازہ فرمائیں کہ ایک ہزار مہینوں کے تراسی سال اور چار ماہ بنتے ہیں۔ گویا جو شخص خالص رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اس ایک رات کی عبادت کرلے اُسے اللہ تعالیٰ تراسی سال اور چار ماہ کی مسلسل عبادت سے بھی زیادہ ثواب عطا کرتا ہے۔ سبحان اللہ! نیکیاں کمانے کا کتنا سنہری موقع اور عمدہ سیزن ہے، جو صرف ایک ہی رات میں طے ہو جاتا ہے۔

یوں تو پورا مہینا ہی رحمتوں اور برکتوں والا ہے، مگر اس لیلۃ القدر کی فضیلت بہت ہی زیادہ ہے۔ یہ رات جہاں ہزار مہینے سے افضل ہے، وہیں تمام سابقہ گناہوں کی مغفرت و بخشش کا ذریعہ بھی ہے، چنانچہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''جس شخص نے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اُسی کی رضا کے حصول کی خاطر اس لیلۃ القدر میں قیام کیا (یعنی نفل و تلاوت میں مشغول رہا) اُس کے پہلے تمام گناہ معاف ہو گئے۔''[2]

لیلۃ القدر کون سی رات؟

اب رہی یہ بات کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک کی کون سی رات ہے؟ تو اس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے متعدد احادیث ثابت ہیں، جن سے اس رات کی تحدید میں مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے

[1] صحّحه الحاكم و الذهبي ثم الألباني، مشكاة المصابيح (١/ ٦١٢)

[2] متفق عليه، مشكاة المصابيح (١/ ٦١٠)

میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ رات رمضان کے آخری دس دنوں میں ہے، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں صراحت موجود ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

”میں نے اس رات کی تلاش میں رمضان کے پہلے دس دنوں کا اعتکاف کیا، پھر میں نے درمیان والے دس دنوں کا اعتکاف کیا، پھر مجھے کسی (جبریل علیہ السلام) نے بتایا کہ یہ رات رمضان کے آخری دس دنوں میں سے ایک ہے پس جس شخص نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہے، اُسے چاہیے کہ (آیندہ) آخری دس دنوں کا اعتکاف کیا کرے۔ مجھے یہ رات دکھائی گئی (کہ کونسی ہے) پھر بھلادی گئی۔“ [1]

اسی حدیث میں ہے کہ لیلۃ القدر کی رات میں نے دیکھا کہ میں پانی اور مٹی میں سجدہ کر رہا ہوں۔ پس تم اِسے آخری عشرے میں تلاش کرو اور آخری عشرے کی بھی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری ان دو آنکھوں نے دیکھا ہے کہ اکیسویں رات کی صبح کو نبی اکرم ﷺ کی پیشانی مبارک پر پانی اور مٹی کے نشانات تھے، کیونکہ اُسی رات بارش ہوئی تھے اور مسجدِ نبوی جو کھجور کے پتوں کی چھت والی تھی، اُس کی چھت ٹپک رہی تھی۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رات آخری دس دنوں میں ہے اور نبی کریم ﷺ اسی رات کی تلاش میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے، جو قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے سنت اور ذریعہ سعادت ونجات ہے۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ہمیں لیلۃ القدر کی رات بتانے کے لیے باہر تشریف لائے تو آگے دو مسلمان آپس میں جھگڑ رہے تھے، وہاں پہنچ کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمھیں لیلۃ القدر کے بارے میں بتانے کے لیے نکلا تھا، مگر فلاں فلاں آدمی جھگڑرہے تھے، پس اُس رات کی تعیین اٹھا لی گئی اور ہوسکتا ہے کہ اِسی میں تمھاری بہتری ہو۔ (یعنی اس کی تلاش میں زیادہ دن مصروفِ عبادت رہو) پھر فرمایا:

”تم اُسے (آخری عشرے کی) نویں، ساتویں اور پانچویں راتوں میں تلاش کرو۔“ [2]

---

[1] متفق عليه. مشكاة المصابيح (١/ ٦٤٤، ٦٤٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٩٥)

ہمیں بھی ان آخری دس دنوں کی تمام راتوں اور خصوصاً تمام طاق راتوں میں ذکر وعبادت اور توبہ واستغفار کا خوب اہتمام کرنا چاہیے اور ہمیں اُخروی سعادت سے اپنا دامن بھر لینا چاہیے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارتے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کرتے اور [عبادت میں] خوب محنت کرتے اور اپنی کمر کس لیتے۔''[1]

اس محنت اور کوشش سے مراد ذکر وعبادت کی کوشش ہے۔

علاماتِ لیلۃ القدر:

لیلۃ القدر کی نشانیاں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں، چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ لیلۃ القدر کی ایک علامت نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''اُس سے اگلے دن کا سورج اس طرح طلوع ہوتا ہے کہ اُس کی شعاعیں نہیں ہوتیں۔''

(یعنی صاف شفاف ٹکیا کی طرح نکلتا ہے)[2]

ایک صحیح حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نشانی بھی بتائی ہے:

''یہ رات بالکل صاف اور ایسی روشن ہوتی ہے گویا چاند چڑھا ہوا ہو۔ اُس میں سکون اور دلجمعی ہوتی ہے، سردی زیادہ ہوتی ہے اور نہ گرمی اور نہ اُس صبح تک ستارے ٹوٹتے جھڑتے ہیں۔''[3]

اگر کسی کو اعتکاف کی حالت میں یا ویسے ہی دورانِ عبادت محسوس ہوجائے کہ شاید یہی لیلۃ القدر ہے تو اُس رات کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا سکھلائی ہے جو سنن ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ فلاں رات لیلۃ القدر ہے تو میں کونسی دعا مانگوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دعا مانگو:

---

1. صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٧٤)
2. صحیح مسلم، مشکاة المصابیح (١/ ٦٤٤، ٦٤٥)
3. مختصر تفسیر ابن کثیر للرفاعي (٤/ ٤١١)

«اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفُوَ فَاعْفُ عَنَّا» [1]

''اے اللہ! تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔ پس تو مجھے معاف کردے۔''

اس کے علاوہ اور بھی دعائیں کرسکتے ہیں، خاص کر رات کے آخری پہر میں جب اللہ تعالیٰ خود آسمانِ دنیا پر نزول فرما کر لوگوں سے کہتا ہے کہ مجھ سے مانگو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا۔

احکام و مسائلِ اعتکاف:

رمضان المبارک کی عبادات میں سے ایک خصوصی عبادت اعتکاف ہے۔ نبی کریم ﷺ اس کا بھی خصوصی اہتمام فرمایا کرتے تھے، رمضان کے آخری دس دن رات مسجد کے ایک گوشے میں گزارتے اور دنیوی معمولات اور تعلقات ختم فرما دیتے، نبی اکرم ﷺ اتنی پابندی سے اعتکاف فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ اعتکاف نہ بیٹھ سکے، تو آپ ﷺ نے شوال کے آخری دس دن اعتکاف فرمایا۔ [2]

جس سال آپ ﷺ کی وفات ہوئی، اس سال آپ ﷺ نے رمضان میں دس دن کے بجائے بیس [۲۰] دن اعتکاف فرمایا۔ [3]

اعتکاف کا معنی ہے: ''یکسوئی سے بیٹھے رہنا۔'' اس عبادت میں انسان صحیح معنوں میں سب سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کے گھر میں یکسو ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی ساری توجہ اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہوجائے۔ چنانچہ وہ اس گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر توبہ و استغفار کرتا ہے، نوافل پڑھتا ہے، ذکر و تلاوتِ قرآن کرتا ہے، دعا و التجا کرتا ہے اور یہ سارے ہی کام عبادات ہیں۔ اس اعتبار سے اعتکاف گویا مجموعہ عبادات ہے۔

بنیادی طور پر اعتکاف کے لیے کوئی وقت یا مدت متعین نہیں، جس وقت اور جتنی مدت کے لیے کوئی چاہے اعتکاف کرسکتا ہے، البتہ مسنون اعتکاف یہ ہے کہ رمضان کے آخری دس دنوں میں یعنی بیس رمضان کو مغرب کے بعد سے لیکر عید کا چاند دیکھنے تک اعتکاف کیا جائے، چنانچہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٦٤٦) و صححهٗ الترمذي والألباني.

[2] صحيح البخاري، باب الاعتكاف في شوال، رقم الحديث (٢٠٤١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٤٤)

''نبی اکرم ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے، پھر آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات (رضی اللہ عنہن) نے آپ ﷺ کے بعد اعتکاف کیا۔''[1]

آغازِ اعتکاف:

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو شخص رمضان المبارک کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرنا چاہے تو وہ اپنی جائے اعتکاف میں کب داخل ہو؟ آغازِ اعتکاف کے بارے میں صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف کرنے کا ارادہ فرماتے تو فجر کی نماز پڑھ کر اُس جگہ میں داخل ہوجاتے جہاں اعتکاف فرمانے کا ارادہ ہوتا۔''[2]

مگر ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ جب کوئی شخص اعتکاف کا ارادہ کرے تو (۲۰) رمضان کے غروبِ آفتاب سے پہلے اعتکاف کے ارادے سے مسجد میں داخل ہوجائے، یوں یہ بات واضح ہوگئی کہ اکیسویں شب مسجد میں رہ کر نمازِ صبح کے بعد اعتکاف کی جگہ میں داخل ہونا چاہیے، اسی طرح آخری عشرے کی پانچ طاق راتیں اعتکاف میں گزاری جاسکتی ہیں۔[3]

مباحاتِ اعتکاف:

دورانِ اعتکاف اگر مُعتکف کے گھر سے اس کی بیوی کھانا وغیرہ لے کر آئے تو اُس سے وہ پکڑ سکتا ہے، اِس سے اُس کے اعتکاف پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ بخاری و مسلم کی صحیح حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ وہ آپ ﷺ کے سرِ اقدس کو کنگھی کر دیا کرتی تھیں اور صحیحین و سننِ اربعہ کی ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

''میں نے آپ ﷺ کا سرِ اقدس دھویا۔''[4]

---

[1] متفق علیہ، مشکاۃ المصابیح (۱/ ٦٤٨)

[2] الفتح الرباني (۱۰/ ۲٤۲) مشکاۃ المصابیح (۱/ ٦٤٩)

[3] فتاویٰ علماے حدیث (٦/ ٤٥٧)

[4] الفتح الرباني (۱۰/ ۲٤٨)

آج تو تمام مساجد میں نہانے کا بھی انتظام موجود ہوتا ہے۔ الغرض نہانے، تیل لگانے اور کنگھا کرنے سے اعتکاف پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اعتکاف کرنے والا اپنی بیوی سے بات چیت بھی کرسکتا ہے اور اس کے جانے پر جائے اعتکاف سے نکل کر الوداع بھی کرسکتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم اور سننِ اربعہ الاّ الترمذی میں اُم المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اعتکاف فرما رہے تھے کہ ایک رات میں آپ ﷺ کی زیارت کے لیے گئی۔ میں نے آپ ﷺ سے بات چیت کی اور پھر میں کھڑی ہوئی اور پلٹی تو آپ ﷺ بھی مجھے الوداع کہنے کے لیے کھڑے ہوئے۔[1]

ممنوعاتِ اعتکاف:

سنن ابو داود میں ہے:

''اعتکاف کرنے والے کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ نہ تو مریض کی عیادت ومزاج پرسی کرے، نہ کسی جنازے میں شرکت کے لیے جائے اور نہ اپنی بیوی کو چھوئے اور نہ بوس وکنار کرے۔''[2]

معتکف کو فضول گفتگو سے گریز کرنا چاہیے، کیونکہ بخاری و مسلم میں یہ بھی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''جو شخص اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ (جب بھی بات کرے تو) اچھی بات کرے یا پھر چپ رہے۔''

یاد رہے کہ دورانِ اعتکاف اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے اور روزہ نہ رکھ پائے تو اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا۔ اعتکاف مکمل کرے اور رمضان کے بعد اُس روزے کی قضا کرلے۔

عورتوں کا اعتکاف:

مردوں کی طرح ہی عورتوں کے لیے بھی اعتکاف مشروع اور باعثِ اجر و ثواب ہے، کیونکہ بخاری و مسلم میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اعتکاف کیا کرتی تھیں۔[3]

---

[1] الفتح الرباني (١٠/ ٢٤٩)

[2] نيل الأوطار (٢/ ٤/ ٢٦٦)

[3] متفقٌ عليه، مشكاة المصابيح (١/ ٦٤٨)

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں مذکور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف چونکہ فرض نہیں، اس لیے عورت کو اپنے شوہر سے اجازت ومشورہ کرلینا چاہیے۔[1]

صحیح بخاری و صحیح مسلم اورسننِ اربعہ میں مذکور احادیث سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشقت کے باوجود ہمیشہ مسجد ہی میں اعتکاف فرمایا اور قرآنِ کریم کے الفاظ ﴿وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ﴾ [البقرۃ: ١٨٧] سے بھی یہی پتا چلتا ہے، لہٰذا امام مالک، احمد اور شافعی رحمہم اللہ وغیرہ جمہور ائمہ و اہلِ علم کے نزدیک اعتکاف کا مسجد میں ہونا شرط ہے، چاہے مرد ہو یا عورت۔ اگر گھروں میں اعتکاف جائز ہوتا تو آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ضرور گھروں ہی میں اعتکاف کرتیں۔

شبینہ:

ماہِ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ''شبینہ'' کے نام سے جو ایک ہی رات میں تلاوتِ قرآنِ پاک کا رواج ہے اور لوگ کثرتِ ثواب کی خاطر اس میں کثرت سے شرکت کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان پر غور کرنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''جس نے قرآن کو تین دن رات سے کم میں پڑھا، وہ اس کو سمجھا نہیں۔''[2]

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک رات میں قرآن ختم کرنے کی اجازت مانگنے والے کو کہا کہ مجھے تو ایک رات میں قرآن ختم کرنے سے صرف ایک سورت ختم کرنا زیادہ محبوب ہے۔[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''مجھے علم نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی مکمل قرآن ایک رات میں پڑھا ہو یا طلوعِ فجر تک ساری رات قیام فرمایا ہو۔''[4]

گویا مروّجہ شبینہ ناجائز ہے۔

---

[1] الفتح الرباني (١٠/ ٢٥٥۔ ٢٥٦)

[2] سنن الترمذي، سنن أبي داود، سنن الدارمي و صححه الألباني، مشكاة المصابيح (١/ ٦٧٤)

[3] زاد المعاد (١/ ٨٨، ٨٩) و جديد فقهي مسائل (ص: ٩٦ تا ١١٠)

[4] فتاویٰ علماے حدیث (٦/ ٣٦٢۔٣٦٣)

قضا عمری:

بعض لوگ رمضان المبارک کے آخری جمعے میں قضائے عمری کے نام سے ایک نماز پڑھتے ہیں، جو ظہر وعصر کے درمیان فجر کی سنتوں سمیت ظہر، عصر، مغرب اور عشا کے فرض اور وتر پھر چار رکعت قضا عمری پڑھی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ اس سے ساری عمر کی قضا نمازوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ یہ نماز نبی اکرم ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کسی سے ثابت نہیں اور دین کے ساتھ سراسر مذاق ہے۔ یہ نماز سراسر خلافِ سنت اور عین بدعت ہے۔[1]

صدقہ فطر:

رمضان المبارک اور روزے کے احکام و مسائل میں سے ایک ''صدقہ فطر'' بھی ہے، جسے زکاۃ الفطر، فطرانہ اور صدقہ فطر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا حکم پہلی بار ۲ھ میں (عید سے دو دن قبل رمضان میں) دیا گیا تھا۔[2]

اس کی فرضیت:

یہ صدقہ فطر جمہور ائمہ وفقہا کے نزدیک فرض ہے۔[3]

اس صدقے کی مشروعیت وفرضیت قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ سورت اعلی (آیت: ۱۴، ۱۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾

''فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا ذکر کیا اور پھر نماز پڑھی۔''

صحیح ابن خزیمہ میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے اس آیت ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ آیت صدقہ فطر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔''[4]

---

1. فتاویٰ علمائے حدیث (۶/ ۱۱۳۔۱۱۴)
2. تحفة الأحوذي (٣/ ٣٤٤) نقلًا عن القسطلاني.
3. تحفة الأحوذي (٣/ ٣٤٨)
4. صحيح ابن خزيمة، نيل الأوطار (٢/ ٤/ ١٨٤)

اس کی حکمت:

صدقہ فطر ادا کرنے میں حکمت کیا ہے؟ اس سلسلے میں سنن ابو داود میں ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر فرض فرمایا، تاکہ روزے دار سے روزے کی حالت میں اگر کوئی فضول و نازیبا بات سرزد ہوگئی ہو تو وہ اُس سے پاک ہو جائے اور مسکینوں کو (کم از کم عید کے روز خوب اچھی طرح سے) کھانا میسر آ جائے۔''[1]

زکاۃ الفطر کی اس حکمت پر غور فرمائیں اور اندازہ کریں کہ ہمارے رسول رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو غربا و مساکین کا کتنا خیال رہتا تھا۔ پھر اس فطرانے کے ساتھ ہی سالانہ زکات اور دیگر نفلی صدقات و خیرات کو ملا کر دیکھیں کہ دینِ اسلام نے اس صفحہ ہستی سے غربت و افلاس کے خاتمے کے ضامن کتنے حل پیش کیے ہیں۔

فطرانہ کن پر؟

یہ صدقہ فطر صرف انھی لوگوں پر واجب نہیں جنھوں نے روزے رکھے ہوں، بلکہ جمہور ائمہ کے نزدیک یہ تمام مسلمانوں پر واجب ہے، کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، جیسا کہ بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کا ایک صاع صدقہ فطر کے طور پر ہر غلام و آزاد، مرد و زن اور چھوٹے بڑے مسلمان پر فرض کیا ہے۔''

فطرانے کی مقدار:

اب رہا یہ مسئلہ کہ فطرانے کی مقدار کتنی ہے؟ تو اس سلسلے میں صحیح بخاری و مسلم، سننِ اربعہ اور مسند احمد کی احادیث میں ایک صاع کا ذکر ہے۔[2]

صاعِ شرعی کا وزن:

صدقہ فطر اگر غلّے کی مختلف اجناس سے نکالنا ہو تو حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جس پیمانے کو صاع کہا گیا ہے، اس کی مقدار وزن کے حساب سے پونے تین سیر یا اڑھائی کیلو گرام کے برابر ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، وقال الألباني: سنده جيد، مشكاة المصابيح (١/ ٥٧٠)

[2] المنتقٰى (٢/ ٤/ ١٧٩)

نقد فطرانے کی تعین:

جو شخص غلے کی شکل میں فطرانہ نکالنے کے بجائے اُس کی قیمت ادا کرنا چاہے تو غلے کی جس قسم سے وہ فطرانہ ادا کرنا چاہے اُس کی فی کس مقدار کے حساب سے اگر اکیلا ہے تو گندم چاول وغیرہ کی اس مقدار کی موجودہ قیمت لگالے اور زیادہ افراد ہوں تو فی کس کے حساب سے سب کی مقدار جمع کرلے اور پھر اُس کی قیمت نکال دے جبکہ اصل غلہ دینا ہی ہے نہ کہ نقدی۔

فطرانہ ادا کرنے کا وقت:

صدقہ فطر کب ادا کیا جائے؟ اس سلسلے میں صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر (کے بارے) میں حکم فرمایا کہ لوگوں کے نمازِ عید کی طرف نکلنے سے پہلے پہلے ادا کر دیا جائے۔''[1]

اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ فطرانہ نماز سے پہلے ہی ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا ہر آدمی کو کوشش کرنا چاہیے کہ نہ صرف عید سے قبل بلکہ عید سے دو ایک دن قبل ہی ادا کر دے، کیونکہ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عیدالفطر سے ایک یا دو دن قبل ہی صدقہ فطر ادا کر دیا کرتے تھے۔''[2]

صدقہ فطر گھر کے سرپرست کو گھر کے تمام افراد بیوی بچوں اور ملازموں کے طرف سے ادا کرنا چاہیے۔

نمازِ عیدین کے مسائل:

① جمہور علمائے امت کے نزدیک نمازِ عید سنتِ موکدہ ہے۔ البتہ بعض نے فرض کفایہ اور بعض نے واجب بھی کہا ہے۔[3]

② عید کے دن غسل کرنے کے مستحب ہونے کے بارے میں بھی بعض آثار ملتے ہیں۔[4]

---

[1] متفق علیه، مشکاة المصابیح (١/ ٥٧٠)

[2] إرواء الغلیل (٣/ ٣٣٤)

[3] المجموع شرح المهذب للنووي (٥/ ٣)

[4] موطأ الإمام مالك (١/ ١٧٧)

③ عیدین اور جمعہ کے دن خوبصورت لباس پہننا اور خوشبو لگانا چاہیے۔[1]

④ عیدالفطر کی نماز کے لیے جانے سے پہلے کوئی میٹھی چیز کھا کر جانا سنت ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دن کھجوریں کھائے بغیر عید گاہ کی طرف نہیں جاتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کھجوریں طاق (۱، ۳، ۵، ۷، ۹) کھاتے تھے۔ (صحیح بخاری) عیدالاضحیٰ کے دن عیدگاہ سے آ کر کھانا چاہیے۔[2] عیدالاضحیٰ کی اس سنت کو نصف دن کا روزہ کہنا جہالت ہے۔

⑤ عیدین کے لیے مسنون و افضل یہ ہے کہ شہر سے باہر جا کر پڑھیں، البتہ بعض ضعیف روایات سے (بوقتِ ضرورت) مسجد میں پڑھنے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔[3]

⑥ عورتوں اور بچوں کو بھی عید گاہ جانا چاہیے۔[4]

⑦ پیدل اور سوار ہو کر دونوں طرح عیدگاہ جانا جائز ہے۔[5]

⑧ عیدگاہ جانے اور آنے کا راستہ بدل لینا چاہیے۔[6]

تکبیراتِ عید:

ا۔ «اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَر كَبِيْراً»[7]

ب۔ «اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ»[8]

⑨ عیدالفطر کے دن، گھر سے نکلنے سے لے کر خطبہ شروع ہونے تک اور عید الاضحیٰ کے موقع پر نو ذوالحج (یومِ عرفہ) کی صبح سے لے کر ۱۳ ذوالحج کی عصر تک تکبیریں کہتے رہیں۔[9]

⑩ نمازِ عید الفطر کا وقت سورج کے دو نیزے اور عید الاضحیٰ کا ایک نیزہ بلند ہونے سے شروع

---

[1] السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٧٩)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٤٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١١٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣١٣)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٦٤)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٣٠) أحكام العيدين للفريابي (١٧)

[6] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٧٢)

[7] زاد المعاد (١/ ٤٤٩)

[8] فتح الباري (٢/ ٤٦٢)

[9] إرواء الغليل (٣/ ١٢٥) تمام المنة (ص: ٣٥٦)

ہو جاتا ہے۔[1]

⑪ نمازِ عید کی دو رکعتوں سے پہلے یا بعد میں کوئی سنت و نفل نماز ثابت نہیں۔[2]

⑫ نمازِ عید سے واپس لوٹ کر اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھنا ثابت ہے۔[3]

⑬ نمازِ عید کے لیے اذان ہے نہ اقامت۔ نمازِ عید کی صرف دو رکعتیں ہیں۔[4]

⑭ نمازِ عید کی دو رکعتیں عام دو رکعتوں کی طرح ہی پڑھی جاتی ہیں۔ صرف پہلی رکعت میں تکبیرِ تحریمہ اور دعاے استفتاح کے بعد سات اور دوسری رکعت میں تکبیرِ قیام یا تکبیرِ انتقال کے بعد پانچ تکبیریں اضافی کہی جاتی ہیں، جنھیں تکبیراتِ زوائد کہا جاتا ہے۔[5] یہ تکبیراتِ زوائد سنت ہیں اور اگر بھول کر چھوٹ جائیں، تو اس پر سجدہ سہو بھی نہیں ہے۔[6]

⑮ نمازِ عید کی قراءت جہری ہے۔[7]

⑯ نمازِ عید کے بعد امام کو خطبہ دینا چاہیے۔[8]

⑰ خطبے کا آغاز مسنون خطبے ہی سے کرنا چاہیے۔[9]

⑱ عیدین کا خطبہ ایک ہی مسنون ہے، جمعہ کی طرح دو نہیں۔[10]

⑲ عیدگاہ میں منبر لے جانا جائز نہیں، امام ویسے ہی کھڑے ہو کر خطبہ دے۔[11]

⑳ عید کا خطبہ سننا سنت ہے۔[12]

---

[1] إرواء الغليل (٣/ ١٠١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٧٦)

[3] صحيح سنن ابن ماجه (١/ ٢١٧) إرواء الغليل (٣/ ١٠٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٦)

[5] سنن أبي داود مع العون (٤/ ٦) إرواء الغليل (٣/ ١٠٦)

[6] المغني (٣/ ٢٧٥) نيل الأوطار (٣/ ٣٠٠)

[7] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨١)

[8] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٨)

[9] زاد المعاد (١/ ٤٤٧)

[10] إرواء الغليل (٣/ ٣٤٨) فقه السنة (١/ ٣٢٢)

[11] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ٤٤٩)

[12] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ٤٤٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٥)

(۲۱) عید کی نماز کے لیے بھی دوسری جماعت کروائی جاسکتی ہے۔[1]

(۲۲) عید مبارک کہنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کو « تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنكُمْ » کہا کرتے تھے۔[2]

(۲۳) عید و جمعہ ایک ہی دن میں آجائیں تو جمعے کی فرضیت ساقط ہوجاتی ہے۔ دونوں پڑھنی بہتر ہیں، لیکن عید پڑھنے کے بعد اگر جمعہ کے بجائے صرف نمازِ ظہر ادا کی جائے تو بھی درست ہے۔[3]

ثمراتِ رمضان

نمازِ پنج گانہ کے اہتمام کی تربیت:

رمضان المبارک میں آپ نے پنجگانہ نماز کے ساتھ ساتھ تراویح و نوافل کا خوب اہتمام کیا، اور انھیں باجماعت ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور تلاوتِ قرآن سے اپنے قلب و روح کو منور کیا۔ پورا مہینا ایسا کرنے سے ایک طرح کی تربیت وٹریننگ ہوجاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ سب امور صرف رمضان المبارک کی حد تک ہی تھے اور کیا عید کے ساتھ ہی ان امور کو بھی سال بھر کے لیے الوداعی سلام کر دیا جائے؟ اور تلاوت و نوافل تو کجا، کیا نمازِ پنجگانہ کی فکر بھی نہیں رہے گی؟ جیسا کہ کسی موسمی قسم کے مسلمان یا جاہل نادان کا مقولہ ہے:

دو رکعت نماز عید الفطر　　　کھائی سویّاں اور گئی فکر

بھئی! تراویح کی فکر تو آیندہ سال تک واقعی ختم ہوگئی مگر کیا فرض نمازوں کی فکر بھی ساتھ ہی جاتی رہے گی؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ نمازِ پنجگانہ ہر مسلمان پر ہر روز فرض ہے، چاہے رمضان ہو یا کوئی دوسرا مہینا۔ لہٰذا نمازوں کو ادا کرنے کا وہی اہتمام رہنا چاہیے جس کا سبق ہم نے رمضان المبارک میں سیکھا ہے اور تاحینِ حیات یہ مسلمانوں پر فرض ہے، کیونکہ سورت حجر کی آخری آیت (۹۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٧٤)

[2] الجوهر النقي (٣/ ٣٢٠) تمام المنّة (ص: ٣٥٦)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ٢٤) سنن أبي داود (١٠٧١)

''اور تا دمِ موت (جس کا آنا یقینی امر ہے) اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں۔''

نبی مکرم ﷺ کی تعلیم بھی یہی ہے، جیسا کہ بے شمار احادیث سے پتا چلتا ہے۔ لہٰذا عید الفطر کے ساتھ ہی نمازِ پنج گانہ کی فکر نہیں جاتی رہنی چاہیے۔ سلفِ امت میں سے ایک اللہ والے کو کہا گیا کہ بعض لوگ رمضان میں تو اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد سب کچھ چھوڑ بیٹھتے ہیں تو اس نے کہا:

''کتنے برے ہیں وہ لوگ جو صرف رمضان ہی میں اللہ کے حق کو پہچانتے ہیں۔''

پھر ساتھ ہی اپنے مخاطب کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''صرف رمضانی نہ رہو، بلکہ ربانی بنو۔''[1]

اللہ تعالیٰ تمام روزے داروں کے صیام و قیامِ رمضان کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور سال کے دوران میں مسنون اور مستحب روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور جن دنوں یا جس انداز سے روزے رکھنا حرام اور ممنوع و مکروہ ہے، ان سے محفوظ رکھے۔ آمین

مراجعِ درس

1. فضائل و مسائلِ رمضان و روزہ۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
2. رمضان المبارک۔ تالیف: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

---

[1] كتاب الصيام للشيخ عبد الله آل محمود (ص: ٧٥)

مصادر و مراجع

① القرآن الکریم۔

② تفسیر ابن کثیر۔

③ تفسیر احسن البیان۔ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ۔

④ احکامِ غسل و وضو۔ تالیف: ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑤ بے نماز کا شرعی حکم۔ تالیف: الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ، ترجمہ: الشیخ شبیر بن نور حفظہ اللہ۔

⑥ جواهر الإیمان شرح اللؤلؤ والمرجان. تالیف: حافظ عمران ایوب لاہوری حفظہ اللہ۔

⑦ حصن المسلم. شیخ سعید بن علی قحطانی، ترجمہ: مولانا عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ۔

⑧ ذکرِ الٰہی۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑨ رمضان المبارک: فضائل و برکات، تالیف: ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑩ صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: مولانا محمد طیب محمد خطاب بھواروی حفظہ اللہ۔

⑪ صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ ابوعبداللہ علی بن محمد مغربی۔ ترجمہ: حافظ عبد الغفار مدنی حفظہ اللہ۔

⑫ فضائل و مسائلِ رمضان و روزہ، تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑬ رمضان المبارک، تالیف: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ۔

⑭ کتاب الصیام، تالیف: مولانا محمد اقبال کیلانی حفظہ اللہ۔

⑮ نماز کا بیان۔ تالیف: مولانا محمد اقبال کیلانی حفظہ اللہ۔

⑯ مچھلی کے پیٹ میں۔ تالیف ڈاکٹر محمد بن عبد الرحمٰن العریفی، ترجمہ: الشیخ ابو عدنان محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑰ مسائل و احکامِ طہارت و نماز۔ تالیف: ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑱ نماز میں عدمِ پابندی کا انجام اور تارکِ نماز کا حکم۔ تالیف: ابو عدنان الشیخ محمد منیر قمر

⑲ نمازِ باجماعت کی اہمیت و فضیلت۔ تالیف: الشیخ عبد العزیز بن عبد اللہ ابن باز۔
ترجمہ: مولانا ابوعبد الرحمٰن شبیر بن نور

⑳ نمازِ تراویح، تالیف: الشیخ ابو عدنان محمد منیر قمر حفظہ اللہ

گلدستۂ دروسِ خواتین

5

مسنون حج و عمرہ اور زکاۃ

تالیف
محترمہ ام عدنان قمر

تنقیح و مراجعہ
فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ۔ ڈسکہ

ام القریٰ پبلی کیشنز
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

فون: 0321-6466422 .0333-8110896

اسلام میں زکات کی اہمیت

حمد و ثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ البقرہ (آیت:۴۳) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ﴾

''اور نماز پڑھا کرو اور زکات دیا کرو اور (اللہ تعالیٰ کے آگے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔''

معمولی بصیرت والا ہر مسلمان بھی یہ جانتا ہے کہ ارکانِ اسلام میں ایمان، نماز اور روزہ کے بعد زکات دینِ اسلام کا انتہائی اہم رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عظیم کے بیشتر مقامات پر زکات و نماز کو یکجا بیان فرمایا ہے اور کم و بیش اسی (۸۰) مرتبہ اس کا حکم دیا گیا ہے۔

زکات کی تعریف:

زکات کا لغوی معنی ہے:''بڑھنا، پاک ہونا''، سورۃ الاعلی (آیت:۱۴) میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی﴾ ''وہ شخص کامیاب ہوگیا، جس نے اپنے آپ کو پاک کیا۔''

عربی لغت میں لفظ''زکات'' پاکیزگی اور برکت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور شریعت میں''زکات'' ایک مخصوص مال کے مخصوص حصے کو کہا جاتا ہے جو مخصوص لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ اسے ''زکات'' اس لیے کہا گیا ہے کہ اس سے دینے والے کا تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور اس کا مال پاک اور بابرکت ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ''زکات'' کے لیے قرآن وسنت میں''صدقے'' کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ سورت توبہ (آیت:۱۰۳) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَ تُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا ﴾

'' (اے میرے نبی!) آپ ان کے مالوں سے صدقہ لے لیجیے، جس کے ذریعے آپ ان (کے اموال) کو پاک کیجیے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کیجیے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زکات انسان کے اخلاق و کردار کی پاکیزگی کا بڑا ذریعہ ہے۔ جیسا کہ سورۃ النور (آیت: ۵٦) میں اللہ عز وجل کا فرمان ہے:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾

''اور نماز پڑھتے رہو اور زکات دیتے رہو اور پیغمبرِ الٰہی کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔''

اس آیت میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مدد حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے جس پر چل کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رحمت اور مدد حاصل ہوئی تھی۔

سورۃ الروم (آیت: ۳۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾

''جو تم سود پر دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں بڑھتا رہے تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا اور جو تم زکات دیتے ہو اور اس سے اللہ کی رضامندی طلب کرتے ہو تو (وہ موجبِ برکت ہے اور) ایسے ہی لوگ (اپنے مال کو) دو چند کرنے والے ہیں۔''

یعنی سود سے بظاہر اضافہ معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا، بلکہ اس کی نجاست بالآخر دنیا و آخرت میں تباہی کا باعث ہے۔

زکات کے دو فائدے:

زکات اور صدقہ کے دو فائدے ہیں:

① زکات و صدقات سے روحانی و معنوی اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی بقیہ مال میں اللہ کی طرف سے برکت ڈال دی جاتی ہے۔

② قیامت والے دن اس کا اجر و ثواب کئی گنا ملے گا، جس طرح حدیث میں ہے:

''حلال کمائی سے کھجور کے برابر صدقہ بڑھ بڑھ کر پہاڑ کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہو جائے گا۔''[1]

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠١٤)

چنانچہ جو لوگ بخل اور حبِ مال میں پھنس کر اس سے غافل رہے، وہ اللہ کے ان دشمنوں کے ساتھ ہوگئے، جنھوں نے اللہ و رسول کی اطاعت پر مال و دولت کو ترجیح دی۔

زکات کے مصارف:

اسلام میں زکات کا بہت بڑا مقام ہے اور نماز و شہادتین کے بعد اس کا عظیم رکن ہے جو مستحق لوگوں کو ادا کر دینا مسلمانوں پر واجب ہے۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ (آیت: ٦٠) میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں بیان کیا ہے:

﴿ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾

''صدقات (زکات و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنانِ صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیفِ قلب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیے۔ یہ حقوق) اللہ کی طرف سے مقرر کر دیے گئے ہیں اور اللہ خوب جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔''

زکات کے آٹھ (٨) مصارف و مقامات ہیں، جن کا ذکر سورۃ التوبۃ (آیت: ٦٠) میں درجِ ذیل ہے:

①، ② فقیر اور مسکین: یہ دونوں باہم قریب قریب ہیں، حتیٰ کہ ان کا ایک دوسرے پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ تاہم دونوں میں یہ بات قطعی ہے کہ جو شخص حاجت مند ہو اور ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے وسائل سے محروم ہو، اُسے فقیر و مسکین کہا جاتا ہے۔ مسکین کی تعریف میں ایک حدیث آئی ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''مسکین گھومنے پھرنے والا نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایک یا دو دو لقمے یا کھجور کے لیے گھر گھر پھرتا ہے، بلکہ مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال بھی نہ ہو جو اسے بے نیاز کر دے۔''

اس لیے پیشہ ور گداگروں کے بجائے، مہاجرین، دین کے طلبا، علما اور سفید پوش ضرورت

مندوں کا پتا چلا کر ان کی امداد کرنی چاہیے، جو سوال کرنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا انسان کی عزت نفس اور خود داری کے خلاف ہے۔ جس کے پاس اتنا سامان ہو جو اس کو کفایت کرتا ہو لیکن اس کے باوجود وہ لوگوں سے ہمیشہ سوال کرنے والا ہے، تو بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

''اس کے چہرے پر قیامت کے دن گوشت نہیں ہوگا۔''[1]

فقیر سے مسکین قدرے بہتر حیثیت رکھنے والا ہوتا ہے اور وہ دستِ سوال بھی دراز نہیں کرتا اور نہ اپنی شکل ایسی بناتا ہے کہ لوگ اسے کچھ دیں۔[2]

٣ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو زکات دی جائے، تاکہ ہتھیار، سواری اور خرچ وغیرہ جیسی ان کی ضروریات میں وہ ان کے کام آ سکے، تاکہ اللہ کے دشمنوں سے وہ جہاد کر سکیں۔

٤ اسی طرح مسافر کو بھی زکات کا مال دیا جاسکتا ہے، یعنی وہ مسافر جو لمبا سفر ہونے کی وجہ سے راستے ہی میں اس کا خرچہ ختم ہو جاتا ہے یا پھر کوئی دشمن لٹیرا سفر میں ان کے مال و اسباب ان سے چھین لیتا ہے یا دیگر کسی سبب سے ان کا سامانِ خرچ ختم ہو جاتا ہے تو ایسے لوگوں کو بھی زکات دی جاسکتی ہے، جس سے وہ اپنے گاؤں یا شہر یا اپنے وطن پہنچنے تک ان کی ضروریات پوری ہوں۔ اپنے گھر میں بے شک وہ صاحبِ حیثیت ہی کیوں نہ ہو۔

٥ قرض ادا کرنے کے لیے بھی زکات کی رقم دی جاسکتی ہے، لیکن وہ مقروض ایسے ہوں جو اپنے اہل وعیال کے نان ونفقے کے سلسلے میں زیر بار ہوگئے ہوں اور قرض ادا کرنے کے لیے ان کے پاس نقد رقم ہو نہ کوئی ایسی چیز جسے بیچ کر قرض ادا کر سکیں۔ دوسرے وہ ذمہ دار اصحابِ ضمانت ہیں کہ کسی کی ضمانت دی اور پھر اس کو ادا کرنے کے ذمے دار قرار پاگئے۔ تیسرے وہ لوگ جو کسی فصل کے تباہ ہو جانے یا کاروبار کے خسارے کی وجہ سے مقروض ہوگئے۔ ان سب کی مدد بھی مالِ زکات سے کی جاسکتی ہے۔

٦ عاملین: وہ افرادِ کار ہیں جو زکات جمع کرنے، اسے تقسیم کرنے اور اس کا حساب کتاب رکھنے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٩)

پر مامور ہوتے ہیں۔ ان کی اجرت یا تنخواہیں مالِ زکات سے دی جاسکتی ہیں اور وہ ان کے لیے حلال ہے، چاہے وہ مالدار ہی کیوں نہ ہوں۔

⑦ **مؤلفة القلوب**: ایک تو وہ کافر جو اسلام کی طرف کچھ مائل ہو اور اس کی مدد کرنے سے اس کے مسلمان ہو جانے کی توقع ہو۔ دوسرے وہ نومسلم افراد جنھیں یہ امداد اسلام پر مضبوط کر دینے کا باعث بن سکتی ہو۔ بہر حال زکات کے مال میں بہت خیر ہے، اس کو خرچ کرنے میں مسلمانوں کے لیے بہت سارے فائدے ہیں، جیسا کہ لوگوں کی ضرورت میں مدد اور ان پر قرض کے بارِگراں کی تخفیف وغیرہ۔

⑧ اس کے علاوہ غلاموں اور قیدیوں کی آزادی، مجاہدوں کو معاون چیز کی فراہمی اور مسافروں کی مدد کے ساتھ ساتھ زکات کے آٹھوں مصارف میں بڑا فائدہ ہے۔

اللہ کا اپنے بندوں پر بڑا کرم اور بہت مہربانی ہے کہ اس نے ان کو باہم معاون بنایا، جن میں مال دار آدمی محتاج ومسکین کی مدد کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو کچھ بھی نوازا، اس کے ذریعے وہ بر وتقویٰ کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ نے اُن کو جو مال و دولت دی ان پر احسان کیا ہے، زکات ادا کرنے میں ان کے لیے اللہ کا شکرانہ بھی ہے۔ بلاشبہہ اللہ بڑا محسن اور کرم فرما ہے، اس لیے بندہ مومن پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ اللہ کی حمد وتعریف کے ساتھ اس کا شکرانہ ادا کرے، جس نے اس کو زکات لینے والا نہیں، بلکہ دینے والا بنایا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''بلند ہاتھ پست ہاتھ سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔''[1]

اس لیے اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کو بلند ہاتھ والا بنا دیا۔ آپ خرچ کرتے ہیں، بھلائی کرتے اور اللہ کے بندوں کے ساتھ سخاوت کرتے ہیں۔ پھر زکات میں آپ اور آپ کے مال کی طہارت اور پاکی وصفائی بھی ہے، جیسا کہ سورۃ التوبہ (آیت:۱۰۳) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾

''آپ اُن کے مال کی زکات وصول کیجیے تا کہ ان کو پاک کیجیے اور اس کے ذریعے ان کے باطن کا تزکیہ کیجیے۔''

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٤)

زکات کی فضیلت:

زکات اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ [الأعراف: ١٥٦]

''اور میری رحمت تو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، بس میں اپنی رحمت ان لوگوں کے نام لکھ دوں گا جو (گناہ اور شرک سے) بچے رہتے ہیں اور زکات ادا کرتے ہیں۔''

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زکات وصدقات انسان کے اخلاق وکردار کی طہارت و پاکیزگی کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ زکات دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں آپ کے لیے بہتر ہے۔ جس کے ذریعے اپنے مال کی صفائی اور حفاظت اور خود اپنی صفائی کرتے ہیں۔ زکات ادا کرنے سے مال دار اور فقیر کے درمیان محبت پیدا ہوتی ہے اور یوں معاشرہ بغض و عداوت، نفرت اور خود غرضی جیسی بیماریوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ زکات دینے والے میں سخاوت، شفقت اور ہمدردی اور زکات لینے والے میں احسان مندی، تواضع اور انکساری جیسی صفاتِ حمیدہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس مال سے آپ کو نوازا ہے اس میں سے جب آپ مسکین ومحتاج لوگوں کی مدد کرتے ہیں تو اس میں آپ کا خوب بھلا اور بڑی فضیلت و اہمیت ہوتی ہے، کیونکہ آپ نے اس کی پریشانی وتنگی کو دور کیا ہے اور اپنا مال دے کر اس کے ساتھ ہمدردی برتی ہے، چنانچہ زکات کی اس کے نزدیک بڑی اہمیت ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ آپ کو ایسی دُعا دیتا ہے جو اللہ قبول فرماتا ہے۔ اس دُعا میں آپ کے لیے دونوں جہاں کی سعادت وکامیابی ہوتی ہے اور اگر آپ اپنے بہت سارے مال میں سے کچھ حصہ کسی مسکین ومحتاج کو دیتے ہیں، تو اُس سے آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ اضافہ فرماتا ہے، جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اللہ ہمارے صدقے کی اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کی بچے کی پرورش کرتا ہے، حتیٰ کہ ایک کھجور کے برابر صدقہ (بڑھ بڑھ کر) اُحد پہاڑ کی مثل ہوجاتا ہے۔''[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦٢)

زکات کے مال سے آپ کسی کی پریشانیاں دور کر دیتے ہیں۔ بچے، بوڑھے، پریشان حال اور مجبور مسافروں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں تو اس کا آپ کو بہت فائدہ اور بڑا اجر و ثواب ہوتا ہے۔ مال اللہ کی نعمت ہے جس کا شکر یہ ادا کرنا ضروری ہے اور اس کی واحد شکل یہی ہے کہ اس کی زکات ادا کی جائے اسے اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے اور یہ بات معلوم ہے کہ اگر اللہ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا کیا جائے تو اللہ کی عنایات میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ سورت ابراہیم (آیت: ۷) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ﴾

''اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں ضرور تمھیں اور زیادہ دوں گا۔''

زکات نہ دینے کا انجام:

زکات ادا نہ کرنے والوں کے لیے بڑا سخت حکمِ الٰہی ہے۔ زکات میں بخل کرنے اور اُسے ادا نہ کرنے والے کو ڈراتے ہوئے اللہ عزوجل نے سورۃ آل عمران (آیت: ۱۸۰) میں فرمایا ہے:

﴿ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾

''وہ لوگ جنھیں اللہ نے اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا ہے، وہ اس میں کنجوسی کو اپنے لیے بہتر نہ سمجھیں (وہ اچھا نہیں) بلکہ وہ اُن کے لیے نہایت بُرا ہے، وہ جس مال میں کنجوسی کرتے ہیں عنقریب قیامت والے دن اس کا طوق بنا کر اُن کی گردنوں میں ڈالا جائے گا اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو معلوم ہے۔''

جو لوگ اللہ کے دیے ہوئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، حتیٰ کہ اس میں سے فرض زکات بھی نہیں نکالتے، تو صحیح بخاری کی حدیث میں آتا ہے کہ قیامت والے دن ان کے مال کو ایک زہریلے اور نہایت خوفناک سانپ کی شکل دی جائے گی، جس کی آنکھوں پہ دو سیاہ نقطے ہوں گے۔ وہ سانپ قیامت کے دن اس کے گلے کا طوق بن جائے گا، پھر وہ سانپ اس کی باچھیں پکڑے

گا اور اسے کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں جس کو تم دنیا میں بڑا پیار کرتے تھے۔

''یہی وہ خزانہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا، لو اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزا چکھو۔''[1]

سورۃ التوبہ (آیت: ۳۴، ۳۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَ الْفِضَّۃَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَ جُنُوْبُھُمْ وَ ظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ﴾

''جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو، جس دن وہ دوزخ کی آگ میں (خوب) گرم کیا جائے گا، پھر اس کے ذریعے سے ان (بخیلوں) کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا:) یہ وہی مال ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، تو اب چکھو اس کا مزہ جو تم جمع کرتے تھے۔''

زکات میں بخل کرنے کی سزا یہی جہنم ہے۔ جو مال اس نے جمع کیا، جس میں بخل کیا اور جس کے لیے پریشان ہوا، اسی سے اس کو عذاب ہوگا اور قیامت کے دن وہی اس کے لیے عذاب بن جائے گا، کیونکہ اس نے اس مال کا حق ادا نہیں کیا تھا تو وہ ہی اس کے لیے وبالِ جان بن گیا۔ ہر وہ مال جس کا حق اور اس سے متعلق اللہ کا فریضہ ادا نہ کیا جائے تو وہ کنز [جمع کیا خزانہ] ہے اور جس کی زکات ادا کر دی جائے تو وہ کنز نہیں رہتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''نصاب کو پہنچے جس مال کی زکات ادا کر دی جائے تو وہ مال کنز نہیں ہے۔''[2]

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو بھی سونے چاندی والا اس کا حق ادا نہیں کرتا یعنی اس کی زکات ادا نہیں کرتا تو قیامت کے دن اس کے لیے آگ کے تختے بچھائے جائیں گے اور جہنم کی آگ میں ان کو تپایا جائے گا، پھر اس کی پیشانی، اس کے پہلو اور اس کی پیٹھ کو داغا جائے گا۔ وہ

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٦٥) دیکھیں: تفسیر أحسن البیان: حافظ صلاح الدین یوسف.

[2] سنن أبي داود، کتاب الزکاۃ، رقم الحدیث (١٥٦٤)

تختے جب بھی ٹھنڈے ہو جائیں گے تو ان کو دوبارہ گرم کیا جائے گا، اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی، پھر وہ جنت یا جہنم کی طرف اپنی راہ دیکھ لے گا۔''

اسی طرح اونٹ یا گائے والا جو بھی ان کی زکات ادا نہیں کرتا تو قیامت کے دن اس کو چٹیل میدان میں بچھا دیا جائے گا، پھر اس کے اوپر سے گزرتے ہوئے اپنے کُھروں سے اس کو روندیں گے اور سینگوں سے ماریں گے، اس کا آخری حصہ جب بھی اس پر سے گزر جائے گا تو اس کا پہلا حصہ پھر لوٹ آئے گا اور یہ وہ دن ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔ اس دن [جانوروں] کے ذریعے اس آدمی کو عذاب دیا جائے گا، اس کے بعد وہ جنت یا جہنم کی طرف اپنا راستہ دیکھ لے گا۔[1]

قرآن وسنت کی یہ دونوں عظیم دلیلیں سونے اور چاندی کی تمام چیزوں کو شامل ہیں، ان میں سونے چاندی کے زیورات بھی داخل ہیں جن پر زکات فرض ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ امام ابو داود اور امام نسائی نے حسن سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور اس کی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

''کیا ان کی زکات دیتی ہو؟''

اس نے کہا: نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تم چاہتی ہو کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمھیں ان دونوں کے بدلے آگ کے دو کنگن پہنائے؟'' اس عورت نے اسی وقت انھیں نکال کر زمین پر پھینک دیا اور کہہ دیا:

''یہ دونوں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں۔''[2]

حافظ ابن قطان نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ سنن ابو داود میں جید سند کے ساتھ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ سونے کی پازیب پہنا کرتی تھیں، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''کیا یہ کنز (خزانہ) ہے؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر وہ سونا جو نصاب کو پہنچ جائے اور اس کی زکات ادا کر دی جائے وہ خزانہ (کنز) نہیں کہلائے گا۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٨٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٦٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٧٩) بسند حسن.

سنن ابو داود کی ایک دوسری روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی رحمت ﷺ نے مجھے چاندی کے کچھ چھلے پہنے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ نے پوچھا: ''عائشہ! یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے انھیں اس لیے بنوایا ہے، تاکہ آپ کے لیے خوب صورت بن سکوں۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تو اس کی زکات ادا کرتی ہے؟'' میں نے کہا: ''نہیں'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جہنم کی آگ میں سے تمھارا حصہ ہے۔''

یہ حدیثیں سونے چاندی کے زیورات میں زکات کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں، چاہے وہ استعمال میں ہوں یا نہ ہوں، نبی مکرم ﷺ نے کسی قسم کے زیور کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ بس نصاب شرط ہے، اگر اس کی مقدار نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر ایک سال کی مدت گزر جائے تو اس پر زکات واجب ہو جاتی ہے۔

یہ ایک بہت بڑی وعید ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ زکات میں بخل کرنا اور اس کو ادا نہ کرنا بہت خطرناک ہے، قیامت کے دن اس کا مال خود اسی کے لیے باعثِ نقصان اور وبالِ جان بن جائے گا، خواہ وہ نقد مال ہو، یا پھل ہوں، یا اونٹ گائے اور بکریاں ہوں، ایسے سبھی مالوں کے سبب قیامت کے دن اس کو عذاب ہوگا۔ اونٹ، گائے، بکری، سونے اور چاندی، نقدی اور مالِ تجارت، زرعی پیداوار اور اس کے علاوہ دوسری اشیا کے متعلق عذاب کیسا اور کیا ہوگا، نبی اکرم ﷺ نے سب بیان فرمایا ہے۔

مسلم معاشرے میں جن عادات کو عام ہونا چاہیے، ان میں سے ایک زکات ہے، سورۃ التوبہ (آیت: ۷۱) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾

''اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اچھی بات سکھلاتے ہیں اور بُری بات سے منع کرتے ہیں اور نماز کو درستی کے ساتھ (وقت پر جماعت سے) ادا کرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ

کا کہا مانتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحم کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔''

جنت الفردوس کے وارث بننے والے مومنوں کی جو صفات اللہ نے بیان فرمائی ہیں، ان میں سے ایک زکات ادا کرنا ہے، جیسا کہ سورۃ المومنون (آیت:۴) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ﴾ ''اور وہ جو زکات دیا کرتے ہیں۔''

زکات ادا کرنے سے مال بڑھتا اور بابرکت ہو جاتا اور آفتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس اہم مسئلے کے بارے میں ہم سب مسلمانوں کی ذمے داری ہے کہ اللہ کا حق ادا کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کریں اور جو غافل و بے خبر ہیں، ان کو اللہ کے نزدیک کریں، کیونکہ نصیحت مومن کے لیے نفع بخش ہے۔ زکات کا مسئلہ واضح ہے، نماز کا معاملہ بھی صاف ہے، اسی طرح روزوں کی بات بھی واضح ہے، لیکن انسان غافل بنا ہوا ہے، اطاعت وفرمانبرداری اس کے لیے بارِ گراں ہے، اس لیے اللہ کی طرف یاد دہانی ضروری ہے۔ سورۃ الذاریات (آیت: ۵۵) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

''اور نصیحت کرتے رہو، کیوں کہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔''

نیز سورۃ الغاشیہ (آیت:۲۱) میں فرمایا ہے:

﴿ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴾ ''تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو۔''

چنانچہ مومن بھی اپنے بھائی کو تذکیر کرتا ہے اور یہ نہیں کہتا ہے کہ میرے بھائی کو پتا ہے، وہ اس کے بارے میں جانتا ہے، ایسا ہرگز نہیں۔ جب آپ اس میں افراط وتفریط دیکھیں یا آپ کو اس کی کچھ غفلت و اعراض کا پتا چلے تو آپ اپنے بھائی کو نصیحت کریں، اس کو اچھے الفاظ اور ایسے بہتر اسلوب و انداز میں اللہ کی یاد دلائیں، جس میں اس کے لیے آپ کے دل میں پیار ہو اور اس کی سعادت و کامیابی کا جذبہ شامل ہو۔ سورۃ الزمر (آیت:۵۳) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾

''(اے پیغمبر! میری طرف سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر

زیادتی کی ہے! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا، اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے (اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

کتنے مجرم اور نافرمان ایسے ہیں جن پر غفلت و بے خبری اور شیطان کی پیروی میں سالوں بیت جاتے ہیں، پھر کوئی اس کو خیر کی دعوت دیتا ہے تو وہ سنبھل جاتا ہے اور اپنی غلطی پر اللہ کی طرف تائب ہوتا ہے، چنانچہ اللہ اس کو معاف کر دیتا ہے اور اس کے پچھلے گناہوں سے درگزر کرتا ہے، جیسا کہ سورت مومن (آیت: ۳) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾

’’اللہ تعالیٰ تو اس کے لیے غفور ورحیم ہے جو تائب ہو اور اس کی طرف رجوع کرے اور اپنے حق میں غفلت و سستی برتنے والے کے لیے سخت عذاب وسزا اور بڑے انتقام والا ہے۔‘‘

زکات کے فوائد:

مسلمان مرد و زن کے لیے ہر حال میں ضروری ہے کہ وہ اپنی نماز و زکات کا خیال رکھیں اور اس میں غفلت برتنے سے ہر کوئی بچے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

’’صدقے سے مال کم نہیں ہوتا اور مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہو، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں۔‘‘

① زکات کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے نفس کا تزکیہ اور اس کی صفائی ہوتی ہے اور بخیلی و کنجوسی کی عادت دور ہوتی ہے۔

② دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مال دار اور فقرا کے درمیان محبت و الفت اور نرمی و رحم دلی کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

③ اس سے مال میں برکت و زیادتی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا بہتر بدلہ ملتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورت سبا (آیت: ۳۹) میں فرمایا ہے:

﴿ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾

''کہہ دو کہ میرا پروردگار اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے اور تم جو چیز خرچ کرو گے، وہ اس کا (تمھیں) عوض بہترین بدلا دے گا اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔''

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَا بَنِيْ آدَمَ أَنْفِقْ يُنْفَقْ عَلَيْكَ»[1]

''اے بنی آدم! تو خرچ کر ربِ کریم تجھ پر خرچ کریں گے [یعنی بدلہ دیں گے]۔''

مگر انسان اللہ تعالیٰ کے حق کو بھول جاتا ہے۔ مقصدِ بیان یہ ہے کہ بر و تقویٰ پر تعاون اور باہم دیگر نصیحت ضروری ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے کامیاب، نجات یافتہ اور نیک بندوں کے بارے میں بتلایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے رہتے ہیں، کیونکہ انسان سرا سر خسارے میں ہے، جیسے کہ سورۃ العصر میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر]

''زمانے کی قسم! بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ایک دوسرے کو [ایمان اور عملِ صالح کی] نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

زکات اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اسے غیر مستحقین کو دے کر ان سے دوستی کرنا یا ان سے اپنا فائدہ اٹھانا یا ان سے اپنی مذمت کو دور کرنا جائز نہیں، بلکہ مسلمان پر مستحقین کو زکات دینا واجب ہے، صرف اس غرض سے کہ وہ مستحق ہے، کسی دوسری غرض سے دینا جائز نہیں اور وہ بھی اخلاص و خوشی کے ساتھ تاکہ اپنی ذمے داری سے بری ہو جائیں اور اجر و ثواب کے مستحق ٹھہریں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو دین کی سمجھ عطا کرے، معاملاتِ دین میں صدق و صفائی کی توفیق دے، اپنی رضا کی باتوں کی طرف سبقت لے جانے کا جذبہ عطا کرے اور ہمیں ہر اس بات کی توفیق دے، جو ہمارے لیے نفع بخش ہو اور اپنے رب کی فرمانبرداری اور اس

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٨٤)

کا حق ادا کرنے میں معاون ہو۔ ہم سب کو نیکی وتقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کو تعاون دینے والا، حق کی نصیحت کرنے والا اور صبر کرنے والا بنا دے اور اپنے غیظ وغضب کی باتوں سے محفوظ رکھے ۔ آمین، وہ بلند و بالا اور سخی و مہربان ہے۔

مراجعِ درس

1. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
2. زکات سے متعلق اہم فتاوی۔ تالیف: الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ۔ ترجمہ: فضل اللہ سلفی
3. رمضان و روزہ اور زکات۔ تالیف: فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

حج اور عشرہ ذوالحج کی فضیلت

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورت فجر کی ابتدائی تین آیتوں میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴾

''قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی۔''

ماہِ ذوالحج صرف سفرِ حج وعمرہ پر روانہ ہونے والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ روے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے بڑی فضیلت وبرکت اور حرمت والا مہینا ہے۔

قرآنِ کریم کی سورت توبہ (آیت: ۳۶) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ﴾

''جس دن سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے، اُسی وقت سے اللہ کے نزدیک اُس کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے جن میں سے چار ماہ حرمت واحترام والے ہیں۔''

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے تو اُن حرمت والے چار مہینوں کی تعیین نہیں کی لیکن اللہ تعالیٰ کی خاص راہنمائی سے امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ان کی تعیین بھی فرما دی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (حجۃ الوداع کے سال) نبی اکرم ﷺ نے یومِ نحر کو خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں دیگر بہت سے اہم دینی مسائل واحکام کی طرف خصوصی توجہ دلانے کے علاوہ حرمت والے چار مہینوں کی تعیین کرتے ہوئے فرمایا:

« ثَلَاثٌ مُتَوَالِيَاتٌ: ذُو الْقَعْدَةُ وذُوالْحِجَّةُ وَالْمُحَرَّمُ، وَرَجَبُ مُضَرَ الَّذِىْ

بَيۡنَ جُمَادَىٰ وَشَعۡبَانَ》[1]

''تین مہینے ذو القعدۃ، ذو الحجہ اور محرم تو مسلسل ہیں اور (چوتھا) رجب ہے جو جمادیٰ الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے۔''

اس ارشادِ نبوی ﷺ سے معلوم ہوا کہ ماہ ذوالحج حرمت وفضیلت والا مہینا ہے۔ اس ماہ کے بھی پہلے دس دن ''عشرہ ذوالحج'' کی تو اور بھی زیادہ فضیلت ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کی حرمت اور کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے تیسویں پارے میں عشرہ ذوالحج کی راتوں کی قسم کھائی ہے۔ اسی طرح نو ذوالحج یعنی یومِ عرفہ اور دس ذوالحج یومِ نحر وقربانی، ان دنوں کی بھی قسم کھائی ہے اور ان کی عظمت وحرمت کو اجاگر فرمایا ہے۔ سورت فجر کی ابتدائی تین آیتوں میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَالۡفَجۡرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشۡرٍ ۝ وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ﴾

''قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ فجر سے مراد بطورِ خاص یومِ نحر وقربانی کی صبح ہے اور دس راتوں سے ذوالحج کی پہلی دس راتیں مراد ہیں۔ اس تفسیر کی تائید میں صحیح بخاری، سنن ابو داود، ترمذی اور ابن ماجہ میں مذکور وہ ارشادِ نبوی ﷺ بھی نقل کیا ہے، جس میں آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کو ذوالحج کے اِن دس دنوں کی عبادت سے بڑھ کر کسی دوسرے دن کی عبادت محبوب نہیں ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے استفسار فرمایا:

《وَلَا الۡجِهَادُ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ؟》 ''کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

《وَلَا الۡجِهَادُ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ، اِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ بِنَفۡسِهٖ وَمَالِهٖ، فَلَمۡ يَرۡجِعۡ مِنۡ ذٰلِكَ بِشَيۡءٍ》[2]

''جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں، سوائے اُس شخص کے جو اپنی جان ومال ہتھیلی پر رکھ کر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٩)

[2] المعجم الأوسط، رقم الحديث (١٧٧٧)

میدانِ جہاد میں نکلا اور کوئی چیز واپس نہ لایا (یعنی جان و مال سب اللہ کی راہ میں قربان کر دیا اور شہید ہوگیا)۔''

اندازہ فرمائیں کہ شہید کے عملِ شہادت اور مالی قربانی دینے کے سوا دوسرا کوئی عمل اِن دس دنوں میں کیے گئے نیک عمل کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ دس سے مراد ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں کی راتیں ہیں اور طاق سے مراد یومِ عرفہ ہے اور جفت سے مرادنحر وقربانی کا دن ہے، کیونکہ وہ دسواں دن ہوتا ہے۔ اس ماہ ذوالحجہ اور پھر اس کے پہلے دس دنوں کی فضیلت و برکت اپنی جگہ، خاص یومِ عرفہ یعنی ۹رذوالحجہ کی تو نبی اکرم ﷺ نے بہت فضیلت بیان فرمائی ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں نو ذوالحج کے روزے کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''یوم عرفہ کا روزہ دوسالوں کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، ایک گزرا ہوا سال اور دوسرا آیندہ سال۔''[1]

لیکن یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ جو لوگ حج کر رہے ہوں اور نو ذوالحج کے دن میدانِ عرفات میں موجود ہوں، ان کے لیے یومِ عرفہ کا روزہ رکھنا جائز نہیں، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شک گزرا کہ میدانِ عرفات میں نبی اکرم ﷺ روزے سے ہیں یا نہیں؟ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ ﷺ روزے سے ہیں اور بعض نے کہا کہ نہیں آپ ﷺ روزے سے نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کی طرف دودھ کا پیالہ بھیجا۔

﴿ فَشَرِبَ وَهُوَ يَخْطُبُ النَاسَ بِعَرَفَةَ ﴾

''آپ ﷺ نے وہ دودھ پی لیا، جبکہ آپ ﷺ میدانِ عرفات میں لوگوں سے خطاب فرما رہے تھے۔''

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میدانِ عرفات میں حجاج کا روزہ رکھنا خلافِ سنت ہے۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عرفات کے میدان میں یومِ عرفہ (حج) کا روزہ رکھنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم (٨/ ٥٠، ٥١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٢٥، ٢٤٢٦)

''عرفہ، قربانی اور تشریق کے دن ہم اہلِ اسلام کی عید ہیں اور یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔''

واضح رہے کہ عرفہ کے دن روزے کی ممانعت کو حُجاج کرام کے ساتھ خاص سمجھا جائے، کیونکہ دوسری حدیث میں عرفہ کے دن روزے کی بہت فضیلت آئی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کے نزدیک عرفات میں موجود حاجی لوگوں کے سوا سب کے لیے یومِ عرفہ کا روزہ مستحب ہے۔

عشرہ ذوالحج سے مراد عام لوگوں کے لیے یکم سے لے کر نو ذوالحج تک کے روزے اور حُجاج کے لیے یکم سے لے کر آٹھ ذوالحج تک کے روزے ہیں۔ عشرہ ذوالحج کے روزوں کے بارے میں متعدد احادیث ملتی ہیں جن میں ان کا ثواب مذکور ہے، نیز یومِ عرفہ کے روزے کا ثواب تو دیگر کتب کے علاوہ صحیح مسلم میں بھی مذکور ہے جس میں شک کی کوئی گنجایش ہی نہیں اور بقیہ ایام کے روزوں کی مشروعیت واستحباب اور ثواب بھی بجا ہے لیکن یہ کہ ہر دن کے روزے کا ثواب سال بھر کے روزوں کے برابر ہو، ایسا تو نہیں، لیکن نفلی روزوں کا اجر وثواب بہت زیادہ ہے۔

اس کے علاوہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''کوئی دن ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ یوم عرفہ سے زیادہ اپنے بندوں کو جہنم سے رہائی دے، اللہ تعالیٰ ان کے قریب ہوجاتا ہے اور پھر فخر کے طور پر فرشتوں سے پوچھتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا چاہیے؟ کس طرح گرد آلود اور پراگندہ بال ہوکر مجھے پکارتے ہوئے دور دراز سے میرے لیے آئے ہیں۔ میں تمھیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان سب کو بخش دیا۔''[1]

یہ سارا دن ذکر اور دعاؤں میں گزارنا چاہیے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ عشرہ ذوالحج افضل ہے یا عشرہ رمضان؟ تو انھوں نے فرمایا: عشرہ ذوالحج کے دس دن رمضان کے آخری عشرے کے دنوں سے افضل ہیں۔

موصوف کے شاگردِ رشید علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کوئی صاحبِ عقل وخرد اس جواب پر غور کرے تو اسے شافی وکافی پائے گا، کیونکہ

---

[1] صحيح مسلم (٩/ ١١٢) شرح السنة (١٩٣١)

(ارشادِ نبوی ﷺ کی رو سے) کوئی دن بھی ایسا نہیں، جس میں کیا گیا کوئی عمل اس عشرہ ذوالحج کے ایام میں کیے گئے عمل سے افضل ہو اور پھر اِنھی ایام میں یومِ عرفہ، یومِ نحر اور یومِ ترویہ جیسے فضیلت والے ایام بھی شامل ہیں جبکہ رمضان المبارک کے عشرہ اخیر کی راتیں قیام کی راتیں ہیں۔ نبی اکرم ﷺ ان میں شب زندہ داری فرمایا کرتے تھے۔ (اِسی غرض سے اعتکاف کیا جاتا ہے) اور اُنہی راتوں میں سے ایک رات (لیلۃ القدر) بھی ہے، جس کا ثواب ہزار مہینے کی عبادت سے بھی زیادہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس تفصیل کے سوا کوئی دوسرا جواب دے تو اس کے بس میں نہیں کہ کوئی صحیح دلیل بھی دے سکے۔''

آگے چل کر شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

''ہفتے کے ایام میں سے افضل دن، جمعہ کا دن ہے، سال کے ایام میں سے افضل یومِ نحر اور بعض کے نزدیک یومِ عرفہ ہے مگر صحیح یومِ نحر ہی ہے، کیونکہ صحیح حدیثِ نبوی ﷺ میں اور امام مالک اور شافعی و احمد رحمہم اللہ کے نزدیک بھی ''یومِ نحر'' ہی ''یومِ حجِ اکبر'' ہے۔''[1]

① حجِ اکبر:

اسی دن کو ''یومِ حجِ اکبر'' بھی قرار دیا گیا ہے۔ عید کے دن کو ''یومِ حجِ اکبر'' قرار دینے سے متعلق حدیث کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے موصولاً بیان کیا ہے، جس میں مروی ہے:

''حجِ اکبر کا دن قربانی کا دن ہے اور ''حجِ اکبر'' حج ہے۔ لوگوں کے [عمرے کو] حجِ اصغر کہنے کے مقابلے میں اسے ''حجِ اکبر'' کہا گیا۔''

یہ وہی دن ہے، جس سے متعلق قرآنِ کریم کی سورت توبہ (آیت: ۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ ﴾

''اور ''حجِ اکبر'' کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے منادی کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (دونوں) مشرکوں سے بے تعلق (جدا) ہیں۔''

آپ اندازہ کریں کہ جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ بے تعلق ہو جائیں، اس کے لیے

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۵/ ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹)

دنیا میں کوئی جگہ ہے نہ آخرت میں کوئی مقام ہے۔

قرآن کی آیت اور حدیثِ نبوی ﷺ کی مذکورہ وضاحت سے اس نظریے کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''یومِ عرفہ'' جمعہ کے دن آئے تو اسے ''حجِ اکبر'' کہا جاتا ہے اور اس کا ثواب عام حج سے ستر گنا زیادہ ہے، یہ درست نہیں، کیونکہ ''حجِ اکبر'' تو ''یومِ نحر'' کو کہا گیا ہے۔ اسی بنا پر اس عید کو بڑی عید بھی کہا جاتا ہے۔

② بوڑھوں، ضعیفوں اور عورتوں کا جہاد:

میدانِ جنگ میں کفار و مشرکین کو تہ تیغ کرنے والے غازیوں اور شہیدوں کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام و مرتبہ عطا فرمایا ہے، وہ صرف انھی لوگوں کا حصہ ہے جو اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لیے سروں پر کفن باندھے محاذِ جنگ پر دشمنوں کو للکارتے ہیں، مگر وہ انسانی طبقے جو اس دل گردے کے مالک نہیں ہوتے کہ معرکہ حق و باطل کو سر کریں، انھیں جہاد کا ثواب عطا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حج کو اس کا نعم البدل قرار دیا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی:

«نَرَى الْجِهَادَ اَفْضَلَ الْأَعْمَالِ، أَفَلَا نُجَاهِدُ؟»

''ہم جہاد کو افضل اعمال میں سے سمجھتے ہیں تو کیا ہم (عورتیں) بھی جہاد نہ کریں؟''

اس پر نبی رحمۃ للعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لٰكِنَّ اَفْضَلُ الْجِهَادِ، حَجٌّ مَبْرُوْرٌ»[1] ''تمھارے لیے افضل جہاد، حجِ مبرور ہے۔''

ایک روایت میں ہے:

''جس میں کوئی قتال و جنگ نہیں اور وہ ہے: حج و عمرہ۔''

جبکہ نسائی شریف کی ایک حسن سند والی حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بوڑھوں، کمزوروں، ضعیفوں اور عورتوں کا جہاد حج و عمرہ ہے۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٢٠، ٣٧٨٤)

[2] سنن النسائي (٥/ ١١٤)

③ فرضیتِ حج:

یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ اس نے نبی اکرم ﷺ کے ذریعے حج وعمرہ پر ان تمام فضائل وبرکات اور عظیم انعامات کی بشارت دی ہے، ورنہ مسلمانوں کے لیے تو اس کی فرضیت کا حکم ہی تعمیلِ ارشاد کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ سورت آل عمران (آیت: ۹۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق (فرض) ہے کہ جو اس کے گھر، (بیت اللہ شریف) تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں وہ اس کا حج کریں اور جو کوئی اس کے حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔''

اور صحیح بخاری ومسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حج وعمرے کو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن قرار دیا ہے۔[1] جبکہ صحیح مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

«يَآاَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ فُرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوْا»

''اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے، لہٰذا تم حج کرو۔''

ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہر سال حج کریں؟ نبی اکرم ﷺ خاموش رہے، حتیٰ کہ اس شخص نے تین مرتبہ یہی سوال دہرایا۔ تب نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال حج کرنا) واجب ہو جاتا اور تم اس کی طاقت نہ پاتے۔''[2]

اس ارشادِ رسالت مآب ﷺ سے معلوم ہوا کہ حج اور عمرہ زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ فرض ہے۔ اس بات پر پوری امتِ اسلامیہ کا اجماع ہے کہ پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہی حج وعمرہ کرنا فرض ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہر قسم کی طاقت رکھتے ہوئے کم از کم زندگی میں ایک بار تو حج کر لیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨) صحيح مسلم (١/ ١٧٦، ١٧٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٠٩)

[2] صحيح مسلم (٩/ ١٠٠، ١٠١)

④ فریضہ حج ادا کرنے میں جلدی کرنا:

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

”فریضہ حج ادا کرنے میں جلدی کرو۔ اس لیے کہ تم میں سے کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ اسے کب کوئی بیماری یا شدید ضرورت اس سے روک لے۔“[1]

⑤ ترکِ حج پر وعید:

جو شخص استطاعت کے باوجود فرضی حج نہیں کرتا، اپنے دنیاوی مشاغل میں مصروف رہے اور جان بوجھ کر فریضہ حج کو موخر کرتا جائے، حتیٰ کہ اسی حالت میں اسے حج کیے بغیر ہی موت آجائے تو اس کے بارے میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔ سنن سعید بن منصور میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

”میں نے ارادہ کیا کہ ان شہروں کی طرف اپنے آدمی بھیجوں جو ہر اس آدمی کا پتا چلائیں جس نے طاقت کے باوجود حج نہ کیا ہوتا کہ میرے آدمی ایسے لوگوں پر غیر مسلموں سے لیا جانے والا ٹیکس (جزیہ) نافذ کر دیں۔“

پھر فرمایا: ”وہ مسلمان نہیں، وہ مسلمان نہیں۔“[2]

⑥ گناہوں سے مکمل طہارت:

کس قدر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو فریضہ حج سے سبکدوش ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور سابقہ گناہوں سے کلی طور پر پاک ہوکر لوٹتے ہیں، جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ جنم لیتے وقت اس دنیا میں گناہوں سے پاک آتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ حَجَّ، فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ مِنْ ذُنُوبِهِ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ﴾

”جس نے حج کیا اور دورانِ حج اس سے کوئی شہوانی فعل سرزد ہوا اور نہ اس نے فسق وفجور (گناہ) کا ارتکاب کیا، وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہوکر لوٹا گویا آج ہی اس

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢١٤، ٣١٤، ٣٢٣، ٣٥٥)

[2] اس اثر کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”التلخيص الحبير“ (٢/ ٢٢٣) میں سنن سعید بن منصور کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

کی ماں نے اسے جنم دیا ہے۔''

صحیح مسلم اور ابن خزیمہ میں حضرت ابن شماسہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ معروف صحابی رسول ﷺ حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ پر موت کا عالم طاری ہوا تو اس وقت ہم ان کے پاس موجود تھے۔ وہ دیر تک خشیتِ الٰہی سے روتے رہے اور پھر اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ سنانے لگے اور فرمایا: ''جب اللہ نے میرے دل میں قبولِ اسلام کا جذبہ پیدا فرمایا تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! اپنا دستِ مبارک آگے بڑھایئے تاکہ میں بیعت کروں۔ جب آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، آپ ﷺ نے فرمایا: عَمرو! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں ایک شرط پیش کرنا چاہتا ہوں، فرمایا: وہ کیا؟ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! شرط صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے [میرے سابقہ سب گناہ] بخش دے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے عَمرو! کیا تمھیں معلوم نہیں، اسلام قبول کرنا پہلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور (دین کی خاطر) ہجرت کرنا پہلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے اور حج کرنا بھی سابقہ گناہوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔''[1]

⑦ اللہ کے مہمان:

حُجاج کرام کے لیے یہی شرف کیا کم ہے کہ حج وعمرہ کرنے والوں کو نبی اکرم ﷺ کی بعض احادیث میں اللہ کے وفد اور مہمان قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''تین قسم کے لوگ اللہ کے وفد (مہمان) ہیں: ① جہاد کرنے والا۔ ② حج کرنے والا۔ ③ عمرہ کرنے والے۔''[2]

⑧ قابلِ رشک زندگی اور قابلِ فخر موت:

حاجی کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر شرف وثواب سے نوازا ہے کہ اس کا جینا بھی قابلِ رشک ہے

---

[1] صحيح مسلم (٢/ ١٣٧، ١٣٨) الإيمان لابن خزيمة (٢٥١٥)

[2] سنن النسائي (٥/ ١١٣، ٦/ ١٦)

اور اس کی موت بھی قابلِ فخر و اعزاز ہے۔ صحیح بخاری ومسلم شریف میں ہے کہ میدانِ عرفات میں ایک شخص اونٹنی سے گرا اور جانبر نہ ہوا، بلکہ اس کی روح پرواز کرگئی۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اسے بیری کے پتوں والے پانی سے غسل دو اور انہی احرام کے کپڑوں میں کفن دے دو۔ اس کے سر کو نہ ڈھانپو اور نہ اسے خوشبو لگاؤ۔''

پھر فرمایا:

''یہ قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ یہ ﴿لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ﴾ پکار رہا ہوگا۔''[1]

جبکہ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہوگا اور یہ سکون کے ساتھ لبیک پکارتا ہوا اٹھایا جائے گا۔ اللہ اکبر۔ حج اسلام کا عظیم رکن ہے، اس کا ہر رکن اور ہر عمل انسان کے مقصدِ حیات کو سمجھنے اور اس میں کامیاب ترین بنانے میں ترقی سے ہمکنار کرتا ہے، اس کا منکر اللہ کا باغی قرار پاتا ہے اور استطاعت و وسعت کے باوجود اسے انجام نہ دینے والا اللہ کی رحمتوں سے بھی محروم رہتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کہتا ہے: میں نے اپنے بندے کو جسمانی صحت اور مالی وسعت عطا کی مگر پھر بھی پانچ سال گزرنے کے باوجود وہ میرے پاس (حج کے لیے) نہیں آتا۔ ایسا آدمی (فضائل وبرکات سے) محروم ہوتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان دس دنوں کی فضیلت اور برکت حاصل کرنے کی توفیق سے نوازے۔ ہم سب کو بھی اسی طرح صحیح سنت کے مطابق حج کرنے کی توفیق عطا فرمائے، جس سے وہ ہمارے تمام گناہوں کو مٹادے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
3. سوئے حرم۔ تالیف: الشیخ ابوعدنان مولانا محمد منیر قمر
4. صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ علی بن محمد مغربی رحمہ اللہ۔ ترجمہ: حافظ عبد الغفار مدنی

---

[1] صحيح البخاري (١٢٦٥، ١٢٦٨، ١٨٣٩، ١٨٤٩، ١٨٥١) صحيح مسلم (٨/ ١٢٦، ١٣٠)

متعلقاتِ حج وعمرہ

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورت آل عمران (آیت: ۹۶، ۹۷) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''بے شک سب سے پہلے جو گھر لوگوں کے (عبادت) کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہاں کو ہدایت کرنے والا۔ اس میں کئی کھلی نشانیاں ہیں (اللہ کی قدرت کی، ان میں سے ایک) مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس کے اندر آئے اس کو امن مل جاتا ہے اور اللہ کا فرض ہے لوگوں پر حج کرنا بیت اللہ کا جو وہاں تک راہ پا سکیں اور جو کوئی نہ مانے (یعنی باوجود قدرت کے حج نہ کرے یا حج کو فرض نہ جانے) تو اللہ تعالیٰ سارے جہان سے بے پروا ہے۔''

اسلام کا رکن:

دینِ اسلام میں حج وعمرے کی اس قدر اہمیت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک رکن قرار دیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ وإِقَامِ الصَّلٰوةِ وإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَصَوْمِ رَمضَانَ وَحَجِّ الْبَيْتِ »

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق

نہیں اور حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکات ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ شریف کا حج کرنا۔''

مجموعہ عبادات:

نماز، روزہ اور زکات کی طرح ہی حج وعمرہ بھی ایک اہم عبادت ہے، بلکہ ایک اعتبار سے تو یہ دیگر عبادات سے بھی جلیل القدر ہے، کیونکہ نماز اور روزہ صرف بدنی عبادات ہیں اور زکات مالی عبادت ہے جبکہ حج وعمرہ مالی اور بدنی ہر قسم کی عبادات کا مجموعہ ہے۔

افضل عمل:

اس رکن کی فضیلت کا اندازہ آپ نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے لگا سکتے ہیں جس میں نبی اکرم ﷺ نے حج کو افضل ترین اعمال میں سے ایک شمار فرمایا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا:

((أَيُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟)) ''سب سے افضل عمل کون سا ہے؟''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْاِیْمَانُ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ)) ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔''

کہا گیا کہ اس کے بعد؟ تو نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ)) ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔''

پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((حَجٌّ مَبْرُوْرٌ))[1] ''حجِ مقبول۔''

حجِ مبرور:

علمائے کرام نے ''حجِ مبرور'' کی شرح بیان کرتے ہوئے متعدد آرا کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی رحمہ اللہ ''القِریٰ لقاصد أم القُریٰ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٢٠، ٢٧٨٤)

’’بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ حج ہے جس کے دوران میں کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ حج ہے جو عنداللہ مقبول ہو جائے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے وہ حج مراد ہے، جس میں ریا وشہرت، فحاشی اور لڑائی جھگڑا نہ کیا گیا ہو اور کچھ اہلِ علم کا کہنا ہے کہ حجِ مبرور کی علامت یہ ہے کہ اس سے آدمی پہلے کی نسبت بہتر ہو کر لوٹے اور گناہ کی کوشش نہ کرے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسا حج جس کے بعد انسان دنیا سے بے رغبت اور آخرت کا طلب گار بن جائے، جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حج مبرور کے مفہوم میں یہ سبھی امور شامل ہیں۔‘‘[1]

جنت کی بشارت:

حج وعمرے سے حاصل ہونے والی سعادتوں، کامرانیوں اور فضائل وبرکات کا یہ عالم ہے کہ تمام گناہوں کے کفارے کے ساتھ ساتھ جنت کی خوش خبریاں بھی کانوں میں رس گھولتی، دلوں میں ایمان جگاتی اور روح کو بالیدگی و تازگی اور خوشی بخشتی ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

’’ایک عمرہ دوسرے عمرے تک تمام گناہوں کا کفارہ ہے اور حجِ مبرور کا ثواب تو جنت ہی ہے۔‘‘[2]

مفہومِ استطاعت:

حج وعمرے کی فرضیت کے لیے استطاعت اور طاقت و قدرت کا ہونا شرط ہے۔ لہٰذا استطاعت کے مفہوم اور اس کی اقسام کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے، تاکہ اس بات کا فیصلہ کرنا آسان ہو جائے کہ کسی مسلمان پر کب تک حج فرض نہیں ہوتا اور کب اور کن حالات میں فرض ہو جاتا ہے؟ اس سلسلے میں سورت آل عمران (آیت: ۹۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾

’’لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق (فرض) ہے کہ جو اس کے گھر (بیت اللہ شریف) تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، وہ اس کا حج کریں۔‘‘

---

[1] مرعاة المفاتيح (٦/ ١٩٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٧٣) صحيح مسلم (٩/ ١١٧، ١١٨)

① زادِ راہ اور سواری:

اس آیت میں جس طاقت و استطاعت کا ذکر ہوا ہے، اس کے مفہوم کی تعیین کے سلسلے میں قرآن وسنت ہر دو میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ سورت بقرہ (آیت: ۱۹۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی﴾

''اور زادِ راہ (سفر خرچ) اپنے ساتھ رکھو، اس لیے کہ اچھا توشہ یہی ہے کہ (بھیک مانگنے سے) بچے رہو۔''

تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کا سببِ نزول بیان کرتے ہوئے ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''اہلِ یمن حج کے لیے نکلتے تو کوئی زادِ راہ ساتھ نہیں لیتے تھے اور اپنے آپ کو کہتے کہ ہم متوکّل ہیں، لیکن جب مکہ مکرمہ پہنچتے تو لوگوں سے بھیک مانگتے تھے۔ اس پر یہ ارشادِ الٰہی نازل ہوا کہ ''زادِ راہ اپنے ساتھ رکھو، اس لیے کہ اچھا توشہ یہی ہے کہ (بھیک مانگنے سے) بچے رہو۔''[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی تفسیری قول صحیح بخاری شریف، کتاب الحج، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی﴾ اور متعدد دیگر کتبِ حدیث میں بھی مذکور ہے۔[2]

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اس آیتِ مذکورہ میں ''تقویٰ'' سے اس کا معروف اصطلاحی معنی مراد نہیں بلکہ یہاں اس کا لغوی معنی (بچنا) مراد ہے، جیسا کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں وضاحت کی ہے۔[3]

طاقت کی تعیین اور مفہومِ استطاعت کے سلسلے میں سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت ہے:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ارشادِ ربانی: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ میں

---

① تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۳۹) طبع حلبی مصر.

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۵۲۳) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۷۳۰)

③ تفسیر روح المعاني (۱/ ۲/ ۸۶) و اشرف الحواشي از مولانا محمد عبدہٗ الفلاح (ص: ۳۸ حاشیہ نمبر: ۷)

''سبیل'' سے کیا مراد ہے؟ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((اَلزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ)) ''زادِ راہ اورسواری۔''

زادِ راہ سے مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس اتنا مال ہو جو اس کی مکہ مکرمہ تک آمدورفت، وہاں پر اس کی مدتِ اقامت کے دوران میں اخراجات اور اس کے گھر والوں کی گزر اوقات کے لیے کافی ہو۔ سواری سے مراد آمد و رفت کا ذریعہ ہے۔ سواری خواہ اپنی ہو یا کرائے پر ہو، جیسا کہ ان عرب ممالک سے عموماً حج وعمرے کے لیے لے جانے والے کاروان اور قافلے ہوتے ہیں، یا پھر بحری و ہوائی جہاز میں، ان میں سے کسی بھی شکل میں سواری پر آنے والا خرچ موجود ہو۔

② امن:

ایسے ہی اہلِ علم نے ''استطاعتِ حج'' کی شرائط میں اس چیز کو بھی داخل کیا ہے کہ بیت اللہ شریف تک جانے آنے کا راستہ اور سفر پر امن ہو اور کسی جانی یا مالی نقصان کا خطرہ غالب نہ ہو۔[1]

③ عورت کے لیے محرم کی شرط:

اگر حج کرنے والی عورت ہو تو اس کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ اس کا شوہر یا کوئی بھی محرم ہو اور محرم میں ہر وہ رشتہ دار مرد شامل ہے، جس سے اس عورت کا نکاح حرام ہے، جیسے باپ، بیٹا، بھائی، چچا، ماموں وغیرہ۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''کوئی مرد (غیر محرم) کسی عورت کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے اور نہ کوئی عورت محرم کے بغیر سفر کرے۔''[2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی عورت محرم کے بغیر کسی قسم کا کوئی سفر اختیار نہ کرے، اس حدیث میں اس سفر کی مدت وغیرہ کا ذکر نہیں، جبکہ بعض دیگر احادیث میں سفر کی مدت بھی مذکور ہے، مثلاً صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھنے والی کسی عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی محرم

---

[1] الفتح الرباني (١١/ ٤٢، ٤٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٠٦، ٥٢٣٣) صحيح مسلم (٩/ ١٠٩)

کے بغیر ایک دن اور رات کی مسافت کا سفر کرے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک شب و روز کا سفر ہو تو کوئی عورت محرم کے بغیر نہ نکلے اور وہ عورت جو اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہو اور اس کا شوہر یا اور کوئی بھی محرم نہ ہو، یہ صورت اگرچہ نادر ہی ہے، مگر کہیں کہیں اس کا پتا چلتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ایسی عورت سے فرضیتِ حج ساقط ہو جاتی ہے۔ یعنی اس پر حج فرض نہیں ہوتا، کیونکہ اس پر شرائطِ استطاعت پوری نہیں ہوتیں، البتہ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ بامرِ مجبوری وہ دوسری ثقہ بڑی عورتوں کے ساتھ جا سکتی ہے اور یہ صرف فرض حج ادا کرنے کے لیے اجازت دی ہے مگر وہ اس شکل میں نفلی حج یا عمرے کے لیے نہیں جا سکتی۔[1]

حجِ بدل:

اگر کوئی شخص (مرد و زن) مال دار تو ہو اور باقی تمام شرائطِ استطاعت بھی پوری ہوں مگر دائمی مرض و کمزوری یا کبرسنی و بڑھاپے کی وجہ سے وہ خود سفرِ حج اور ادائے مناسک کی مشقت برداشت کر سکنے سے قاصر ہو تو اسے اجازت ہے کہ وہ خود تو حج کے لیے نہ جائے، البتہ اپنی طرف سے کسی دوسرے کو اپنے خرچ پر حج کرنے کے لیے بھیج دے۔ اسے ہی ''حجِ بدل'' کہا جاتا ہے۔

جس کی ایک دلیل صحیح بخاری شریف میں مذکور ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

''ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: میری بہن نے حج کی نذر مانی تھی مگر وہ (حج کیے بغیر ہی) فوت ہوگئی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اس پر کوئی قرض ہوتا تو کیا تم ادا کرتے؟ اس نے کہا: ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس پر اللہ کا قرض ہے، وہ (اس کی طرف سے حج) ادا کرو، کیونکہ اللہ تو حق واپسی کا زیادہ حقدار ہے۔''[2]

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ایک عورت کا واقعہ مذکور ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتی ہے کہ میری ماں مرگئی ہے، اس حال میں کہ اس پر ایک ماہ کے روزے باقی ہیں،

---

[1] بلوغ الأماني من أسرار الفتح الرباني للبناء (٥/ ٨٥/ ١١/ ٤٤٤٣)

[2] صحيح البخاري، كتاب الأيمان والنذور، رقم الحديث (١٦٩٩)

کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھ لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: رکھ لو۔ مزید وہ کہتی ہے:

''اس نے کوئی حج نہیں کیا، کیا میں اس کی طرف سے حج کرلوں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کی طرف سے تم حج کرلو۔''[1]

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مرد کے بدلے میں عورت اور عورت کے بدلے میں مرد بھی حج کرسکتا ہے، البتہ حجِ بدل کے لیے ایک شرط تو یہ ہے کہ اگر یہ کسی زندہ کی طرف سے ہو تو پھر یہ کسی ایسے ضعیف العمر بوڑھے، دائمی مریض اور لاغر و کمزور مرد یا عورت کی طرف سے کیا جائے جس کے تندرست وتوانا ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہی ہو اور وہ عمر رسیدہ یا کمزور ہونے کی وجہ سے کسی سواری پر بھی بیٹھا نہ رہ سکتا ہو۔[2] حجِ بدل کے لیے دوسری اہم شرط یہ ہے کہ حجِ بدل کرنے والا شخص پہلے اپنی طرف سے حج ادا کر چکا ہو اور اس فریضے سے پہلے خود سبک دوش ہو چکا ہو، جیسا کہ معروف حدیثِ شبرمہ رضی اللہ عنہ سے پتا چلتا ہے۔[3]

حج سے قبل حاجی کے لیے چند اہم امور:

① تقویٰ: ہر عازمِ حج کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے، تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرے اور مقدور بھر کوشش کرے کہ پورے سفرِ حج اور ادائے مناسک کے دوران میں کسی ایسے کام کا ارتکاب نہ کرنے پائے، جسے حالتِ احرام میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ممنوع قرار دیا ہے، مثلاً بے ہودہ اور شہوانی افعال، لڑائی جھگڑا اور دیگر فسق و فجور، کیونکہ سورت بقرہ (آیت: ۱۹۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ﴾

''حج کے مہینے مقرر و معلوم ہیں، پس جو شخص ان مہینوں میں حج کا احرام باندھ لے تو شہوت کی باتیں، گناہ اور جھگڑا نہ کرے اور جو نیک کام تم کرو گے، اللہ کو معلوم ہوجائے گا۔''

[1] صحيح مسلم، كتاب الصوم (٨/ ٢٥)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٤/ ٦٦)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٠٣) صحيح ابن خزيمة (٣٠٣٩)

② توبہ: ہر حاجی کو چاہیے کہ سفرِ حج پر روانگی سے قبل اپنے سابقہ تمام گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور خلوصِ نیت کے ساتھ توبہ کر لے، کیونکہ سورت نور (آیت: ۳۱) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! تم سب اللہ کی طرف تائب ہو جاؤ، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

یاد رہے کہ اللہ کے نبی ﷺ دن میں سو سے بھی زیادہ بار توبہ کیا کرتے تھے، جبکہ وہ گناہوں سے پاک تھے اور ہماری تو زندگی گناہوں سے بھری پڑی ہے، ہم کو زیادہ سے زیادہ توبہ کرنی چاہیے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ پرخلوص توبہ وہ ہوتی ہے جس میں:

① گناہوں سے کلی اور فوری اجتناب کیا جائے۔

② آیندہ گناہ نہ کرنے کا عہدِ مصمم اور پختہ ارادہ کیا جائے۔

③ سابقہ گناہوں پر ندامت اور شرمندگی کا اظہار کیا جائے۔[1]

اگر توبہ کر لینے کے بعد اپنے آپ کو ان امور پر سختی سے پابند پائے تو سمجھ لو کہ اس کی توبہ کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ غفار نے قبول کر لیا ہے، اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیے ہیں جیسا کہ سنن ابن ماجہ میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔''

③ حقوق و امانات ادا کرنا: اللہ کے گھر کی طرف روانگی سے پہلے دوسرے لوگوں کے حقوق اور امانتیں ادا کر دے۔ کسی پر کوئی ظلم وزیادتی کی ہو تو اس سے معافی مانگے۔ کسی سے کوئی قرض لیا ہوا ہو اور تاحال واجب الادا ہو تو وہ دے کر جائے یا کم از کم لکھ کر دے یا ویسے ہی اپنے گھر والوں کو اچھی طرح سمجھا دے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ [النساء: ۵۸]

④ خلوص وللّٰہیت: یعنی سفر اللہ تعالیٰ کے لیے ہو: سفرِ حج پر روانگی کے وقت اسے یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ وہ اپنے اندر خلوص وللّٰہیت پیدا کرے، کیونکہ اُس کا یہ سفر مکے کی طرف نہیں بلکہ اللہ کی طرف روانگی ہے، ویسے تو تمام اعمال ہی میں اخلاص قبولیتِ عمل کی

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٥٢)

بنیادی شرط ہے، مگر خصوصاً حج وعمرے کے اس جلیل القدر عمل کو ریا کاری، شہرت اور فخر ومباہات کا ذریعہ ہرگز نہیں بنانا چاہیے، جیسا کہ سورۃ البینۃ (آیت: ۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾

''لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں، اطاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔'' یعنی ہر قسم کی عبادت اور اطاعت خاص اسی کے لیے ہو۔

⑤ **مالِ حلال:** حج وعمرے پر جانے کے لیے حلال و پاکیزہ مال استعمال کیا جائے، جس میں حرام کی آمیزش تک نہ ہو، کیونکہ صحیح مسلم، سنن ترمذی اور بعض دیگر کتب میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

« أَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ وَلَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّباً، وإِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِينَ »

''لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف حلال وپاک مال ہی کو قبول کرتا ہے اور اللہ نے مومنوں کو بھی وہی حکم فرمایا ہے، جو انبیا و رسل علیہم السلام کو فرمایا ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّي بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ [المومنون: ۵۱]

''میرے رسولو! پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ اور اچھے عمل کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو، میں جانتا ہوں۔''

نیز ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ [البقرۃ: ۱۷۲]

''ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں وہ تم کھاؤ۔''

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا جس کے اوصاف یوں تھے:

''وہ لمبا سفر کرکے آتا ہے، اس کے بال پراگندہ ہوتے ہیں، وہ گرد وغبار سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یا رب! یارب! کہتا ہے، جبکہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام، اس کا پہننا حرام اور اس کی ساری غذا بھی حرام سے ہے۔

بھلا ایسے شخص کی دعائیں کہاں سنی جائیں گی؟"[1]

اس ارشادِ گرامی کو پیشِ نظر رکھ کر وہ لوگ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر سوچیں جن کے ذرائع روزگار ہی سراسر غیر شرعی، غیر قانونی اور ناجائز وممنوع کاروبار ہیں۔ ایسے کاروبار سے حاصل شدہ مال خرچ کر کے حج کرنے والے لوگ اس حدیث شریف میں مذکور شخص کے واقعے سے درسِ عبرت حاصل کریں۔ ایسے لوگوں کو اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

٦ **شرک و بدعات:** اس سلسلے کی آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اس سفرِ مبارک کو شرک وبدعات کی تمام انواع و اقسام اور آلایشوں سے محفوظ رکھا جائے، کیونکہ شرک وہ مرض ہے جو انسان کے تمام اعمال کو اکارت و ضائع کر دیتا ہے۔ سورت انعام کے دسویں رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ جلیل القدر انبیا و رسل علیہم السلام کے نام لے لے کر ان کے مقام و مرتبے کو بیان فرمایا اور آیت (٨٨) میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾

"اگر ان (انبیا) نے بھی شرک کیا ہوتا تو ان کے بھی تمام اعمال اکارت وضائع ہو جاتے۔"

پھر خاص امام الانبیا و الرسل حضرت محمد رسول اللہ۔ علٰی نبینا وعلیهم الصلاة والسلام۔ سے مخاطب ہو کر سورت زمر (آیت: ٦٥) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾

"آپ کی طرف اور آپ سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیا کی طرف وحی کی جا چکی ہے کہ اگر آپ بھی شرک کریں تو یقیناً آپ کا سارا عمل بھی ضائع ہو جائے گا اور آپ خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

اندازہ فرمائیں! شرک کے معاملے میں جب انبیا و رسل علیہم السلام کو اس طرح خطاب فرمایا گیا ہے تو ان کے سامنے ہماری حیثیت ہی کیا ہے؟ ہمیں تو اور بھی اپنی ساری زندگی کو اس مرضِ خطیر سے محفوظ رکھنا چاہیے اور خصوصاً زائرینِ دیارِ مقدسہ کو اس سفرِ سعادت میں اپنے آپ کو شرک سے بچا کر رکھنا چاہیے۔

[1] صحیح مسلم (٧/ ١٠٠)

شرک کی طرح اپنے آپ کو انواع و اقسام کی بدعات سے بھی بچانا چاہیے اور ہر اس کام سے اجتناب کرنا چاہیے جو ظاہر میں کتنا ہی بھلا معلوم کیوں نہ ہوتا ہو، مگر اس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے کچھ بتایا ہو نہ خود کیا ہو اور خلفا وصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل سے بھی جس کا ثبوت نہ ملتا ہو۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النور: ٦٣]

''جو لوگ اس (رسول) کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، انھیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں ان پر کوئی مصیبت یا دردناک عذاب نہ آجائے۔''

اسوہ حسنہ:

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہمارے امام و پیشوا اور مطاع و راہنما ہیں۔ آپ ﷺ کا طرزِ عمل ہمارے لیے بہترین نمونہ اور مشعلِ راہ ہے، جیسا کہ سورت احزاب (آیت: ۲۱) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾

''رسول اللہ کی ذاتِ گرامی میں تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔''

لہٰذا آپ ﷺ کے طرزِ عمل کو اختیار کرنے میں ہمارے لیے عزوشرف کے علاوہ اجر وثواب بھی ہے تو کیوں نہ ہم آغازِ سفر اور دیگر تمام دینی و دنیوی امور میں آپ ﷺ کے طرزِ عمل کو اپنائیں۔ اس طرح کام بھی اپنا ہو اور نیکیاں بھی پائیں۔

سفرِ حج کے لیے مسنون ومستحب دن:

یوں تو کسی بھی دن سفر کا آغاز کیا جاسکتا ہے لیکن مسنون ومستحب یہ ہے کہ سفرِ حج وعمرہ بالخصوص اور دیگر اغراض کے لیے بالعموم جمعرات کے دن سفر شروع کیا جائے، کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''نبی اکرم ﷺ جمعرات کے سوا کسی دوسرے دن سفر پر کم ہی نکلا کرتے تھے۔''

نیز بخاری شریف میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ''نبی اکرم ﷺ جمعرات کو سفر پر نکلنا پسند فرماتے تھے۔''

اگر جمعرات کو نکلنا کسی وجہ سے ناممکن یا دشوار ہو تو پیر (سوموار) کا دن بھی مناسب ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے پیر ہی کو مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی، جیسا کہ کتبِ حدیث وسیرت میں معروف ہے۔[1]

مسنون وقت:

یہ بھی مسنون و مستحب ہے کہ سفر علی الصبح شروع کیا جائے، کیونکہ سنن ابو داود و ترمذی اور دارمی کی ایک جید سند والی حدیث میں حضرت صخر غامدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ دعا فرمائی ہے:

«اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِأُمَّتِيْ فِيْ بُكُوْرِهَا»

''اے اللہ! میری امت کو اس کے سفرِ صبح گاہی میں برکت عطا فرما۔''

حضرت صخر غامدی رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے راوی بیان کرتے ہیں:

''حضرت صخر رضی اللہ عنہ ایک تاجر تھے اور وہ اپنا مالِ تجارت بھی صبح کے وقت ہی روانہ کیا کرتے تھے (اسی کی برکت سے) وہ بہت بڑے مال دار ہوگئے تھے۔''[2]

رفیقِ سفر:

آدابِ سفر میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ کسی موحد، متبعِ سنت اور اخلاقِ عالیہ کے مالک انسان کو اپنا رفیقِ سفر منتخب کر لیں، کیونکہ صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''اگر لوگوں کو تنہا سفر کرنے کی وہ قباحتیں معلوم ہو جائیں، جنھیں میں جانتا ہوں تو کوئی سوار بھی رات کو اکیلا سفر پر نہ نکلے۔''[3]

سفر کی دعائیں:

سفر کی تیاری کے امور سے فارغ ہو کر جب گھر سے نکلنے لگیں تو سنن ابو داود میں مذکور یہ دعا کریں:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٤٩)

[2] مشكاة المصابيح (٢/ ١١٤٤) رقم الحديث (٣٩٠٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٩٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٧٣)

«بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ»

''اللہ کا نام لے کر اور اس پر توکل کر کے (گھر سے نکل رہا ہوں) اور اس کی توفیق کے بغیر نیکی کرنے کی ہمت ہے نہ بُرائی سے بچنے کی طاقت ہے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب کوئی شخص گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھ لیتا ہے تو شیطان اس کا پیچھا چھوڑ دیتا ہے اور وہ اپنے چیلوں کو بھی اس کا پیچھا چھوڑ دینے کی ہدایت کر دیتا ہے۔''[1]

مسافر کو الوداع کرنے کے لیے جو لوگ آئے ہوں وہ سب مسافر کے لیے سنن ابو داود و ترمذی شریف میں مذکور یہ دعا کریں:

«اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ»[2]

''میں تیرے دین وامانت اور خاتمہ عمل کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔''

سفر پر روانہ ہونے والا شخص جب سوار ہونے لگے تو صحیح مسلم اور مسند احمد میں مذکور یہ دعا کرے:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اللّٰهُ أَكْبَرُ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾» [الزخرف: ١٣، ١٤]

''اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اس (سواری) کو ہمارے لیے مسخر (فرماں بردار) کیا، ورنہ ہم میں اس کی طاقت نہ تھی۔ اور ہم سب اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

اسی طرح ایک دعا یہ بھی ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَ مُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [هود: ٤١]

''اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا (ٹھہرنا) اللہ کے نام سے ہے، بے شک میرا پروردگار بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

یہ دعا حضرت نوح علیہ السلام نے تاریخِ انسانی کے مشہور واقعہ ''طوفانِ نوح'' کے موقع پر اپنی کشتی میں سوار ہوتے وقت کی تھی۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٩٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٤٢)

دورانِ سفر:

صحیح بخاری شریف میں مذکور ایک حدیث کی رو سے مسافرین کے لیے سنت یہ ہے کہ جب وہ کسی اونچائی کی طرف چڑھیں تو ''اللہ اکبر'' کہیں اور جب گہرائی کی طرف اتریں تو ''سبحان اللہ'' کہیں۔

المختصر سارا سفر ذکرِ الٰہی میں مشغول رہیں، قصر وجمع یا صرف قصر کرکے اوقاتِ مقررہ پر باجماعت نمازیں ادا کرتے جائیں، لایعنی اورفضول گفتگو سے پرہیز کریں اور یہ صرف سفرِ حج یا عام سفر ہی میں نہیں، بلکہ اس عمل کو زندگی بھر کے لیے اپنائیں، اس میں بہت خیر و برکت ہے۔

میقاتِ مکانی:

میقاتِ مکانی سے مراد وہ پانچ معروف جگہیں ہیں جہاں سے حج وعمرے کے لیے احرام باندھا جاتا ہے اور احرام باندھے بغیر حُجاج وعُمار کا وہاں سے گزرنا جائز نہیں جو ذو الحلیفہ (مدینہ منورہ) قرن المنازل (طائف) جحفہ (رابغ) یلملم (سعدیہ، جنوب) اور ذات عرق (شمال) ہیں۔

احرام باندھنے کا طریقہ:

احرام باندھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسنون طریقے سے غسل کیا جائے، حتیٰ کہ حیض و نفاس اور چھوٹے بچے والی عورتیں بھی غسل کریں، کیونکہ احرام کا یہ غسل سنتِ رسول ﷺ ہے۔ اگر کسی وجہ سے میقات پر کوئی مجبوری پیش آ جائے اور غسل کرنا ممکن نہ ہو تو صرف وضو بھی کیا جا سکتا ہے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔[1]

مردوں کا خوشبو لگانا:

وضو یا غسل سے فارغ ہوکر مردوں کے لیے بدن کو ہر قسم کی خوشبو لگانا جائز ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''میں نبی اکرم ﷺ کو حسبِ مقدور سب سے عمدہ خوشبو لگایا کرتی تھی اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ احرام باندھتے تھے۔''[2]

---

[1] الفتح الرباني (١١/ ١٢٣، ١٣١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٢٨) صحيح مسلم (٨/ ١٠٠)

احرام کے کپڑے پہننا:

غسل کرکے خوشبو لگا لینے کے بعد مردوں کے لیے دو چادروں میں احرام باندھنا ضروری ہے جس میں سے ایک تہمد کے طور پر اور ایک اوپر کے لیے ہوگی اور مستحب یہ ہے کہ یہ چادریں سفید ہوں اور عورتیں اپنے معمول کے کپڑے پہن لیں جو موٹے ساتر اور باپردہ ہوں، البتہ چہرے پر نقاب باندھیں، نہ دستانیں پہنیں اور نہ کسی قسم کی خوشبو لگائیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''احرام والی عورت ورس یا زعفران لگا کوئی کپڑا نہ پہنے۔''[1]

عورتوں کا دستانے پہننا اور نقاب کا باندھنا بھی منع ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

''احرام والی عورت منہ پر نقاب باندھے اور نہ دستانے پہنے۔''[2]

پردہ:

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ احرام کی حالت میں بھی پردے کا اہتمام ضروری ہے، جبکہ اکثر خواتین کو اس طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی اور وہ احرام باندھنے سے لے کر احرام کھولنے تک اپنے پرائے محرم غیر محرم کسی سے بھی پردہ نہیں کرتیں۔

اس سستی کا سبب:

صرف احرام کی حالت میں خواتین کے پردے کے بارے میں سُستی برتنے کا سبب در اصل یہ غلط فہمی ہے کہ احرام والی عورت کو ''نقاب'' باندھنے سے منع کیا گیا ہے۔

ڈھاٹے کی ممانعت:

احادیث میں نقاب اور برقع چہرے پر باندھنے سے منع کیا گیا ہے نہ کہ لٹکانے سے۔ اگر چادر یا دوپٹے کو سر سے کچھ اس طرح گرایا جائے کہ وہ پردے کا کام دے تو وہ جائز ہے اور حدیث میں جس چیز کی ممانعت آئی ہے اس کا ارتکاب بھی نہ ہوگا، کیونکہ احرام کی حالت میں بھی پردے

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٤/ ٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٣٨)

کے اہتمام کا ثبوت صحیح احادیث میں موجود ہے۔ جن میں سے ایک میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

''سوار لوگ ہمارے پاس سے گزرتے جبکہ ہم احرام باندھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہوتیں۔ جب وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم سر سے کپڑا سِر کا کر چہرے پر ڈال لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو چہرے کھول لیتیں۔''[1]

ایسے ہی صحیح بخاری میں تعلیقاً و مختصراً اور بیہقی میں موصولاً و مطولاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فتویٰ مذکور ہے۔ اس سے بھی جہاں پردے کے اہتمام کا پتا چلتا ہے وہیں نقاب و برقع کی اصل حقیقت کا بھی پتا چل جاتا ہے کہ وہ پردے میں مانع نہیں ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احرام والی عورت چہرے پر کپڑے کو باندھے تو نہیں بلکہ صرف سر کی طرف سے لٹکا دے، پھر صحیح قول کی رو سے بے شک وہ کپڑا اس کے چہرے کو چھوتا رہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔[2]

نمازِ احرام:

اب احرام کی نیت کرنے اور تلبیہ ﴿ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ﴾ کہنے کا آغاز کرنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لیں، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ذو الحلیفہ کے مقام پر دو رکعتیں پڑھتے اور اونٹنی پر سوار ہوتے۔ جب وہ سیدھی کھڑی ہوجاتی تو مسجد ذوالحلیفہ کے پاس ہی تلبیہ شروع کردیتے تھے۔''[3]

اس حدیث کی بنا پر احرام باندھنے اور تلبیہ کہنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے اور یہ دو رکعتیں نفلی ہوں گی۔ جمہور علمائے مذاہب کا یہی مسلک ہے اور یہ دو رکعتیں مسنون (نفلی وسنت) ہیں، اگر کوئی پڑھ لے تو ثواب وفضیلت ہے اور اگر کسی وجہ سے نہ پڑھ سکے تو کوئی گناہ یا دم نہیں ہے۔[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٣٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٣٥)

[2] بحواله مناسك الحج و العمرة (ص: ١٢) و مجموع فتاویٰ ابن تيمية (٢٦/ ١١٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٥٤) صحيح مسلم (٨/ ٨٩)

[4] شرح صحيح مسلم للنووي (٨/ ٩٢، ٩٣)

اس نماز سے جب فارغ ہو جائیں تو دل میں نیت کریں اور تلبیہ پکارنا شروع کر دیں۔
یہاں اب آپ کو اختیار ہے کہ حج کی تینوں اقسام میں سے جس کا چاہیں احرام باندھیں اور اسی کے حساب سے تلبیہ کے آغاز میں قبلہ رو ہوکر:

اگر حجِ تمتع کرنا ہے تو «لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ عُمْرَةً» کہیں۔

اگر حجِ قِران کرنا ہے تو «لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ حَجًّا وَعُمْرَةً» کہیں۔

اور اگر حجِ مفرد کرنا ہو تو «لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ حَجًّا» کہیں اور ساتھ ہی تلبیہ کہنا شروع کر دیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں صحیح معنوں میں سنت کے مطابق اس فریضے کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے اس عمل کو خالص اپنی رضا کے لیے قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
3. سوئے حرم۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر
4. صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ علی بن محمد مغربی رحمہ اللہ۔ ترجمہ: حافظ عبدالغفار مدنی

محرمات ومباحاتِ احرام وطوافِ بیت اللہ

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

سورۃ البقرہ (آیت: ۱۹۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ﴾

''حج کے تو کئی مہینے ہیں جو مشہور ہیں (یعنی شوال اور ذو القعدہ اور دس دن ذی الحجہ کے) پھر جو کوئی ان دنوں میں حج کا احرام باندھ لے تو حج میں (یعنی حج کے ختم ہونے تک) شہوت کی باتیں اور گناہ اور جھگڑا نہ کرے جو نیک کام تم کرو گے اللہ کو معلوم ہو جائے گا اور راہ کا خرچ اپنے ساتھ رکھو اس لیے کہ اچھا توشہ یہی ہے کہ (بھیک مانگنے سے بچے) اور عقل مندو! مجھ سے (میرے عذاب اور غصے سے) ڈرتے رہو۔''

مسنون تلبیہ:

اپنے میقات سے تلبیہ کہنا شروع کیا جاتا ہے اور تلبیے کے مسنون الفاظ کے بارے میں صحیحین، سننِ اربعہ، بیہقی، موطا امام مالک، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلبیہ کہتے ہوئے سنا:

«لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ، وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ» [1]

''میں حاضر ہوں، اے میرے رب! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، بے شک ہر قسم کی تعریف اور تمام نعمتیں تیرے ہی لیے ہیں اور ساری بادشاہی بھی، تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔''

[1] الموطأ (۱/ ۳۳۱) صحیح البخاري (۱۵٤۹) صحیح مسلم (۸/ ۸۷، ۸۸) سنن أبي داود (۱۸۱۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مختصر سا تلبیہ بھی مروی ہے جس کے صرف یہ تین ہی الفاظ ہیں:

((لَبَّیْكَ اِلٰهَ الْحَقِّ، لَبَّیْكَ)) [1]

''میں حاضر ہوں، اے معبودِ برحق! میں حاضر ہوں۔''

آدابِ تلبیہ:

مردوں کے لیے تو یہ تلبیہ بلند آواز سے پڑھنا ضروری ہے، مگر خواتین کو اجازت ہے کہ وہ اپنی آواز کو اس قدر دھیما اور پست رکھیں جسے وہ خود یا صرف ان کی ساتھی خواتین ہی سن سکیں۔

فضائلِ تلبیہ:

سنن ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' میرے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صحابہ کو حکم فرمائیں کہ وہ بلند آواز سے تلبیہ کہیں، کیونکہ یہ شعائرِ حج میں سے ایک شعار ہے۔'' [2]

اس تلبیے کی فضیلت کا اندازہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے بھی ہو جاتا ہے جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''کوئی تلبیہ کہنے والا تلبیہ کہتا ہے تو اس کے دائیں بائیں والے تمام پتھر، درخت اور مٹی بھی تلبیہ کہنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے دائیں بائیں سے زمین منقطع ہو جاتی (تلبیہ کہنے لگتی) ہے۔''

صحیح بخاری اور سنن بیہقی میں مذکور ایک حدیث سے پتا چلتا ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر حدودِ حرم تک یہ تلبیہ جاری رہنا چاہیے۔ [3]

---

[1] سنن النسائي (٥/ ١٦١) سنن ابن ماجه (٢٩٢٠) سنن البيهقي (٥/ ٤٥) مستدرك الحاكم (١/ ٤٥٠)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٢٣) صحيح ابن خزيمة، رقم الحديث (٢٦٢٨) صحيح ابن حبان (٩٧٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٨) سنن ابن ماجه (٢٩٢١) صحيح ابن خزيمة (٢٦٣٤)

محرماتِ احرام

جب کسی میقات سے احرام باندھ کر "لَبَّيْكَ اَللّٰهمّ لَبَّيْكَ" شروع کیا جائے تو اس وقت سے لے کر احرام کھولنے تک اس کے آداب اور شرعی پابندیوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوجاتا ہے۔ ان پابندیوں کو ''محرماتِ احرام'' کہا جاتا ہے جو قرآن وسنت کی رو سے درج ذیل ہیں:

① بال کاٹنا یا نوچنا:

احرام کی حالت میں سر یا جسم کے کسی بھی حصے سے بالوں کا کاٹنا، مونڈھنا یا نوچنا حرام ہے۔

فدیہ:

اگر کسی بیماری یا دوسرے جائز شرعی عذر کی وجہ سے بال کاٹنے ضروری ہو جائیں تو پھر اس کے بدلے میں فدیہ ادا کرنا ضروری ہوگا، جیسا کہ سورت بقرہ (آیت: ۱۹۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾

''تم میں سے جو شخص (حالتِ احرام میں) بیمار ہو جائے یا کسی کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور اس بنا پر سر منڈوالے) تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ کرے یا قربانی دے۔''

اس فدیے کی تعیین نبی اکرم ﷺ نے فرمائی ہے کہ وہ تین دن کے روزے رکھے یا مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ایک بکرا قربانی کرے۔

② تا ⑥ احرام کی حالت میں:

② ناخن کاٹنا: مرد وزن کا۔
③ سلے ہوئے کپڑے پہننا: مردوں کا۔
④ جرابیں پہننا: مردوں کا۔
⑤ سر کو ڈھانپنا: مردوں کا۔
⑥ خواتین اور مرد حجاج سبھی کا خوشبو لگانا یا خوشبو والا کپڑا پہننا۔

یہ سب امور بھی نبی اکرم ﷺ کے بعض ارشادات کی رو سے حرام ہیں۔

⑦ نکاح اور منگنی کرنا:

احرام کی حالت میں کسی کا نکاح کرنا، اپنا نکاح کروانا یا پیغامِ نکاح دینا منع ہے۔[1]

⑧ جنگلی جانوروں کا شکار کرنا:

احرام کی حالت میں جنگلی جانوروں کا شکار کرنا بھی منع ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ [المائدۃ: ٩٥]

''اے ایمان والو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو۔''

فدیہ:

اگر کسی سے احرام کی حالت میں کسی جنگلی جانور کے شکار کا فعل سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ فدیہ مقرر فرمایا ہے کہ جیسا جانور شکار کرے، ویسا ہی پالتو جانور مکے میں ذبح کر کے مسکینوں میں تقسیم کرے یا اس کی قیمت کے برابر مسکینوں کو کھانا کھلائے یا اتنے روزے رکھے۔[2]

⑨ جماع کرنا۔ ⑩ بدکاری اور معصیت کرنا۔

⑪ بوس وکنار کرنا۔ ⑫ لڑائی جھگڑا کرنا۔

یہ سب امور بھی حالتِ احرام میں حرام ہیں، کیونکہ سورۃ بقرہ (آیت: ١٩٧) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ﴾

''حج کے تو کئی مہینے ہیں جو مشہور ہیں (یعنی شوال اور ذوالقعدہ اور دس دن ذوالحجہ کے) پھر جو کوئی ان دنوں میں حج کا احرام باندھ لے تو حج میں (حج کے ختم ہونے تک) شہوت کی باتیں اور گناہ اور جھگڑا نہ کرے، جو نیک کام تم کرو گے اللہ کو معلوم ہو جائے گا اور راہ کا خرچ اپنے ساتھ رکھو اسی لیے کہ اچھا توشہ یہی ہے کہ (بھیک مانگنے سے بچے) اور عقل مندو! مجھ سے (میرے عذاب اور غصے سے) ڈرتے رہو۔''

---

[1] موطأ الإمام مالك (١/ ٣٤٨) صحيح مسلم (٩/ ١٩٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٤١)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر ابن کثیر اردو (٢/ ٢٢ تا ٢٧)

حالتِ احرام میں جماع کر لینے سے تو حج ہی باطل ہو جاتا ہے، البتہ بوس و کنار سے حج تو باطل نہیں ہوتا لیکن اس ممنوع فعل کے ارتکاب پر فدیہ دینا پڑے گا۔[1]

⑬ حرم کے درخت اور گھاس کاٹنا:

حدودِ حرم کے اندر اگے ہوئے درخت، گھاس اور نباتات کاٹنا ہر حال میں منع ہے، چاہے کوئی احرام کی حالت میں ہو یا احرام کے بغیر۔[2]

گری پڑی چیزیں اٹھانا:

حدودِ حرم میں گری پڑی چیزوں کا اٹھانا بھی منع ہے، وہ حرمِ مکی ہو یا حرمِ مدنی۔ اس کی ممانعت کا ثبوت صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے جس میں ہے کہ فتح مکہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اس شہرِ مکہ کو اللہ نے اس دن سے احترام وحرمت والا بنایا ہے، جس دن سے زمین و آسمان بنائے گئے تھے، یہ حرمتِ الٰہی کے ساتھ قیامت تک کے لیے قابلِ احترام ہے اور اس میں مجھ سے پہلے کسی کو قتال (جنگ) کی اجازت نہیں دی گئی اور مجھے بھی دن کی ایک گھڑی میں اس کی اجازت ملی۔ یہ شہر حرمتِ الٰہی کے ساتھ قیامت تک کے لیے محترم ہے۔ اس کے کانٹے دار درخت نہ کاٹے جائیں، اس کے شکار کے جانوروں کو بھگایا (شکار) نہ کیا جائے، اس میں گری پڑی کوئی چیز نہ اٹھائی جائے سوائے اس کے جو اس کا اعلان و تعارف کرانے کے لیے اٹھائے اور اس کی گھاس نہ کاٹی جائے۔ تب (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا) حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سوائے اذخر کے؟ (اسے کاٹنے کی اجازت فرما دیں) کیونکہ یہ بھٹی میں جلانے اور گھروں میں (بچھانے اور چھتوں پر ڈالنے کے) کام آتی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوائے اذخر کے (یعنی اسے کاٹنے کی اجازت ہے)۔“[3]

---

[1] المغني (٣/ ٣١٠) الفتح الرباني (١١/ ٢٣٣، ٢٣٦)

[2] المغني (٣/ ٣١٥، ٣١٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٣٤) صحيح مسلم (٩/ ١٢٣، ١٢٦)

مباحاتِ احرام:

بعض امور ایسے ہیں جو احرام کی حالت میں بھی جائز ہیں۔

① غسل کرنا۔ ② سر کو مل کر دھونا۔

③ سر دھوتے وقت اس کا ڈھک جانا۔ ④ احرام کو بدلنا یا دھونا۔

⑤ سایہ کرنا یا سائے میں بیٹھا۔ ⑥ آنکھوں میں سُرمہ یا دوا لگانا ڈراپس ڈالنا۔

⑦ موذی جانوروں کو مارنا۔ ⑧ منہ ڈھانپنا۔

''حضرت عثمان بن عفان ذو النورین، زید بن ثابت اور مروان بن حکم رضی اللہ عنہ احرام کی حالت میں منہ کو ڈھانپا کرتے تھے۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب آندھی چلتی تو لوگ (صحابہ رضی اللہ عنہم) احرام کی حالت میں منہ ڈھانپ لیتے۔''

⑨ سر یا جسم کے کسی حصے کو خراشنا۔

⑩ بیلٹ وگھڑی باندھنا، زیور وعینک پہننا، پرس رکھنا، آئینہ دیکھنا۔

⑪ پھول یا بوٹی کی خوشبو سونگھنا۔

احرام کی حالت میں خوشبو لگانا تو منع ہے، البتہ کسی بوٹی یا پھول کی خوشبو سونگھنا قابل مواخذہ نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور موطا امام مالک وسنن بیہقی میں حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ کے آثار سے پتا چلتا ہے۔[1]

دخولِ حرم ومکہ مکرمہ کے آداب:

میقات سے احرام باندھ کر تلبیہ کہتے ہوئے اور احرام کے محرمات ومباحات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوں تو مکہ کے باہر ہی سے حدودِ حرم شروع ہوجاتی ہیں، جن کی علامات آپ کو مکہ شریف کی طرف جانے والی ہر سڑک پر ملیں گی، وہاں احرام کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ حرم کی پابندیاں بھی لازم ہوجائیں گی جو مُحرم وغیر مُحرم، مکی وغیر مکی اور مقامی وآفاقی سب لوگوں کے لیے یکساں ہیں۔

---

[1] دیکھیں: المحلی لابن حزم تحقیق أحمد شاکر (٧/ ٢٤٦) حجة النبي للألباني (ص: ٢٨، ٢٩)

شہرِ مکہ میں داخل ہونے کی کوئی مخصوص دعا نہیں، عام شہروں میں داخل ہوتے وقت کی جانے والی دعاؤں میں سے کوئی مسنون دعا کر لیں، البتہ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ دعا مروی ہے:

«اَللّٰهُمَّ لَاتَجْعَلْ مَنَايَانَا بِهَا حَتّٰى تُخْرِجَنَا مِنْهَا»[1]

''اے اللہ! ہماری موت اسی شہر میں واقع نہ ہو جائے بلکہ ہمیں یہاں سے نکال دینا۔''

مکہ شریف میں داخل ہوکر جہاں قیام کا ارادہ ہو، وہاں سامان رکھنے آئیں تو کوئی معمولی چیز کھا پی اور سستا بھی لیں، پھر باوضو ہوکر حرم شریف کی طرف روانہ ہوں۔

آدابِ دخولِ مسجدِ حرام:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ حرام کے باب (بنی شیبہ) پر آئے۔ اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور مسجدِ حرام میں داخل ہوئے۔''[2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس راستے سے داخل ہونے کی حکمت یہ ہے کہ حجرِ اسود جہاں سے طواف کا آغاز کیا جاتا ہے، وہاں تک پہنچنے کا سب سے قریبی راستہ یہی ہے اور باب السلام (باب بنی شیبہ) سے جب مسجدِ حرام میں داخل ہونے لگیں تو مستدرک حاکم و بیہقی میں مذکور حسن درجے کی ایک حدیث کی رو سے اپنا دایاں قدم پہلے اندر رکھیں اور یہ دعا کریں:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ»[3]

''اے اللہ! حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود و رحمتیں نازل فرما، اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دے۔''

اب آپ حرم شریف کے سائے میں ہیں۔ تھوڑا آگے بڑھیں تو مسجدِ حرام کے عین وسط میں بیت اللہ شریف ہے، جو پورے عالمِ انسانیت کے لیے مرکزیت کی روشن علامت ہے۔ جسے دیکھنا ہر دلِ مسلم کی تمنا و آرزو اور تڑپ ہے۔ سنہری تاروں سے مزین، سیاہ غلاف میں مستور یہی خانہ کعبہ ہے،

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٥، ٢٦) طبراني في كتاب الدعاء (٨٥٣)

[2] صحيح ابن خزيمة، رقم الحديث (٢٧١٣) سنن البيهقي (٥/ ٧٤)

[3] صحيح مسلم (٥/ ٢٢٥) سنن أبي داود (٤٦٥) سنن النسائي (٢/ ٥٣) سنن ابن ماجه (٧٧٢)

جس کے در و دیوار کی زیارت کا شوق دل میں اٹھکیلیاں لیتا ہے، جذباتِ شوق کا دامن ہاتھوں سے چُھوٹا جاتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کیفیت کو لفظوں کا جامہ پہنانا ہی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس ایمان افروز نظارے سے ہمکنار کرے۔ آمین یا الٰہ العالمین

طواف کے احکام و مسائل:

جب آپ احرام باندھے ہوئے مسجدِ حرام میں داخل ہوں تو یہاں "تحية المسجد" کی دو رکعتیں پڑھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ حرمِ مکی کا تحیۃ طواف ہے۔ ہاں اگر کسی فرض نماز کی جماعت ہو رہی ہو تو سب سے پہلے جماعت میں شامل ہو جائیں۔ اسی طرح اگر کسی نے فرض نماز نہ پڑھی ہو اور طواف مکمل کرنے تک وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو تو وہ شخص بھی پہلے فرض نماز ادا کرے اور پھر طواف شروع کرے، اس پر تمام ائمہ وفقہا کا اتفاق ہے۔[1]

طہارت و وضو:

یہ بھی یاد رہے کہ طواف سے پہلے طہارت و وضو شرط ہے، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ پہنچ کر سب سے پہلا جو کام کیا، وہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور پھر بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔"[2]

طریقہ طواف:

طواف کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے حجرِ اسود کے سامنے آئیں، اس کا بوسہ لیں یا ہاتھ لگا کر ہاتھ کا بوسہ لیں اور «بِسْمِ اللّٰه وَاللّٰهُ اَكْبَرُ» کہیں اور طواف شروع کر دیں۔

بھیڑ کی شکل میں:

اگر آپ حجرِ اسود تک نہیں پہنچ پاتے تو پھر دور ہی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ"، کہیں اور طواف شروع کر دیں، کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

---

[1] المغني (٣/ ٣٣٣) فقه السنة (١/ ٦٩٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦١٤، ١٦٤١) صحيح مسلم (٨/ ٢٢٠)

''نبی کریم ﷺ نے بیت اللہ شریف کا طواف اونٹ پر بیٹھ کر کیا اور آپ ﷺ جب حجرِ اسود کے سامنے آتے تو اپنے ہاتھ میں موجود کسی چیز (چھڑی) سے اس کی طرف اشارہ فرماتے اور تکبیر کہتے۔''[1]

حجرِ اسود کی فضیلت:

حجرِ اسود کو بوسہ دینے اور چُھونے کی بڑی فضیلت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حجرِ اسود کو اٹھائے گا، اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے یہ دیکھے گا اور اس کی زبان ہوگی جس سے یہ بولے گا اور ہر اس آدمی کے لیے گواہی دے گا جس نے ایمان کے ساتھ حصولِ ثواب کے لیے اُسے چُھوا (یا بوسہ دیا) ہوگا۔''[2]

حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کو چُھونا گناہوں اور خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔ ارشادِ رسالت مآب ﷺ ہے:

''حجرِ اسود جنت کا پتھر ہے اور یہ برف سے بھی زیادہ سفید و شفاف تھا مگر مشرکین کے گناہوں نے اسے کالا کر دیا ہے۔''[3]

حجرِ اسود کے ان فضائل کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ ہر شکل میں اسے بوسہ دینے یا ہاتھ سے چھونے کی کوشش کی جائے، بلکہ صرف اشارہ کر دینے سے بھی یہ فضیلت حاصل ہوجاتی ہے، کیونکہ یہ طریقہ بھی نبی اکرم ﷺ کا تعلیم فرمودہ ہے۔ لہٰذا ''بِسْمِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہہ کر طواف شروع کر دیں، حجرِ اسود سے چل کر وہیں تک پہنچنے پر ایک چکر مکمل ہوگا اور ایسے سات چکر لگانے ہوتے ہیں۔

ملتزم سے چمٹنا اور دعائیں کرنا:

حجرِ اسود اور بابِ کعبہ کے درمیان والی جگہ جس کا نام ''ملتزم'' ہے، اس کے ساتھ چمٹنا اور اس پر اپنا سینہ، ہاتھ، بازو اور چہرہ رکھنا بھی مسنون ہے، جیسا کہ سنن ابو داود و ابن ماجہ میں مذکور بعض احادیث سے پتا چلتا ہے۔[4] وہاں اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں اور اپنی حاجتیں طلب کریں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦١١)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٦١) سنن الدارمي (٢/ ٤٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٤٤)

[3] مسند أحمد (١/ ٣٠٧، ٣٢٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٧٧) صحيح ابن خزيمة (٢٧٣٣)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٦٢)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر دیوارِ کعبہ کے اس حصے کے ساتھ چمٹنا ممکن نہ ہو تو پاس کھڑے ہوکر دعا کرلیں اور اس التزام کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔

رکنِ یمانی کو چھونا:

طواف کے ساتوں چکروں میں سے ہر چکر میں رکنِ یمانی کو ہاتھ سے چھونا بھی سنت وثواب ہے۔ مگر رکنِ یمانی کو بوسہ دینا یا اسے ہاتھ سے چھوکر اپنے ہاتھ کو چومنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔

دورانِ طواف کی دعائیں اور لایعنی گفتگو سے اجتناب:

یہ طواف، حج وعمرہ کا ایک اہم رکن ہے اور قربِ کعبہ کی بنا پر قبولیتِ دعا کا خصوصی موقع بھی۔ لہٰذا حُجاج کرام کو چاہیے کہ دورانِ طواف اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کریں اور دعائیں مانگیں اور لایعنی گفتگو سے کلی اجتناب کریں، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً مروی ہے:

''بیت اللہ کا طواف کرنا بھی نماز ہی ہے، لیکن اللہ نے اس میں بات چیت کو حلال قرار دیا ہے۔ بس جو کوئی بات کرے تو اسے چاہیے کہ کوئی بھلائی کی بات کرے۔''[1]

ایک دعا کے سوا دورانِ طواف کوئی مخصوص دعا یا ذکر کسی صحیح سند سے ثابت نہیں۔ لہٰذا قرآن وحدیث کی عام دعاؤں میں سے جو جی چاہے ذکر و دعا کریں جائز ہے۔ ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ مَابَيْنَ الرُّكْنَيْنِ: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ » [البقرة: ٢٠٢]

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکن یمانی اور حجرِ اسود کے مابین یہ کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! ہمیں دنیا وآخرت کی بھلائیاں عطا فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔''

قرآن وسنت سے ثابت شدہ اور مسنون دعائیں پڑھنے ہی میں تمام تر فضائل وبرکات، اجر وثواب اور اطمینانِ قلب وروح ہے اور اگر وہ یاد نہ ہوں تو پھر جو جی میں آئے اور جس زبان میں بھی ہو، دعائیں کرتے جائیں، کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لیے نہایت آسان دین لائے، مگر افسوس ہم نے ان آسانیوں سے فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ دین کو خود ہی مشکل بنا لیا ہے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٦٠) سنن الدارمي (٢/ ٤٤)

وقتِ طواف:

بیت اللہ شریف کے طواف کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں بلکہ جب بھی دن یا رات کے جس وقت بھی کوئی حرم شریف تک پہنچ جائے، اسی وقت طواف کرسکتا ہے۔

دورانِ طواف رکاوٹ:

طواف کے دوران میں اگر کوئی ضرورت پیش آجائے مثلاً فرض نماز کی جماعت کھڑی ہو جائے، جنازہ پڑھا جانے لگے یا پیاس و پیشاب جیسی کوئی بشری حاجت لاحق ہو جائے یا وضو ٹوٹ جائے تو طواف چھوڑ کر اس ضرورت کو پورا کرلیں، یہ جائز ہے۔ پھر جہاں سے طواف چھوڑا تھا وہیں سے شروع کرکے اسے مکمل کرلیں اور یہی معاملہ صفا ومروہ کے مابین سعی کا بھی ہے۔[1]

نمازِ طواف:

جب طواف کے سات شوط (چکر) مکمل ہو جائیں تو بابِ کعبہ (بیت اللہ شریف کے دروازے) کے سامنے موجود مقامِ ابراہیم علیہ السلام کی طرف آجائیں اور وہاں آکر سورت بقرہ (آیت: ۱۲۵) کے یہ الفاظ پڑھیں:

﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ ''اور مقامِ ابراہیم کو جائے نماز بنالو۔''

پھر مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے سامنے اس طرح رکھیں کہ کعبہ شریف اور مقامِ ابراہیم علیہ السلام ایک سیدھ میں آپ کے سامنے آجائیں اور طواف کی دو رکعتیں پڑھیں۔ ان دو رکعتوں کا ذکر صحیح بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث میں بھی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف مکمل کرلیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامِ ابراہیم کے پاس دو رکعتیں پڑھیں۔''[2]

ان دو رکعتوں میں سے پہلی رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد سورت کافرون ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور دوسری رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد سورت اخلاص ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾

[1] المغني (٣/ ٣٥٥، ٣٥٦) فقه السنة (١/ ٦٩٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٢٧) صحيح مسلم (٨/ ٢١٨، ٢١٩)

پڑھیں، کیونکہ معروف حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہی مذکور ہے۔ ان دونوں رکعتوں سے فارغ ہوکر اپنے لیے اور اپنے عزیز و اقارب کے لیے دین و دنیا کی بھلائیوں کی دعائیں مانگیں۔

آبِ زم زم:

طواف کی دو رکعتوں اور دعاؤں سے فارغ ہوکر آپ جی بھر کر آبِ زم زم پئیں اور اپنے سر پر بھی ڈالیں، کیوں کہ یہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''آبِ زمزم ہر مرض وغرض کے لیے مفید ہے۔''[1]

صحیح مسلم، مسند احمد اور طیالسی میں ارشادِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''یہ مبارک پانی ہے۔ یہ بھوکے کے لیے کھانا ہے اور بیمار کے لیے شفا بخش دوا ہے۔ روے زمین کا سب سے بہتر و افضل پانی آبِ زمزم ہے۔''[2]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی آبِ زمزم کے مشکیزے بھر بھر کر ساتھ لے جاتے تھے اور مریضوں کو پلاتے اور ان پر چھڑکا کرتے تھے۔[3]

زم زم میں کفن یا نقدی بھگونا:

بعض حُجاجِ کرام بلکہ اکثر لوگ برکت کی غرض سے کفن کے کپڑے تھانوں کے حساب سے بھگو کر لاتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ زم زم میں تر کیے ہوئے کپڑوں میں مُردوں کو کفنانا باعثِ نجات ہے۔ حالانکہ یہ سراسر عبث اور لا اصل بات ہے، اگر عقائد و اعمال درست نہیں تو یہ کفن بھی کسی کام نہیں آ سکتا۔ نجات کا دارومدار اللہ کی نظرِ کرم اور پھر صحتِ عقیدہ و اعمالِ صالحہ پر ہے۔ عبداللہ بن ابی کا واقعہ اس بات کی دلیل ہے۔

صفا و مروہ کے مابین سعی:

جب آپ طوافِ بیت اللہ اور نمازِ طواف سے فارغ ہوجائیں تو بابِ صفا کے راستے مسجدِ حرام سے نکلیں، کیونکہ صحیح مسلم اور مسند احمد میں مذکور حدیث کے مطابق حجۃ الوداع کے موقع پر

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٢٥٧، ٣٧٢) مصنف ابن أبي شيبة (٣/ ٢٧٤)

[2] صحيح مسلم (١٦/ ٣٠) الطيالسي (١/ ٢٠٣) الفاكهي (٣/ ٢٩، ٣٠) مسند البزار (١١٧١، ١١٧٢)

[3] صحيح البخاري (٣/ ١٨٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٦٣)

نبی اکرم ﷺ اسی راستے سے نکل کر صفا پر گئے تھے، پھر قبلہ رو ہو کر صفا پر ذکر و دعا کریں اور سورۃ البقرۃ کی آیت (۱۵۸) پڑھیں، اس کے بعد صفا سے نیچے کی طرف اترتے جائیں اور مروہ کی طرف چلنے لگیں اور سعی شروع کر دیں جس کے بارے میں مسند احمد، مستدرک حاکم، سنن دارقطنی اور بیہقی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِسْعَوْا، اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ»[1]

''سعی کرو، کیونکہ اللہ نے تم پر یہ سعی فرض کی ہے۔''

لہٰذا معمول کے مطابق چلتے ہوئے ان ستونوں تک پہنچ جائیں جن کو سبز رنگ کیا گیا ہے اور ''سبز میل'' کے نام سے مشہور ہیں، آجکل وہاں سبز ٹیوبیں جل رہی ہوتی ہیں۔ وہاں سے باوقار طریقے سے مردوں کے لیے دوڑنا ضروری ہے اور اسی دوڑنے کا نام ''سعی'' ہے جو صحیح مسلم اور دیگر کتب والی معروف حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کی رو سے مسنون ہے، کیونکہ اس میں ہے:

''پھر آپ ﷺ صفا سے اترے اور مروہ کی طرف چلنے لگے اور جب آپ ﷺ وادی کے درمیان پہنچ گئے تو وہاں سے دوڑے (سعی کی) یہاں تک کہ چڑھائی (مروہ کی) آ گئی تو پھر معمول کے مطابق چلنے لگے یہاں تک کہ مروہ پر پہنچ گئے۔''

یہ ساری جگہ جو آج کل خوبصورت سنگِ مرمر سے فرش کی گئی ہے اور دونوں پہاڑیوں کی صرف تھوڑی تھوڑی چوٹیاں بطورِ نشانی باقی رکھی گئی ہیں، یہ نبی اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک اور بعد میں بھی مدتِ مدید تک کشادہ اور پتھریلی جگہ تھی، یہی وجہ ہے کہ نسائی شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا يُقْطَعُ الْاَبْطَحُ إِلَّا شَدًّا»[2] ''اس پتھریلی وادای کو دوڑ کر پار کرنا چاہیے۔''

یہاں بھی صفا کی طرح قبلہ رو ہو جائیں، تکبیر و توحید اور ذکر و دعا کریں اور خود اپنے اور عزیز و اقارب کے لیے دعائیں کریں۔ پھر چلنے کی جگہ چلتے ہوئے اور دوڑنے کی جگہ دوڑے ہوئے صفا پر جا چڑھیں، یہ دوسرا چکر مکمل ہو گیا ہے۔ اسی طرح سات چکر مکمل کرنے ہیں اور ساتواں چکر ظاہر ہے کہ مروہ پر جا کر ختم ہوگا۔

---

[1] طبقات ابن سعد (٨/ ٢٤٧) مسند أحمد (٦/ ٤٢١، ٤٢٢، ٤٣٧)

[2] سنن النسائي (٥/ ٢٤٢) مصنف ابن أبي شيبة (٤/ ٦٩) مسند أحمد (٦/ ٤٠٤، ٤٠٥) الطبراني (٢٥/ ٩٨)

عورتوں کی سعی:

عورتوں کے سعی کرنے کا طریقہ بھی مردوں کی طرح ہی ہے، کیونکہ بخاری شریف، کتاب الانبیا میں حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا واقعہ ہی اس سعی کا آغاز اور سببِ مشروعیت ہے اور انھوں نے اس جگہ دوڑ کر ہی ساتوں چکر لگائے تھے۔[1] تاہم رش اور بے پردگی کا اندیشہ ہو تو صرف چل کر ہی اس حصے کو پار کرلیں۔

سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا:

جب مروہ پر پہنچ کر سعی کے سات چکر مکمل کرلیں تو حجِ تمتع کرنے والے اپنے سر کے کچھ بال کٹوالیں اور عورتیں اپنی چوٹی کے بال پکڑ کر صرف انگلی کے ایک پَورے کے برابر کاٹ لیں۔ ان کے لیے یہی کافی ہے اور اس پر اجماع ہے۔ اس کے ساتھ ہی عمرہ مکمل ہوگیا، احرام کھول دیں، معمول کا لباس پہنیں۔ مرد خوشبو استعمال کریں، حسبِ معمول زندگی کے ایام بسر کریں، مصروفِ عبادت رہیں اور کوشش کرکے حرم شریف میں باجماعت نمازیں ادا کریں۔

خواتین کے لیے حکم:

اگر کسی عورت نے عمرے کا احرام باندھا مگر طوافِ بیت اللہ اور سعی صفا و مروہ سے پہلے ہی اسے حیض آ گیا یا زچگی ہوگئی اور نفاس کا خون جاری ہوگیا تو وہ طواف و سعی نہ کرے اور جب وہ پاک ہوجائے تو طواف و سعی کرکے سر کے بال پَورے برابر کاٹ لے اور احرام کھول دے، اس کا عمرہ مکمل ہوگیا اور اگر کسی وجہ سے یومِ ترویہ (۸/ ذوالحج) تک بھی پاک نہ ہو تو وہ دوسرے حُجاج کے ساتھ ہی (حج کے لیے) منیٰ چلی جائے کیونکہ احرام تو وہ پہلے ہی سے باندھے ہوئے ہے، اسے عمرے کے بجائے حج کے احرام سے بدل لے جو محض نیت کرنے ہی سے ہو جائے گا، اس طرح اس کا ''حجِ قِران'' بن جائے گا، پھر وہ منیٰ و عرفات اور مزدلفہ کے تمام مناسکِ حج پورے کرے اور ایامِ تشریق کی رمی بھی کرے اور یومِ نحر و قربانی (۱۰/ ذی الحج) کو جب وہ جمرہ عقبہ پر رمی کرلے اور قربانی کرکے اپنے سر کے بال پَورے برابر کاٹ لے تو اس پر بھی دوسری عام عورتوں کی طرح شوہر کے سوا ہر چیز حلال ہو جائے گی اور پھر جب طواف و سعی بھی (پاک ہوکر) کرلے گی تو اس کا

[1] مختصراً از مناسك الحج والعمرة (ص: ۲۷)

حج وعمرہ دونوں مکمل ہو جائیں گے اور اس کے لیے بھی ہر چیز حلال ہو جائے گی۔[1]

ایسی عورت اور ہر قارن ومفرد کے لیے صحیح بخاری ومسلم میں مذکور ایک حدیث کے مطابق صرف ایک طواف اور ایک سعی ہی حج وعمرہ دونوں کے لیے کافی ہے، البتہ طواف قدوم مستحب ہے اور طوافِ وداع واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ وہ ہمیں صحیح سنت کے مطابق حج وعمرہ کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
3. سوئے حرم۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ علی بن محمد مغربی رحمہ اللہ۔ ترجمہ: حافظ عبد الغفار مدنی

[1] التحقيق و الإيضاح (ص: ٣٤)

مسائل حج اور زیارتِ مدینہ

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَ اذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَ اِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾

[البقرة: ۱۹۶ تا ۲۰۳]

’’حج کے تو کئی مہینے ہیں جو مشہور ہیں (یعنی شوال اور ذو القعدہ اور دس دن ذو الحجہ کے) پھر جو کوئی ان دنوں میں حج کا احرام باندھ لے تو حج میں (یعنی حج کے ختم ہوئے تک) شہوت کی باتیں اور گناہ اور جھگڑا نہ کرے، جو نیک کام تم کرو گے اللہ کو معلوم ہو جائے گا اور راہ خرچ اپنے ساتھ رکھو، اسی لیے کہ اچھا توشہ یہی ہے کہ (بھیک مانگنے سے

بچے) اور عقل مندو! مجھ سے (میرے عذاب اور غصے سے) ڈرتے رہو، اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں کہ (حج کے دنوں میں) اپنے پروردگار کا فضل وکرم چاہو، پھر جب عرفات سے (نویں تاریخ شام کو) لوٹو تو (مزدلفہ) میں آ کر اللہ کو یاد کرو اور جیسے اللہ تعالیٰ نے تم کو بتلایا، اس طرح یاد کرو اور اس سے پہلے تو تم گمراہ تھے۔ ایک بات اور ہے کہ اسی مقام سے لوٹو جہاں سے سب لوگ لوٹتے ہیں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگو، بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے، پھر جب حج کے کام پورے کر چکو تو جس طرح (جاہلیت کے زمانے میں) اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے تھے، اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ اللہ کی یاد کرو تو بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں: ہمارے پروردگار! ہم کو (جو دینا ہے) دنیا ہی میں دے دے، ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہ رہا اور بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ان کی کمائی میں سے کچھ حصہ ملے گا اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو، پھر جو شخص جلدی کر کے دو ہی دن میں (منیٰ سے) چل دے تو اس پر کچھ گناہ نہیں اور جو دیر (تیرہ تاریخ) تک ٹھہرا رہے، اس پر بھی کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ پرہیزگار ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ سمجھ لو کہ تم اس کے پاس (قیامت کے دن) اکٹھے ہوگے۔‘‘

۸/ ذوالحج، یومِ ترویہ:

جو لوگ حج تمتع کر رہے ہوں اور عمرے کا احرام کھول چکے ہوں، وہ ۸/ ذوالحج (یومِ ترویہ) کو اپنی قیام گاہ پر غسل کریں۔ مرد حُجاج دستیاب شدہ عمدہ خوشبو لگائیں اور اپنی قیام گاہ ہی سے حج کا احرام باندھ لیں، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ایسے ہی کیا تھا اور یہی مسنون طریقہ ہے۔ ۸/ ذوالحج یعنی یومِ ترویہ کو نمازِ ظہر، عصر، مغرب، عشا اور اگلے دن کی نمازِ فجر منیٰ ہی میں جا کر ادا کرنا سنت ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

’’نبی اکرم ﷺ یومِ ترویہ کو حج کا تلبیہ کہتے ہوئے منیٰ کی طرف روانہ ہوئے اور اپنی

سواری پر بیٹھ کر گئے اور آپ ﷺ نے ظہر وعصر، مغرب وعشا اور فجر کی نمازیں وہیں ادا فرمائیں۔‘‘[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ رات منیٰ میں جا کر گزارنا ہی سنت ہے اور نمازِ ظہر کے لیے وہاں پہنچنا مسنون عمل ہے۔ ہاں اگر کوئی مجبوری ہو تو رات کو بھی منیٰ پہنچنا جائز ہے اور اس پر کوئی فدیہ بھی نہیں۔[2]

منیٰ میں نمازِ ظہر وعصر اور عشا قصر کر کے (دوگانہ) پڑھی جائیں۔ اس میں مکی و غیر مکی یا مقامی و آفاقی حجاج میں کوئی فرق نہیں۔[3]

۹/ ذوالحج، یومِ عرفہ یا یومِ حج:

۹/ ذوالحج کو ’’یومِ عرفہ‘‘ اور ’’یومِ حج‘‘ بھی کہا جاتا ہے۔ اس دن نمازِ فجر منیٰ میں ادا کر کے کچھ دیر ذکرِ الٰہی میں گزاریں اور جب سورج طلوع ہو جائے تو منیٰ سے عرفات کو تلبیہ اور تکبیریں کہتے ہوئے روانہ ہو جائیں، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

’’نبی اکرم ﷺ طلوعِ آفتاب کے بعد منیٰ سے روانہ ہوئے۔‘‘[4]

وادیِ عُرنہ میں:

زوالِ آفتاب کے بعد وادیِ عُرنہ کے ساتھ ہی آگے وادی نمرہ (عرفات) میں آپ ﷺ تشریف لے گئے (جہاں آج کل مسجدِ نمرہ بنائی گئی ہے) وہاں آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا، پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان کہلوا کر ایک اقامت سے ظہر اور پھر دوسری اقامت سے عصر کی نمازیں قصر وجمع کر کے پڑھیں۔

وقوفِ عرفات:

وقوفِ عرفات حج کا ’’رُکنِ اعظم‘‘ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْحَجُّ عَرَفَةُ»[5] ’’میدانِ عرفات میں وقوف کرنے ہی کا نام حج ہے۔‘‘

---

[1] سنن أبي داود (١٩٠٥) سنن ابن ماجه (٣٠٧٤) سنن الدارمي (٢/ ٤٥، ٤٩) سنن البيهقي (٥/ ٧، ٩)

[2] المغني (٣/ ٣٦٣) نيل الأوطار (٣/ ١٥١٤٦ مصرى)

[3] التحقيق و الإيضاح (ص: ٢٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٥٩) صحيح مسلم (٩/ ٣٠)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٨٩، ٨٩٠)

طریقہ وقوف:

نبی اکرم ﷺ نے ''جبلِ رحمت'' (عرفات میں موجود پہاڑی) کے دامن میں وقوف فرمایا تھا، جبلِ رحمت کے اوپر آپ نہیں چڑھے تھے بلکہ اس کے پاس ہی قبلہ رو ہو کر وقوف فرمایا تھا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ عرفات میں سینے تک اس طرح ہاتھ اٹھائے دعا کر رہے تھے جیسے کوئی مسکین کھانا مانگ رہا ہو۔''[1]

آپ ﷺ جبلِ رحمت کے دامن میں بچھی چٹانوں پر اس طرح مشغولِ دعا و ذکر رہے تھے مگر موقف کی وسعت کو واضح کرنے کے لیے صحیح مسلم اور ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے تو یہاں وقوف کیا ہے، مگر پورا میدانِ عرفات ہی جائے وقوف ہے۔''[2]

یومِ عرفہ کی فضیلت اور دعائیں:

یومِ عرفہ کی بڑی فضیلت ہے، اس ایک دن کے روزے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دو سالوں کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔[3]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

''جب یومِ عرفہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نازل ہوتا ہے اور فرشتوں کو فخریہ کہتا ہے: ''میرے بندوں کو دیکھو! وہ کس طرح گرد آلود اور پراگندہ بال والے مجھے پکارتے ہوئے دور دراز سے میرے لیے آئے ہیں۔ میں تمھیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان سب کو بخش دیا۔''[4]

یہ سارا مبارک دن ذکر و دعا میں گزارنا چاہیے۔ افضل دعا یہ ہے:

«لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ»[5]

---

[1] سنن البيهقي (٥/ ١١٧) أخبار مكة للفاكهي (٥/ ٢٣، ٢٤)

[2] صحيح مسلم (٨/ ١٩٥)

[3] صحيح مسلم (٨/ ٥٠، ٥١) سنن أبي داود (٢٤٢٥، ٢٤٢٦) سنن الترمذي (٧٤٩) سنن ابن ماجه (١٧٣٠)

[4] شرح السنة (١٩٣١) صحيح ابن خزيمة (٢٨٤٠) صحيح ابن حبان (١٠٠٦)

[5] مسند أحمد (٣/ ٢١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٨٥)

''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ سارے جہاں کی بادشاہی اور ہر قسم کی تعریف اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

عام حجاج کو چاہیے کہ وہ یہ دعا اور ایسی ہی قرآن وسنت سے ثابت شدہ ومسنون دعائیں مانگیں:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [البقرة: ٢٠٢]

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس دنیا میں اور آخرت میں، دونوں جہانوں میں حسنات و بھلائیاں عطا کر اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔''

«اَللّٰهُمَّ حَجَّةً، لَا رِيَاءَ فِيهَا وَلَا سُمْعَةَ»[1]

''اے اللہ! میں (صرف تیری رضا کے لیے) حج کرنے آیا ہوں، نمود ونمایش سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔''

اسی طرح غروبِ آفتاب تک ذکر و دعا میں مشغول رہیں۔

لیلۃ الجمع یا مزدلفہ کی رات:

میدانِ عرفات میں جب سورج غروب ہوجائے تو اور تلبیہ اور تکبیریں کہتے ہوئے نمازِ مغرب پڑھے بغیر ہی سکون واطمینان کے ساتھ مزدلفہ کی طرف روانہ ہوجائیں۔ اس وقت افراتفری مچانا اور شور وغل کرنا منع ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے جب لوگوں کو ایسے کرتے دیکھا تو آپ فرمایا:

''لوگو! آرام وسکون سے چلو، کیونکہ یہاں دوڑنا کوئی نیکی کا کام نہیں۔''[2]

اس طرح جب مزدلفہ پہنچ جائیں تو صحیح بخاری ومسلم میں مذکور احادیث کے مطابق ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ قصر اور جمع تاخیر کر کے پہلے نماز مغرب اور پھر نماز عشا پڑھیں، چنانچہ صحیح مسلم والی مشہور حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں ہے:

''آپ ﷺ میدانِ عرفات سے مزدلفہ پہنچے اور وہاں آپ ﷺ نے ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ نمازِ مغرب وعشا پڑھیں اور ان کے مابین کوئی سنت ونفل نہیں پڑھے، پھر آپ ﷺ نمازِ فجر تک سوگئے۔''

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث، (٢٨٩٠) مصنف ابن أبي شيبة (٣/ ٤٤٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٧١)

کنکریاں اکٹھی کرنا:

بعض لوگ مزدلفہ پہنچتے ہی نمازیں ادا کرنے سے پہلے کنکریاں اکٹھی کرنا شروع کر دیتے ہیں جو خلافِ سنت فعل ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ فجر پڑھنے اور پھر مشعر الحرام پر ذکر و دعا کے بعد منیٰ کو روانگی کے وقت کنکریاں لانے کا حکم فرمایا تھا۔[1]

وادیِ محسّر:

منیٰ و مزدلفہ کے مابین ہی وادیِ محسر بھی ہے جو منیٰ ہی کا حصہ ہے، جہاں اصحابِ فیل (ہاتھی والوں) کی بربادی کا واقعہ رونما ہوا تھا۔ یہ وادی مزدلفہ سے خارج ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ایسی جگہوں سے گزرتے جہاں پر اللہ نے اپنے دشمنوں پر عذاب نازل کیے تھے تو جلدی جلدی گزر جاتے، چنانچہ حجر اور ثمود کے علاقوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیزی سے گزرے تھے۔[2] ایسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وادیِ محسر میں بھی کیا تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث میں بھی ہے:

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وادیِ محسر میں پہنچے تو اپنی سواری کو کچھ حرکت دی (اور تیزی سے نکل گئے)۔''

الغرض مزدلفہ میں جب روشنی خوب ہو جائے مگر ابھی سورج طلوع نہ ہوا ہو تو تلبیہ کہتے ہوئے منیٰ کی طرف روانہ ہوجانا چاہیے۔

۱۰/ ذوالحج یا یومِ نحر وقربانی:

۱۰/ ذوالحج کو جب آپ مزدلفہ سے منیٰ پہنچ جائیں تو یہاں آ کر چار کام کرنے ہوتے ہیں، جن میں مسنون ترتیب یہ ہے:

① جمرہ عقبہ کی رمی۔ ② نحر وقربانی۔

③ حلق یا تقصیر (پورا سر منڈوانا یا کچھ بال کٹوانا)۔ ④ طوافِ افاضہ یا طوافِ زیارت۔

① رمی جمرہ عقبہ:

۱۰/ ذوالحج کو مزدلفہ سے منیٰ آتے ہی سب سے پہلے جمرہ عقبہ پر رمی کرنا یا کنکریاں مارنا

---

[1] صحيح مسلم (۹/ ۲۷)

[2] بحواله حجة النبي (ص: ۸۷)

مسنون ہے۔ رمی سے فارغ ہو جانے کے بعد جمرہ عقبہ کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنا ثابت نہیں ہے۔

''رمی کرتے وقت تمام کنکریاں ایک ایک کر کے مارنا ضروری ہے۔''[1]

اہلِ منیٰ کی عید:

ایک خاص بات یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منیٰ میں ہوتے ہوئے بھی ۱۰/ ذو الحج کو عید پڑھنا مستحب ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور آپ کے خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم نے منیٰ میں نمازِ عید ہرگز ہرگز نہیں پڑھی۔ منیٰ میں مقیم حجاج کے لیے جمرہ عقبہ پر رمی کرنا ایسا ہی ہے، جیسے دوسرے شہروں والوں کے لیے عید پڑھنا ہے۔[2]

۲ نحر و قربانی:

قربانی کا جانور حتی الامکان اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا چاہیے اور یہ ممکن نہ ہو تو دوسرا آدمی بھی مقرر کیا جاسکتا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے بیک وقت دونوں ہی صورتوں پر عمل فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے تریسٹھ اونٹ ذبح کیے اور باقی کے (سینتیس اونٹ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ذبح کرنے کے لیے حکم فرمایا تھا۔

قربانی کے جانور کا گوشت کھانا:

اپنی قربانی کے جانور کا گوشت کھانا بھی سنت ہے، چاہے تھوڑا سا ہی کیوں نہ کھایا جائے اور اس میں سے فقیروں اور محتاجوں میں بھی تقسیم کرنا چاہیے، کیونکہ سورت حج (آیت: ۳۶) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴾

''پس تم خود (قربانی کا گوشت) کھاؤ اور فقیروں، محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔''

قربانی سے فارغ ہو کر اپنے سر کے سارے بال منڈوالیں یا کچھ بال کٹوالیں؛ دونوں طرح ہی جائز ہے، اگرچہ منڈوانا افضل ہے۔

عورتوں کے لیے حکم:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

---

[1] المغني (٣/ ٣٨٦)

[2] فتاویٰ ابن تيمية (٢٦/ ١٧٠، ١٧١)

«لَيْسَ عَلَى النِّسَآءِ حَلْقٌ، اِنَّمَا عَلَى النِّسَآءِ التَّقْصِيْرُ»[1]

''عورتوں کے لیے سر منڈوانا نہیں، ان کے لیے کچھ بال کاٹنا ہی کافی ہے۔''

تحللِ اول:

حلق یا تقصیر کے بعد احرام کھول دیں، اس کے ساتھ ہی صرف میاں بیوی کے ازدواجی تعلق کو چھوڑ کر باقی وہ تمام اشیا حلال ہوگئیں جو احرام کی وجہ سے حرام تھیں۔

طوافِ افاضہ کا مسنون وقت:

طوافِ افاضہ کا مسنون وقت تو یوم نحر ۱۰/ ذو الحج ہی ہے، کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یومِ نحر میں قربانی کی اور مکہ مکرمہ چلے گئے اور بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔''[2]

لہٰذا مسنون تو یہی ہے، لیکن اگر عذر (حیض یا بیماری) ہو تو ایامِ تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳/ ذوالحج) میں سے کسی دن کر لینا چاہیے، یہی بہتر ہے ورنہ جب عذر و مجبوری زائل ہو، واپسی سے پہلے پہلے یہ طواف کرلیں اور اس تاخیر پر کوئی فدیہ بھی نہیں۔

تحلّلِ ثانی یا تحلّلِ کلی:

طوافِ افاضہ وسعی کر لینے کے بعد حجاج پر میاں بیوی کے تعلقات سمیت ہر وہ چیز حلال ہو جاتی ہے جو احرام کی وجہ سے حرام تھی۔ حدیث میں ہے:

''... یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حج مکمل کرلیا اور یومِ نحر میں قربانی دے لی اور بیت اللہ کا ''طوافِ افاضہ'' بھی کر لیا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس چیز کو حلال کر لیا جو (احرام کی وجہ سے) حرام تھی۔''[3]

قیامِ منیٰ اور ذِکر وعبادت:

حدیث میں ہے:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ ظہر کے بعد طوافِ افاضہ کیا، پھر منیٰ کی طرف تشریف لے گئے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۷۲۸) صحيح مسلم (۹/ ۵۱)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱٦۹۱) صحيح مسلم (۸/ ۲۱۰)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱٦۹۱، ۱٦۹۲) صحيح مسلم (۸/ ۲۱۰، ۲۱۱)

اور ایامِ تشریق کی راتیں منیٰ ہی میں گزاریں۔[1]

منیٰ میں قیام کا عرصہ ذکر وعبادت میں گزاریں، کیونکہ سورت بقرہ (آیت: ۲۰۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾

''اِن گنتی کے دنوں (ایامِ منیٰ) کو ذِکرِ الٰہی میں بسر کریں۔''

منیٰ میں قیام کے دوران میں نمازِ ظہر وعصر اور عشا قصر کر کے (دوگانہ) پڑھنا مسنون ہے۔

ایامِ تشریق میں رمی جمار کا طریقہ:

جو شخص یومِ نحر کے علاوہ تین دن ایامِ تشریق میں جمرات پر رمی کر لے گا، اس کی کل ستر (۷۰) کنکریاں بنیں گی۔ ہر جمرے پر سات سات کنکریوں سے رمی کرنا ضروری ہے۔

صحیح بخاری وسنن بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب جمرہ اولیٰ پر رمی کرتے (جو مسجدِ خیف کے قریب ہے) تو اس پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' کہتے، پھر تھوڑا سا بائیں جانب ہو جاتے اور قبلہ رو کھڑے ہو کر طویل عرصے تک ہاتھوں کو اُٹھائے دعا فرماتے۔ پھر دوسرے (جمرہ وسطیٰ) پر بھی اسی طرح رمی اور دعا کرتے، پھر تیسرے جمرے پر آتے جو عقبہ کے پاس ہے (اور جمرہ عقبہ یا کبریٰ کہلاتا ہے) اس پر بھی سات ہی کنکریوں سے رمی فرماتے اور ہر کنکری کے ساتھ ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' بھی کہتے مگر:

« وَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا ثُمَّ يَنْصَرِفُ »[2]

''وہاں (دعا کے لیے) کھڑے نہیں ہوتے تھے، بلکہ چلے جاتے تھے۔''

ایسے ہی یہی طریقہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں بھی ہے۔

طوافِ وداع:

جب ایامِ تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳/ ذوالحج) کی رَمی مکمل ہو جائے تو منیٰ سے مکہ مکرمہ آ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی تمام مناسکِ حج مکمل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف روانگی ہوتی ہے، لہٰذا جاتے وقت ''طوافِ وداع'' ضرور کر لیں، کیونکہ یہ بھی واجب ہے۔[3]

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٩٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٧٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٥١، ١٧٥٣)

[3] شرح الفتح الرباني (١٢/ ٢٣٦)

وجوبِ طوافِ وداع:

طواف وداع کے واجب ہونے کی دلیل صحیح بخاری اور مسلم اور ابو داود میں مذکور وہ حدیث ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''کوئی حاجی اس وقت تک (مکہ مکرمہ سے) نہ جائے جب تک وہ آخر میں طوافِ وداع نہ کرلے۔''[1]

اگر کوئی طوافِ وداع کیے بغیر مکہ سے ملک چلا جائے تو اس پر دم واجب ہے، البتہ جو عورت طوافِ افاضہ کرچکی ہو اور اس کے بعد اُسے حیض آجائے تو اسے طوافِ وداع کیے بغیر نکلنے کی اجازت ہے۔

طوافِ وداع کا طریقہ و آداب:

اس طواف کے لیے نہ تو احرام ہے نہ اضطباع اور نہ رمل اور اس کے بعد صفا و مروہ کے مابین سعی بھی نہیں ہے۔ معمول کے لباس میں حرم شریف میں جا کر سابق صفحات میں ذکر کیے گئے آداب کے ساتھ بیت اللہ شریف کا طواف کریں۔ جب سات شوط (چکر) پورے ہوجائیں تو مقامِ ابراہیم علیہ السلام پر دو رکعتیں پڑھیں۔ ملتزم کے ساتھ چمٹ کر یا پاس کھڑے ہوکر دعائیں کریں، آبِ زمزم پئیں اور پھر ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ، اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ'' پڑھتے ہوئے حرم شریف سے نکل جائیں اور اپنا بایاں قدم پہلے باہر رکھیں جیسا کہ عام مساجد سے نکلنے کا طریقہ بھی ہے۔ یوں ''طوافِ وداع'' کے ساتھ ہی حج وعمرہ کے تمام مناسک (فرائض و واجبات) پورے ہو جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی کوئی کمی یا نقص باقی نہیں رہ جاتا۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو یہ ایمان پرور بہاریں دیکھنا نصیب کرے۔ آمین یا إله العالمين.

یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ طوافِ وداع کے بعد آپ مکہ میں نہ رہیں یعنی آپ کا یہ آخری کام ہوگا اس کے بعد اگر کوئی مدینہ منورہ زیارتِ مسجدِ نبوی کی نیت سے جانا چاہتا ہے تو جا سکتا ہے۔

---

[1] صحيح مسلم (٩/ ٧٨، ٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٠٢)

آدابِ زیارتِ مدینہ طیبہ

حمد وثنا اور خطبہ مسنونہ کے بعد:

اللہ تعالیٰ کا فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [الأحزاب: ٥٦]

''اللہ پیغمبر پر (اپنی رحمت اتارتا ہے) اور فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں، مسلمانوں تم بھی پیغمبر پر درود بھیجو اور سلام بھیجو سلام بھیجنا۔''

مدینہ طیبہ، مسجدِ نبوی وحجرہ رسول ﷺ اور روضہ شریفہ کی زیارت حج کا حصہ یا رکن تو نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ اس مقدس سفر کے دوران میں مدینہ طیبہ جانا ہی نہیں چاہیے۔ تکمیلِ حج کے بعد مدینہ طیبہ بھی جائیں، کیونکہ یہی وہ شہر ہے جہاں مسجدِ نبوی ﷺ ہے۔

① مسجدِ نبوی ﷺ:

اِس میں نماز پڑھنے کی نیت کر کے اور حصولِ ثواب کی غرض سے شدّ رحال (سفر کرنا) موسمِ حج اور غیر موسمِ حج میں ہر وقت ہی جائز ہے، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''(حصولِ ثواب کی غرض سے) صرف تین مسجدوں کی طرف سفر کر کے جانا جائز ہے؛ مسجدِ حرام، میری مسجد (مسجدِ نبوی ﷺ) اور مسجدِ اقصیٰ۔''[1]

لہٰذا مدینہ منورہ کے سفر کا ارادہ کریں تو دل میں نیت مسجدِ نبوی ﷺ ہی کی زیارت کی ہونی چاہیے اور جب آپ مسجد نبوی ﷺ میں پہنچ جائیں تو پھر حجرہ رسول ﷺ اور روضہ شریفہ کی زیارت بھی مشروع ہے۔ اس طرح سفر کرنے سے مذکورہ ارشادِ نبوی ﷺ کی خلاف ورزی نہ ہوگی۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨٩) صحيح مسلم (٩/ ١٦٧، ١٦٨)

مسجدِ نبوی ﷺ میں ایک نماز کا ثواب صحیح بخاری ومسلم کی ایک حدیث کی رو سے عام مساجد میں پڑھی گئی، ایک ہزار نماز سے زیادہ ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''میری اس مسجد میں ایک نماز کا ثواب مسجد حرام کو چھوڑ کر دوسری تمام مساجد سے ایک ہزار گُنا سے بھی زیادہ ہے۔''[1]

② حجرہ رسول ﷺ:

مدینہ طیبہ ہی وہ شہر ہے جہاں سرورِ کائنات سید المرسلین، امام الانبیاء، امامِ اعظم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا حجرہ طیبہ ہے، جس میں آپ ﷺ کی قبرِ مقدس ہے، جہاں مسجدِ نبوی ﷺ میں ''تحیۃ المسجد'' پڑھ لینے کے بعد بہ صد ہزار جان درود وسلام پڑھنا چاہیے۔

③ روضہ شریفہ:

مدینہ طیبہ ہی وہ شہر ہے، جس میں ''روضۂ شریفہ'' ہے، جس کے بارے میں صحیح بخاری ومسلم میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَا بَيْنَ بَيْتِيْ وَمِنْبَرِيْ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ))[2]

''میرے گھر اور میرے منبر کا درمیانی قطعہ ارضی جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے۔''

نبی اکرم ﷺ نے جس مقام کو ''روضہ'' کا نام دیا، وہ آپ ﷺ کے گھر اور منبر کے مابین والی جگہ ہے، جس کے ستونوں پر سفید سنگ مرمر لگا کر نمایاں اور ممتاز کیا گیا ہے، لیکن عوام الناس تو صرف نبی اکرم ﷺ کی قبرِ مقدس پر مشتمل حجرہ رسول ﷺ کو روضہ شریفہ سمجھتے ہیں، جبکہ وہ حجرہ شریفہ ہے جو ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ، طیبہ و طاہرہ بنت صدیق رضی اللہ عنہما کا گھر ہوا کرتا تھا اور آپ ﷺ کی قبرِ مقدس اسی جگہ ہے۔

مسجدِ نبوی ﷺ میں داخل ہونے کے آداب:

جب مدینہ طیبہ پہنچیں تو جہاں قیام کا ارادہ ہو، وہاں اپنا سامان وغیرہ رکھیں۔ نہا دھوکر اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث: (١١٩٠) صحيح مسلم (٩/ ١٦٣، ١٦٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٩٦، ١٨٨٨) صحيح مسلم (٩/ ١٦٢)

باوضو مسجدِ نبوی ﷺ کا رخ کریں۔ مسجد کے پاس پہنچنے پر پہلے اپنا دایاں پاؤں مسجد کے اندر رکھیں اور یہ دعا کریں:

«اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ»

''اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دے!''

مسجد میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کریں کہ ''تحية المسجد'' کی دو رکعتیں ادا کریں اور بہتر ہو کہ یہ دو رکعتیں ''روضة الجنة'' میں ادا کی جائیں۔ ''تحية المسجد'' سے فارغ ہو کر حجرہ اقدس پر حاضر ہوں اور محسنِ انسانیت، نبی رحمت ﷺ پر کمالِ ادب اور جوشِ محبت کے ساتھ درود وسلام پڑھیں، کیونکہ قرآنِ کریم میں اس کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [الأحزاب: ٥٦]

''اللہ پیغمبر پر (اپنی رحمت اتارتا ہے) اور فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! آپ پر درود وسلام پڑھو۔''

پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قبر پر سلام کہیں جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہی آسودہ خاک ہیں اور پھر حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی قبر پر سلام کہیں کہ وہ بھی ساتھ ہی یکے از آسودگان ہیں اور آپ ﷺ کے ان دونوں صاحبین کے لیے دعا بھی کریں اور ہر ایک کے لیے ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَأَرْضَاهُ'' کہیں۔

یہاں بعض امور کی طرف توجہ مبذول کروانا مناسب معلوم ہوتا ہے:

① وہاں حاضری کے لیے کوئی مخصوص دعا وسلام ثابت نہیں۔

② وہاں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے جو ثابت ہے وہ صرف یہ ہے:

''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ'' ''اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر سلامتی ہو۔''

''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَا بَكْرٍ'' ''اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! آپ پر سلامتی ہو۔''

''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَتَاهُ'' ''اے ابا جان! آپ پر سلامتی ہو۔''

وہ اتنا کہتے اور چل دیتے تھے۔[1]

[1] بحواله التحقيق والإيضاح (ص: ٦٢)

③ حجرہ رسول ﷺ کی دیواروں اور جالیوں کو چھونا، انھیں چومنا اور اس کا طواف کرنا جائز نہیں، کیونکہ خود امام غزالی رحمہ اللہ نے اس چوما چاٹی پر نکیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"إِنَّهٗ عَادَةُ النَّصَارَىٰ وَالْيَهُوْدِ" "یہ یہود ونصاریٰ کی عادت ہے۔"

④ صلات وسلام کے وقت یہاں زیادہ دیر تک رُکے رہنا اور بھیڑ کا سبب بننا، جس کے نتیجے میں شور پیدا ہو، یہ بھی درست نہیں، کیونکہ یہ ادب گاہِ عالَم ہے، یہاں آوازوں کو پست رکھنا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں سورت حجرات (آیت: ۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ﴾

"نبی کی آواز سے اپنی آوازوں کو اونچا مت کرو۔"

اس ارشادِ الٰہی پر آپ ﷺ کی موت وحیات ہر دو شکلوں میں ہی عمل کریں کہ اس میں احترامِ رسالت پنہاں ہے۔[1]

⑤ جب صلات وسلام سے فارغ ہو جائیں تو قبلہ رو ہو کر اللہ تعالیٰ سے دین و دنیا کی بھلائیوں کی دعائیں مانگیں۔

⑥ بعض لوگ جوشِ محبت میں ہوش کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور قبلہ رو ہونے کے بجائے قبرِ شریف کی طرف ہی منہ کیے رہتے ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ دعا قبلہ رو ہو کر ہی کرنی چاہیے۔ ایسے امور کو بدعات کہا جاتا ہے۔ جبکہ یہ معاملہ انتہائی خوفناک انجام کا سبب بن سکتا ہے، جس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ صحیح بخاری ومسلم میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"جس نے اس (مدینہ منورہ) میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی، اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو، اس سے اس کا کوئی فدیہ یا فرضی یا نفلی عبادت قبول نہ کی جائے گی۔"[2]

مسجدِ قبا:

مدینۃ الرسول ﷺ میں قیام کے دوران میں مسجد قبا میں کسی وقت دو رکعتیں ضرور پڑھ لیں،

[1] التحقيق و الإيضاح لابن باز (ص: ٦٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٧٠) صحيح مسلم (٩/ ١٤٣)

کیونکہ سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''جو شخص گھر سے وضو کر کے آئے اور مسجدِ قبا میں نماز (دو رکعتیں) ادا کرے، اسے ایک عمرے کا ثواب ملتا ہے۔''[1]

بقیع الغرقد:

قیامِ مدینہ کے دوران میں مسجدِ نبوی ﷺ میں پنج گانہ نمازِ باجماعت کی پابندی کریں اور مسجدِ نبوی ﷺ کے ساتھ ہی جنت البقیع ہے، اس کی زیارت کے لیے جائیں تو صحیح مسلم میں مذکور یہ دعا اہلِ بقیع کے لیے کریں:

«اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِیْنَ، وَآتَاکُمْ مَا تُوْعَدُوْنَ غَدًا مُؤَجَّلُوْنَ، وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَهْلِ بَقِیْعِ الْغَرْقَدِ»[2]

''مومن لوگو! تم پر سلامتی ہو اور تمھیں وہ مل گیا ہے جس کا تم سے وعدہ تھا اور جب اللہ نے چاہا ہم بھی تم سے آملیں گے۔ اے اللہ! بقیع الغرقد کے آسودگان کی مغفرت فرما۔''

دیگر تاریخی یادگاریں:

مذکورہ مقامات اور زیارتوں کے علاوہ مدینہ طیبہ اور اس کے گردونواح میں کتنی ہی تاریخی یادگاریں ہیں، اسی طرح مکہ مکرمہ کے قرب وجوار میں بھی ایسے مقامات موجود ہیں جن کی شرعی نقطہ نظر سے تو نہیں البتہ تاریخی نقطہ نظر سے زیارت کی جاسکتی ہے اور اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ جہاں بھی جائیں وہیں دو رکعتیں ضرور ہی پڑھیں، کیونکہ یہ التزام قطعاً ثابت نہیں ہے اور جہاں جہاں جو کچھ ثابت ہے وہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

قیامِ مدینہ طیبہ:

حرمین شریفین روے زمین پر دو ایسے مقامات ہیں جہاں رہتے ہوئے کسی مسلمان کا کبھی جی نہیں بھرتا، کیونکہ وہاں قلب ونظر کی آبیاری اور روح وایمان کی بالیدگی کے سامان موجود ہیں۔ ایک

---

[1] صحیح البخاري (٢/ ٤٧) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٢٤) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٤١١)

[2] صحیح مسلم (٧/ ٤١)

حرم (حرم مکی) میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نماز کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور دوسرے حرم (حرمِ مدنی) میں ایک نماز کا ثواب صحیح حدیث کی رو سے ایک ہزار نماز سے زیادہ ہے، لہٰذا حرمین شریفین میں قیام سے تو کبھی جی نہیں بھرتا، لیکن نبی اکرم ﷺ کے بعض ارشادات سے پتا چلتا ہے کہ حج وعمرہ کے مناسک مکمل ہو جانے کے بعد اپنے گھروں کو جلد لوٹ جانا مستحب ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں ایک عام ہدایت پر مشتمل ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''سفر بھی عذاب کا ایک حصہ ہے، کیونکہ یہ تمھیں (وقت پر اور مناسبِ حال) کھانے پینے سے روکتا ہے، لہٰذا تم میں سے جب کوئی شخص اپنا کام پورا کر لے تو جلد اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ آئے۔''[1]

سنن دارقطنی میں تو خاص حج کے بارے میں بھی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''تم میں سے جب کوئی شخص مناسکِ حج پورے کر لے تو اسے جلد اپنے گھر لوٹ جانا چاہیے، اس کے لیے یہی زیادہ اجر کا باعث ہے۔''[2]

واپسی کے آداب:

مدینہ منورہ کی زیارتوں کے بعد جب مسجدِ نبوی ﷺ سے باہر نکلیں تو اپنا بایاں پاؤں پہلے باہر رکھیں اور صحیح مسلم میں مذکور یہ دعا پڑھیں:

﴿اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّد اَللّٰھُمَّ اِنِّیُ اَسۡئَلُكَ مِنۡ فَضۡلِكَ﴾[3]

''اے اللہ! حضرت (ﷺ) پر درود و رحمتیں نازل فرما۔ اے اللہ! میں تیرے فضل وکرم کا طلب گار ہوں۔''

مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت کس راستے سے نکلنا ہے؟ اس کا کوئی ذکر وارد نہیں ہوا، اپنے مناسبِ حال کسی بھی راستے سے نکلیں اور واپسی کے وقت سفر اور سواری کی دعائیں کریں اور جب اپنا شہر نظر آ جائے تو صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں مذکور یہ دعا کریں:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٠٤) صحيح مسلم (١٣/ ٧٠)

[2] سنن الدارقطني (٣/ ٣٠٠) سنن البيهقي (٥/ ٢٥٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٩٧، ٣٠٨٤) صحيح مسلم (٩/ ١١١، ١١٣)

«آئِبُوْنَ، تَائِبُوْنَ، عَابِدُوْنَ، سَاجِدُوْنَ، لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ»[1]

''ہم تو تائب ہو کر سجدہ وعبادت گزاری کا عہد کر کے لوٹ آئے ہیں اور اپنے رب کی تعریفیں کرتے ہیں۔''

جب اپنے شہر، قصبے یا گاؤں پہنچیں تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے محلے کی مسجد میں جائیں اور دو رکعت نماز ادا کریں، کیونکہ سنن ابو داود میں مذکور ایک حدیث کی رُو سے یہ سنتِ رسول ﷺ ہے اور پھر جب اپنے گھر آئیں تو گھر میں داخل ہوتے ہی ابو داود میں مذکور یہ دعا کریں:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّيْ أَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمُوْلَجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا»[2]

''اے اللہ! میں تجھ سے داخل ہونے اور نکلنے کی جگہوں کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں، تیرا نام لے کر ہم یہاں سے نکلے تھے اور اللہ کے نام ہی سے داخل ہو رہے ہیں اور اے ہمارے معبود و پروردگار! تجھی پر ہمارا بھروسا ہے۔''

اس کے بعد گھر والوں کو سلام کہیں اور اہلِ خانہ سے ملیں۔ آپ کا یہ مبارک سفرِ حج وعمرہ مکمل ہوگیا ہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰه

ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ روے زمین پر بسنے والے تمام مسلمانوں کو شرفِ حج وعمرہ سے نوازے۔ آمین۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

مراجعِ درس

1. تفسیر ابن کثیر۔
2. تفسیر احسن البیان۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف
3. سوئے حرم۔ تالیف: فضیلۃ الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ
4. صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ علی بن محمد مغربی رحمہ اللہ۔ ترجمہ: حافظ عبد الغفار مدنی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٩٧، ٢٠٨) صحيح مسلم (٩/ ١١١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٩٦)

مصادر و مراجع

① القرآن الکریم۔

② تفسیر ابن کثیر۔

③ تفسیر احسن البیان۔ تالیف: فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ۔

④ رمضان و روزہ اور زکاۃ۔ تالیف: فضیلۃ الشیخ ابو عدنان مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑤ زکاۃ سے متعلق اہم فتاوی۔ تالیف: الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ۔ ترجمہ: مولانا فضل اللہ سلفی۔

⑥ سوئے حرم۔ تالیف: الشیخ ابو عدنان محمد منیر قمر حفظہ اللہ۔

⑦ صحیح فضائلِ اعمال۔ تالیف: علامہ ابوعبداللہ علی بن محمد مغربی رحمہ اللہ۔ مترجم: حافظ عبدالغفار مدنی۔